خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

مارچ 2015

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ---------- 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---------- 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---------- 6000 روپے



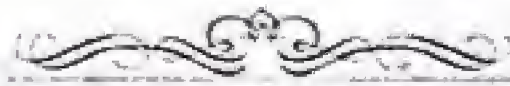












مارچ 2015

جلد 42 شمارہ 11

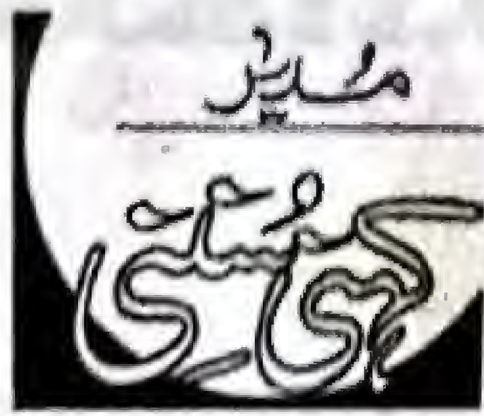
قیمت 60 روپے

خط وکتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: Info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com



خواتین ڈائجسٹ کا مارچ کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

عہد حاضر کی ہانپتی دوڑتی زندگی اور تیز گامی میں اُلجھ کر لطافت کا عنصر کم ہوتا جا رہا ہے۔ مسائل اور مصائب نے زندگی کو مشکل بنا دیا ہے۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہم ایسی تحریروں کا انتخاب کریں جو ہماری قارئین کو یاس اور ناامیدی کے اندھیروں سے نکال کر خوشی کے کچھ پل مہیا کر سکیں۔ تفریح کے ساتھ ساتھ انہیں ناموافق حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دیں۔

ہمارا انتخاب، ہماری ترجیح ایسی کہانیاں ہوتی ہیں جو زندگی کو بامعنی، آسان اور خوبصورت بنائیں۔ اپنی ہی نہیں دوسروں کی بھی۔

ہم اپنی مصنفین سے بھی استدعا کرتے ہیں کہ وہ اپنی کہانیوں میں خوش امیدی کا پیغام دیں۔ ایسی کہانیاں جو کچھ دیر کے لیے قارئین کو زندگی کی تلخیوں سے دور لے جائیں۔ زندگی میں جہاں تلخ حقائق ہیں، وہاں خوش رنگ، خوبصورت خواب بھی ہیں۔ امید اور خوابوں کو زندہ رہنا چاہیے۔

ہر شب تاریک کے اختتام پر روشن سحر ہوتی ہے اور ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔

سالگرہ نمبر،

اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس شمارے کے ساتھ خواتین ڈائجسٹ نے ایک اور سال کی مسافت طے کر لی ہے۔ اپریل کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ سالگرہ نمبر میں آپ کی پسندیدہ مصنفین کی تحریروں کے ساتھ مصنفین سے خصوصی سروے بھی شامل ہوگا۔

مصنفین سے درخواست ہے کہ اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ شاملِ اشاعت ہو سکیں۔

سالگرہ نمبر سروے،

سالگرہ نمبر میں حسبِ روایت قارئین کی شمولیت کے لیے سروے بھی شامل ہوگا۔ سروے کے سوالات یہ ہیں۔

1۔ خواتین ڈائجسٹ کی وہ کون سی خوبی ہے جو اسے دیگر پرچوں کے مقابلے میں آپ کو زیادہ پسند ہے۔

2۔ خواتین ڈائجسٹ کی کسی تحریر نے آپ کی زندگی میں کون سی مثبت تبدیلی پیدا کی؟ مصنف اور تحریر کا نام بھی لکھیں۔

3۔ اگر خواتین ڈائجسٹ کی مصنفین سے آپ کی ملاقات ہو اور ان سے ایک ہی سوال کرنا ہو تو آپ کس مصنف سے کیا سوال کریں گی؟

اس شمارے میں،

- عمیرہ احمد کا ناول ۔ آبِ حیات،
- نمرہ احمد کا ناول ۔ نمل،
- تنزیلہ ریاض کا ناول ۔ عہدِ الست،
- دیبعہ احمد کا مکمل ناول ۔ کٹھ پتلی،
- عفت سحر طاہر کا ناول ۔ میں ماں گی دعا اختتامی مراحل میں،
- ثمینہ عظمت علی، مدیحہ آصف، کنیز نور علی، اور نگار احمد کے افسانے،
- شہر ناک کی میزبان زینب جمیل سے باتیں،
- ماضی کی فنکارہ ۔ مینی زیدی سے ملاقات،
- کرن کرن روشنی ۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی اُلجھنیں اور دستان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے' اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابوداؤد' سنن نسائی' جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے' وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کررہے ہیں' وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

اِدارہ

نماز سے گناہوں کی معافی

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سنتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے جو فائدہ دینا ہوتا' دے دیتا اور جب مجھے کوئی اور آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سناتا تو میں اس سے قسم لیتا۔ اگر وہ قسم کھاتا تو میں اس پر اعتبار کرلیتا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھے حدیث سنائی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سچ فرمایا۔ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو بھی شخص کوئی گناہ کرلیتا ہے' پھر اچھی طرح وضو کرکے دو رکعت نماز پڑھتا ہے اور اللہ سے بخشش مانگتا ہے تو اللہ اسے ضرور بخش دیتا ہے۔" (ابوداؤد)

فوائد و مسائل: 1 حدیث نبوی قبول کرنے میں احتیاط اور صحیح غلط میں امتیاز کا عمل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے شروع ہوا ہے۔

2 حضرت علی رضی اللہ عنہ اس لیے قسم نہیں لیتے تھے کہ انہیں صحابہ کی روایت پر یقین نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے لوگ حدیث کی اہمیت کو محسوس کریں اور وہی حدیث بیان کریں جو انہیں خوب اچھی طرح یاد ہو' اس کے علاوہ یہ فائدہ بھی پیش نظر تھا کہ اگر وہ حدیث کسی کو سنائیں تو پورے اعتماد سے سنائیں کہ حدیث صحیح ہے۔

3 حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہا کی صداقت پر اتنا یقین تھا کہ ان کی سنائی ہوئی حدیث بے چون و چرا تسلیم کرلیتے تھے۔

4 وضو اور نماز گناہوں کی معافی کا ذریعہ ہیں۔

5 نماز کے باوجود دل میں نادم ہوتے ہوئے اللہ سے مغفرت کی دعا کرنا ضروری ہے' البتہ بعض چھوٹے گناہ صرف وضو سے یا صرف نماز سے بھی معاف ہوجاتے ہیں۔

نماز پڑھنا

حضرت عاصم بن سفیان ثقفی رحمتہ اللہ سے روایت ہے کہ مسلمانوں نے ذات سلاسل کی جنگ کی، لیکن یہ لوگ (عاصم اور ان کے کچھ ساتھی) جنگ میں شریک نہ ہو سکے۔ (بعد میں پہنچے' چنانچہ) وہ لوگ (کچھ عرصہ) محاذ پر مورچہ زن رہے (لیکن دوبارہ جنگ کی نوبت نہ آئی تو) پھر وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس واپس آ گئے۔ اس وقت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں حضرت ابو ایوب اور حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ عاصم رحتمہ اللہ نے کہا۔

"ابو ایوب! ہم تو اس سال جہاد سے محروم رہ گئے۔ ہمیں بتایا گیا کہ جو شخص چار مسجدوں میں نماز پڑھے' اس کا گناہ بخش دیا جاتا ہے۔"

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ "بھتیجے! میں تجھے اس سے آسان عمل بتاتا ہوں' میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرما رہے تھے 'جو شخص وضو کرے جس طرح حکم دیا گیا ہے اور نماز اس طرح پڑھے جس طرح حکم دیا گیا ہے تو اس کے گزشتہ عمل معاف ہو جائیں گے۔" عقبہ! کیا یہ حدیث اسی طرح ہے؟ انہوں نے کہا ہاں (اسی طرح ہے۔)" (مسند احمد)

فوائد و مسائل : 1 ایک غزوہ ذات سلاسل ۸ھ میں فتح مکہ سے پہلے ہوا تھا۔ یہ اور جنگ ہے جو ذات سلاسل کے نام سے مشہور ہے۔ یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں واقع ہوئی۔

2 "سلاسل" کا مطلب ریت کے ٹیلوں کا سلسلہ ہے۔ یہ دونوں جنگیں صحرائی علاقے میں واقع ہونے کی وجہ سے ذات سلاسل کے نام سے معروف ہوئیں۔

3 حضرت عاصم رحمتہ اللہ کا جنگ میں شریک نہ ہونا گناہ نہیں تھا کیونکہ ہر جہاد میں کچھ مجاہد شریک ہوتے ہیں' کچھ ہنگامی حالات کے لیے یا کسی اور جنگ میں شریک ہونے کے لیے یا دوسرے فرائض انجام دینے کے لیے پیچھے رہتے ہیں۔ اس جنگ میں حضرت عاصم رحمتہ اللہ کا پیچھے رہ جانا شاید ان کی کسی کوتاہی کی وجہ سے پیش آیا ہو گا کہ وہ ارادہ رکھنے کے باوجود شریک نہ ہو سکے ہوں گے' اس لیے انہوں نے اپنا ایک گناہ شمار کیا۔

4 چار مساجد سے مراد مسجد حرام' مسجد نبوی' مسجد اقصیٰ اور مسجد قبا ہیں جن کی زیارت کے لیے جانے کی ترغیب احادیث میں مروی ہے۔

5 حکم کے مطابق وضو اور نماز سے مراد اچھی طرح آداب و سنن کو ملحوظ رکھتے ہوئے وضو کرنا اور نماز پڑھنا اور نماز میں توجہ اور خشوع و خضوع کا اہتمام کرنا ہے' یعنی بہترین انداز سے وضو کر کے بہترین انداز سے نماز ادا کی جائے۔

6 سنت کے مطابق وضو اور نماز اتنا بڑا عمل ہے کہ اس سے بعض بڑے گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔

گناہوں سے معافی

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بھلا بتاؤ! اگر کسی کے گھر کے سامنے (صاف پانی کا) ایک دریا بہتا ہوا' وہ اس میں روزانہ پانچ بار غسل کرے تو اس (کے جسم) پر کتنی میل باقی رہ جائے گی؟"

حاضرین نے کہا "بالکل نہیں رہے گی۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"نماز گناہوں کو اسی طرح ختم کر دیتی ہے جس طرح پانی سے میل کچیل ختم ہو جاتی ہے۔"

فوائد و مسائل : 1 مسنون وضو اور نماز سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

2 شرعی مسئلہ مثالیں دے کر بیان کرنے سے زیادہ سمجھ میں آتا ہے اور زیادہ یاد رہتا ہے۔ دوسرے علمی مسائل کی بھی یہی کیفیت ہے۔

نماز قائم کرنا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کسی عورت سے زنا سے کم تر ناجائز حرکت کی۔ یہ تو معلوم نہیں کہ اس نے کس حد تک غلطی کی، تاہم زنا نہیں کیا' پھر وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ بات عرض کی۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کردی۔

"دن کے کناروں میں بھی نماز قائم کیجئے اور رات کی گھڑیوں میں بھی' یقیناً "نیکیاں برائیوں کو دور کردیتی ہیں۔ یہ نصیحت ہے نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے۔" (سورۃ ہود 114)

صحابی نے کہا "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا یہ (رعایت) صرف میرے لیے ہے؟؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو بھی اس پر عمل کرے' اس کے لیے ہے۔"

فوائد و مسائل : 1 مرد کا کسی عورت کو اور عورت کا کسی مرد کو گناہ آلود نظر سے دیکھنا' چھونا اور بوس و کنار وغیرہ کرنا یہ سب گناہ کے کام ہیں اور حدیث میں انہیں بھی "زنا" قرار دیا گیا ہے' تاہم یہ بد فعلی سے کم تر درجے کے گناہ ہیں' اس لیے جب کوئی شخص ایسی حرکت کا ارتکاب کر کے دل میں نادم ہو' توبہ کرے اور وضو کر کے نماز پڑھ لے تو اس کا گناہ معاف ہو جائے گا' البتہ ناجائز جنسی عمل کے ارتکاب پر حد کا نفاذ ضروری ہے' حد لگ جانے سے وہ بھی معاف ہو جاتا ہے۔

2 مومن کے دل میں اللہ کا خوف ہونا چاہیے۔ اگر نفس امارہ اور شیطان کے غلبے سے غلطی ہو جائے تو فوراً اس کے ازالہ اور معافی کی فکر ہونی چاہیے۔

3 دن کے کناروں کی نمازیں فجر اور عصر کی ہیں جن کے درمیان ظہر کی نماز آجاتی ہے اور رات کی نمازیں مغرب اور عشاء ہیں' یعنی نماز پنجگانہ کی ادائیگی گناہوں کی معافی کا باعث ہے۔

پانچ نمازوں کی فرضیت اور محافظ کا بیان

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ نے میری امت پر پچاس نمازیں فرض کیں۔ میں یہ حکم لے کر واپس آیا حتیٰ کہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچا۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا : 1 آپ کے رب نے آپ کی امت پر کیا فرض کیا ہے۔؟

میں نے کہا : "اس نے مجھ پر پچاس نمازیں فرض کی ہیں۔"

انہوں نے فرمایا : "اپنے رب کے پاس واپس جائیں کیونکہ آپ کی امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔"

میں دوبارہ اپنے رب کی طرف گیا تو اس نے نصف نمازیں معاف فرمادیں۔

میں پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور انہیں بتایا۔

انہوں نے فرمایا "اپنے رب کے پاس واپس جائیے کیونکہ آپ کی امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔"

میں پھر اپنے رب کی طرف گیا تو اس نے فرمایا "یہ (ادا کرنے میں) پانچ ہیں اور یہی (ثواب میں) پچاس ہیں۔ میرا فرمان تبدیل نہیں ہوتا۔"

میں پھر موسیٰ علیہ اسلام کے پاس آیا۔

انہوں نے فرمایا "اپنے رب کے پاس واپس جائیے۔"

میں نے کہا "مجھے اپنے رب سے شرم محسوس ہوتی ہے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل : 1 یہ حدیث واقعہ معراج کا ایک حصہ بیان کرتی ہے۔

2 حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو فرمایا کہ آپ کی امت زیادہ نمازیں پڑھنے کی طاقت نہیں رکھتی' اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں بنی اسرائیل سے اس قسم کا تجربہ ہوا تھا کہ بنی اسرائیل نے اللہ کے حکم کے مطابق نمازیں ادا کرنے میں کوتاہی کی تھی۔ (صحیح مسلم' حدیث : ۱۴۳)

3 پچاس نمازوں کا حکم تبدیل کر کے پانچ کر دینا اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت ہے اور مسلمانوں پر اللہ کا احسان عظیم ہے۔ اس احسان کا شکر صرف اسی طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ پانچوں نمازیں پابندی سے اور پورے آداب کالحاظ رکھ کر بروقت ادا کی جائیں۔

4 پانچ نمازوں کو پچاس قرار دے کر فرمایا کہ میرا فرمان تبدیل نہیں ہوتا' اس کی وجہ یہ ہے کہ خود اسی کا قانون ہے کہ صحیح انداز سے خلوص کے ساتھ ادا کی ہوئی نیکی کا ثواب کم از کم دس گنا لکھا جاتا ہے۔ ارشاد ہے۔ من جاء بالحسنتہ فلہ عشر امثالھا (الانعام : ۱۶۰) "جو نیکی لے کر حاضر ہوا' اس کا دس گنا (بدلہ) ملے گا۔"

5 آخری بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید تخفیف کی درخواست کرنے سے اجتناب فرمایا کیونکہ پانچ پر پچاس کے ثواب کی خوشخبری میں یہ ارشاد تھا کہ اب مزید تخفیف نہیں کی جائے گی۔

عہد

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا : میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا' آپ نے فرمایا۔

"پانچ نمازیں ہیں جو اللہ نے اپنے بندوں پر فرض کی ہیں تو جو شخص انہیں اس طرح لے کر حاضر ہوا کہ ان کے حق کو غیر اہم سمجھ کر ان میں کمی نہ کی ہو تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس سے وعدہ فرمائے گا کہ اسے جنت میں داخل کر دے گا اور جو انہیں اس طرح لے کر آیا کہ ان کے حق کو اہمیت نہ دیتے ہوئے ان میں کمی کی (پوری نمازیں ادا نہ کیں) تو اسے اللہ کے ہاں کوئی عہد حاصل نہیں ہوگا' (اللہ کی مرضی ہے) چاہے اسے عذاب دے' چاہے بخش دے۔" (ابو داؤد)

فوائد و مسائل : 1 صرف پانچ نمازیں فرض ہیں۔ باقی سب نفل ہیں لیکن بعض نمازوں کی تاکید زیادہ ہے بعض کی کم' تاہم ان کی ادائیگی میں بھی کوتاہی کرنا جائز نہیں کیونکہ فرضوں کی کمی نوافل سے پوری ہوگی۔

2 کمی کرنے سے مراد بعض نمازیں ترک کر دینا یا نماز کی ادائیگی کے دوران میں خشوع و خضوع وغیرہ کا خیال نہ رکھنا ہے۔

3 دین کے فرائض کو کما حقہ اہمیت نہ دینا اللہ کی رضا سے محرومی کا باعث ہے۔

4 نماز صحیح طریقے اور پابندی سے ادا کرنے والا یقیناً" جنت میں جائے گا اگرچہ بعض گناہوں کی وجہ سے کچھ وقت کے لیے جنہم میں بھی بھیج دیا جائے گا۔

5 نماز کو اہمیت نہ دینا مغفرت سے محرومی کا باعث بن سکتا ہے' اس لیے ترک نماز کو کفر قرار دیا گیا ہے کہ جس طرح کافر جنت میں نہیں جا سکتا' اسی طرح بے نمازی بھی عذاب کا مستحق ہوگا۔

اسلام

حضرت انس بن مالک رضی عنہ سے روایت ہے' کہ انہوں نے فرمایا: ہم مسجد میں بیٹھے تھے کہ اسی اثنا میں ایک آدمی اونٹ پر سوار ہو کر مسجد میں داخل ہوا۔ اس نے مسجد میں اونٹ بٹھایا' اس کا گھٹنا باندھا' پھر کہا۔

"آپ لوگوں میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی مجلس میں ٹیک لگائے تشریف فرما تھے۔ انہوں نے کہا۔ "یہ سفید فام جو ٹیک لگا کر تشریف فرما ہیں۔"

اس آدمی نے کہا "عبدالمطلب کے بیٹے!"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "(بات کرو) جواب دے رہا ہوں۔"

اس آدمی نے کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں آپ سے کچھ دریافت کروں گا اور سوال میں سختی ہوگی' آپ دل میں (ناراضی) محسوس نہ کیجیے گا۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو چاہو پوچھ لو۔"

آدمی نے کہا "آپ کو آپ کے رب کی اور آپ سے پہلے لوگوں کے رب کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا آپ کو اللہ نے سب لوگوں کی طرف بھیجا ہے؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ گواہ ہے ہاں (یہی بات ہے۔)"

اس نے کہا "میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا اللہ نے آپ کو رات دن میں پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم دیا ہے؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ گواہ ہے ہاں (ایسا ہی ہے)۔"

اس نے کہا "میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا آپ کو اللہ نے سال میں اس مہینے (رمضان) کے روزے رکھنے کا حکم دیا ہے؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ گواہ ہے ہاں۔"

اس نے کہا "میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے دولت مندوں سے یہ صدقہ (زکاۃ) لے کر ہمارے غریبوں میں تقسیم فرمائیں؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ گواہ ہے ہاں۔"

اس شخص نے کہا :

"میں آپ کی لائی ہوئی (شریعت) پر ایمان لے آیا ہوں اور میں اپنے پیچھے اپنی قوم کے افراد کی طرف سے پیغام رساں بن کر آیا ہوں۔ میں بنو سعد بن بکر (قبیلہ) کا ایک فرد ضمام بن ثعلبہ ہوں۔" (صحیح بخاری)

فوائد و مسائل : 1 نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسجد سادہ اور کچی تھی' اس لیے اونٹ وغیرہ کے آنے سے منع نہیں کیا گیا۔ ممکن ہے اونٹوں کے بٹھانے کے لیے جگہ مخصوص ہو۔ اس بنا پر آج کل مسجد کے ساتھ سائیکلوں' اسکوٹروں اور گاڑیوں وغیرہ کے لیے جگہ خاص کی جاسکتی ہے۔

2 مجلس میں معزز شخصیت کے لیے نمایاں نشست مخصوص کی جاسکتی ہے تاکہ آنے والے اجنبیوں کو پہچاننے میں مشکل نہ ہو۔

3 اگر سائل سوال کرتے ہوئے ادب و احترام کا مناسب خیال نہ رکھ سکے تو عالم کو چاہیے کہ ناراضی محسوس نہ کرے۔

4 ایک راوی کی روایت (خبر واحد) قابل قبول ہے جب کہ وہ راوی قابل اعتماد (ثقہ) ہو۔

5 عالم کے پاس سفر کر کے جانا اور اس سے مسائل کی تحقیق کرنا مستحسن ہے۔

6 نازل سند کے ساتھ حدیث معلوم ہو تو عالی سند حاصل کرنے کی کوشش کرنا اچھی بات ہے۔

7 قرات علی الشیخ بھی حصول علم کا ایک درست طریقہ ہے۔

8 جب قوم کسی فرد کو اپنا نمائندہ منتخب کرلے تو پھر اس کی کارروائی پر اعتماد کرنا چاہیے' الا یہ کہ اس سے واضح غلطی سرزد ہو جائے۔

افضل

"میری اس مسجد میں ایک نماز مسجد حرام کے سوا' دوسری مسجدوں میں پڑھی جانے والی ہزاروں نمازوں سے افضل ہے۔" (مسلم)

فائدہ : 1 "میری اس مسجد" سے مراد مسجد نبوی کا صرف وہ حصہ نہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مسجد میں شامل تھا بلکہ اس میں ہونے والے بعد کے تمام اضافے بھی شامل ہیں کیونکہ ان اضافوں کی حیثیت الگ مسجد کی نہیں' اس لیے مسجد نبوی کے پرانے یا نئے جس حصے میں بھی نماز ادا کی جائے' یہ ثواب حاصل ہو جائے گا' البتہ اگلی صفوں کی افضلیت جس طرح دوسری مساجد میں ہے' وہاں بھی ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

2 مسجد نبوی کی ایک نماز ہزار نمازوں کے برابر نہیں' بلکہ ہزار نمازوں سے بہتر ہے' اسی طرح مسجد حرام کی ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر نہیں بلکہ ان سے بھی افضل ہے' تاہم خشوع و خضوع' آداب و ارکان کے لحاظ اور توجہ و انابت وغیرہ کی کمی بیشی کی بنا پر اس ثواب میں بھی کمی بیشی ہو سکتی ہے۔





انشا جی کی ایک پنجابی نظم

تینوں دسیا تے توں ہسنا اے — اسیں کہندے کہندے مر جانا
اسیں تینوں کجھ نئیں دسنا اے — توں ہسدے ہسدے مر جانا
بس اگ اپنی وچ جلنا اے — اسیں اُجڑے اُجڑے رہ جانا
اور آپے پکھا جھلنا اے — توں وسدے وسدے مر جانا
اسیں پکے آں توں خام کڑے — ہاں سوچ لیا انجام کڑے
کجھ ہویا نئیں کی ہونا سی — اک گھر وچ دیوا بلدا ای
اک دن دا ہسنا رونا سی — کی دیکھ سندیسے گھلدا ای
اوہ ساگر چھلاں ایویں سی — کیوں پورب پچھم جانی ایں
اوہ ساریاں گلاں ایویں سی — کیوں من اپنا بھٹکانی ایں
پر چرچا کرنا تمام کڑے — گھر آ جا پے گئی شام کڑے

ماضی کی خوبصورت فنکارہ

عینی زیدی سے ملاقات

شاہین رشید



شاید 1987-1988ء کی بات ہے کہ ڈرامہ سیریل چھاؤں کوئٹہ ٹی وی سینٹر سے آن ایر ہوا تھا اور اس کے ڈائریکٹر پروڈیوسر کاظم پاشا صاحب تھے۔ سپرہٹ سیریل کے تمام فنکاروں نے ہی راتوں رات شہرت حاصل کی تھی۔ آمنہ خان' لیلیٰ زبیری اور عینی زیدی۔ ان تینوں کی پرفارمنس بہترین تھی۔ ان تینوں فنکاراؤں میں "لیلیٰ زبیری" تو فیلڈ سے وابستہ رہیں' لیکن آمنہ خان اور عینی زیدی غائب ہو گئیں۔ کچھ عرصہ قبل آمنہ خان نے بھی شاید ایک آدھ سیریل کیا مگر پھر غائب ہو گئیں (البتہ آپ ان کی بیٹی "عاصمہ جہانگیر" کو ڈراموں میں دیکھتے رہتے ہوں گے۔) اب رہ گئیں عینی زیدی۔ تو جب تقریباً" ایک سال قبل "میری صبح کا ستارہ" میں انہیں "صنم جنگ" کی ساس کے روپ میں دیکھا تو احساس ہوا کہ دنیا واقعی گول ہے اگر زندگی ہو تو کہیں نہ کہیں دکھائی بھی دے جاتے ہیں۔ سنائی بھی دے جاتے ہیں اور ملاقات بھی ہو جاتی ہے۔

تو اس بار پھر ماضی کی حسین اور باصلاحیت فنکارہ عینی زیدی سے آپ کی ملاقات کروائیں گے۔ گزشتہ ماہ ہم نے "ہما نواب" سے آپ کی ملاقات کرائی تھی۔

"عینی! آپ کو ڈراموں میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی' کیسی ہیں آپ؟ اور اگر میں آپ کے حسن کی۔ اور آپ کی بارعب شخصیت ہونے کی تعریف نہ کروں تو یہ آپ کے ساتھ زیادتی ہوگی۔"

"بہت شکریہ۔ تعریف اور محبت کا۔ بہت خوشی ہوئی اپنے بارے میں سن کے۔"

"تعریفی ریمارکس تو آپ کو ملتے ہی رہتے ہوں گے۔ خیر آپ بتائیے کہ "چھاؤں" کے بعد کا سفر کہاں اور کیسا گزرا۔"

"ڈرامہ سیریل "چھاؤں" میں تو آنا اس طرح ہوا کہ میرے میاں صاحب "آرمی" میں تھے تو ان کی پوسٹنگ "کوئٹہ" میں ہوئی۔ اور لیلیٰ زبیری بھی آرمی آفیسر کی بیوی تھیں تو ان کے شوہر کی پوسٹنگ بھی وہیں ہوئی تھی تو ان دنوں کاظم پاشا "چھاؤں" سیریل پہ کام کر رہے تھے اور انہیں اس کے لیے لیڈنگ رول کے لیے نئے چہرے کی تلاش تھی۔ اس زمانے میں چاروں پی ٹی وی سینٹرز میں بہترین سیریلز کا مقابلہ شروع ہوا تھا۔ اور میرا تو اس فیلڈ میں آنے کا کبھی ارادہ ہی نہیں تھا نہ ہی کوئی سوچ تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں میری بیٹی کی پیدائش ہوئی تھی اور وہ صرف نو ماہ کی تھی۔ تو خیر لیلیٰ زبیری نے مجھ سے ذکر کیا اور مجھے اسکرپٹ دکھایا۔

اور میرا تعارف کاظم پاشا صاحب سے کروایا۔ تو بس انہوں نے تو ٹھان لی کہ آپ کو تو ہم نے سیریل میں لینا ہی لینا ہے۔ پھر میں نے اپنے شوہر سے ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ کیسے کرو گی' بچی چھوٹی ہے اور دیگر مصروفیات بھی۔ تو میں نے کہا کہ صرف چار اقساط ہیں' اور چار اقساط کے بعد میرا کردار ختم ہو جائے گا یعنی کہانی میں مجھے مار دیا جائے گا۔ تو کوئی مسئلہ نہیں' بہت فورس کر رہے ہیں تو آپ اجازت دے دیں۔

تو انہوں نے اجازت دے دی۔ اور پھر میرا خیال ہے کہ دوسری قسط آن ایر گئی ہی تھی تو ایک آدھ دن کے بعد میری دوست نے کہا کہ تم بازار گئی ہو' میں نے کہا کہ نہیں۔ تو کہنے لگی کہ تم ہر میگزین کے کور کے اوپر بیٹھی ہوئی ہو' میں تو بے ساختہ رونے لگی کہ "میں تو سمجھی تھی کہ میں تو چار اقساط میں کام کر کے چلی جاؤں گی اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا" مگر جناب اتنی زیادہ پسندیدگی ہوئی کہ ہیڈ کوارٹر سے بھی فون آ گیا کہ اس کردار کو سیریل کے آخر تک لے کر جائیں۔ اور اسی وجہ سے پھر کہانی میں بھی تبدیلی لائی گئی' اور میرے کردار کو بڑھا دیا گیا۔ اور پھر میں نے کیا آخر تک۔ اور مجھے بالکل بھی آئیڈیا نہیں تھا کہ مجھے اور میری پرفارمنس کو اتنا زیادہ پسند کیا جائے گا۔ اور راتوں رات مجھے اتنی شہرت اور اتنی عزت مل جائے گی کہ میں "اسٹار" بن جاؤں گی۔ یہ سب اللہ کا مجھ پر خاص کرم تھا۔"

"اور میرا خیال ہے کہ اس سیریلز کی سب ہی خواتین کو بہت شہرت ملی۔ چاہے وہ آمنہ خان ہوں یا لیلیٰ زبیری۔"

"جی جی۔ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اگرچہ لیلیٰ زبیری پہلے سے کام کر رہی تھیں مگر انہیں بھی شہرت اس ڈرامے سے ملی۔ خیر۔ پھر اس کے بعد ہم لوگ امریکہ چلے گئے۔ اور امریکہ جانے سے پہلے میرے شوہر نے آرمی چھوڑ دی اور وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لے لی۔ چھاؤں کے بعد میں نے دو مزید ڈرامے کیے۔ "کاغذ" اور "تاوان" اب مجھے پتا نہیں ہے کہ وہ آن ایر ہوئے تھے کہ نہیں۔ "تاوان" نصرت ٹھاکر صاحب کا تھا۔ پھر جب امریکہ گئی تو وہاں کے ایک چینل سے میں نے کمپیئرنگ اور ڈسکشن کے لائیو شو کیے تھے۔ وہ بڑے کامیاب گئے۔ پھر جب یہاں سے گئی تو پاکستان آنے کا اتفاق بھی نہیں ہوا۔ پھر 2006ء میں میرے شوہر کا انتقال ہو گیا پھر میں واپس آئی تو سوچا کہ چلو ٹرائی کرتے ہیں کچھ۔"

"امریکہ اتنے سال رہیں۔ وہاں میڈیا میں کام بھی کیا تو کیسا رہا کام کا تجربہ؟"

"وہاں جس چینل سے میں نے کام کیا وہ نیا نیا کھلا تھا۔ اچھا تھا مگر اتنا آرگنائزڈ نہیں تھا' اس لیے زیادہ عرصہ چل نہ سکا۔ وہاں دو سال میں نے کام کیا۔"

"پاکستان آپ ہیں' پچیس سال کے بعد آئیں تو کس طرح دوبارہ میڈیا تک رسائی ہوئی؟"

"میں 2013ء میں اپنی بیٹی کی شادی کرنے پاکستان آئی تھی۔ اور یہاں میں اپنی بہن کے یہاں ٹھہرتی ہوں۔ تو میرا بھائی جو یہاں "اردو ون" کا ڈائریکٹر ہے۔ اس نے کہیں میرا ذکر کیا ہو گا "جامی" اس کا نام ہے۔ تو پھر "ہم ٹی وی" والوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور "میری صبح کا ستارہ" کرنے کے لیے کہا۔"

"آپ لوگوں کو یاد تھیں؟"

"جی۔ میں بہت حیران ہوئی۔ جب بہت ینگ لڑکوں نے مجھے ویلکم بیک عینی زیدی کہا۔ تو میں نے بڑی حیرانی سے کہا کہ آپ مجھے جانتے ہیں تو کہنے لگے کہ آپ کو کون نہیں جانتا۔ کہنے لگے کہ آپ کے ڈراموں کو دیکھ کر تو ہم بڑے ہوئے ہیں۔"

"امریکہ میں پاکستانی ڈرامے دیکھتی تھیں؟ اگر دیکھتی تھیں تو کیسے لگتے تھے۔"

"جب میں یہاں سے گئی ہوں تو سیٹلائٹ ڈاؤن ہوتا تھا۔ پھر جب بھی شروع کر دی تو کافی عرصہ نہیں دیکھ پائی تو اب کچھ ہی عرصہ قبل میں نے دیکھنا شروع کیا ہے۔ اگر کبھی دیکھے بھی تو چلتے پھرتے۔"

"تواب کیسا محسوس کرتی ہیں؟"

"سچ پوچھیں تو میں تو بہت متاثر ہوئی ہوں۔ کیونکہ اتنے زبردست موضوعات پہ ڈرامے بن رہے ہیں کہ میں سمجھتی ہوں کہ آج کل کے ڈراموں میں وہی کچھ دکھایا جارہا ہے جو ہمارے معاشرے میں ہورہا ہے۔ جیسے "مہر" کے "طلاق" کے اور "نکاح" کے موضوعات پر قلم اٹھائے گئے ہیں۔ اور نہ صرف موضوعات نئے ہیں بلکہ ینگ بچے اداکاری بھی کمال کی کرتے ہیں اور میں نے دیکھا ہے کہ پاکستانی ڈراموں کی ڈبنگ بھی ہورہی ہے دوسری زبانوں پر۔ تو میں تو واقعی بہت متاثر ہوئی ہوں۔ اور اب تو فلموں میں بھی تھوڑا بہت اٹھان آرہا ہے اور اچھی بن رہی ہیں مگر پھر بھی ان کو ٹائم لگے گا۔"

"اتنی تعریف نہ کریں۔ موضوعات بولڈ ہیں تو گھسے پٹے بھی ہیں کچھ؟"

"ہاں بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔ بہت گہری نظر سے اور تنقیدی نظر سے دیکھیں تو بعض کہانیاں بہت گھسی پٹی ہوتی ہیں۔ ایک لڑکی' دو لڑکے 'مظلوم عورت وغیرہ وغیرہ۔ اور مجھے جب "میری صبح کا ستارہ" ملا تو میں نے کہا کہ بہت رونے دھونے والا ٹریجک ڈرامہ ہے میں تو اس میں کام نہیں کروں گی۔ اور نگیٹو رول تو بالکل نہیں کروں گی۔ تو کہا کہ پھر وہ رول کرلیں جس میں ماں ہر وقت روتی رہتی ہے۔ تو خیر ایک بری ساس کا کردار میں نے کرلیا۔"

"لوگوں نے پسند کیا اس رول میں؟ اور حقیقت میں بھی ایسی بارعب اور صبح کے ستارے والی ساس ہیں۔"

قہقہہ۔" جو لوگ مجھے جانتے ہیں انہوں نے کہا کہ تم بالکل ویسی نہیں ہو' جیسا تم نے رول کیا ہے۔ تو بارعب تو ہوں کہ میری شخصیت ہی ایسی ہے مگر سخت نہیں ہوں۔ اس رول میں تو لوگوں نے مجھے برا کہا۔ گالیاں بھی دیں اور بددعائیں بھی دیں کہ کیسی ساس ہیں آپ۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ یہی میری کامیابی

ہے۔ میری اپنی فرینڈز جو مجھے کافی عرصے سے جانتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا دل چاہتا ہے کہ تمہیں اٹھا کر پھینک دیں۔"

"ساسیں تو اکثر ایسی ہی ہوتی ہیں۔ اور اس لیے وہ بدنام بھی ہیں۔ مگر بہو بھی اتنی معصوم اور سیدھی نہیں ہوتیں جتنی اس سیریل میں دکھائی گئی تھی۔"

"میں بھی آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں کہ جس نے بی اے کیا ہوا ہو اور جو جاب کرتی ہو۔ وہ ایسی سیدھی نہیں ہو سکتی۔ کچھ تو اپنے حق کے لیے بولے۔ اس زمانے میں اتنی مظلوم لڑکیاں ہوتی نہیں ہیں۔ خصوصاً" پڑھی لکھی لڑکیاں تو بالکل بھی نہیں۔ اور سب نے اس بات پر اعتراض کیا کہ یہ کون سے زمانے کا ڈرامہ ہے۔ آج کل تو ایسا نہیں ہوتا۔ البتہ ڈائریکشن اچھی تھی۔ سکینہ سموں کے ساتھ بہت اچھا ٹائم گزرا۔"

"آپ کہہ رہی ہیں کہ ڈرامے بہت اچھے ہو گئے ہیں۔ تو کیا معاشرے میں چینج لایا جاسکتا ہے؟"

"بالکل لایا جاسکتا ہے۔ اور عورتوں کے لیے تو میرے خیال میں بہت چینج آیا ہے۔ خواتین کو اپنے حقوق پتا چلے، وہ گھر سے باہر نکلیں۔ کام کر رہی ہیں، اپنے حق کے لیے لڑ رہی ہیں۔ میڈیا نے خواتین کے لیے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ کیونکہ ٹی وی ہر چھوٹے بڑے گھر میں اور گاؤں دیہات میں موجود ہوتا ہے۔"

"آپ کی شخصیت میں بڑا رعب ہے تو اگر آپ کو لوئر طبقے کی خاتون کا رول دیں تو کیا آپ کر سکیں گی اور کیا لوگ قبول کر لیں گے آپ کو اس کردار میں؟"

"میرے ساتھ ٹریجڈی یہی ہے کہ مجھ پر ایک ماڈرن خاتون کا لیبل لگا دیا گیا ہے۔ ابھی بھی دو تین رولز ایسے تھے جو مجھے پسند آئے، مگر نہیں دیے گئے۔ کہ جی آپ کر نہیں سکیں گی۔ تو میں نے کہا کہ جب تک آپ دیں گے نہیں، آزمائیں گے نہیں تو کیسے پتا چلے گا کہ میں کر سکتی ہوں یا نہیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ پھر میں آرٹسٹ تو نہ ہوئی نا۔"

"آپ نے بیس پچیس سال پہلے "چھاؤں" کیا اور اب "صبح کا ستارہ" گزرے زمانے میں ریہرسل، میٹنگز، ایک ایک سین پہ ڈسکشن۔ اب ایسا نہیں ہے تو کیا اب لوگ زیادہ ٹیلنٹڈ ہو گئے ہیں؟"

"یہ غلط بھی ہے اور کوئی ٹیلنٹ نہیں ہے لوگوں کا۔ مسئلہ یہ ہے کہ اب ہر ایک کو پیسہ چاہیے۔ سب کو اپنا معیار زندگی بلند کرنا ہے تو اس لیے وہ بیک وقت تین، چار ڈراموں میں کام کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ڈرامے کی خوب صورتی کی بات ہے تو اس کے لیے بہت ضروری ہے کہ ریہرسل بھی ہو اور ڈسکشن بھی ہو، آپ کی آواز کا اتار چڑھاؤ اور آپ کے ایکسپریشن اس چیز کی تو اصلاح کرتا ہے ڈائریکٹر۔ اور جب ہم پوری تیاری کے ساتھ جاتے تھے تو ہمارا سین بھی تو جلدی اوکے ہو جاتا تھا۔ اب تو آرٹسٹوں کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اسٹوری کیا ہے۔ تو خود سوچیے کہ جب مجھے کہانی کا بیک گراؤنڈ نہیں معلوم ہوگا تو میں ایکسپریشن کیسے دے سکوں گی۔ مجھے بھی میرا کردار دے دیا گیا تھا تو میں بالکل مجھے مطمئن نہیں ہوئی اور پھر میں نے پورا سیریل منگوایا اور اسے پڑھا۔ پورا تو نہیں پڑھ سکی مگر آؤٹ لائن پڑھ لی۔"

"آج کل کیا مصروفیات ہیں آپ کی، انڈر پروڈکشن کتنا کام ہے آپ کا؟"

"آن ایر کوئی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی انڈر پروڈکشن ہے۔ کیونکہ میں بہت کم عرصے کے لیے آئی تھی اور اب عنقریب میری واپسی ہے، کیونکہ ڈراموں کے لیے دو دو تین تین ماہ رکنا پڑتا ہے۔ تو ان شاءاللہ تین چار ماہ کے بعد واپس آؤں گی تو پھر کام کروں گی۔"

"واپس کیوں جا رہی ہیں، بچے آپ کے وہیں امریکہ میں ہی ہیں؟"

"جی بچے بھی ہیں پھر میری اپنی جاب بھی ہے۔ کچھ اور کمٹمنٹس بھی ہیں میں وہاں کالج میں پڑھاتی ہوں تو چھٹی کا ذرا مسئلہ ہوتا ہے۔"

"اتنے عرصے کے بعد پاکستان واپس آئیں تو۔۔ کیا

چیلنج دیکھا آپ نے؟"

"درمیان میں ایک بار آئی تھی مگر صرف لاہور قیام ہوا تھا۔ کراچی نہیں آسکی تھی' اور پاکستان کو دیکھ کر بہت تکلیف سے گزرتی ہوں۔ ہمارا کراچی روشنیوں کا شہر تھا اور دور دور سے لوگ دیکھنے آتے تھے اب تو شہر اجڑا اجڑا سا لگتا ہے۔ سڑکیں خراب ہوگئی ہیں۔ ٹریفک بہت گندا ہوگیا ہے۔ بے یارومددگار والا حساب ہوگیا ہے اس شہر کے ساتھ۔ بہت افسوس ہوا کراچی کو دیکھ کر۔"

"کچھ اپنی نجی لائف کے بارے میں بتائیں۔"

"میرے تینوں بچوں کی شادیاں ہوگئی ہیں ماشاء اللہ۔ تین بچے ہیں میرے۔ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں۔ چھوٹی بیٹی کی شادی کو ایک ہی سال ہوا ہے۔ میری بڑی بیٹی ماہین زیدی کمپیوٹر انجینئر ہے۔ علی زیدی بھی کمپیوٹر انجینئر ہے اور چھوٹی بیٹی کا میاں چونکہ بزنس مین ہے تو وہ لاہور میں رہتی ہے۔"

"داماد کے لیے کیسی ساس ہیں اور بہو کے لیے کیسی ساس ہیں؟"

"میں داماد کے لیے اور بہو کے لیے، بہت پسندیدہ اور چہیتی ساس ہوں۔ میرے بچے میرا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ بہو بھی ماشاء اللہ بہت اچھی ہے۔ اور چونکہ میرے شوہر کا انتقال ہوچکا ہے تو بیٹے کے ساتھ ہی رہتی ہوں تو ہم فرینڈ کی طرح رہتے ہیں۔ ساس، بہو والا ریلیشن تو ہے ہی نہیں۔ اور میرے بیٹے کو شکوہ رہتا ہے کہ میں اسے ٹائم نہیں دیتی۔ میں صبح اپنی بہو کے ساتھ واک پر نکل جاتی ہوں۔ کھانا بھی اکثر باہر ہی کھاتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ جی یہ بہو ہے تو اسے کھانا بھی پکانا ہے اور ہر کام کرنا ہے۔ چونکہ وہاں تو سارا کام خود کرنا پڑتا ہے تو کبھی وہ پکالیتی ہے تو کبھی میں پکالیتی ہوں۔ ابھی تک تو سب کچھ بہت اچھا ہے۔ آگے فیوچر کا کچھ پتا نہیں۔ بیٹے کی شادی کو چھ سال ہوگئے ہیں اور ماشاء اللہ ایک بیٹا ہے اس کا۔"

"فارغ اوقات میں کیا کرتی ہیں؟"

"فارغ اوقات میں کوئی نہ کوئی کلاس جوائن کرلیتی ہوں۔ آج کل کچھ نہیں کررہی۔ لیکن کچھ نہ کچھ شغل میلہ لگا ہی رہتا ہے۔ گارڈننگ کرلی' کوکنگ کرلی۔ نٹنگ کرلی۔ بس تو زندگی ایسے ہی چلتی رہتی ہے۔"

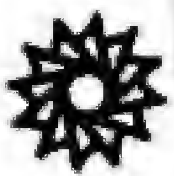
"اور کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"بس یہی کہ واپس آکے اور یہاں کے لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اس فیلڈ میں واپس آکر اور اب انتظار کررہی ہوں کہ کوئی بہت ہی اچھا اور چیلنجنگ رول ملے اور میں سب کو دکھا سکوں کہ میں مشکل رول بھی کرسکتی ہوں۔ اور مجھ پر سے یہ ٹیگ ہٹ جائے کہ میں صرف امیر اور ماڈرن خواتین کے رول ہی کرسکتی ہوں۔ میڈیا کی ترقی دیکھ کر خوشی ہوئی بہت سارے چینلز دیکھ کر اچھا لگا۔ اور چھپا ہوا ٹیلنٹ اب ابھر کر سامنے آرہا ہے۔"

"پرانے لوگوں سے ملاقات ہوئی' جیسے کاظم پاشا' لیلیٰ زبیری' آصف رضا میر صاحب؟"

"کاظم پاشا سے گزشتہ سال ملاقات ہوئی تھی' آصف رضا میر کی طرف گئی مگر ملاقات نہیں ہوئی۔ لیلیٰ زبیری سے میری بہت اچھی دوستی ہے۔ سب سے مل کر اچھا لگا' پرانے دن یاد آئے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے خوب صورت فنکارہ عینی زیدی سے اجازت چاہی۔ اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔



سرورق کی شخصیت

ماڈل	حمیرہ
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر	موسیٰ رضا



نادیہ خاتون



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

نمرہ کشور۔۔۔ میلسی

ہمیں یکسر بھلا دینے والی انیسہ سلیم نے ایک بار کہا تھا۔ "تنزیلہ ریاض بہت محنت سے لکھتی ہیں۔" اور واقعی تنزیلہ آپی نے بہت جانفشانی اور لگن سے عہد الست لکھا ہے۔ اس کہانی کے پورے پورے پیراگراف میری ڈائری کی زینت بنتے ہیں، لیکن اگلے ماہ آخری قسط.... نہیں ابھی جدائی بھی گوارا نہیں اور زارا کی ممی کی اچانک ڈیتھ نے حقیقت میں اداس کر دیا.... یقین نہیں آتا۔ کیونکہ یہ ایسی تحریروں کا ہی اعجاز ہوتا ہے کہ وہ کہانیاں لگتی ہی نہیں ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم خود وہ زندگی جی رہے ہوں اور تنزیلہ آپی کا انداز.... ٹیپو کی لن ترانیوں نے مسکرانے پر بری طرح مجبور کر دیا۔ نمرہ احمد ہوں اور انفرادیت نہ ہو، ریڈر چونکے بنا رہ نہیں پاتا۔ اب یہی ہاشم کے انداز و اطوار.... ہم کیسے ہضم کریں آخر! ہاشم کا جواہرات سے ایکسکیوز کرنا، اس کی وہ کیفیت، زر تاشہ کی قبر پہ پھولوں کے ساتھ حاضری اور "اظہار ندامت"، نمرہ آپی نے یکسر مختلف انداز میں "نمل" لکھا ہے۔ ہم تو اب حیران بھی نہیں ہوتے (عادی ہو گئے ہیں) "بن مانگی دعا" بہت دلچسپ ہو گیا ہے۔ سائرہ رضا لگتا ہے کچھ طویل لکھ رہی ہیں ہمارے لیے۔ پلیز آپی ماہا ملک کو واپس بلا لائیں کسی طرح بھی، آپی جان میرے پیپرز ہو رہے ہیں، دعاؤں کی ریکویسٹ ہے۔

ج: پیاری نمرہ! آپ کی اداسی کو محسوس کرتے ہوئے، ہم نے عہد الست کی اقساط میں اضافہ کر دیا ہے۔ تنزیلہ ریاض کا ناول پڑھتے ہوئے ہمارے بھی وہی محسوسات ہوتے ہیں جو آپ کے ہیں۔ بلاشبہ ان کی تحریر میں بلا کی روانی اور توازن ہے۔ ایک لفظ بھی زائد نہیں، غیر ضروری تفصیل نہیں، سادہ اور دل نشین انداز سے بڑی بڑی گتھیاں سلجھاتی چلی جاتی ہیں۔

نمرہ احمد نے "مصحف" اور "جنت کے پتے" جیسی بے مثال تحریریں لکھی ہیں اور نمل ہی نہیں ان کا ہر ناول ہی مختلف ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو ہر امتحان میں کامیابی دے۔ آمین

بشریٰ صدیق۔۔۔ چیچہ وطنی

عہد الست کے لاسٹ پیرے نے الجھا دیا جہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کا ذکر ہے، وہاں پرندے کا نام ہدہد ہے جبکہ یوسف کھوہ والا پرندہ ہدہد نہیں فاختہ ہے۔ ہدہد کو تو کبھی بولتے ہوئے سنا ہی نہیں ہے، وہ تو صرف زمین، دیوار اور درختوں میں سوراخ کرتا ہی دکھائی دیتا ہے اگر میں غلطی پر ہوں تو پلیز تصحیح کر دیں۔

ج: پیاری بشریٰ تصحیح کا شکریہ۔ ممکن ہے وہ پرندہ فاختہ ہی ہو، دراصل دیہاتوں میں اس طرح کی حکایتیں مشہور ہو جاتی ہیں جن کی کوئی تاریخی حقیقت نہیں ہوتی، پرندہ خواہ فاختہ ہو یا ہدہد، یہ صرف حکایت ہے محض سنی سنائی بات اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ بات اماں اصغری نے کہی ہے، جو گاؤں میں رہنے والی ایک سادہ لوح خاتون ہیں، یہ محض گاؤں کے لوگوں کا خیال ہے اس بات کی وضاحت آگے چل کر ٹیپو کے الفاظ سے بھی ہو گئی ہے۔ جب وہ کہتا ہے۔

"سبحان اللہ اس سارے واقعہ سے ایک اور بات بھی

واضح ہو جاتی ہے کہ پنجابی اتنی پرانی زبان ہے کہ مصر کے وہ بازار جہاں صرف عبرانی بولی اور سمجھی جاتی تھی وہاں پر پرندوں کو پنجابی پر پورا عبور حاصل تھا۔"

حقیقت یہ ہے' ہدہد پرندہ کا حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ میں ذکر ہے حضرت سلیمان علیہ السلام پرندوں کی بولیاں سمجھتے تھے اور ہدہد نے انہیں ملکہ سبا بلقیس کے بارے میں آکر بتایا تھا۔

شبانہ عندلیب۔۔۔ گوجرانوالہ

سرورق کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ سب سے پہلے "آب حیات" پڑھا۔ عمیرہ جی آپ نے پچھلی دو اقساط بہت جاندار لیکن کچھ کچھ فلمی لکھی ہیں۔ جاندار اس طرح کہ سالار کی شادی کے بعد جس طرح آپ نے اس کے ایک ایک دن رات کا احوال لکھا اس نے ناول کی خوب صورتی کو اور بڑھا دیا۔ ان کے جھگڑے اور رومانس کو ہم نے بہت انجوائے کیا۔ امامہ کا چھوٹی چھوٹی شکایتوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا اس پر سالار کا بہت پیار اور تفصیل سے جواب دینا بہت اچھا لگا مگر سالار کا امامہ پر التفات کچھ خاص اچھا نہیں لگا بلکہ فلمی لگا کیونکہ اگر سالار اسے اتنی محبت دے رہا ہے تو اسے بھی جواب میں کچھ تو کرنا چاہیے تھا۔ مگر جناب وہ تو بالکل ٹس ہی رہی۔ عمیرہ جی سالار کی کچھ سمجھ نہیں آتی کہ ایک طرف تو امامہ کے ڈاکٹرز کو پسند کرنے پر اتنا روڈ ہو جاتا ہے کہ اسے ڈانٹ دیتا ہے تو دوسری طرف اسے سات خون بھی معاف کر دیتا ہے۔ ایسا کیوں؟

اگر امامہ نے اسے بتایا کہ وہ ان ناولوں کے کرداروں میں خود کو اور جلال کو محسوس کرتی تھی تو اسے فوراً ٹوک دیتا کہ اسے اچھا نہیں لگتا جلال کا ذکر۔ مگر وہ تو منہ پھلا کر بیٹھ گیا اور بیچاری کو جھڑک دیا اگر وہ اتنا ہی صاف گو ہے تو کھل کے بات کرتا۔ اس قسط میں امامہ کا سوال "میں کیوں اچھی لگی تمہیں؟" میں سالار کا جواب کچھ خاص سمجھ میں نہیں آیا۔ ویسے آپی سالار کیوں نو سال امامہ کے پیچھے خوار ہوا جبکہ وہ اس کی بتائی گئی خوبیوں پر پوری بھی نہیں اترتی ہے۔ یہ صرف محبت کی وجہ سے تو نہیں ہوا پلیز جواب ضرور دیجیے گا۔

آل ٹائم مائی فیورٹ پیر کامل آج کل دن رات میرے سرہانے رکھا رہتا ہے اب "آب حیات" کو پڑھنا بھی اچھا لگ رہا ہے۔

میں بھی آپی سائرہ رضا کی طرح عمیرہ احمد کی تمام کہانیاں بالکل چوکنی بلی کی طرح پڑھتی ہوں کہ نہ جانے آگے کیا ہو جائے' وہ کس کردار کو کہاں مار دیں۔ عمیرہ جی پلیز پلیز اب امامہ کو بھی سالار کی محبت میں گرفتار کر دیں۔ آخر وہ بیچارا اس کی ہر بات مانتا ہے۔

اس کے بعد نمرہ احمد کا "نمل" پڑھا۔ زمر کے حالات جان کر دل بہت دکھا اور اس کے ساتھ ہم روئے۔ اس بیچاری کو ناکردہ گناہ کی سزا ملی' آخر اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ فارس بھی مفت میں پھنسا۔ خدا غارت کرے ہاشم کو' جس نے اپنا گناہ چھپانے کے لیے ان دونوں کو پھنسایا۔ زمر کو عمر بھر کا روگی بنا دیا۔ خدا پوچھے گا بیگم جواہرات کو۔ آخر عہد الست بھی اپنے اختتام کو پہنچ رہا ہے۔ تنزیلہ جی یقیناً آپ بہت زیادہ تعریف کی مستحق ہیں۔

باقی ناول اور ناولٹ بھی اچھے تھے۔ شہریار منور سے ملاقات اور حنا الطاف سے باتیں اچھی رہیں۔ مستقل سلسلوں میں مجھے رنگا رنگ سلسلہ خبریں ویریں اور نفسیاتی الجھنیں بہت پسند ہیں۔ باقی ہمارے نام کی تو کیا ہی بات ہے۔

ج : پیاری شبانہ! بہت دلچسپ خط لکھا ہے آپ نے' لیکن سلسلہ وار کہانیوں کے علاوہ اور کسی تحریر پر کوئی تبصرہ نہیں' صرف ایک سطر میں نمٹا دیا۔ "آب حیات" کے بارے میں آپ کے تمام سوالات کے جوابات اگلی اقساط میں مل جائیں گے۔

ربیعہ مظہر' غزالہ غفور۔۔۔ گجرات' گاؤں جوڑا

خواتین ڈائجسٹ سے رشتہ بہت ہی پرانا ہے اگر بتانے لگوں۔ تو بس یہ "عہد الست" ' نمل' "آب حیات' بن مانگی دعا" یہ سب ناول میرے اوپر سحر ساطاری ہو جاتا ہے ان کو پڑھنے کے بعد جو سکون ملتا ہے۔ وہ بیان نہیں۔ باقی بھی تمام سلسلے ایسے ون ہیں' پلیز کوئی قاری بہن بتائے گی کہ ایک کہانی تھی۔ جس کے کرداروں کے نام موسیٰ خیل' اور عیسیٰ خیل تھے۔ اس کا نام اور یہ کب شائع ہوئی تھی اگر کسی کو پتا ہے تو پلیز بتا دیں۔

ج : پیاری غزالہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ اگر کسی قاری بہن کو کہانی کے بارے میں معلوم ہو تو ہمیں لکھ دیں۔ ہم ان کا خط شائع کر دیں گے۔

رخسانہ عبدالستار۔۔۔ گوجرانوالہ مغل چک کلاں

سب سے پہلے تو عمیرہ احمد زندہ باد۔ کیا بات ہے ان کی تحریر کی۔ عمیرہ احمد سے میری گزارش ہے کہ وہ سالار سکندر اور امامہ ہاشم کو علیحدہ نہ کریں بڑی مشکل سے نو سال بعد ملے ہیں۔ نمرہ احمد بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ نمل بہت اچھا جا رہا ہے۔ نمرہ احمد کا جنت کے پتے اور قراقرم کا تاج محل بہت زبردست تحریریں ہیں۔ آپی آپ نے کہا تھا کہ نمرہ احمد اور عمیرہ احمد دونوں بہنیں نہیں ہیں۔ لیکن میں تو پیشن گوئی کرتی ہوں کہ یہ دونوں اشفاق احمد کی بیٹیاں ہیں کیونکہ ایسی تحریریں لکھنا ورثے میں ملتا ہے۔

ج : پیاری رخسانہ! نمرہ احمد اور عمیرہ احمد میں کوئی رشتہ نہیں ہے اور نہ ہی ان کا اشفاق احمد سے کوئی رشتہ ہے۔ اشفاق احمد صاحب کی تو کوئی بیٹی ہی نہیں ہے ان کے چار بیٹے ہیں۔

ثانیہ یعقوب۔۔۔ کبیروالہ

میں سات سال سے خواتین ڈائجسٹ کی خاموش قاری ہوں۔ یہ ڈائجسٹ مجھے دیوانگی کی حد تک اچھا لگتا ہے۔ اس کے تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔ سائرہ رضا، سمیرا احمید اور نمرہ احمد کی تحریریں مجھے بہت متاثر کرتی ہیں۔ نمرہ احمد کا ناول نمل بہت اچھا ہے۔ سعدی اور زمر نے تو ہمیں اپنے حصار میں قید کر لیا ہے۔ عفت سحر جی کا بن مانگی دعا بھی بہت اچھا چل رہا ہے۔

ج : پیاری ثانیہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

صبا منظور۔۔۔ دیپال پور

مجھے امید ہے اگلی قسط میں زمر پھپھو اور فارس ماموں کی شادی ہو جائے گی۔ شہر محبت کا موضوع پرانا تھا۔ عہد الست میں جو مسلم کنٹرول کے بارے میں کہا، وہ اسلام فوبیا کے نام سے ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے۔

ج : جی صبا! پورا یورپ اس وقت اسلام فوبیا میں مبتلا ہے۔ کیونکہ ان کا میڈیا ایک مقصد کے تحت اس کو پھیلا رہا ہے اور ساری دنیا جانتی ہے کہ میڈیا پر یہودیوں کا کنٹرول ہے۔

ماروی مہوش۔۔۔ گوجرانوالہ

نایاب جیلانی کہاں غائب ہیں۔ آپ ان سے کوئی فنٹاسٹک ناول لکھوائیں۔ آب حیات بہت ہی اچھا جا رہا ہے۔ نمل کی یہ قسط بھی جان دار تھی۔

ج : پیاری ماروی! نایاب جیلانی جلد ہی لکھیں گی۔

روشنی۔۔۔ عارف والا

خواتین ڈائجسٹ کی جان آب حیات ناول ہے۔ اور میری موسٹ فیورٹ سائرہ رضا کیوں غیر حاضر ہیں۔

ج پیاری روشنی! سائرہ رضا ناول لکھ رہی ہیں۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ شامل ہو گا۔

نگہت نورین۔۔۔ سیالکوٹ

آج چھ فروری ہے۔ خواتین نہیں آیا کچھ کریں۔ شعاع، خواتین دونوں جلدی اور اکٹھے شائع کیا کریں۔ آج ڈائجسٹ نہیں آیا۔۔۔ سوچا خط کی ایک نئی روایت لکھوں۔۔۔ آخر کیا ہو گا سفینہ بیگم کا رویہ۔۔۔ دیکھیے محض اگلے دن کیا ہو گا نور محمد کے لیے؟ کیا امامہ کو اس کا بھائی ملے گا؟ زمر بدلہ لینے پر اتر آئی ہے۔ کیا وہ خود کو گناہ گار کرلے گی۔۔۔ کسی کا خون کسی کے سر۔۔۔؟ کیا ہو گا اب آدم و حوا کے امامہ اور سالار کے ساتھ۔۔۔؟ دیکھیے کل صبح تین بجے صرف خواتین ڈائجسٹ میں۔۔۔ خواتین، خواتین، خواتین جیسا کوئی نہیں (نقل کرنے پر ہم نمبرون ہیں)

7 فروری۔۔۔ اگلا دن۔۔۔

خواتین آگیا۔ کالج سے آئی کال کی اور کانوں کو کچھ دیر سکون آیا۔ بھاگم بھاگ سائیکل پر گئی۔ جی ہاں میں سائیکل چلاتی ہوں۔ خواتین پکڑا اور گھر آکر جلدی جلدی ابھا۔۔۔

نمر یہ کیا، پچھلی قسط میں اتنا ڈرایا اور اب ایک دم سب کچھ کافور ہو گیا ایک طرف معیز کچھ سمجھتا ہے دوسری طرف کچھ۔۔۔؟ یہ آخر ہو کیا رہا ہے۔ مصنفہ شاید خود ہی کردار کی نفسیات کو سمجھ نہیں سکیں۔ خیر جو بھی ہے۔ ٹھیک ہی تھی قسط۔۔۔ عہد الست اتنی تھوڑی قسط۔۔۔ اس قسط نے کچھ گڑبڑا دیا۔ ویسے یہ خضر الٰہی کا کیا چکر ہے اور اتنی جلدی آخری قسط۔۔۔ سلمان حیدر ہی ٹیپو ہے۔ یہ کیا؟ خیر آخری قسط میں پتا چلے گا۔ "آب حیات" میں بیت العنکبوت شروع ہو چکا ہے۔ دیکھیے آگے کیا جو نکانے والی خبر ہے؟ نمل

بیسٹ رہی یہ قسط! ویل ڈن مگر اس دفعہ کوئی نام ہی نہیں ہے قسط کا... اور شروع میں کوئی نظم بھی نہیں... ؟ افسانے سب ہی ٹھیک تھے۔ ایمل رضا اچھا اضافہ تھا۔ ویل ڈن... ؛ حیا بخاری کچھ خاص پسند نہ آئیں۔ عتیقہ ملک بھی بس نارمل ہی تھیں۔ ویسے ایک بہن نے پوچھا سیالکوٹ کی ہی تھی یہ "تیسرا دروازہ" اور اک کھڑکی کھلی ہے ابھی، مگر کھول کون رہا ہے "بن مانگی" کو کتنی مانگ رہ گئی ہے؟ آپ سب کچھ چھپا جاتی ہیں۔ ہمارا انداز کیسا لگا ضرور بتایئے گا۔

ج : پیاری نگہت! ہمیں بخوبی اندازہ ہے کہ ہماری قارئین خواتین ڈائجسٹ سے کتنی محبت کرتی ہیں، کتنی بے چینی سے اس کا انتظار کرتی ہیں اور پرچا لیٹ ہو جائے تو انہیں کتنی کوفت ہوتی ہے۔ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے پرچا جلد آجائے لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی ایسا مسئلہ ہو جاتا ہے کہ ہم اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔

نمرہ کی قسط میں اس بار کوئی نام نہیں تھا اور نہ ہی نظم تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ پچھلے عنوان "فریب کار" کا ہی تسلسل تھا۔ "بن مانگی دعا" کی چند ہی اقساط باقی ہیں، صحیح اس لیے نہیں بتا سکتے آخری اقساط میں کہانی سمیٹتے ہوئے اقساط میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

تنزیلہ کا ناول ابھی ختم نہیں ہو رہا، وجہ وہی ہے کہ بہت سے واقعات کی وضاحت ابھی باقی ہے۔

ہم اپنی قارئین سے کچھ نہیں چھپاتے لیکن جب تک کوئی بات حتمی نہ ہو۔ اسے قارئین کو بتانا بھی مناسب نہیں سمجھتے۔ بس اتنی سی بات ہے۔ خط آپ نے بہت اچھے انداز سے لکھا ہے۔ پڑھ کر مزا آیا۔

سعدیہ، سائرہ، حنا اور عظمیٰ... سرگودھا

باجی ہم آپ کے نئے نئے قاری ہیں۔ بالکل نئے نکور خواتین چار ماہ سے لے رہے ہیں اور وجہ باجی نمرہ احمد کا نمل ہے۔ فری پیریڈ میں جو کہ فرسٹ ایئر میں ہر وقت ہوتا ہے۔ عظمیٰ نے کسی لڑکی سے لے کر نمل پڑھا اور ہمیں سنایا۔ اتنا اچھا گھریلو سسپنس۔ ہائے اتنا مزہ آیا۔ آج تک ہم نے کوئی رسالہ نہیں پڑھا تھا۔ اب ہم ہر ماہ لیتے ہیں۔ ہم بس سلسلے وار کہانیاں پڑھتے ہیں۔ اس میں ذرا رائٹر کھل کر کہانی کی انوائرمنٹ ــــــــ بناتا ہے۔ عہد الست کے کئی پیراگراف تو ہم دو دو دفعہ پڑھتے ہیں۔ بہت پسند ہے۔ نیا ناول آب حیات سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید وہ پرانی کسی اسٹوری کا سلسلہ ہے۔ پلیز عدنان ملک اور "چپ رہو" کے عمیر کا انٹرویو دیں اور پلیز پلیز ہم سب کی فرمائش پر باجی نمرہ احمد کا بھی انٹرویو دیں۔ بے شک تصویر کے بغیر ہو اور اس میں دیں جس میں چھوٹے چھوٹے 95 - 96 سوال ہوتے ہیں۔ ایک کنفیوژن امامہ یا امائمہ عہد الست اور آب حیات کے کردار دونوں بہت ملتے ہیں یعنی کہ رونا اور رونا۔

ج : سعدیہ، سائرہ، حنا اور عظمیٰ، خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔

"آب حیات" یہ نومبر میں شروع کیا گیا تھا۔ تب ہی ہم نے پیر کامل کا خلاصہ بھی لکھا تھا آپ چار ماہ سے پڑھ رہی ہیں۔ آپ کے پاس نومبر کا پرچا ہو گا اس میں سے پڑھ لیں، عمیرہ احمد کے ناول، پیر کامل کا تسلسل ہے۔ امامہ اور سالار پیر کامل کے بنیادی کردار ہیں۔ امامہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق ہے، وہ ختم رسالت پر کامل یقین رکھتی ہے جبکہ اس کے گھر والے اس پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ عشق رسول اور ایمان کامل کے لیے امامہ نے اپنا گھر چھوڑ دیا، اس کے لیے اس نے سالار کی مدد حاصل کی سالار اس وقت ایک بے راہ رو نوجوان تھا۔ اس نے محض ایک تھرل کے لیے امامہ کی مدد کی۔ امامہ اور سالار نو سال تک ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔ اس دوران سالار پر اللہ تعالیٰ کا کرم ہوا اور اسے ہدایت کی روشنی نصیب ہوئی تو اسے امامہ کی قدر و قیمت کا احساس ہوا، وہ امامہ کو تلاش کرتا رہا اور معجزاتی طور پر ایسے اتفاق رونما ہوئے کہ امامہ دوبارہ اس کی زندگی میں آگئی۔ اب ان دونوں نے باقاعدہ ازدواجی زندگی کا آغاز کیا ہے جو "آب حیات" میں آپ پڑھ رہی ہیں۔

امامہ اور امائمہ دو بالکل مختلف کردار ہیں۔ صرف رونے کی وجہ سے دونوں کو ملانا درست نہیں۔

احمد یار پھاٹک... آرائیاں والا تحصیل وزیر آباد

ادارے کو خط لکھنے کا مقصد، ناولٹ "مرگ وفا" مصنفہ نبیلہ رمضان شمارہ جنوری 2015ء میں دی گئی غلط معلومات کی تصحیح کرنا ہے۔

ناولٹ متذکرہ بالا میں ایک افریقی سانپ "ممبا" کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے جیسا کہ "ممبا" اور "کوبرا" دونوں نام ایک ہی سانپ کے ہیں۔ حالانکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔

"ممبا" اور "کوبرا" دونوں الگ الگ اقسام کے سانپ ہیں۔ "ممبا" جسے "بلیک مامبا" کہا جاتا ہے' ایک انتہائی خطرناک افریقی سانپ ہے جو کہ براعظم افریقہ میں پایا جاتا ہے اور کوبرا سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا ہے۔

جبکہ کوبرا جسے "کنگ کوبرا" بھی کہا جاتا ہے' ایک ایشیائی سانپ ہے اور اس کا مسکن بطور خاص ہندوستان (بشمول پاکستان) کا علاقہ ہے۔ ناولٹ متذکرہ میں "ممبا" اور "کوبرا" کا جس انداز سے تذکرہ کیا گیا ہے' اس سے قارئین کی معلومات میں اضافہ ہونے کے بجائے غلط سمت میں راہنمائی ہوئی ہے۔

ج : سانپوں کی اقسام کہانی کا موضوع نہیں تھیں۔ اور نہ ہی یہ سانپوں کے بارے میں کوئی مضمون تھا۔ بہرحال آپ نے اتنے غور سے ناولٹ پڑھا اور خط لکھ کر تصحیح فرمائی۔ اس کے لیے بہت شکریہ۔

فاطمہ علی ساگر۔۔۔ گوجرانوالہ

میرا خواتین ڈائجسٹ سے رشتہ اتنا پرانا نہیں (بس پچھلے آٹھ سال سے میں اس کی قاری ہوں) ہاہاہا شادی کے آٹھ سال بعد میں نے اپنی دوست سے خواتین ڈائجسٹ لے کر پڑھا پھر تو مت پوچھیں میں اس کی دیوانی ہو گئی۔ سب سے پہلے کرن کرن روشنی مجھے بہت پسند ہے کیا غزلیں، نظمیں، شعروشاعری نفسیاتی مسائل سب بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ آپ کی ساری رائٹرز تو کمال کی ہیں۔ مگر جو بات رخسانہ نگار۔ نمرہ احمد' عفت سحر طاہر' تنزیلہ ریاض' عمیرہ احمد میں ہے۔ وہ دوسروں میں کہاں۔ یونی بکس میں بچوں کے مسائل کے بارے میں بھی بتائیں۔

ج : پیاری فاطمہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ نے متعدد خطوط لکھے جو شائع نہیں ہوئے تو آپ نے مایوس ہو کر خط لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ اور تین سال تک ہم پرچے کے بارے میں آپ کی رائے سے محروم رہے۔ ہم پہلے بھی کئی بار بتا چکے ہیں کہ خط شائع ہوں یا نہ ہوں ہم تمام خط پوری توجہ اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں' کیونکہ ہمارے لیے ہماری قارئین کی رائے بہت اہم ہے۔

آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔ تھوڑا انتظار کر لیں۔

ام دعا۔۔۔ میرپور آزاد کشمیر

"آب حیات" میں اس دفعہ اصلی سالار سکندر دیکھنے کو ملا' وہی زچ کر دینے والا' شرارتی اور نہ دبنے والا! اور امامہ سے اس کی محبت بے حد اچھی لگی "امامہ" اس امامہ سے بے حد مختلف جو "پیر کامل" کا حصہ تھی! وہ امامہ جس نے حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنا گھر' والدین' آرام' آسائشیں سب چھوڑ دیں۔۔۔۔ اتنی بڑی بڑی آزمائشوں سے گزر کر چھوٹی چھوٹی الجھنیں کیونکر پال لیں؟ (خیر ایسے بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ بڑی آزمائشوں سے گزر جاتے ہیں ہمت سے وہ چھوٹی مشکلوں میں بعض اوقات زیادہ الجھتے اور پھنستے ہیں) "نمل" کی قسط کافی جاندار رہی۔۔۔ مجھے شروع میں ہاشم کا کردار سب سے مضبوط اور اچھا لگا مگر پھر ہر گزرتی قسط کے ساتھ ہاشم کچھ اچھا نہیں لگا مگر چونکہ ہاشم کا کردار نمرہ کا فیورٹ کردار ہے سو دوبارہ ہاشم کو جج کر رہے ہیں کہ کیا ہوگا؟ اور یہ کیونکر نمرہ کا فیورٹ کردار ہے اور عبدالست انتہائی میچور تحریر! سمجھانے کا انداز بہترین۔۔۔ لیکن یہ قسط ذرا سی کنفیوزنگ لگی کہ ہر کردار' ایک دوسرے سے جڑا ہوا الگ رہا تھا۔۔۔ اور کچھ سمجھ نہ آیا کہ کون کیا ہے۔۔۔ (ہاہا) خیر آخری قسط میں واضح ہو جائے گا۔

یہ تین ستارے "عمیرہ' نمرہ" اور "تنزیلہ" ذہانت کی روشنی سے جگمگ کرتے ہیں۔ "قلم" کا صحیح استعمال ہر کسی کے بس میں نہیں۔۔۔ یہ تو خاص لوگ ہوتے ہیں جن کو اللہ چنتا ہے' ان پر بہت ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ان کے الفاظ میں اثر ہوتا ہے جو رب تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور "اثر" ہر کسی کے قلم میں نہیں ہو سکتا!

ج : ام دعا! آپ نے بالکل صحیح لکھا' قلم کار پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے' الفاظ میں تاثیر اللہ کے کرم سے ہوتی ہے اور صحیح سمت کی جانب رہنمائی کرنے کی توفیق اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے۔

عظمیٰ شفیق۔۔۔ جڑانوالہ

یہ ثریا باجی ہیں "ہماری لنگوٹی" بے ساختہ ہنسی کا فوارہ چھوٹ گیا جی ہاں حیا بخاری کا ناولٹ پڑھتے ہوئے۔

بہت ہی منفرد سا ناولٹ تھا۔ عبو کا مطلب کیا ہے ؟ مسکرائی ہے زندگی کچھ متاثر نہ کر سکا۔ البتہ ناول میں جو اشعار تھے اچھے لگے۔ راؤ سمیرا ایاز کا ناولٹ قدرے بورنگ تھا پڑھ کے لگا ٹائم ضائع کیا۔ مہک فاطمہ کا افسانہ عمدہ تھا بس "کاش مجھے بھی مریم جیسی ہی بہو ملے آج سے بیس سال بعد۔ ابھی بیٹے پانچ سال کے ہیں' مجھے نمرہ احمد سے کہنا ہے وہ ایک قسط کا مکمل ناول بھی لکھیں پلیز پلیز۔

ج : پیاری عظمیٰ! آپ نے خط لکھا' بہت خوشی ہوئی۔ حیا بخاری تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ عنیقہ ملک اور راؤ سمیرا ایاز کے ناولٹ آپ کو متاثر نہ کر سکے۔

اچھی بہو ملنے کی دعا کچھ قبل از وقت ہے' لیکن ہم آپ کی دعا پر آمین کہتے ہیں۔

عبو کے معنی ہیں غور و فکر' توجہ نصیحت۔

فریدہ لاکھو' سائرہ لاکھو.... نواب شاہ

سب سے پہلے بن مانگی دعا کی قسط پڑھی۔ پھر نمل پڑھا' واہ نمرہ جی! نمل کی خاص بات یہ ہے کہ ہر کریکٹر جان دار ہے۔ تنزیلہ ریاض کا عہد الست کا یہ جملہ "دنیا کے ساتھ وہ مت کیجیے گا جو ابلیس نے آپ کے ساتھ کیا۔" آج تک نہیں بھولی۔

ج : بہت شکریہ فریدہ اور سائرہ۔

آصفہ عائشہ.... کمالیہ

اس ماہ کے شمارے میں کوئی خاص اسٹوری نہیں تھی۔ نایاب جیلانی کیوں نہیں لکھ رہی ہیں۔ پلیز آشان خان کا انٹرویو شائع کریں۔

ج : نایاب جیلانی جلد لکھیں گی۔ آشان کے انٹرویو کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچائی جا رہی ہے۔

سبرینہ اعجاز.... کراچی

خواتین بہت شان دار تھا' افسانے' ناولٹ' ناول سب بیسٹ تھے ۔مجھے ایک ناول کا نام جاننا ہے' بہت پہلے پڑھا تھا۔ اس میں ہیروئن کا نام ہما تھا اس کی دو دوستیں تھیں جو کزن بھی تھیں' تایا زاد تھیں۔ تینوں کی شادی ہوئی تو ایک کزن لندن' دوسری دبئی اور خود ہیروئن ملتان چلی گئی۔ ہیروئن کو یہ غلط فہمی تھی کہ وہ اپنے جس کزن سے محبت کرتی ہے۔ وہ اس کی دوسری کزن کو پسند کرتا ہے جبکہ ایسا نہیں تھا ہیرو ہما یعنی ہیروئن کو ہی پسند کرتا تھا پلیز اس ناول کا نام بتادیں۔

سبرینہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ ہمیں کہانی کا نام یاد نہیں۔ ممکن ہے کسی قاری بہن کو یاد ہو' اگر کسی نے ہمیں خط لکھا تو ہم شائع کردیں گے۔

☼

قارئین متوجہ ہوں!

1- خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کرسکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

خواتین ڈائجسٹ
37- اردو بازار کراچی

خبرناک کی

زینب جمیل سے باتیں

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"زینب جمیل۔"
2 "پیار کا نام؟"
"زینی۔"
3 "تاریخ پیدائش / شہر؟"
"30مارچ 1990ء / گوجرانوالہ۔"
4 "اسٹار / قد؟"
"Pices / 5فٹ 7انچ۔"
5 "بہن بھائی / آپ کا نمبر؟"
"چار بہن بھائی ہیں ایک بھائی دو بہنیں اور میں گھر میں بڑی ہوں۔"
6 "تعلیمی قابلیت؟"
"بیچلر۔"
7 "شوبز میں آمد؟"
"انٹرن شپ کی تھی "جیو" میں تو خبرناک کے لیے آفر آگئی۔"
8 "شادی / پسند؟"
"ابھی تو کوئی ارادہ نہیں اور پسند ناپسند کی بات نہیں، جو اوپر والے نے لکھ دیا ہو گا وہی ہو گا۔"
9 "پہلا پروگرام / وجہ شہرت؟"
"خبرناک تھا۔ یہی پروگرام وجہ شہرت بنا اور "آپ کی کنیز۔"
11 "شوبز کی لائف؟"
"بہت اچھی ہے۔ ہر شعبے کی طرح اچھائیاں برائیاں ہیں۔"
12 "صبح کب اٹھتی ہیں؟"
"کام پہ جانا ہو تو چھ سے سات کے درمیان اٹھ جاتی ہوں۔"
13 "صبح ناشتہ کرنے کا دل چاہتا ہے یا پانی پینے کا؟"
"میرا تو دل ناشتہ کرنے کو چاہتا ہے' چائے اور ناشتہ میرے لیے لازمی ہوتا ہے۔"
14 "مادری زبان؟"
"پنجابی۔"
15 "بات جو بری لگتی ہے؟"
"اگر کوئی مس مینجمنٹ کرے۔"
16 "پاکستان کا کون سا قانون برا لگتا ہے؟"
"یہاں تو جی جس کی لاٹھی اس کی بھینس والی بات ہے۔"
17 "تہوار جوش و شوق سے مناتی ہیں؟"
"قومی بھی اور مذہبی بھی... بہت جوش و خروش کے ساتھ مناتی ہوں۔"
18 "کیا آپ جسمانی طور پر مکمل انسان ہیں؟"
"ظاہری طور پر مکمل ہوں اندرونی خامیوں کو سدھارنا چاہتی ہوں۔"
20 "کس دن کا شدت سے انتظار رہتا ہے؟"
"جب میرا کوئی پروجیکٹ آن ایر ہو یا نیا پروجیکٹ شروع ہوتا ہے۔"
21 "تھکن میں کیفیت؟"
"بہت سست ہو جاتی ہوں اور کہیں نہیں جاتی۔"
22 "کب معذرت کر لیتی ہوں؟"
"جب کہیں جانے کا موڈ نہ ہو اور بہت تھکن ہو تب۔"
23 "طبیعت میں ضد ہے؟"
"نہیں ضد نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی کام سے انکار کر دوں تو بس وہ انکار ہی ہوتا ہے۔"
25 "غصے میں رد عمل؟"
"چیختی ہوں۔"
26 "مردوں کی کوئی اچھی اور بری بات؟"
"ایمان داری اچھی لگتی ہے اور جھوٹ بولنا برا لگتا

ہے۔"

27 "کوئی لڑکا مسلسل گھورے تو؟"

"میں کنفیوز ہو جاتی ہوں۔"

28 "انعامی بانڈ لینے کا شوق ہے؟"

"نہیں بالکل بھی نہیں۔"

29 "گھر میں کس سے ڈرتی ہیں؟"

"کسی سے نہیں۔ گھر کی بڑی ہوں اور والدین تو میری جان ہیں۔"

30 "کیا وقت سے پہلے ملا؟"

"نہیں جی.... سب کچھ وقت پر ہی مل رہا ہے۔"

31 "محبت کے معاملے میں کیسی ہیں؟"

"بہت کھل کر کرتی ہوں۔ پہلے نہیں کر پاتی تھی۔"

32 "کس ملک کا پاسپورٹ لینا چاہتی ہیں؟"

"امریکہ اور سوئیزرلینڈ۔"

33 "ونڈو شاپنگ کا شوق ہے؟"

"نہیں میں ونڈو شاپنگ نہیں کرتی۔ سچ مچ شاپنگ کرتی ہوں۔"

34 "شاپنگ میں پہلی ترجیح؟"

"پرفیوم پھر کچھ اور۔"

35 "فراخ دل ہیں؟"

"جی بالکل کنجوس بالکل بھی نہیں ہوں۔ اگر دوستوں کے ساتھ کہیں کھانا کھانے جاؤں تو کوشش ہوتی ہے کہ بل میں ہی دوں۔"

36 "تحفے میں آپ کی ترجیح؟"

"پرفیوم.... مجھے اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں لگتا۔"

37 "ایک پسندیدہ شخصیت جس کے ساتھ ایک شام گزارنا چاہتی ہیں؟"

"سلمان خان۔"

38 "کب موڈ پر خوش گوار اثر ہوتا ہے؟"

"جب میرا کوئی رکا ہوا کام شروع ہو جائے۔"

39 "پسندیدہ پروفیشن؟"

"ایکٹنگ.... اداکاری سے بہتر کچھ نہیں۔"

40 "بستر کب چھوڑتی ہیں؟"



"اگر لیٹ ہو جاؤں تو چھلانگ مار کر اٹھ جاتی ہوں۔ ورنہ آرام کرتی رہتی ہوں کہ ابھی اٹھ جاتی ہوں۔"

41 "چاہت کس میں ہوتی ہے۔ اپنے لوگوں میں یا؟"

"صرف اور صرف اپنے لوگ۔"

42 "چھٹی کہاں گزارتی ہیں؟"

"صرف اپنے گھر میں.... گھر سے بڑھ کر کوئی جگہ ہو ہی نہیں سکتی۔"

43 "لباس میں کیا پسند ہے؟"

"جو آرام دہ ہو گھر میں تو ٹراؤزر اور شرٹ میں ہوتی ہوں"۔

44 "ایک لفظ میں اپنی شخصیت کی وضاحت کریں؟"

"ڈریمر Dreamer (خوابوں میں رہنے والی)۔"

45 "مرد حسین ہونا چاہیے یا ذہین؟"

"ذہین۔"

46 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"

"اپنے کمرے میں۔"

47 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب جلدی دیتی ہیں؟"
"سب کے... میں کسی کو ناراض نہیں کرنا چاہتی۔"
48 "فارغ اوقات میں کیا کرتی ہیں؟"
"ایکسرسائز۔"
49 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائیں؟"
"نہیں... لیکن کوئی تنگ کرے تو اسے بلاک کر دیتی ہوں۔"
50 "مہمانوں کی آمد؟"
"مجھے اچھی نہیں لگتی۔"
51 "چیزیں، جو جمع کرتی ہیں؟"
"پرفیومز۔"
52 "اگر اس ملک کی وزیراعظم ہو جائیں تو؟"
"اچھی بات ہے... خوش ہو جاؤں گی۔"
53 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"جس کے پیچھے کوئی ایسا مقصد ہو جو میرے لیے برا ہو۔ ورنہ نصیحت تو مجھے پسند ہیں۔"
54 "انسان کی زندگی کا سب سے اچھا دور؟"
"میرا خیال ہے کہ جب انسان اپنے پروفیشن میں پیک (بلندی) پر ہو۔"
55 "کن پر بہت خرچ کرتی ہیں؟"
"اپنے گھر والوں پہ۔"
56 "اپنی کمائی سے مہنگی چیز کیا خریدی؟"
"کچھ عرصہ پہلے اپنے لیے گاڑی خریدی ہے۔"
57 "کھانا کہاں کھانا پسند کرتی ہیں۔ اپنا بیڈ، ڈائننگ ٹیبل یا چٹائی پہ؟"
"ڈائننگ ٹیبل... نہ چٹائی، نہ بیڈ۔"
58 "ہاتھ سے کھانا کھاتی ہیں یا چھری کانٹے سے؟"
"یہ تو کھانے پر منحصر ہے کہ ہاتھ سے کھانے والا ہے یا چھری کانٹے سے۔"
60 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"
"کافی ہے اور سب کو ہی ہوتی ہے میرا خیال ہے۔"
61 "کھانے دیسی پسند ہیں یا بدیسی؟"
"دیسی۔"
62 "کوکنگ سے لگاؤ؟"
"کوئی خاص نہیں مگر سب کچھ بنا لیتی ہوں۔"
63 "کوکنگ چینل شوق سے دیکھتی ہیں؟"
"بالکل بھی نہیں۔"
64 "کس شخصیت کو اغوا کرنا چاہتی ہیں اور تاوان میں کیا لینا چاہیں گی؟"
"جس کو بھی اغوا کروں گی۔ پیسے ہی مانگوں گی۔"
65 "آپ کو فوبیا ہے؟"
"ہر جانور سے ڈر لگتا ہے، ہر پرندے سے، مجھے فوبیا ہے اور میں چاہتے ہوئے بھی کنٹرول نہیں کر سکتی۔"
66 "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"
"اگر سچی ہو تو اندھی ہوتی ہے۔"
67 "دکھ کب ہوتا ہے؟"
"جب کوئی اگنور کرے تب۔"
68 "مطالعہ کرنے کا شوق ہے؟"
"بالکل شوق ہے اور انگریزی رائٹرز کو شوق سے پڑھتی ہوں۔"
69 "شادی میں پسندیدہ رسم؟"
"مہندی۔ اگر مہندی نہ ہو تو پھر میں جاتی بھی نہیں۔ اگر بہت مجبوری نہ ہو تو۔"
70 "شادی میں کیا دینا بہتر ہے تحفہ یا کیش؟"
"میرے خیال میں کیش۔"
71 "کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟"
"کسی سے نہیں۔"
72 "اپنا فون نمبر کتنی بار تبدیل کیا؟"
"ایک ہی نمبر ہے اور بار بار نمبر تبدیل کرنا مجھے پسند بھی نہیں۔"
73 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"
"موبائل اور پیسے۔"
74 "آپ دوسروں سے مختلف ہیں یا؟"

بقیہ صفحہ نمبر 281



عمیرہ احمد

آبِ حیات

آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں، جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سرا مل جاتا ہے۔

J۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال



کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی ڈیلی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ نینسی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتا دیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد، مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی' اس نے اس بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

5۔ وہ جیسے ہی گھر آیا، معمول کے مطابق اس کے دونوں بچے اپنا کھیل چھوڑ کر اس کے گلے آلگے۔ حسب معمول اس کی بیوی نے بھی جو تیسری بار امید سے تھی' اس کا پرتپاک استقبال کیا۔ وہ لان میں اپنی بیوی بچوں کو مطمئن و مسرور دیکھ کر سوچ رہا ہے کہ اگر وہ چند پیپر پھاڑ کر پھینک دے تو اس کی زندگی آئندہ بھی اسی طرح خوب صورت رہ سکتی ہے۔ مگر وہ ضروری فون آجاتا ہے۔ جس کا وہ انتظار کر رہا ہے۔ اب اسے اپنی فیملی اور استعفیٰ میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا تھا۔

8۔ پریذیڈنٹ ایک انتہائی مشکل صورت حال سے دوچار تھا۔ اس کا فیصلہ کانگریس کے الیکشنز پر بری طرح اثر انداز ہو سکتا تھا۔ کیبنٹ کے چھ ممبرز کے ساتھ پانچ گھنٹے کی طویل نشست کے بعد اسے پندرہ منٹ کا وقفہ لینا پڑا تھا۔ فیصلے کی ذمہ داری اس کے سر تھی۔ آخر کار وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

10۔ الزائمر کے مریض باپ کو وہ اپنے ہاتھوں سے یخنی پلا رہا تھا۔ اس کے انداز میں اپنے باپ کے لیے نہایت پیار' احترام اور تحمل ہے۔ اس کے باپ کو معلوم نہیں کہ وہ اس کے ہاتھ سے آخری بار کھانا کھا رہا ہے۔ اس کا سامان ایئرپورٹ پر جا چکا ہے اور وہ گاڑی کا انتظار کر رہا ہے۔

Q۔ وہ نیلے رنگ کی شفاف جھیل پر اس کے ہمراہ ہے۔ خوب صورت حسین مناظر میں گھری جھیل میں وہ صندل کی لکڑی کی کشتی میں سوار ہے۔

K۔ وہ تیسری منزل پر بنے اپارٹمنٹ کے بیڈ روم کی کھڑکی سے ٹیلی اسکوپ کی مدد سے ساٹھ فٹ کے فاصلے پر اس بینکوئٹ ہال پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ ٹائم نو بج کر دو منٹ ہو رہے ہیں۔ پندرہ منٹ بعد وہ مہمان بینکوئٹ ہال میں داخل ہوگا۔ وہ ایک پروفیشنل شوٹر ہے۔ اسے مہمان کو نشانہ بنانے کے لیے ہائر کیا گیا ہے۔

3۔ وہ اس سے اصرار کر رہی ہے کہ نجومی کو ہاتھ دکھایا جائے۔ وہ مسلسل انکار کرتا ہے مگر اس کی خوشی کی خاطر مان لیتا ہے نجومی لڑکی کا ہاتھ دیکھ کر بتاتا ہے کہ اس کے ہاتھ پر شادی کی دو لکیریں ہیں۔ دوسری لکیر مضبوط اور خوشگوار شادی کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ دونوں ساکت رہ جاتے ہیں۔

آدم و حوا

ایک خوب صورت اتفاق نے سالار اور امامہ کو یکجا کر دیا۔ اس نے امامہ کو نو سال بعد دیکھا تھا۔ ان کی ابتدائی زندگی کا پہلا اختلاف لائٹ پر ہوا۔ سالار کو لائٹ آن کر کے سونے کی عادت تھی جبکہ امامہ کو روشنی میں نیند نہیں آتی تھی۔ لیکن سالار نے امامہ کی بات مان لی۔ صبح وہ امامہ کو جگائے بغیر سحری کر کے نماز پڑھنے چلا جاتا ہے' امامہ سحری کے لیے اٹھتی ہے تو فرقان کے گھر سے کھانا آیا رکھا ہوتا ہے۔ امامہ اسے سالار کی بے اعتنائی سمجھتی ہے۔ سعیدہ اماں سے فون پر بات کرتے ہوئے وہ رو پڑتی ہے اور وجہ پوچھنے پر اس کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ سالار کا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔ سعیدہ اماں کو سالار پر سخت غصہ آتا ہے۔ وہ ڈاکٹر سبط علی کو بھی بتا دیتی ہیں کہ سالار نے امامہ کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ سالار ڈاکٹر سبط علی کے گھر امامہ کا روکھا رویہ محسوس کرتا ہے سعیدہ اماں بھی سالار کے ساتھ ناراضی سے پیش آتی ہیں۔ پھر امامہ اس رات سعیدہ اماں کے ہی گھر رہ جاتی ہے۔ سالار کو اچھا نہیں لگتا مگر وہ منع نہیں کرتا۔ امامہ کو یہ بھی برا لگتا ہے کہ اس نے ساتھ چلنے پر اصرار نہیں کیا۔ اس کو سالار سے یہ بھی شکوہ ہوتا ہے کہ اس نے اسے منہ دکھائی نہیں دی۔ سالار اپنے باپ سکندر عثمان کو بتا دیتا ہے کہ اس کی شادی آمنہ نامی جس لڑکی سے ہوئی ہے وہ دراصل امامہ ہے۔ سکندر عثمان اور طیبہ سخت پریشان ہو جاتے ہیں۔ امامہ کو فرقان کے گھر روزانہ کھانا کھانے پر بھی اعتراض ہوتا ہے اور سالار کے سی فوڈ کھانے پر بھی۔ سکندر عثمان' طیبہ اور انیتا ان دونوں سے ملنے آتے ہیں اور امامہ سے بہت پیار سے ملتے ہیں۔ وہ سالار کا ولیمہ اسلام آباد میں کرنے کے بجائے اب لاہور میں کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ ڈاکٹر سبط امامہ سے سالار کے ناروا سلوک کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو وہ شرمندہ سی ہو جاتی ہے کیونکہ وہ بات اتنی بڑی نہیں تھی جتنی اس نے بنا ڈالی تھی۔ سالار' امامہ سے اسلام آباد چلنے کو کہتا ہے۔ تو امامہ خوف زدہ ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر سبط' سالار کو سمجھاتے ہیں۔ وہ خاموشی سے سنتا ہے۔ وہ وضاحت اور صفائی میں کچھ نہیں بولتا مگر ان کے گھر سے واپسی پر وہ امامہ سے ان شکایتوں کی وجہ پوچھتا ہے۔ وہ جواباً "روتے ہوئے" وہی بتاتی ہے' جو سعیدہ اماں کو بتا چکی ہے۔ سالار کو اس کے آنسو تکلیف دیتے ہیں' پھر وہ اس سے معذرت کرتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ آئندہ جو بھی شکایت ہو' کسی اور سے نہ کرنا' ڈائریکٹ مجھے ہی بتانا' وہ اس کے ساتھ سعیدہ اماں کے گھر سے جہیز کا سامان لے کر آتا ہے' جو کچھ امامہ نے خود جمع کیا ہوتا ہے اور کچھ ڈاکٹر سبط نے اس کے لیے رکھا ہوتا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں گھٹیا رومانوی ناول دیکھ کر سالار کو کوفت

ہوتی ہے اور وہ انہیں تلف کرنے کا سوچتا ہے۔ مگر امامہ کی وجہ سے رک جاتا ہے۔ سالار اپنے بینک میں امامہ کا اکاؤنٹ کھلوا کر تیس لاکھ روپے اس کا حق مہر جمع کرواتا ہے۔ وہ امامہ کو لے کر اسلام آباد جاتا ہے اور ایئرپورٹ پر اسے بتاتا ہے کہ سکندر عثمان نے منع کیا تھا۔ امامہ کو شدید غصہ آتا ہے۔ گھر پہنچنے پر سکندر عثمان اس سے شدید غصہ کرتے ہیں۔

پانچویں قسط

وہ جس شیشے سے اسے دیکھ رہی تھی' وہ پھر دھندلا گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ سالار سے اگلا جملہ کیا کہے۔ وہ دوبارہ اپنی ای میل کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ کتاب میں امامہ کی دلچسپی مکمل طور پر ختم ہو چکی تھی۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

ڈپریشن کے دورے کا آغاز نئے سرے سے ہوا تھا۔ دوسرے بیڈ روم کے باتھ روم میں آکر وہ بے مقصد اپنا دایاں ہاتھ رگڑ رگڑ کر دھوتی رہی۔ یہ احمقانہ حرکت تھی اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا' لیکن وہ اس وقت اپنی ذہنی پریشانی لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ واقعی بہت اپ سیٹ تھی۔ وہ شراب کا ایک گلاس نہیں تھا' بلکہ اس کی ازدواجی زندگی میں آنے والی پہلی کھائی تھی' پہلی اور سب سے بڑی۔ اس کے لیے یہ یقین کرنا ناممکن ہو رہا تھا کہ وہ ایسی کمپنی کے ہوتے ہوئے شراب سے مکمل اجتناب کرتا ہوگا اور شراب پینے کا کیا مطلب تھا.... ؟ یہ کسی کو سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بے مقصد گھر کے ہر کمرے میں پھرتی رہی۔ نیند مکمل طور پر اس کی آنکھوں سے غائب ہو گئی تھی۔

"اللہ سکون کے آسمان کو اندیشوں کی زمین کے بغیر کیوں نہیں کھڑا کرتا؟" اس نے ٹیرس سے بے مقصد نیچے جھانکتے ہوئے سوچا تھا۔

وہ اس تاریکی اور سردی میں کتنی ہی دیر ٹیرس کی ریلنگ کے پاس کھڑی نیچے دیکھتی رہی' اسے وقت کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔

"تم کیا کر رہی ہو یہاں؟" اپنے عقب میں سالار کی آواز نے اس کی سوچوں کے تسلسل کو توڑا۔ وہ کمرے سے اس کی طویل عدم موجودگی کی وجہ سے اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں آیا تھا۔

"میں.... ؟" امامہ نے چونک کر' پلٹ کر اسے دیکھا۔ "میں نیچے دیکھ رہی تھی۔"

"نیچے کیا ہے؟" سالار نے اس کے قریب آکر نیچے جھانکا۔

"نیچے.... ؟" امامہ کو خود بھی پتا نہیں چلا کہ اس نے نیچے کیا دیکھا تھا۔

"نیچے.... ؟.... کچھ بھی نہیں۔" سالار نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ اسے غائب دماغ لگی تھی' غائب دماغ یا پھر پریشان۔

"اندر چلیں؟" وہ کوئی جواب دینے کے بجائے اپنی شال ٹھیک کرتی ہوئی اس کے ساتھ اندر آگئی۔

"تم سو جاؤ' میں تھوڑی دیر بعد آؤں گی۔" اس نے اندر آتے ہوئے سالار سے کہا۔

"میں کچھ دیر ٹی وی دیکھوں گی۔" سالار ٹھٹک گیا۔

امامہ ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں لیے اب ٹی وی آن کر رہی تھی۔ شادی کے بعد پہلی مرتبہ وہ ٹی وی میں اتنی دلچسپی ظاہر کر رہی تھی۔

"ٹی وی پر کوئی خاص پروگرام آرہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں' ویسے ہی دیکھوں گی۔" امامہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ چلا جائے۔
وہ جانے کے بجائے صوفے پر اس کے برابر آکر بیٹھ گیا۔ اس نے امامہ کے ہاتھ سے ریموٹ کنٹرول لے کر ٹی وی کا آف کیا اور ریموٹ کنٹرول سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔
امامہ نے کچھ جز بز ہو کر اسے دیکھا۔
"میں شراب نہیں پیتا امامہ! میں یہ پھل چکھ چکا ہوں' اس کا ذائقہ کیسا ہے' اس کا اثر کیا ہے۔ میں دونوں سے واقف ہوں' مجھے شراب میں کوئی غم ڈبونا ہے' نہ کسی سُرور کی تلاش ہے۔ میرے لیے یہ ان گناہوں میں سے ایک ہے' جن کو میں چھوڑ چکا ہوں۔ تم ہر روز اللہ تعالیٰ سے بس یہ دعا کیا کرو کہ وہ مجھے سیدھے راستے سے نہ بھٹکائے۔" وہ اس سے سوال کی توقع کر رہی تھی' جواب کی نہیں۔ وہ جیسے کسی سائیکالوجسٹ کی طرح اس کا ذہن پڑھ رہا تھا۔
"اب تمہیں ٹی وی دیکھنا ہے تو دیکھو' ورنہ آکر سو جاؤ! گڈنائٹ۔"
اس نے ٹی وی آن کرتے ہوئے امامہ کے ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول دیا' اور بیڈ روم میں چلا گیا۔ وہ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔
"انسان کو کون سی چیز بدل دیتی ہے؟ وقت؟ حالات؟ زندگی؟ تجربہ؟ تکلیف؟ تلاش؟ محبت؟... یا پھر اللہ؟"
اس نے ٹی وی آف کرتے ہوئے سوچا۔



سالار کے ساتھ اس گفتگو نے اس کے لیے بہت آسانی پیدا کر دی تھی۔ دوبارہ ڈنر پر جاتے ہوئے' امامہ نے وہاں آنے والے لوگوں کو اس طرح نہیں جانچا تھا جس طرح پچھلی بار جانچا تھا۔ اس بار وہ اسے اتنے برے نہیں لگے تھے' جتنے پہلی بار لگے تھے' پہلے کی طرح اسے احساس کمتری کا دورہ پڑا تھا' نہ ہی احساس برتری کا' اور نہ ہی نیم عریاں لباس میں عورتوں کو دیکھ کر اس نے کسی احساس برتری کی ٹوپی پہنی تھی اور ان تعصبات کے بغیر اس کے لیے وہاں جانا قدرے آسان ہو گیا تھا۔
"تم کسی سے کوئی بات کیوں نہیں کرتیں؟"
وہ شاید چوتھا ڈنر تھا' جب واپسی پر رات کو سونے سے پہلے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد سالار نے اس سے پوچھا۔ وہ ناول پڑھتے ہوئے چونکی تھی۔
"کیسی بات؟"
"کوئی بھی بات...؟" وہ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
"جب کوئی مجھ سے کچھ پوچھتا ہے تو میں جواب دیتی ہوں۔"
"لیکن تم بھی تو کسی سے کچھ پوچھا کرو۔" وہ ان پارٹیز میں اس کی مسلسل خاموشی کو نوٹس کر رہا تھا۔
"کیا پوچھا کروں؟"
سالار اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔ وہ واقعی سنجیدہ تھی۔
"تم حال چال پوچھو' پھر تم فیملی کے بارے میں پوچھ سکتی ہو' بچوں کے بارے میں بات کر سکتی ہو۔ فار گاڈ سیک امامہ! عورتوں کو تو یہ نہیں بتانا پڑتا کہ انہیں آپس میں کیا باتیں کرنی ہے۔" وہ اسے بتاتے بتاتے کچھ سٹپٹا سا گیا۔
"اچھا' میں کوشش کروں گی۔" اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

"میرا یہی سوشل سرکل ہے' یہی لوگ بار بار ملیں گے تمہیں' ان ہی میں سے تم نے دوست بنانے ہیں۔"
"لیکن میں نے دوست بنا کر کیا کرنا ہے؟" اس نے دوبارہ ناول کھولتے ہوئے کہا۔ سالار نے ہاتھ بڑھا کر ناول اس کے ہاتھ سے لے لیا۔
"کتابیں اچھی ہوتی ہیں' لیکن ایک دنیا ان کے باہر ہے' وہ بھی اچھی ہے۔" وہ سنجیدہ تھا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔
"لوگوں سے چھپ چھپ کر' بھاگ بھاگ کر' اب بہت مشکل ہو گیا ہے دوبارہ ان کے ساتھ چلنا۔" وہ خود بھی سمجھ نہیں پائی کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔
"اسی لیے چاہتا ہوں کہ تم لوگوں کے ساتھ انٹرایکٹ کرو۔ اب ضرورت نہیں رہی چھپنے کی' جہاں میں تمہیں لے کر جاتا ہوں' وہاں تم میری فیملی ہو۔ وہاں کوئی تم سے تمہاری فیملی کے بارے میں انویسٹی گیٹ نہیں کرے گا۔" وہ اسے سمجھا رہا تھا۔
"اچھا' میں کوشش کروں گی۔"
اس نے غیر محسوس انداز میں سالار کے ہاتھ سے کتاب لیتے ہوئے کہا۔
"بھابھی کے ہاں بھی جایا کرو۔" وہ اسے نوشین کے بارے میں کہہ رہا تھا۔
"جاتی ہوں۔" اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔
وہ اسے چپ چاپ' کچھ دیر دیکھتا رہا۔
"اب اس طرح مت دیکھو مجھے۔" امامہ نے اس کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس کرتے ہوئے گردن موڑ کر کہا۔ "میں نے کہا ہے نا' میں کوشش کروں گی۔"
وہ کچھ کہنے کے بجائے کمبل کھینچتا ہوا چت لیٹ گیا تھا۔ وہ دوبارہ کتاب پڑھنے لگی' لیکن کچھ دیر بعد اسے سالار کی نظریں پھر خود پر محسوس ہوئی تھیں۔
"اب کیا ہے؟" اس نے کچھ جھنجلا کر سالار کو دیکھا تھا۔
"کچھ نہیں۔" امامہ نے اس کی نظروں میں کوئی بے حد عجیب سا تاثر محسوس کیا تھا۔ وہ بہت سنجیدگی سے کچھ سوچ رہا تھا۔



عید کے دو ہفتے کے بعد اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں ان کے ولیمہ کی تقریب منعقد ہوئی تھی۔ اگر سالار کی ضد نہ ہوتی تو سکندر کبھی اس تقریب کے لیے اسلام آباد کا انتخاب نہ کرتے' لیکن سالار کی ضد کے سامنے سکندر نے بالآخر گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ سکندر کے دوسرے بچوں کے برعکس ولیمہ کی یہ تقریب خاصی سادگی سے ہوئی تھی۔ میوزک کا وہ اہتمام جو سکندر کے گھر کی تقریبات کا حصہ سمجھا جاتا تھا' وہ اس تقریب سے غائب تھا۔ مینو اتنا لیوش نہیں تھا' جتنا پہلے ہوتا تھا' لیکن مہمانوں کی تعداد تقریباً" اتنی ہی تھی' جتنی عام طور پر سکندر کی تقریبات میں ہوا کرتی تھی۔
دو ہزار کے قریب افراد کی موجودگی میں امامہ" اتنا ہی غیر آرام دہ سے محسوس کر رہی تھی' جتنا اسے کرنا چاہیے تھا۔ مہمانوں کی ایک بڑی تعداد سے وہ پہلے ہی سالار کی عید ملن پارٹیز اور دوسرے ڈنرز میں چند دن پہلے واقف ہو چکی تھی۔ اب تعارف کچھ نئے طریقے سے اور دوبارہ ہو رہا تھا۔ ان کمفرٹیبل ہونے کے باوجود وہ خوش تھی اور

طمانیت کا احساس لیے ہوئے تھی۔ وہ باقاعدہ طور پر سالار کی فیملی کا حصہ بن کر جیسے کسی چھت کے نیچے آگئی تھی۔
وہ لیمہ کے بعد دو ہفتے کے لیے بھماس گئے تھے۔ پاکستان سے باہر سالار کے ساتھ امامہ کا یہ پہلا سفر تھا۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ زندگی میں دوبارہ کبھی ان پندرہ دنوں جیسے پرسکون اور بے فکری کے دن ان کی زندگی میں دوبارہ کبھی نہیں آنے والے تھے۔ وہ زندگی میں اس سے زیادہ خوب صورت جگہوں پر اس سے زیادہ سہولت کے ساتھ جاتے' تب بھی زندگی کے ان دنوں کو واپس نہیں لاسکتے تھے۔ جب ان دونوں کے درمیان رشتہ نیا تھا لیکن تعلق پرانا' جب ایک دوسرے پر اعتماد زیادہ نہیں تھا' لیکن توقعات اور امیدیں بہت تھیں اور جب ان دونوں کے درمیان ابھی شکایتوں اور تلخیوں کی دیواریں کھڑی نہیں ہوئی تھیں' زندگی ایک دوسرے سے شروع ہو کر ایک دوسرے پر ہی ختم ہو رہی تھی۔
سالار کا فون انٹرنیشنل رومنگ پر تھا' لیکن دن کا زیادہ وقت وہ آف رہتا تھا۔ بینک اور اس سے متعلقہ کاموں کو

پندرہ دنوں کے لیے اس نے اپنی زندگی سے نکال دیا تھا اور ایک سیل کے آف رہنے سے ان کی زندگی میں حیران کن تبدیلی آئی تھی۔ ان کے پاس ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے بہت زیادہ وقت تھا اور اس وقت میں سیل فون مداخلت نہیں کر پا رہا تھا۔
ایک دوسرے سے کہی جانے والی ساری باتیں بے معنی تھیں' ساری باتیں بے مقصد تھیں اور ساری باتیں "ضروری" تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو اپنے بچپن' اپنے ماضی کے سارے قصے' ساری خوشگوار باتیں بتاتے رہے تھے جو ایسے ہی ٹرپس اور resorts سے جڑی ہوئی تھیں۔
سمندر کے پانی کے اس جھیل نما حصے پر بنے بہت سے رانچز میں سے ایک پر بیٹھے' شفاف پانی میں نظر آتی مختلف قسم کی آبی مخلوق کو دیکھتے اور ایک دوسرے کو دکھاتے انہیں پتا نہیں کیا کیا یاد آتا رہتا' پھر انہیں ہنسی کے دورے پڑتے۔ بے وجہ ہنسی جس کا تعلق کسی چیز سے نہیں' صرف اس ذہنی کیفیت سے تھا جس میں وہ ان دنوں تھے۔

سالار بھماس پہلے بھی دوبارہ آچکا تھا اور اس کے لیے وہ جگہ نئی نہیں تھی۔ وہ اسے لے کر ان تمام جگہوں پر جا رہا تھا' جو سی فوڈز کے لیے مشہور تھیں اور امامہ کو پہلی بار اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے کس حد تک سی فوڈ پسند ہے۔ خود اس نے سالار کے اصرار اور دباؤ کے باوجود مچھلی کے علاوہ کسی دوسری چیز کو چکھنے تک کی ہمت نہیں کی تھی۔
"ہم اپنے گھر میں اس طرح کا ایک رانچ بھی بنوائیں گے۔"
وہ اس صبح پھر لکڑی کے تختے پر آکر پانی میں ٹانگیں ڈبوئے بیٹھے تھے' جب امامہ نے کہا۔
سالار نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ اسے مذاق سمجھا تھا لیکن وہ بے حد سنجیدہ' جھکی ہوئی پانی کو مٹھی میں لیے اچھال رہی تھی۔
"کس پر بنائیں گے؟" سالار نے جیسے اسے کچھ یاد دلانے کی کوشش کی۔
"جھیل پر۔" وہاں بلا کی سنجیدگی تھی۔
"اور جھیل کہاں سے آئے گی؟" وہ ہکا بکا تھا۔
"وہ تم بناؤ گے نا۔" وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔
"اور اس جھیل میں پانی کہاں سے آئے گا؟"
امامہ نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔
"نہر کے ذریعے۔" وہ ہنس پڑا لیکن امامہ نہیں ہنسی۔

"پانی کی نہر نکالنا دودھ کی نہر سے زیادہ مشکل ہے' سویٹ ہارٹ!"
اس نے امامہ کے کندھوں پر بازو پھیلایا۔ امامہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔
"تم نہیں بنا کرو گے؟" وہ سوال نہیں تھا' دھمکی تھی۔
"ہم یہاں آجایا کریں گے' بلکہ اگلے سال میں تمہیں ماریشس لے کر جاؤں گا' پھر اس سے اگلے سال مالدیپ۔"
امامہ نے اس کی بات کاٹی۔
"تم نہیں بنا کرو گے جھیل؟"
"امامہ! جھیل کیسے بنا کروں میں تمہیں ۔۔۔؟ ہاں' یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کسی ایسی جگہ پر گھر بنائیں جہاں قدرتی طور پر آس پاس اس طرح پانی ہو۔" سالار نے اسے ٹالنے کی کوشش کی تھی۔
فی الحال وہ اسے صاف لفظوں میں اس رانچ پر بیٹھ کر اپنے ہنی مون ٹرپ کے دوران اور غیر ردمانوی باتوں کے درمیان یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ عقل سے پیدل ہے اور جاگتے میں خواب دیکھ رہی ہے اور وہ بھی احمقانہ۔
"ہاں' یہ ٹھیک ہے۔" اس پر بروقت اثر ہوا تھا اور سالار نے جیسے اطمینان کا سانس لیا۔
"سالار' تم بہت اچھے ہو۔" امامہ نے اب اس کا ہاتھ پیار سے پکڑتے ہوئے کہا۔
"امامہ! یہ بلیک میلنگ ہے۔" سالار نے ہاتھ چھڑائے بغیر گہرا سانس لے کر احتجاج کیا۔ وہ اس کے جھوٹ کو اس کے گلے کی ہڈی بنا رہی تھی۔
"ہاں! ہے تو۔" اس نے بڑے آرام سے کندھے اچکا کر ہنستے ہوئے کہا۔
وہاں باقی دن امامہ نے اس رانچ کا دوبارہ ذکر نہیں کیا تھا اور سالار نے اس پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ اسے امید تھی وہ اس رانچ کے بارے میں بھول گئی ہوگی لیکن ایسا نہیں تھا۔
واپس آنے کے چوتھے دن بعد اس نے فخریہ انداز میں سالار کو اس گھر کے نئے ڈیزائنز دکھائے تھے۔ وہ جھیل اور رانچ بھی اس کا حصہ بن چکے تھے۔ وہ اب اس پر کیا کہہ سکتا تھا۔ وہ ہنی مون اسے بہت مہنگا پڑا تھا۔ وہ دنیا کی پہلی بیوی تھی جس نے اپنے ہنی مون ٹرپ پر ایک جھیل اور رانچ کی شاپنگ کی تھی۔ اور وہ دنیا کا پہلا شوہر تھا جس نے اس شاپنگ پر اعتراض نہیں کیا تھا۔
ان کے اپارٹمنٹ کی دیوار پر اب کچھ اور تصویروں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ کچھ اور یادوں اور خوشگوار لمحوں کا۔۔۔ ان کے ولیمہ کا فوٹو شوٹ۔ پیچ کلر کے شرارے میں بلیک ڈنر سوٹ میں ملبوس سالار کے ساتھ وہ پہلی بار دلہن کے روپ میں تھی۔۔۔ وہ سالار کی فیورٹ تصویر تھی۔ اور ان کے ہنی مون کی تصویریں جس میں تقریباً" ایک جیسی سفید ٹی شرٹس میں' وہ ایک بیچ پر کھڑے نظر آرہے تھے۔ ان ساری تصویروں میں صرف ایک چیز کامن تھی" ان کے چہرے اور آنکھوں میں نظر آنے والی خوشی اور چمک' ان کے ہونٹوں پر موجود وہ مسکراہٹ' جو ان تصویروں پر نظر ڈالنے والی کسی بھی پہلی نظر کو ایک لمحہ کے لیے مسکرانے پر مجبور کر دیتی تھی۔

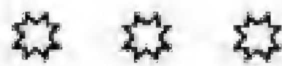
They were made for each other

(وہ ایک دوسرے کے لیے بنے تھے۔)
کم از کم وہ تصویریں ہر لحاظ سے یہ ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

زندگی آہستہ آہستہ اپنے معمول پر آرہی تھی۔ سالار واپس آنے کے بعد مصروف ہو گیا۔ وہ بینک سے تقریباً" دس بجے گھر آرہا تھا اور پہلے کی طرح گھر سے کافی کے لیے باہر نکلنے کا سلسلہ کچھ عرصے کے لیے منقطع ہو گیا تھا۔ ان کے درمیان بات چیت صبح ناشتے کی میز پر ہو رہی تھی یا رات کے کھانے کی میز پر۔ سالار کے اصرار کے باوجود وہ کھانے پر اس کا انتظار کیا کرتی تھی۔ اسے کھانے سے زیادہ اس کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے ان باتوں میں دلچسپی تھی، جو وہ اس کے ساتھ کیا کرتی تھی اور سالار کو بہت جلد اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے بالآخر اسے اکیلے کھانا کھا لینے پر مجبور کرنا چھوڑ دیا تھا۔

وہ نوشین کے ساتھ اب وقتاً" فوقتاً" گھر سے نکلنے لگی تھی۔ اس کی زندگی کا دائرہ اب گھر سے باہر تک بڑھنے لگا تھا اور سالار اس چیز کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ وہ واقعی چاہتا تھا کہ وہ اس کی انگلی پکڑ کر چلنا چھوڑ دے اور یہ تب ہی ممکن تھا اگر اسے اس کے علاوہ پکڑنے کے لیے کچھ اور ہاتھ نظر آتے۔



وہ اس دن چینل سرفنگ کر رہی تھی، جب اس کی نظریں ایک چینل پر ٹھہر سی گئیں۔ چند لمحوں کے لیے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ اسٹاک مارکیٹ کے حوالے سے کوئی پروگرام تھا اور اس میں شامل دو شرکا میں سے ایک سالار بھی تھا۔ ایک لمحہ کے لیے امامہ کو یقین نہیں آیا تھا کہ وہ اسکرین پر سالار کو دیکھ رہی ہے لیکن چند لمحوں کے بعد سالار کا نام اور اس کا عہدہ اسکرین پر چند لمحوں کے لیے فلیش ہوا۔

"تو وہ مجھ سے جھوٹ بول رہا تھا۔۔۔؟" امامہ نے اس کا عہدہ دیکھ کر سوچا۔ وہ پی آر سے منسلک نہیں تھا، لیکن اس وقت اسے اسکرین پر دیکھتے ہوئے وہ اتنی ایکسائیٹڈ تھی کہ اس نے سالار کے جھوٹ اور اس کی وجوہات پر غور ہی نہیں کیا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے فنانس سے متعلق کوئی پروگرام اتنے شوق اور لگن سے دیکھا تھا۔ وہ سالار کو اکثر اسی طرح کی گفتگو فون پر کرتے سن چکی تھی اور اس نے کبھی اس پر غور بھی نہیں کیا تھا، لیکن اسکرین پر آدھا گھنٹہ اس پروگرام میں اسے سنتے اور دیکھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ بہت امپریسیو تھا۔ کمپوزڈ۔۔۔ کانفیڈنٹ۔۔۔ بے حد شارپ ایک مکمل پروفیشنل۔۔۔ وہ زندگی میں پہلی بار اس کی شکل و صورت اور پرسنالٹی پر غور کر رہی تھی، اور پہلی بار ہی اسے احساس ہوا کہ اس کی آواز بہت اچھی ہے۔ شادی کے تقریباً" دو مہینے کے بعد پہلی بار ٹی وی پر اپنے شوہر کو دیکھتے ہوئے وہ اس سے بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔

سالار کسی پوسٹ لنچ میٹنگ میں تھا، جب امامہ نے اسے فون کیا۔ میٹنگ تقریباً" ختم ہو رہی تھی، اس لیے وہ کال لیتے ہوئے بورڈ روم سے نکل گیا۔

"سالار! تم ٹی وی پر آئے ہو؟" امامہ نے چھوٹتے ہی اس سے کہا۔

ایک لمحے کے لیے سالار سمجھ نہیں سکا۔

"کیا؟"

"تم ٹی وی چینل پر آئے تھے ایک پروگرام میں اور تم نے مجھے بتایا نہیں؟"

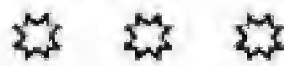
"وہ دو ماہ پہلے ریکارڈ کیا تھا انہوں نے، ریپیٹ کیا ہو گا۔" سالار کو یاد آگیا۔

"تم کیا کر رہی ہو؟" اس نے موضوع بدلا، لیکن امامہ کس حد تک اس پروگرام سے متاثر تھی، اس کا اندازہ اسے رات کو گھر آکر ہوا تھا۔

"میں نے اسے ریکارڈ کر لیا ہے۔" وہ کھانا کھا رہے تھے جب امامہ نے اچانک اسے بتایا۔

"کسے؟" وہ چونکا کیونکہ وہ کوئی اور بات کر رہے تھے۔
"تمہارے اس پروگرام کو۔"
"اس میں ریکارڈ کرنے والی کیا بات تھی؟" وہ حیران ہوا۔
"تم ٹی وی پر بہت اچھے لگ رہے تھے۔" امامہ نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے کہا۔
"اور تم انویسٹمنٹ بینکنگ میں ہو۔۔۔ پی آر میں نہیں؟" امامہ نے اسے جتایا۔
وہ مسکرایا لیکن اس نے جواباً اسے کچھ نہیں کہا۔
"تم نے دیکھا ہے اپنا پروگرام؟"
سالار نے کانٹا ہاتھ سے رکھتے ہوئے اس سے کہا۔
"سویٹ ہارٹ! ایسے بہت سارے پروگرامز ہوتے ہیں جن میں ہر روز بہت سارے ایکسپرٹس بلائے جاتے ہیں۔ اس میں کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے کہ اسے ریکارڈ کر کے بیوی کے ساتھ بیٹھ کر دیکھا جائے۔ اس سے پہلے بھی میں ایسے کئی پروگرامز میں آچکا ہوں اور آئندہ بھی کہیں نہ کہیں نظر آتا رہوں گا۔ میرے بینک کی اس سیٹ پر جو بھی بیٹھا ہو گا وہ تمہیں بزنس چینلز یا ایسے پروگرامز میں کہیں نہ کہیں ضرور نظر آئے گا۔ یہ بھی میری جاب کا ایک حصہ ہے۔"
وہ اس کا ہاتھ تھپک کر اب دوبارہ کانٹا اٹھا رہا تھا۔ امامہ چند لمحے کچھ نہیں بول سکی۔ اس نے جیسے ٹھنڈے پانی کا بھرا ہوا گلاس اس پر انڈیلا تھا۔ اس نے اسے کچھ ایسے ہی شرمندہ کیا تھا۔
"سالار! سود حرام ہے نا؟"
وہ خود سمجھ نہیں پائی کہ اس نے سالار کی بات کے جواب میں یہ کیوں کہا۔ شاید یہ اس شرمندگی کا ردعمل تھا، جو اس نے کچھ دیر پہلے اٹھائی تھی۔
"ہاں۔" وہ کانٹے سے کباب کا ایک ٹکڑا اٹھاتے ہوئے، صرف ایک لمحہ کے لیے ٹھٹکا تھا۔
"بالکل اسی طرح، جس طرح جھوٹ حرام ہے۔۔۔ غصہ حرام ہے۔۔۔ غیبت حرام ہے۔۔۔ بددیانتی حرام ہے۔۔۔ منافقت حرام ہے۔۔۔ تہمت لگانا حرام ہے۔۔۔ ملاوٹ حرام ہے۔" وہ اطمینان سے کہہ رہا تھا۔
"میں ان چیزوں کی بات نہیں کر رہی۔" امامہ نے اس کی بات کاٹی۔ اس نے جواباً امامہ کی بات کاٹی۔
"کیوں۔۔۔ ؟ کیا ان ساری چیزوں سے انسان اور معاشرے کو کم نقصان پہنچتا ہے؟"
امامہ کو جواب نہیں سوجھا۔
وہ صرف ٹی وی کے پروگرام میں بیٹھا ایسی گفتگو کرتا امپریسو لگ رہا تھا، حقیقی زندگی میں اس طرح لاجواب ہونا کچھ زیادہ خوش گوار تجربہ نہیں تھا امامہ کے لیے۔
"تم جسٹی فائی کر رہے ہو سود کو۔۔۔ ؟" اس نے بالآخر کہا۔
"نہیں میں جسٹی فائی نہیں کر رہا۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ہم "جز" کو "کل" سے الگ نہیں کر سکتے۔ اسلامی معاشرے کو سود اتنا نقصان نہیں پہنچا رہا جتنا دوسری خرابیاں۔" وہ اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔
"میں اگر پاکستانی معاشرے میں پائی جانے والی پانچ خرابیاں بتاؤں اور کہوں کہ ان میں سے کوئی ایک ختم کر دو، جس سے معاشرہ بہتر ہو جائے۔ کرپشن کو۔۔۔ ؟ غربت کو۔۔۔ ؟ ناانصافی کو۔۔۔ ؟ بددیانتی کو۔۔۔ ؟ یا سود کو۔۔۔ ؟ میں شرط لگاتا ہوں امامہ! کہ یہ پانچواں آپشن کبھی بھی کسی کی پہلی ترجیح نہیں ہو گا۔"
وہ چیلنج کر رہا تھا اور یہ چیلنج جیت بھی سکتا تھا کیونکہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ بھی پہلی چار میں سے ہی کسی ایک

خرابی کو ختم کرنا چاہے گی' امامہ نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔
"اور سود صرف بینکنگ میں تو نہیں ہے۔ کوئی یوٹیلیٹی بل لیٹ ہوتا ہے تو اس پر سرچارج لگ جاتا ہے' اسکول کالج کی فیس لیٹ ہو جاتی ہے تو فائن لگ جاتا ہے۔ یہ بھی تو سود کی قسمیں ہیں۔"
اس کے پاس اس کی توجیہات کا کوئی جواب نہیں تھا۔
"تو تم بینکنگ میں اس لیے ہو کیونکہ تم سود کو دوسری برائیوں جیسی ایک عام برائی سمجھتے ہو؟" امامہ نے بحث سمیٹنے کی کوشش کی۔
"نہیں' میں اسے بہت بڑی لعنت سمجھتا ہوں تو پھر میری سوچ سے کیا تبدیلی آئے گی؟ یہ سوچ لے کر ساری دنیا کے مسلمان بینک میں کام کرنا بند کر دیں۔۔۔؟ اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے لیے راستے کھلے چھوڑ دیں کہ وہ آئیں اور ٹیک اوور کر لیں۔ ہماری اکانومی کو اپنی مٹھی میں لے لیں۔ جب چاہیں' جیسے چاہیں' ہمارا گلا دبا دیں۔ پاور اس کی جس کے پاس کیپٹل۔ یہ جو فنانشل سسٹم پوری دنیا میں چل رہا ہے' ویسٹ کا قائم کردہ ہے' دوسرے مذاہب کے لوگوں کا ہے' انہوں نے اسے بنایا' پاپولرائز کیا اور پوری دنیا میں پھیلا دیا۔ ہم کہاں سو رہے تھے اس وقت' ہمیں اتنی ٹھوکر کھائی تھی تو پھر دو تین سو سال پہلے کھاتے۔ سود سے پاک ایک متوازی سسٹم بناتے اور چلاتے اس کو' نہ کرتے ویسٹ کی تقلید یا پھر اب کوشش کریں اس سب کو تبدیل کرنے کی' لیکن اس کے لیے بینکوں میں کام کرنا پڑے گا۔ دنیا میں آج تک جو بھی جنگ جیتی گئی ہے' وہ اس نے جیتی ہے جو میدان میں تلوار لے کر اترا ہے۔
میدان سے باہر کھڑے لوگوں نے بڑی سے بڑی گالیاں بھی دی ہوں تو بھی' جنگ ملامتوں اور مذمتوں سے کبھی نہیں جیتی جاتی تو میں اپنی مہارت سے تلوار کا کام لینا چاہوں گا' میری زبان شاید اتنی موثر نہ ہو۔"
امامہ الجھی نظروں سے اسے دیکھتی رہی' سود کے بارے میں یہ ان کی پہلی بحث تھی۔



رمضان میں اور اس کے فوراً" بعد امامہ کو کھانا پکانے کا کوئی خاص اتفاق نہیں ہوا تھا' لیکن اب وہ اس کے لیے باقاعدہ طور پر گھر کا کھانا بنانے لگی تھی۔ وہ سی فوڈ کے علاوہ کسی خاص کھانے کا شوقین نہیں تھا۔ سی فوڈ کو شدید ناپسند کرنے کے باوجود وہ بادل نخواستہ اس کے لیے ہفتے میں ایک' دو بار ڈبوں میں بند سی فوڈ کے بجائے' بازار سے تازہ سی فوڈ لا کر پکانے لگی تھی۔
صرف پہلی بار ان تازہ پرانز' کریبس اور لوبسٹرز کو پکانے کے لیے صاف کرتے ہوئے اسے اتنی شدید کراہت محسوس ہوئی تھی کہ اسے رونا آگیا تھا۔ اتوار کا دن تھا اور وہ لنچ کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ سٹنگ ایریا میں ٹی وی دیکھتے اور کسی دوست سے فون پر بات کرتے ہوئے سالار کو وہم سا ہوا تھا کہ وہ سنک کے سامنے کھڑی رو رہی ہے اور یہ وہم اس لیے ہوا کیونکہ اس کال کے آنے سے پہلے' وہ دونوں آپس میں بے حد خوشگوار انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ وہاں رونے والی کوئی بات نہیں ہوئی تو پھر؟
ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی آف کرتے اور دوست کو خدا حافظ کہتے ہوئے وہ صوفے سے اٹھ کر کچن میں آگیا تھا۔ سنک کے سامنے کھڑی وہ صرف رو نہیں رہی تھی بلکہ زار و قطار رو رہی تھی۔ سالار کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔
"کیا ہوا؟"
سنک میں رکھے برتن سے لوبسٹر زدھو دھو کر شیلف پر رکھے ایک دوسرے برتن میں رکھتے ہوئے اس نے

سالار کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ نفی میں سر ہلا کر وہ اسی طرح اپنے دونوں کاموں میں مصروف رہی۔ سالار نے ہاتھ بڑھا کر سنک کا نل بند کر دیا۔

"کیوں رو رہی ہو تم؟" وہ واقعی سمجھنے سے قاصر تھا۔ "امامہ..."

"اپنے ماں باپ کے گھر میں نے ان چیزوں کو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا جنہیں اب مجھے دھونا پڑ رہا ہے۔" پانی دوبارہ کھولتے ہوئے اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس کے گھر میں بھی سی فوڈ اتنے ہی شوق سے کھائے جاتے تھے لیکن وہ ان سے شدید قسم کی کراہت رکھتی تھی اور ان چیزوں کے پاس بھی نہیں پھٹکتی تھی' نہ ہی کوئی اس سے کہتا تھا۔ معلوم نہیں انسان کو ماں باپ کا گھر کیوں ہر بات پر یاد آتا ہے۔

سالار کو کچھ دیر سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیا کہے۔

"میں نے تمہیں کب کہا ہے کہ تم مجھے یہ بنا کر دو۔"

"تم نے خود کہا تھا کہ میں تمہیں سی فوڈ لا کر دوں گا اور تم آج یہ بنانا۔"

سالار نے پھر کچھ خفگی سے پانی بند کیا۔

"چھوڑ دو' مت بناؤ۔" اس نے سختی سے کہتے ہوئے وہ برتن سنک سے اٹھا کر شیلف پر رکھ دیا۔

"یہ بات نہیں ہے۔ میں سوچ رہی تھی جب شوہر کو بنا کر کھلا سکتی... تو ماں باپ کو بھی بنا کر کھلا دیتی۔" اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

کیا رنج تھا' کیا پچھتاوا تھا' وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

اس کے منع کرنے کے باوجود' اس نے اس دن سی فوڈ ہی تیار کیا تھا۔ لیکن اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر سالار کو اس قدر احساس جرم ہوا تھا کہ وہ ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھا سکا۔

"میں آہستہ آہستہ یہ سی فوڈ کھانا چھوڑ دوں گا' تمہیں دوبارہ یہ گھر پر نہیں بنانا پڑے گا۔"

اس نے کھانے کے دوران اسی احساس جرم کے ساتھ کہا تھا۔

"نہیں' تمہیں پسند ہے تو کیوں چھوڑو گے؟ پتا نہیں مجھے ایسے ہی خیال آگیا تو... آہستہ آہستہ میری ناپسندیدگی کم ہو جائے گی۔" وہ اب اس ساری صورت حال پر کچھ شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

"میں..."

امامہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "رہنے دو بس... اگر کچھ چھوڑنا ہے تو یہ جو تم انرجی ڈرنکس وغیرہ پیتے رہتے ہو انہیں چھوڑ دو۔ میں تمہیں کچھ فریش جوس وغیرہ بنا دیا کروں گی۔"

وہ ہنس پڑا تھا۔ وہ ان ڈرنکس کا واقعی بہت زیادہ عادی تھا اور اس کی بنیادی وجہ اس کا لائف اسٹائل اور پروفیشن تھا۔ ان انرجی ڈرنکس کے سہارے وہ ساری ساری رات بے حد آرام سے کام کرتا رہتا تھا اور فی الحال اس عادت نے اس کی صحت پر کسی قسم کے مضر اثرات نہیں ڈالے تھے۔ سی فوڈ کی نسبت انہیں چھوڑنا زیادہ مشکل تھا۔

اسے کھانے میں کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی' نہ کبھی اس کی یہ خواہش رہی تھی کہ کوئی اس کے لیے کھانے کے لوازمات کا اہتمام کرے یا اسے پیش کرتا پھرے' لیکن اسے اندازہ بھی نہیں ہو پا رہا تھا کہ کتنے غیر محسوس انداز میں وہ امامہ کے ہاتھ کے کھانے کا عادی ہونے لگا تھا۔ امامہ اس کے رات کو بہت دیر سے گھر آنے پر بھی اسے تازہ چپاتی بنا کر دینے کی عادی ہو گئی تھی' اور سالار نے زندگی میں کبھی کہیں ایسی چپاتی نہیں کھائی تھی۔ کسی کے گھر پر بھی نہیں' نرم' خوشبودار' ذائقہ دار اور تازہ۔ کسی بھی ڈنر ٹیبل پر ———— چپاتی کا پہلا لقمہ منہ

میں ڈالتے ہی اسے امامہ یاد آتی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی چپاتی کسی سالن چٹنی یا سلاد کے بغیر بھی بڑی خوشی کے ساتھ کھا سکتا تھا۔

وہ ناشتے میں دو سلائس ایک انڈا کھا کر اور چائے کافی کے ایک کپ کے ساتھ بھاگ جانے والا آدمی تھا اور اب زندگی میں پہلی دفعہ ناشتے کا کوئی "مینیو" ہونے لگا تھا انڈا تلے ہوئے یا ابلے ہوئے کے بجائے مختلف قسم کے آملیٹ کی شکل میں ملنے لگا تھا۔ بعض دفعہ پراٹھا ہوتا۔ ڈبے کے جوس کی جگہ تازہ جوس کے گلاس نے لے لی تھی۔ لنچ کے لیے گھر کے بنے ہوئے سینڈوچز اور سلاد ہوتے۔ وہ آفس میں سب کی طرح ایک فاسٹ فوڈ سے آنے والے لنچ پیک کا عادی تھا اور وہ اس کے ساتھ "کمفرٹیبل" تھا۔

شروع شروع میں وہ امامہ کے اصرار پر کچھ بے دلی سے اس لنچ پیک کو گھر سے لاتا تھا جو امامہ اس کے لیے تیار کرتی تھی مگر آہستہ آہستہ اس کی ناخوشی ختم ہونے لگی تھی۔ وہ "گھر کا کھانا" تھا بے حد "ویلیوایبل" تھا۔ کیونکہ اسے بنانے کے لیے صبح سویرے اٹھ کر اس کی بیوی اپنا کچھ وقت صرف کرتی تھی۔ "بھوک" وہ بازار سے خریدے گئے چند لقموں سے بھی مٹا لیتا لیکن وہ لقمے اس کے دل میں گھر میں بیٹھی ایک عورت کے لیے شکر کا احساس پیدا نہ کرتے جسے وہ ہر روز اس وقت محسوس کرتا جب بینک کے کچن سے کوئی اس کے لنچ کو گرم کر کے اس کے ٹیبل پر لا کر رکھتا تھا۔

وہ پانی کے اس گلاس کا بھی اسی طرح عادی ہونے لگا تھا جو وہ ہر روز اس کے گھر میں داخل ہونے پر اسے لا کر دیتی تھی۔ کافی یا چائے کے اس کپ کا بھی جو وہ دونوں رات کے کھانے کے بعد ٹیرس پر بیٹھ کر پیتے تھے اور گرم دودھ کے اس گلاس کا بھی جو وہ رات کو سونے سے پہلے اسے دیا کرتی تھی اور جسے وہ شروع میں ناگواری سے گھورا کرتا تھا۔

"میں دودھ نہیں پیتا۔" جب اس نے پہلی بار گرم دودھ کا گلاس اسے دیا تو اس نے بے حد شائستگی سے بتایا تھا۔

"کیوں؟" جواباً اس نے اتنی حیرت کا اظہار کیا تھا کہ وہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا تھا۔

"مجھے پسند نہیں ہے۔"

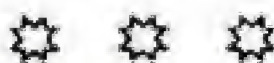
"مجھے تو بڑا پسند ہے تمہیں کیوں نہیں پسند؟"

"مجھے اس کا ذائقہ اچھا نہیں لگتا۔" وہ ایک لمحہ کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔

"تو میں اس میں اوولٹین ڈال دوں۔۔۔" سالار نے اس کے جواب کو مکمل ہونے سے پہلے ہی گلاس اٹھا کر پی لیا تھا۔ وہ زہر پی سکتا تھا لیکن اوولٹین نہیں اور یہ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دودھ پیتی ہے اس لیے اسے بھی دودھ پینا تھا۔ دودھ کے فوائد سے بہر حال اسے دلچسپی نہیں تھی۔

اس کے اپنے گھر میں مردوں کا جس طرح خیال رکھا جاتا تھا وہ بھی اس کا اسی طرح خیال رکھ رہی تھی۔

یہ "عادتاً" تھا "خصوصاً" نہیں اور اسے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ "خیال" کہیں "رجسٹر" ہو رہا تھا۔۔۔ ہر عورت کی طرح وہ بھی یہ سمجھتی تھی کہ اس کے ان تمام کاموں کو حق سمجھ کر لیا جا رہا ہے کیونکہ ہر مرد کی طرح سالار بھی تعریف نہیں کر پا رہا تھا ہر مرد کی طرح اس کے لیے بھی آئی لو یو کہنا آسان تھا بجائے یہ کہنے کے کہ جو تم میرے لیے کرتی ہو اس کی مجھے بہت قدر ہے اور ہر مرد کی طرح وہ بھی اس احساس تشکر کو تحائف اور پیسے سے ریپلیس کر رہا تھا۔



امامہ کے لیے زندگی بدل گئی تھی۔۔۔ بدل گئی تھی یا بہت عرصے کے بعد پھر شروع ہوئی تھی؟ مارکیٹوں میں سالار یا نوشین کے ساتھ پھرتے' چیزوں کو دیکھتے' وہ عجیب سے احساسات کا شکار ہوتی رہتی۔ یہ احساس کہ وہ جن چیزوں کو دیکھ رہی ہے' وہ انہیں اب خریدنے کے قابل ہے اور یہ احساس کہ اب ایک ایسی جگہ ہے جہاں وہ ان چیزوں کو اپنے لیے رکھ سکتی تھی۔ وہ ڈاکٹر سبط علی کا گھر نہیں تھا' ہاسٹل نہیں تھا' نہ ہی سعیدہ اماں کا گھر تھا' یہ اس کا اپنا گھر تھا۔ تشکر' خوشی' آسودگی اور پھر بے یقینی اور حیرانی۔ نو سال کی مشقت کے بعد جو ملا تھا' وہ اس کی اوقات سے بہت زیادہ تھا اور یہ سب ہر کسی کو کہاں ملتا تھا۔ نو سال بے نام' بے خاندان رہنے کے بعد اب جب کہ وہ ایک خاندان کا حصہ بنی تھی تو حیرانی کیسے نہ ہوتی۔۔۔؟ خواری اور بے سروسامانی کا سفر جہاں جاکر ختم ہوا تھا' وہ نعمتوں کی معراج تھی۔ اپنے گھر سے نکلنے کے بعد اس نے اتنے عرصے میں صرف ایک چیز سیکھی تھی۔ اپنے نفس پر قابو پانا' اپنی خواہشات اور ضروریات کو کم سے کم کرنا' قناعت کرنا اور یہ بڑا مشکل تھا۔ وہ آسائشوں سے نکل کر آئی تھی۔ ریت کا ذرہ اسے تھور کے کانٹے کی طرح چبھتا تھا۔ پیسوں کو گن کر خرچ کرنا اور پھر بچانے کی کوشش کرنا' وہ کہاں عادی تھی ان چیزوں کی' لیکن وقت اور حالات نے اسے عادی بنا دیا تھا اور اب جب اتنے سالوں کے بعد اسے آسائش ملی تو ناممکن تھا کہ اسے بات بات پر وہ نو سال یاد نہ آتے۔ وہ ضرورت پڑنے پر سالار کی دراز میں پڑے پیسوں کو نکالتے ہوئے ٹھٹک جایا کرتی تھی' جن کو کمانے میں اس کی محنت شامل تھی' نہ ہی ان کی بچت میں اس کا کوئی حصہ تھا۔ اسے صحیح اندازہ نہیں تھا کہ دراز میں کتنی رقم موجود ہے' کیونکہ وہ انہیں کبھی گن نہیں پائی تھی۔ وہ ہر روز اس دراز میں کچھ رقم کا اضافہ کرنے کا عادی تھا۔ اگر وہ اس دراز کو پورے کا پورا بھی خالی کر دیتی' تب بھی اگلے دن وہ خالی نہیں ہوتا تھا۔ اس روپے کو خرچ کرنا اس کا ''استحقاق'' تھا اور اس رقم کے خرچ ہونے پر سالار نے کبھی اس سے سوال نہیں کیا تھا۔ وہ اس گھر کے سیاہ و سفید کی مالک تھی۔

وہ چیزوں کو پرائس ٹیگ دیکھ کر خریدا کرتی تھی' اپنی خواہش دیکھ کر نہیں' اور اب یک دم پرائس ٹیگ دیکھ کر خریداری کرنا اس کے لائف اسٹائل کا حصہ نہیں رہا تھا۔ سالار زندگی میں خود بھی کبھی بارگیننگ یا سستی چیزوں کے استعمال کا عادی نہیں رہا تھا اور وہ اتنا ہی فیاض اس کے معاملے میں بھی تھا۔ ناممکن تھا کہ اسے جو چیز اچھی لگتی وہ اسے نہ لے کر دیتا اور یہ صرف بازار میں نظر آنے والی چیزوں تک ہی محدود نہیں تھا' بلکہ اسے کسی میگزین یا ٹی وی پر بھی کوئی چیز اچھی لگ جاتی اور وہ سالار سے اس کا ذکر کرتی تو وہ چیز اگلے چند دنوں میں اس کے گھر پر ہوتی تھی اور وہ کس قیمت پر آئی تھی' سالار کو پروا نہیں ہوتی تھی۔ وہ رات کے تین بجے بھی اگر کسی چیز کے کھانے کی فرمائش کرتی تو وہ اسے لے جایا کرتا تھا۔

''میرا دل چاہ رہا ہے۔۔۔''

وہ اب اس جملے کو بولنے کی عادی ہو رہی تھی' کیونکہ کوئی تھا جو آدھی رات کو بھی آئس کریم کے دو اسکوپس' چاٹ کی ایک پلیٹ' پزا کے ایک سلائس' کافی کے ایک کپ' ہاٹ اینڈ سار کی خواہش ہونے پر اسے ملامت یا صبر کی تلقین کرنے کے بجائے' اسے ساتھ لیے مطلوبہ چیز کی تلاش میں' ایک بھی شکایتی لفظ کہے بغیر خالی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا پھرتا تھا۔

شادی کے اس مختصر عرصے میں بھی لاہور کی کوئی ایسی جگہ نہیں تھی' جہاں کھانے کی کسی مشہور چیز کا اس نے سنا ہو اور سالار اسے وہاں نہ لے گیا ہو۔ گوالمنڈی میں فجر کے بعد حلوہ پوری کے ستے ناشتے سے لے کر پی سی کے چوبیس گھنٹے کھلے رہنے والے کیفے میں رات کے پچھلے پہر کھائے جانے والے لیمن ٹارٹس تک جن کو کھاتے ہوئے دیر ہو جانے پر اس نے دبئی کی وہ فلائٹ بھی مس کر دی تھی جو ایک گھنٹہ بعد تھی۔

یہ ناممکن تھا کہ ایسا شخص کسی کی دعاؤں کا حصہ نہ بنے۔ اسے بھی نماز کے بعد دعا کرتے ہوئے سالار کو یاد

نہیں کرنا پڑتا تھا' وہ اسے ہمیشہ خود بخود یاد آجاتا تھا۔ اس سے نکاح ہو جانے کے بعد پہلی نماز پڑھنے پر بھی' جب وہ ناخوش تھی اور اس سے رشتہ ختم کرنا چاہتی تھی اور ڈاکٹر سبط علی کے گھر پر اسے دیکھنے اور سننے کے بعد بھی' جب اس نے پہلی بار "اپنے شوہر" کے لیے اجر کی دعا کی تھی اور رخصتی کے بعد اس گھر میں پہلی نماز کے دوران بھی' جب اس نے سالار کے لیے اپنے دل میں محبت پیدا ہونے کی دعا کی تھی' وہ اسے یاد آتا تھا یا یاد رہتا تھا۔

دن کی کوئی نماز ایسی نہیں ہوتی تھی جب وہ سالار کے لیے اللہ سے نعمتوں اور اجر کی طالب نہیں ہوتی تھی' تب بھی جب وہ اس سے شاکی یا خفا ہوتی تھی۔ وہ اللہ کے بعد اس دنیا میں واقعی اس کا "آخری سہارا" تھا اور "سہارے" کا "مطلب" اور "اہمیت" کوئی امامہ سے پوچھتا۔



"آر یو شیور... تم اکیلے رہ لوگی؟" سالار اب بھی جیسے یقین دہانی چاہتا تھا۔

وہ دو ہفتوں کے لیے نیویارک اپنے بینک کی کسی ورکشاپ کے سلسلے میں جا رہا تھا اور امامہ اس بار اپارٹمنٹ میں ہی رہنا چاہتی تھی۔ عام طور پر سالار کراچی یا کہیں اور جاتے ہوئے اسے سعیدہ اماں یا ڈاکٹر سبط علی کے ہاں چھوڑ جایا کرتا تھا' لیکن اس بار وہ بضد تھی کہ وہ وہیں رہے گی۔ اس کا خیال تھا کہ اب وہ وہاں اکیلی رہ سکتی ہے۔

"میں رہ لوں گی... ویسے بھی فرقان بھائی اور بھابھی تو پاس ہی ہیں... کچھ نہیں ہوتا۔" اس نے سالار کو تسلی دی۔ اس کی فلائٹ صبح گیارہ بجے تھی اور وہ اس وقت پیکنگ سے فارغ ہوا تھا۔

"میرے بغیر رہ لوگی تم؟" اس نے امامہ کی بات سننے کے بعد کہا۔ وہ اب اپنے بریف کیس میں کچھ پیپرز رکھ رہا تھا۔

"ہاں... دو ہی ہفتوں کی تو بات ہے۔" امامہ نے بے حد اطمینان سے اسے کہا۔

"دو ہفتوں میں چودہ دن ہوتے ہیں۔" سالار نے بریف کیس بند کرتے ہوئے کہا۔

"تو کوئی بات نہیں گزر جائیں گے۔"

سالار نے گہرا سانس لیا۔ "ہاں تمہارے تو گزر جائیں گے۔ میرے نہیں گزریں گے' میں تو ابھی سے تمہیں مس کرنے لگا ہوں یار۔" وہ ہنس پڑی۔

"پہلے بھی تو جاتے ہو تم... دو ہفتے پہلے دبئی گئے تھے... پھر پچھلے مہینے سنگاپور..." اس نے تسلی دینے والے انداز میں اسے یاد دلایا۔

"دو دن کے لیے دبئی گیا تھا اور چار دن کے لیے سنگاپور... یہ تو دو ہفتے ہیں۔"

"ہاں تو دو ہفتے ہی ہیں نا' دو مہینے یا دو سال تو نہیں ہیں۔" اس نے کمال اطمینان کے ساتھ کہا۔

سالار اسے دیکھ کر رہ گیا۔

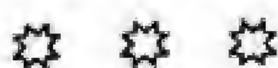
"چلو' اچھا ہے یہ بھی... نہ میں یاد آؤں گا نہ نظر آؤں گا۔ نہ میرا کوئی کام ہوگا' وقت ہی وقت ہوگا تمہارے پاس..." وہ نجانے اس سے کیا سننا چاہتا تھا۔

"ہاں" کافی وقت ہوگا' میں ایک دو پینٹنگز مکمل کروں گی۔ گھر کے کچھ اور کام ہیں' وہ بھی کروں گی۔ سعیدہ اماں کے بھی ایک دو کام ہیں' وہ بھی نمٹاؤں گی۔ میں نے بہت کچھ پلان کیا ہوا ہے۔"

اس نے ناول پکڑے اپنی جماہی روکنے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ ہنس پڑا تھا۔

"تمہارے لیے تو blessing in disguise ہو گیا ہے میرا ٹرپ' میں نے تو سوچا ہی نہیں تھا' میری وجہ سے تمہارے اتنے کام پینڈنگ ہو رہے ہیں۔"

اگر اس کے لہجے میں گلہ تھا تو امامہ نے نوٹس نہیں کیا۔
"چلو' یہ بھی اچھا ہے۔" وہ بڑبڑایا تھا۔
"ویزا لگا ہوتا تو میں تمہیں لے جاتا۔" اسے پھر کچھ خیال آیا تھا۔
"تم پریشان مت ہو میں یہاں پر بالکل ٹھیک رہوں گی۔" امامہ نے فوراً" سے پیشتر کہا۔
سالار جواب دینے کے بجائے چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔
"کیا دیکھ رہے ہو؟" امامہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔
"تمہارا اطمینان۔۔۔"
"میں فلمی ہیروئنز کی طرح ڈائیلاگ نہیں بول سکتی۔"
"صرف فلمی ہیروئنز ہی ڈائیلاگ بولتی ہیں؟"
"نہیں' ہیرو بھی بولتے ہیں۔" وہ اطمینان سے ہنسی۔ سالار مسکرایا تک نہیں تھا۔ وہ پھر سنجیدہ ہو گئی۔
"مت جاؤ پھر۔ ؟ اگر اتنا مس کر رہے ہو تو۔" اس نے جیسے اسے چیلنج کیا۔
"پیار سے کہتیں تو نہ جاتا' لیکن میں تمہارا کوئی چیلنج قبول نہیں کروں گا۔ مجھے تم سے ہارنا پسند ہے۔" وہ ہنسی۔
"تم بات بدل رہے ہو؟"
"نہیں' خود کو تسلی دے رہا ہوں۔ چلو آؤ! تمہیں کافی پلوا کر لاؤں۔"
وہ یک دم بستر سے اٹھتے ہوئے بولا۔
"اس وقت۔۔۔؟" رات کو اس وقت امامہ تیار نہیں تھی۔
"ہاں۔۔۔ اتنے دن تک تو نہیں پلوا سکوں گا کافی۔" وہ دراز سے والٹ اور کار کی چابیاں نکال رہا تھا۔
"لیکن اب میں پھر کپڑے بدلوں۔۔۔؟"
"مت بدلو' چادر لے لو۔۔۔ یہی ٹھیک ہے۔"
سالار نے اس کی بات کاٹی۔ وہ اب سیل فون اٹھا رہا تھا۔
فورٹریس سے کافی پینے کے بعد وہ اسٹیڈیم کے گرد بے مقصد ڈرائیو کرتا رہا۔
"اب گھر چلیں' تمہیں آرام کرنا چاہیے۔" امامہ کو اچانک خیال آیا۔
"میں پلین میں آرام کروں گا۔"
امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اتنا سنجیدہ اور کسی گہری سوچ میں کیوں ڈوبا ہوا تھا۔ واپس آتے ہوئے اس نے راستے میں ایک دکان سے بہت سا پھل خریدا۔
"تم یہاں نہیں ہو گے تو اتنا پھل خریدنے کی کیا ضرورت ہے؟" امامہ حیران ہوئی تھی۔
"تمہارے لیے خریدا ہے' شاید پھل کھاتے ہوئے ہی میں تمہیں یاد آجاؤں۔" اس نے مسکرا کر کہا تھا۔
"یہ پھل کھانے کے لیے شرط ہے۔" وہ بے اختیار ہنسی۔
"نہیں امید۔" امامہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔
واقعی اس کی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ دو ہفتے کا ٹرپ اتنا لمبا تو نہیں تھا کہ اس پر کسی قسم کی اداسی کا اظہار کیا جائے۔ کم از کم سالار سے وہ اس طرح کی جذباتیت کی توقع نہیں کر رہی تھی۔



اسے واقعی سالار کے جانے کے بعد پہلے دو دن کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ وہ معمول کے کام کرتی رہی۔ اس نے



نامکمل تصویروں پر کام شروع کیا اور ساتھ ہی ایک نیا ناول بھی شروع کردیا۔

سالار کی عدم موجودگی میں رات کا کھانا وہ فرقان کے ہاں کھایا کرتی تھی۔ دو دن تک تو وہ اطمینان سے ان کے ہاں کھانا کھانے اور کچھ دیر گپ شپ کرنے کے بعد گھر واپس آجاتی' پھر کوئی ناول نکال لیتی اور سونے تک پڑھتی رہتی' لیکن مسئلہ تیسری رات کو ہوا تھا۔ اس دن سالار نے اسے دن بھر کال نہیں کی تھی' اور اتنے مہینوں میں وہ پہلا دن تھا' جب ان کے درمیان کسی قسم کا رابطہ نہیں ہوا تھا۔ اس کی طرف سے نہ مسیج' نہ کال' اور نہ ہی کوئی ای میل آئی تھی۔ وہ پچھلی رات سے بہت مصروف تھا۔ اس نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ شاید اگلے چند دن وہ اس سے بات نہ کرسکے۔ نیویارک پہنچنے کے بعد سالار سے اس کی صرف پانچ منٹ کے لیے بات ہوئی تھی' لیکن پچھلے دو دن وہ وقفے وقفے سے مختصر ہی سہی' اس کو ای میلز بھیجتا رہا تھا اور اب وہ بھی یک دم آنا بند ہوگئی تھیں۔

وہ اس رات فرقان کے ہاں کھانے پر نہیں گئی' اس کی بھوک غائب ہوگئی تھی۔ اس نے اس دن کمپیوٹر مسلسل آن رکھا ہوا تھا' اس آس میں کہ شاید وہ اسے ای میل کرے' حالانکہ وہ ورکشاپ کے دوران اسے ای میل نہیں کرتا تھا۔

رات کو اس نے کافی کے لیے کریم نکالنے کے لیے فریج کھولا تو اس نے کیک کا وہ ٹکڑا دیکھا' جو دو دن پہلے وہ ایئرپورٹ جانے سے پہلے کھاتے کھاتے چھوڑ گیا تھا اور امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے کیک کا وہ بچا ہوا ٹکڑا فریج میں کیوں رکھ چھوڑا تھا۔ نہ صرف وہ ٹکڑا' بلکہ وہ کین بھی جس میں بچا ہوا جوس تھا۔ کچھ دیر وہ ان دونوں چیزوں کو دیکھتی رہی' پھر اس نے فریج بند کردیا۔

کافی بنا کر وہ ٹیرس پر نکل آئی تھی' جہاں وہ ویک اینڈز پر اکثر بیٹھا کرتے تھے۔

منڈیر سے نیچے جھانکتے ہوئے اس نے سرخ اینٹوں کی اس منڈیر پر دو مگز کے نشان دیکھے تھے۔ ایک ذرا گہرا' دوسرا بہت ہلکا۔ وہ رات کو اکثر یہاں کھڑے' نیچے دیکھتے ہوئے کئی بار یہیں پر اپنے مگز رکھ دیا کرتے تھے۔ نیچے بلڈنگ کے لان میں کچھ بچے اور لوگ چہل قدمی کررہے تھے۔

"تمہیں بچے اچھے لگتے ہیں؟" اس نے ایک دن وہاں کھڑے نیچے کھیلتے اور شور مچاتے ہوئے بچوں کو دیکھتے ہوئے سالار سے پوچھا تھا۔

"ہاں۔۔ لیکن اس طرح کے نہیں۔" اس نے جواباً" چائے پیتے ہوئے' اپنے کندھے اچکا کر مگ سے ان بچوں کی طرف اشارہ کیا۔

وہ ہنس پڑی۔ اس کا اشارہ شور کی طرف تھا۔

"مجھے تو ہر طرح کے بچے اچھے لگتے ہیں۔۔ شور کرنے والے بھی۔" اس نے نیچے جھانکتے ہوئے کہا تھا۔

Good for you but
I can't stand them

سالار نے لاپروائی سے کہا۔

"دوسروں کے بچے ہیں' اس لیے شور کرتے ہوئے برے لگتے ہیں۔ اپنے بچوں کا شور کبھی برا نہیں لگے گا تمہیں۔" اس نے روانی سے کہا۔

"بچے؟ ایک بچہ کافی ہے۔" وہ چائے پیتے پیتے اٹکا۔

امامہ نے کچھ چونک کر نیچے جھانکتے ہوئے اسے دیکھا۔

"ایک کیوں؟"

"تو کتنے ہونے چاہییں؟" وہ سنجیدہ ہوا۔ اس نے ایک لمحہ کے لیے سوچا۔

"کم سے کم چار۔"
"اور زیادہ سے زیادہ بارہ۔" سالار نے ہنستے ہوئے اس کے جملے میں اضافہ کیا تھا۔ وہ اسے مذاق سمجھا تھا۔
"میں سیریس ہوں۔" اس کی ہنسی رکنے پر اس نے کہا۔
"چار بچے۔۔۔ تم حواسوں میں ہو۔" سالار نے مگ منڈیر پر رکھ دیا۔
"کون پالے گا انہیں؟" اسے بے اختیار تشویش ہوئی۔
"تم اور میں۔" اس نے اطمینان سے کہا۔
"میں ایک بچہ پال سکتا ہوں' چار نہیں۔"
سالار نے دونوں ہاتھ اٹھا کر جیسے اسے حتمی انداز میں کہا۔
"ٹھیک ہے تم ایک پال لینا' تین میں پال لوں گی۔" وہ اطمینان سے کہہ کر دوبارہ نیچے جھانکنے لگی۔
"امامہ! میں سنجیدہ ہوں۔"
"اور میں بھی۔"
"ہم چار بچے افورڈ نہیں کر سکتے۔" اسے لگا کہ اسے امامہ کو منطقی انداز میں سمجھانا چاہیے۔
"میں تو کر سکتی ہوں۔ میرے پاس وہ پیسے ہیں جو۔۔۔"
"وہ میں نے اس لیے نہیں دیے کہ تم انہیں بچوں کی فوج پر انویسٹ کرو۔" سالار نے جھنجلا کر اس کی بات کاٹی۔
امامہ کو برا لگا۔ وہ کچھ کہنے کے بجائے بے حد خفگی کے عالم میں پھر نیچے دیکھنے لگی تھی۔
"سویٹ ہارٹ! ہم کو۔۔۔" سالار نے اس کے کندھے کے گرد بازو پھیلا کر اسے منانے کی کوشش کی تھی۔
"ہاتھ ہٹاؤ۔" امامہ نے اس کا ہاتھ جھٹکا۔
"میں نے کیا کیا ہے؟" وہ جھنجلایا۔ "تم چاہتی ہو میں گھر' آفس' اسکول' ڈاکٹرز اور مارکیٹوں کے چکر لگاتے لگاتے بوڑھا ہو جاؤں۔"
"تو تم کیا کرتے ہوئے بوڑھا ہونا چاہتے ہو؟" تڑ سے جواب آیا تھا' وہ لاجواب ہو گیا۔ وہ خفگی بھری سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ رات کے وقت اپنے بچوں کو گھر میں کیوں نہیں رکھتے' دوسروں کو دکھانے کے لیے باہر کیوں لے آتے ہیں۔" وہ اس کے سوال کا جواب دیے بغیر منڈیر سے اپنا مگ اٹھا کر کچھ جھنجلاہٹ کے عالم میں اندر چلا گیا تھا۔ امامہ کو بے اختیار ہنسی آئی تھی۔
وہ اب بھی ہنس پڑی تھی۔ منڈیر کے اس نشان کو دیکھتے ہوئے نجانے کیا کیا یاد آیا تھا۔ نیچے لان میں پھر وہی شور برپا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیوار کے ساتھ لگے اس رگ کو دیکھا جس پر وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کبھی کبھار بیٹھ کر گٹار بجایا کرتا تھا۔ اسے اس کے گٹار میں دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس سے باتیں کرنے کے لیے اس کے پاس بیٹھا کرتی تھی۔ گٹار بجاتے ہوئے وہ خود نہیں بولتا تھا' صرف اس کی باتیں سنتا رہتا اور وہ میکانکی انداز میں وقفے وقفے سے اس کے منہ میں کوئی نہ کوئی کھانے کی چیز ڈالا کرتی تھی۔ وہ اسے دیکھتا رہتا اور گٹار پر باری باری اپنی پسند کی کوئی ٹیون بجاتا رہتا یا اپنے۔ انسٹرومنٹس کو نکال کر ان کی صفائی کرتا رہتا۔ یہ ویک اینڈز پر اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔
اسے احساس نہیں ہوا کہ کافی کا مگ ہاتھ میں لیے اس رگ کو دیکھتے اس کی کافی کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ وہ اسی طرح بھرا ہوا مگ لے کر واپس اندر آ گئی۔

بعض دفعہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کسی کو کیوں یاد کرتے ہیں۔۔۔ یاد کرتے ہیں تو کوئی یاد آتا ہے۔۔۔ یا یاد آتا ہے تو یاد کرتے ہیں۔۔۔؟ دل یہ معمہ کہاں حل کر پاتا ہے۔



فجر کے بعد وہ مسلسل کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی تھی۔ کال نہیں تو کوئی ای میل سہی۔ اس نے وقفے وقفے سے اسے چار پانچ ای میلز کی تھیں، پھر وہ مایوس ہو گئی۔ جواب نہ آنے کا مطلب تھا کہ وہ ای میلز چیک نہیں کر رہا تھا۔

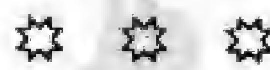
اگلے دن اداسی کا دورہ پہلے سے بھی شدید تھا۔ اس دن وہ پینٹنگ کر سکی نہ کوئی کتاب پڑھ سکی اور اس نے کھانا بھی نہیں پکایا۔ فریج میں پچھلے چند دنوں کا پڑا ہوا کھانا کھالیا۔ شام تک وہ اگلے دن سعیدہ اماں کے ہاں جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس کا خیال تھا یہ تنہائی تھی جو اسے مضمحل کر رہی ہے۔ وہ یہ بھول گئی تھی کہ وہ نو سال تنہا ہی رہی تھی۔ اس سے زیادہ تنہا اس سے زیادہ برے حالات میں۔

اس دن اسے سالار کی تین لائنوں کی ایک ای میل ملی تھی اور ان تین لائنوں کو اس نے رات تک کم از کم تین سو بار پڑھا تھا۔

"Hi Sweet heart! How are you? This work shop has really nailed me down' How is your painting going? Love you."

"ہائی سویٹ ہارٹ!
کیا حال ہے؟ اس ورک شاپ نے تو جیسے مجھے جکڑ لیا ہے۔ تمہاری پینٹنگ کیسی چل رہی ہیں، لو یو۔"

ان تین جملوں کی ایک میل کے جواب میں اس نے اسے ایک لمبی ای میل کی تھی، جس میں اسے اپنی ہر ایکٹویٹی بتائی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا جھوٹ۔ وہ اس سے یہ کیسے کہہ دیتی کہ وہ اداس ہے پھر وہ وجہ پوچھتا تو اسے وہ اپنی اداسی کی کیا وجہ بتاتی۔۔۔؟



"بیٹا! چہرہ کیوں اترا ہوا ہے تمہارا؟ کوئی پریشانی ہے۔۔۔؟ جھگڑا کر کے تو نہیں گیا سالار تمہارے ساتھ؟" سعیدہ اماں نے اس کے چہرے پر پہلی نظر ڈالتے ہی اپنے سوالوں سے اسے بوکھلا دیا تھا۔ وہ بری طرح متفکر ہوئی تھیں۔

"نہیں، نہیں، کچھ بھی نہیں ہوا۔ بس ایسے ہی گھر میں اکیلی تھی، شاید اس لیے۔"

اس نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں بہلایا، لیکن وہ مطمئن نہیں ہوئیں۔

امامہ نے کپڑوں کا بیگ کمرے میں رکھنے کے فوراً بعد ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو دیکھا۔ پانچ دنوں میں پہلی بار اس نے اپنے عکس پر غور کیا تھا۔ وہ واقعی بہت پریشان لگ رہی تھی۔ سعیدہ اماں اگر پریشان ہوئی تھیں تو کوئی حیرانی کی بات نہیں تھی، کوئی بھی اس کا چہرہ آسانی سے پڑھ سکتا تھا۔

اگلے دس منٹ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ اپنے چہرے کے اعصاب اور تاثرات کو ریلیکس کرنے کی پریکٹس کرتی رہی۔ مسکرا کر، گہرے سانس لے کر، چہرے کے تاثرات کو نرم رکھ کر، پھر جیسے زچ ہو کر اس نے شکست مان لی۔

"جہنم میں جائے اب لگتی ہوں پریشان تو میں کیا کروں۔۔۔؟ کتنا مسکراؤں میں۔۔۔؟"

پھر وہ باہر نکل آئی۔ سونا وہاں بھی مشکل تھا اور اداسی یہاں بھی ویسی ہی تھی۔

"اتنی چپ تم پہلے تو کبھی نہیں رہیں بیٹا! اب کیا ہو گیا ہے تمہیں۔۔۔؟" اگلی شام تک سعیدہ اماں حقیقتاً فکر مند ہو چکی تھیں، حالانکہ اس دن صبح سالار سے اس کی بات بھی ہوئی تھی۔

"تم سالار کے ساتھ خوش تو ہو نا؟" وہ تشویش سے پوچھ رہی تھیں اور وہ ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اداسی بری طرح بڑھی تھی۔ مسئلہ خوشی کا نہیں تھا۔ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ وہ اس کے ساتھ خوش ہے یا نہیں۔ بات صرف اس کے ساتھ رہنے کی تھی۔ خوش یا اداس جیسے بھی لیکن اس کے ساتھ ہی۔

اس نے سعیدہ اماں کو جواب دینے کے بجائے موضوع بدل دیا تھا۔ دو دن وہاں رہ کر وہ پھر اسی بے چینی کے عالم میں واپس آئی تھی۔

"لیکن تم نے تو کہا تھا کہ تم میرے آنے تک وہیں رہو گی؟" سالار اس کی واپسی پر حیران ہوا تھا۔

"میری مرضی۔" وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی لیکن معلوم نہیں اس نے یہ کیوں کہا۔

"او کے۔۔۔" وہ جواب پر حیران ہوا تھا، لیکن اس نے کوئی مزید سوال نہیں کیا۔

"مجھے نیویارک سے ورکشاپ کے ختم ہونے کے بعد یہیں سے دو ہفتے کے لیے کینیڈا جانا ہے۔" سالار نے اسے اگلی خبر سنائی، اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"کیا مطلب؟"

"جو کولیگ مانٹریال والی کانفرنس اٹینڈ کر رہا تھا، اسے کوئی میڈیکل ایمرجنسی ہو گئی ہے۔ فوری طور پر مجھے کانفرنس میں جانے کے لیے کہا گیا ہے۔ کیونکہ میرے پاس ویزا بھی ہے اور میں قریب بھی ہوں۔"

وہ صدمے سے بول ہی نہیں سکی۔ دو ہفتے اور باہر ٹھہرنے کا مطلب تھا کہ وہ عید کے ایک ہفتہ کے بعد واپس پاکستان آتا۔

"ہیلو!" سالار نے اس کی لمبی خاموشی پر لائن پر اس کی موجودگی چیک کی۔

"یعنی عید کے بعد آؤ گے تم؟"

اس نے اپنے لہجے کی مایوسی پر قابو کرتے ہوئے سالار کو یاد دلانے کی کوشش کی کہ عید قریب ہے۔

"ہاں۔" یک حرفی جواب آیا۔ یقیناً اسے یاد تھا۔

"اور میں عید پر کیا کروں گی؟"

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیا بات کرے۔ مایوسی کی انتہا تھی، جس کا وہ اس وقت شکار ہو رہی تھی۔ ایک ہفتہ کا انتظار تین ہفتوں میں تبدیل ہو گیا تھا اور تین ہفتوں کے لیے اس اپارٹمنٹ میں اکیلے رہنا۔۔۔ اسے سالار پر غصہ آنے لگا تھا۔

"تم اسلام آباد چلی جانا عید پر۔" سالار نے کہا۔

"نہیں، میں یہیں رہوں گی۔" اس نے بلاوجہ ضد کی۔

"ٹھیک ہے یہیں رہ لینا۔" سالار نے بآسانی گھٹنے ٹیک دیے۔

"تمہیں کیوں بھیج رہے ہیں۔۔۔؟ بھیجنا تھا تو پہلے کہنا چاہیے تھا نہیں۔"

اسے اب بینک والوں پر غصہ آ رہا تھا۔

"ایسی ایمرجنسی ہو جاتی ہے کبھی کبھار، وہ کسی اور کو اتنے شارٹ نوٹس پر پاکستان سے نہیں بھیج سکتے، ورنہ مجھے کہاں بھیجنا تھا انہوں نے۔" سالار نے وضاحت کی۔

"پھر بھی۔۔۔ تم کہہ دیتے کہ تم مصروف ہو، تمہیں ان دنوں پاکستان میں کچھ کام ہے۔" وہ ہنس پڑا۔

"لیکن مجھے تو کوئی کام نہیں ہے۔ میں جھوٹ بولتا۔۔۔؟"

امامہ کو غصہ آگیا۔ "زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا کیا؟"
"نیور! اپنے کام میں؟ ضرورت ہی نہیں پڑی۔" اس نے اطمینان سے کہا۔ امامہ کچھ بول نہیں سکی۔
"تم ایسا کرو ڈاکٹر صاحب کے گھر چلی جاؤ۔ اتنے دن اکیلے رہو گی تو بور ہو جاؤ گی۔"
اس نے اسے مشورہ دیا۔
"نہیں میں بور نہیں ہوں گی۔ مجھے یہاں بڑے کام ہیں۔" وہ اس کے مشورے پر کچھ چڑ سی گئی۔
سالار کو اس کی ٹون نے حیران کیا تھا۔ وہ اس طرح کبھی بات نہیں کرتی تھی اور ابھی کچھ دیر پہلے تک تو وہ بے حد خوشگوار اور پرجوش انداز میں اس سے باتیں کر رہی تھی' پھر یک دم اسے کیا ہوا تھا۔ کم از کم وہ یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ اس کے کینیڈا میں مزید رکنے کی وجہ سے وہ اپ سیٹ ہو رہی ہے۔ وہ امامہ سے پوچھنا چاہتا تھا' لیکن فوری طور پر اس نے موضوع کو بدلنا بہتر سمجھا۔
اپ سیٹ شاید ایک بہت چھوٹا لفظ تھا اس کیفیت کے لیے' جو وہ اس وقت محسوس کر رہی تھی۔ وہ بے حد غم اور غصے میں تھی۔ اسے یہ "ایکسٹینشن" دھوکا لگ رہا تھا۔ آخر وہ اسے چار ہفتے کا کہہ کر تو باہر نہیں گیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اگر چار ہفتے کا بھی کہہ کر جاتا تو اسے کیا اعتراض ہونا تھا' اس نے تب بھی اسے اسی طرح خوشی خوشی روانہ کر دینا تھا' یہ اندازہ لگائے بغیر کہ وہ بعد میں ان تیس دنوں کے ایک ایک گھنٹے کو گنے گی۔
"میں بھی اب اسے ای میل نہیں کروں گی' نہ ہی کال کروں گی' نہ ہی اس سے پوچھوں گی کہ اسے کب آنا ہے اور کب نہیں۔ آتا ہے تو آئے' نہیں تو نہ آئے۔ جہنم میں جائے' میرا ہی قصور ہے۔ بار بار اس سے نہ پوچھتی تو وہ اس طرح نہ کرتا۔"
اس رات بستر میں لیٹے ہوئے وہ بے حد رنجیدگی کے عالم میں ان تمام چیزوں کی فہرست بناتی رہی' جن میں اب اسے سالار کی نافرمانی کرنی تھی۔ بستر پر لیٹے چھت کو گھورتے ہوئے اس کی فہرست ابھی دو سو چھپن اینٹریز تک پہنچی تھی کہ اسے بیڈ کے بالکل اوپر چھت پر چھپکلی نظر آئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اکیلا گھر اور چھپکلی' یہ فی الحال اس کے لیے بدترین تھا۔ وہ چھپکلی کو دیکھتے ہی بیڈ سے اٹھ کر صوفے پر چلی گئی اور اسے پھر سالار پر غصہ آنے لگا تھا۔
ایک چھوٹی سی چھپکلی دو ہفتے پہلے اپارٹمنٹ میں نمودار ہوئی تھی اور وہ بھی سیدھا ان کے بیڈ روم میں۔ شاید کسی دن ٹیرس کا دروازہ کھلا رہنے کی وجہ سے اندر آگئی تھی۔
وہ اس وقت بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ آن کیے رات کو ناول پڑھ رہی تھی' جو بے حد دلچسپ موڑ پر تھا' جب بستر میں نیم دراز اپنی ٹانگیں سکیڑے ہوئے' اس کی نظریں اچانک چھت پر اپنے بیڈ کے بالکل اوپر موجود چھپکلی پر پڑی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے اسے یہ وہم لگا۔ اس نے کمرے کی لائٹ آن کر کے دیکھا' وہ چھپکلی ہی تھی۔ سالار برابر والے بستر میں گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ عام حالات میں کبھی اسے نہ جگاتی' لیکن یہ عام حالات نہیں تھے۔ اس نے اوندھے لیٹے ہوئے سالار کا کندھا جھنجھوڑا۔
"سالار۔۔۔ سالار۔" وہ اس کی آواز پر نیند میں ہڑبڑا گیا۔
"کیا ہوا۔۔۔؟"
"وہ اوپر دیکھو' میرے بیڈ کے اوپر چھت پر چھپکلی ہے۔"
امامہ نے حواس باختہ ہو کر اسے کہا۔ سالار نے موندی ہوئی آنکھوں کو ملتے' لیٹے لیٹے ایک نظر چھت کو دیکھا' پھر امامہ کو اور دوبارہ اوندھے منہ لیٹ گیا۔
"سالار!" امامہ نے دوبارہ اس کا کندھا ہلایا۔
اس کا خیال تھا شاید وہ نیند میں اس چھپکلی کو دیکھ نہیں پایا۔

"دیکھ لی ہے میں نے امامہ۔۔۔ سونے دو۔" وہ لیٹے لیٹے بڑبڑایا۔
"دیکھ لی ہے تو کچھ کرو اس کا۔" وہ اس کی بے توجہی پر ناراض ہوئی۔
"چلی جائے گی خود ہی۔۔۔ تم لائٹ آف کر کے سو جاؤ۔" وہ پھر بڑبڑایا۔
"میں کیسے سوؤں۔۔۔؟ وہ مجھے دیکھ رہی ہے۔" اس کی خفگی بڑھی۔
"لائٹ بند کردو' نہ تم اسے دیکھو' نہ وہ تمہیں دیکھے۔"
اسے اس کے مشورے سے زیادہ اس کی بے حسی پر غصہ آیا۔
"تم میرے لیے ایک چھپکلی نہیں مار سکتے؟"
"میں رات کے اڑھائی بجے چھپکلی نہیں مار سکتا۔۔۔ جسٹ اگنور اٹ۔"
"میں نہیں اگنور کر سکتی اسے۔ یہ اگر گرے تو سیدھا میری ٹانگوں پر گرے گی۔"
اس نے چھت کو دیکھتے ہوئے بے بسی سے کہا۔ وہ واقعی اس کی ٹانگوں پر ہی گرتی۔
"یار میں تمہاری سائیڈ پر آجاتا ہوں' تم میری سائیڈ پر آجاؤ۔"
وہ کروٹ لیتے' کہتا ہوا اسی طرح اس کی سائیڈ پر چلا گیا۔ وہ اس کے ایثار سے زیادہ اس کی دلیری سے متاثر ہوئی تھی۔ کمرے کی بڑی لائٹ دوبارہ بند کرتے ہوئے وہ اپنا ناول لیے سالار کا بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ آن کر کے اس کے بستر میں بیٹھ گئی۔ سالار تب تک اسی طرح اوندھے منہ لیٹے لیٹے اس کا سائیڈ لیمپ آف کر چکا تھا۔ خود کو قدرے محفوظ پاتے ہوئے' کچھ پرسکون انداز میں' اس نے ناول کے چند جملے پڑھے' پھر دوبارہ چھپکلی کو دیکھا۔ وہ جیسے اسی جگہ پر چپک کر رہ گئی تھی۔ امامہ نے سالار کو دیکھا۔ وہ اس چھپکلی کے عین نیچے بے حد اطمینان سے' اسی طرح کمبل اوڑھے اوندھے منہ لیٹا تھا۔
"سالار' تم مرد کتنے بہادر ہوتے ہو۔" اس نے مردوں کو سراہنا ضروری سمجھا۔
"اور سمجھ دار بھی۔" اسے جواباً" بڑبڑاہٹ سنائی دی۔
"سمجھ دار کیسے؟" وہ صفحہ پلٹتے پلٹتے چونکی۔
"چھپکلی گرتی تمہارے بیڈ پر' لیکن بھاگتی میرے بیڈ کی طرف۔ اس کا منہ میرے بیڈ کی طرف ہے۔" جماہی لیتے اسی طرح آنکھیں بند کیے سالار نے سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔
امامہ نے سر اٹھا کر چھت کو دیکھا اور اگلے ہی لمحے وہ بیڈ سے باہر تھی۔ چھپکلی کا رخ واقعی سالار کے بیڈ کی طرف تھا۔
"تم سارے مرد بے حد خود غرض ہوتے ہو اور ایک جیسے ہوتے ہو۔"
وہ بیڈ روم سے باہر نکلتے ہوئے' جتنی بلند آواز میں یہ اس سے کہہ سکتی تھی' اس نے کہا۔
سالار نے بالآخر آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ اسے تنگ کر رہا تھا' لیکن اب اسے اندازہ ہوا تھا کہ تنگ کرنے کے لیے یہ موقع شاید غلط ہے۔
دس منٹ کے بعد اسے چھپکلی کا صفایا کرنے کی اطلاع دے کر وہ اسے منا کر لاؤنج سے واپس لے گیا تھا۔ اس نے اگلے کئی دن یہ چھپکلی نہیں دیکھی تھی اور آج یہ چھپکلی پھر آگئی تھی۔ یقیناً اس نے جھوٹ بولا تھا' اس نے اس چھپکلی کو نہیں مارا تھا۔ وہ احمقانہ بات اس وقت اس کے لیے ایک اور پوائنٹ ہو گیا تھا۔
اگلے دن فون پر اس نے سالار کو اس چھپکلی کے دوبارہ نمودار ہونے کے بارے میں بتایا۔
"تم نے مجھ سے جھوٹ بولا کہ تم نے اسے مار دیا تھا۔" اس نے چھوٹتے ہی سالار سے کہا۔
"میں نے اسے واقعی مار دیا تھا' یہ کوئی اور چھپکلی ہوگی۔" سالار نے لاپروائی سے کہا۔

"نہیں' یہ وہی چھپکلی تھی' تم نے اگر اسے مارا ہوتا تو تم مجھے دکھاتے۔" وہ اپنی بات پر مُصر تھی۔
سالار کا سر گھوم کر رہ گیا۔ وہ امامہ سے اس سے زیادہ احمقانہ گفتگو کی توقع نہیں رکھ سکتا تھا۔
"تم اگر کہتیں تو میں تمہیں وہ مری ہوئی چھپکلی بھی دکھا دیتا۔" اس نے تحمل کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تھی۔
"نہیں یہ وہی تھی میں اسے پہچانتی ہوں۔"
"اگر یہ وہی تھی تو اتنے دن سے کہاں تھی...؟"
اس نے ایک ال لوجیکل چیز پر لاجک دینے کی کوشش کی۔
"جہاں بھی تھی مجھے نہیں پتا' لیکن تم یہی چاہتے تھے کہ میں پریشان ہوں۔"
سالار نے بے اختیار گہرا سانس لیا' وہ اس الزام کے جواب میں کیا کہتا۔ امامہ کو کچھ ہوا تھا' لیکن کیا ہوا تھا۔ یہ اسے سمجھ میں نہیں آیا۔
"تمہیں پتا ہے مجھے چھپکلی سے ڈر لگتا ہے' لیکن تم پھر بھی اسے یہاں چھوڑ کر گئے' کیونکہ تمہیں احساس نہیں ہے میرا' تم مجھے پریشان دیکھ کر خوش ہوتے ہو' تمہارے لیے ہر چیز مذاق ہے۔" اس کی کسی بات کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔ کم از کم سالار نہیں ڈھونڈ سکا لیکن وہ اس کی "گفتگو" سنتا رہا۔
"تم ہمیشہ میرے ساتھ اس طرح کرتے ہو اور مجھے پتا ہے' تم نے ہمیشہ اسی طرح کرنا ہے۔ کیونکہ تمہارے لیے صرف تمہاری اپنی اہمیت ہے اور میں تمہارے گھر کی نوکرانی ہوں یا ہاؤس کیپر۔ تم جہاں مرضی پھرو' لیکن میں ہمیشہ گھر پر رہوں' جیسے غلام رہتے ہیں۔ میں سارا دن کام کروں اور تم میرے لیے ایک چھپکلی نہیں مار سکتے۔" وہ اس بے ربط گفتگو کے اختتام پر ہچکیوں سے رو رہی تھی۔
ساری گفتگو میں ایشو کیا تھا' چھپکلی کا نہ مارا جانا۔ اس کی خود غرضی' اس کا گھر پر نہ ہونا یا گھر کے وہ کام جو اسے کرنے پڑ رہے تھے۔ وہ سمجھ نہیں سکا۔ وہ اے سے زیڈ تک جانے والی گفتگو نہیں تھی۔ X سے $\frac{1}{2}$ 3 تک جانے والی گفتگو تھی' جس کو سمجھنے کے لیے جس فارمولے کی ضرورت تھی وہ فی الحال سالار کو نہیں آتا تھا۔
اگلے پانچ منٹ' وہ بے حد تحمل سے اس کی ہچکیوں کے تھمنے کا انتظار کرتا رہا اور پھر جب بالآخر طوفان کچھ تھما تو اس نے کہا۔
"آئی ایم سوری' میرا قصور ہے۔ میں فرقان سے کہتا ہوں' ملازم کو بھیجے' وہ چھپکلی کو مار دے گا۔" فی الحال معذرت کے علاوہ اسے اس صورت حال سے نبٹنے کا کوئی اور راستہ نظر نہیں آیا۔
"نہیں' اب میں چھپکلی کے ساتھ رہوں گی تاکہ تمہیں پتا چلے۔" اس نے ناک رگڑتے ہوئے اسے کہا۔
سالار کو بے اختیار ہنسی آگئی اور اس نے کھانس کر اس ہنسی پر قابو پایا۔ وہ جلتی پر تیل نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ امامہ کا مسئلہ کیا تھا' وہ اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا' لیکن وہ حیران تھا اگر یہ موڈ سوئنگز تھے تو یہ بدترین قسم کے تھے اور اگر یہ tantrums تھے تو سمجھ میں نہ آنے والے' لیکن پاکستان سے اتنی دور بیٹھے وہ سوچنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔
فرقان کے ملازم نے آکر اس دن وہ چھپکلی مار دی تھی' لیکن اس چیز نے بھی امامہ کے دل میں کسی ممنونیت کو پیدا نہیں کیا تھا۔
اگلے دن کھانا پکاتے ہوئے اس کے ہاتھ پر چھری سے کٹ لگ گیا۔ سنک میں پانی کے نیچے انگلی رکھے اسے پھر وہ یاد آنے لگا۔
"یہ کیا ہوا ہے؟"
وہ اس دن آفس سے آنے کے بعد لاؤنج میں ٹہلتے ہوئے' فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ امامہ ڈنر کے لیے

برتن لگا رہی تھی۔ وہ بات کرتے ٹہلتے ہوئے' کچن کاؤنٹر پر پڑے پیالے سے کچھ بینز کھا رہا تھا جب امامہ نے آکر وہاں رکھے چاول اٹھائے۔ سالار نے اس کے ہاتھ کی پشت پر چند آبلے دیکھے۔ فون پر بات سنتے سنتے اس نے بے اختیار اس سے کہا "یہ کیا ہوا؟"

"یہ۔۔۔؟" امامہ نے چونک کر اس کی نظروں کے تعاقب میں اپنا ہاتھ دیکھا۔

"کچھ نہیں' کھانا بنا رہی تھی تو آئل کے کچھ چھینٹے گر گئے۔" اس نے لاپروائی سے بتایا۔

وہ اسی طرح فون پر بات سنتے ہوئے' اس کا ہاتھ پکڑ کر دیکھنے لگا۔ پھر اس کا ہاتھ چھوڑ کر وہ اسی طرح فون پر بات کرتے لاؤنج سے غائب ہو گیا۔ وہ فریج سے پانی نکال رہی تھی' جب وہ دوبارہ نمودار ہوا۔ اسی طرح فون پر اسٹاک مارکیٹ کے کسی ایشو پر بات کرتے ہوئے' اس نے امامہ کا ہاتھ پکڑ کر چند لمحوں میں اس پر مرہم لگایا اور پھر اسی طرح دوبارہ چلا گیا۔ وہ ہل نہیں سکی تھی۔ اتنے سالوں میں اس کے کسی زخم پر رکھا جانے والا وہ پہلا مرہم تھا۔ وہ اتنے سالوں میں شاید بے حس ہو گئی تھی۔۔۔ چھوٹی چھوٹی تکلیفوں اور چوٹوں پر رونا اور ان کی پروا کرنا اس نے چھوڑ دیا تھا۔ اسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ کسی زخم کو مندمل کرنے کے لیے بھی کچھ کیا جاتا تھا۔ مرہم دوسرے رکھتے ہیں اور اس کی زندگی میں کوئی دوسرا رہا ہی نہیں تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے سالار کی نظر ایک بار پھر اس کے ہاتھ پر پڑی تھی اور اس نے قدرے خفگی کے عالم میں اس سے کہا۔

"اگر اسی وقت ہاتھ پر کچھ لگا لیتیں تو یہ آبلے نہ پڑتے۔"

"مجھے اس سے تکلیف نہیں ہوئی۔"

"مگر مجھے تکلیف ہو رہی ہے سویٹ ہارٹ!"

وہ اس سے نظریں ملا کر جواب نہیں دے سکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اسے تکلیف ہو رہی ہو گی اور اس مرہم سے زیادہ ٹھنڈک اس کے اس جملے نے پہنچائی تھی اسے 'تو اب کوئی تھا' جسے اس کے ہاتھ پر آنے والے ایک معمولی زخم پر بھی تکلیف ہوتی تھی۔

اس کے ہاتھ پر چھوٹے موٹے زخموں کے کئی نشان تھے۔ وہ ان میں سے ان زخموں کو بڑی آسانی سے پہچان سکتی تھی' جو اس گھر میں آنے کے بعد لگے تھے۔ ان زخموں میں اسے تکلیف ہوئی تھی اور یہ تکلیف اس لیے ہوئی تھی' کیونکہ ہر بار کسی نے بڑے پیار سے ان پر کچھ لگایا تھا یا لگانے کو کہا تھا۔

جیل' مرہم' پلاسٹ' اسپرٹ' اینٹی سیپٹک کریم۔ وہ درد کے احساس سے جیسے دوبارہ آشنا ہو رہی تھی اور اب اتنے مہینوں کے بعد یہ پہلا کٹ تھا' جس کے بارے میں اس سے پوچھنے والا کوئی نہیں تھا اور اسے وہ "پوچھنے والا" ایک بار پھر بری طرح یاد آیا تھا۔

دوسرے ہفتے کے اختتام تک وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی بری طرح جھنجلانے لگی تھی۔ ملازمہ کے ساتھ' مالی کے ساتھ' اس گھر میں آنے والے فرقان کے بچوں کے ساتھ اور خود سالار کے ساتھ۔

"امامہ! کیا ہو رہا ہے تمہیں۔۔۔؟ سب ٹھیک ہے نا؟" سالار کو بالآخر اس سے بہت ڈائریکٹ ہو کر پوچھنا پڑا تھا۔

"کیا ہونا ہے مجھے؟" وہ اس کے سوال پر بری طرح چڑی۔

"وہی تو پوچھ رہا ہوں میں۔" اس نے تحمل سے کہا۔

"کچھ نہیں ہو رہا مجھے۔۔۔"

"پھر تم۔" وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔ یہ کہنا ذرا مشکل تھا کہ وہ اس کے ساتھ تلخ ہو رہی تھی۔

"پھر میں کیا۔۔۔؟" امامہ نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔
"کچھ نہیں میں ابھی دو تین دن تک تم کو فون نہیں کرسکوں گا۔"
"کیوں؟" وہ بری طرح بگڑی۔ "اتنا بھی کیا کام ہے کہ تم مجھے چند منٹ کے لیے بھی کال نہیں کرسکتے۔"
"میں تمہیں ای میل کردیا کروں گا' اگر وقت ملا تو کال بھی کرلوں گا۔۔۔ لیکن شاید نہ کرسکوں۔" وہ تحمل سے اسے سمجھا رہا تھا۔
"تم ای میل بھی نہ کرو مجھے' اس سے اور بھی وقت بچے گا تمہارا۔"
اس نے بے حد خفگی کے عالم میں فون بند کردیا۔ اسے سالار پر بری طرح غصہ آرہا تھا۔ چند منٹوں کے بعد دوبارہ کال آنے لگی تھی۔ وہ کال ریسیو نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اسے ریسیو کرنا پڑی۔
"تم نے فون بند کیا تھا؟" وہ دوسری طرف حیرانی سے اس سے پوچھ رہا تھا۔
"ہاں۔۔۔"
"کیوں؟"
"تاکہ تمہارا وقت ضائع نہ ہو۔ میں نے کل ایک میگزین میں پڑھا تھا کہ جن مردوں کو احساس کمتری ہوتا ہے' وہ اپنی بیویوں کو اپنی جھوٹی مصروفیات کے قصے سناتے رہتے ہیں۔" سالار نے کچھ ہکا بکا ہو کر اس کا جملہ سنا تھا۔ اسے اس بات کا کوئی سر پیر سمجھ میں نہیں آیا۔ "تاکہ ان کی بیویوں کو یہ امپریشن ملے کہ وہ بہت اہم ہیں اور دنیا ان کے بغیر نہیں چل سکتی۔" سالار نے اسی اچنبھے میں اس کے باقی جملے بھی سنے تھے۔ "اس سے ان کی self esteem بڑھتی ہے۔"
اس نے آخری جملہ کہہ کر کچھ دیر سالار کے رد عمل کا انتظار کیا۔ وہ خاموش تھا۔
"ہیلو۔۔۔" امامہ کو خدشہ ہوا کہ شاید کال ڈراپ ہوگئی ہے۔
"میں سن رہا ہوں' اس میگزین میں بس اتنا ہی لکھا تھا؟"
وہ سنجیدہ لگ رہا تھا لیکن بات سنجیدہ نہیں تھی۔
"ہاں۔"
"گڈ۔۔۔ ڈینٹسٹ کے پاس گئی تھیں تم؟" اس نے کسی رد عمل کا اظہار کیے بغیر بات بدلی تھی۔
امامہ کی جھنجلاہٹ میں اضافہ ہوا۔ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی' وہ اس سے بحث کرنا چاہتی تھی۔
دو گھنٹے کے بعد اس نے ان دو ہفتوں پر پروگرام چارٹ اسے ای میل کردیا۔ کانفرنس کی آرگنائزنگ باڈی کی طرف سے شرکا کو بھیجے ہوئے اس ڈاکومنٹ کو پڑھنے میں اسے کم سے کم پندرہ منٹ لگے۔ اس کے پندرہ دن کا شیڈول واقعی بہت hectic تھا۔ یہ ای میل اسے اس کے کس جملے کی وجہ سے کی گئی تھی' وہ اندازہ کرسکتی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے جوابی ای میل میں اس شیڈول کے بارے میں ایک لفظ کہا' نہ ہی اپنی شرمندگی کا اظہار کیا۔
"تم نے فرقان کے گھر ڈنر پر جانا کیوں چھوڑ دیا؟" سالار نے اس دن اس سے پوچھا۔
"میری مرضی۔"
وہ کہنا چاہتی تھی کہ ڈنر ٹیبل پر فرقان کو یا اس کی بیٹی کو دیکھتے ہوئے' اسے وہ یاد آتا تھا اور وہ ہر روز ڈنر کے بعد کچھ زیادہ اپ سیٹ ہورہی تھی' اس لیے اس نے وہاں جانا چھوڑ دیا تھا لیکن وہ یہ سب نہیں کہہ سکتی تھی۔
"میں جانتا ہوں تم بہت بہادر ہو' اکیلے رہ سکتی ہو تو ڈنر کرنا بھی تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پھر بھی ان کے گھر چلی جاتیں تو کوئی ایکٹوٹی ہوتی تمہارے پاس' ان بے کار ناولز کو پڑھنے کے علاوہ۔"

"تمہیں کیا پروا ہے؟" اس نے سالار کے جملے پر جز بز ہو کر کہا تھا۔
"مجھے تمہاری پروا ہے... یہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر بیٹھنا چھوڑ دو۔" وہ سنجیدہ تھا۔
"تم نے مجھے نصیحتیں کرنے کے لیے فون کیا ہے؟" وہ جھنجلائی۔
"ہاں۔"
"تو کرتے رہو۔"
"تم پر کوئی اثر نہیں ہو گا... یہی کہنا چاہتی ہو تم؟"
"تم باہر جا کر مجھ سے مس بی ہیو کرنے لگے ہو۔"
"کیا؟" سالار کو لگا اسے سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔
"میں بار بار نہیں دہرا سکتی اپنی بات۔" اس نے سرد مہری سے کہا۔
"میں مس بی ہیو کر رہا ہوں تمہارے ساتھ؟" اس نے بے یقینی سے اس سے پوچھا۔
"ہاں۔" جواب بالکل دو ٹوک تھا۔ سالار نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔
"میں اگر تمہیں کوئی عقل کی بات سمجھاتا ہوں تو میں مس بی ہیو کرتا ہوں تمہارے ساتھ؟"

"اب تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ میں بے وقوف ہوں؟" سالار کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔
"میں نے کب کہا تم بے وقوف ہو؟"
"اب تم مجھ کو جھوٹا کہہ رہے ہو؟" وہ بے بسی سے ہنس پڑا۔
"کیا ہوا ہے تمہیں امامہ؟"
"اب تم کہہ دو میرا دماغ خراب ہو گیا ہے..."
"پانی پیو..."
"کیوں پیوں؟"
"اچھا مت پیو... موسم کیسا ہے باہر کا؟"
وہ اب موضوع بدلنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر وہ امامہ کے ردعمل پر بری طرح حیران تھا۔
"امامہ! کوئی پریشانی ہے تمہیں؟" وہ اگلے دن نوشین کے ساتھ اس کے کہنے پر فورٹریس آئی تھی، جب ساتھ چلتے چلتے نوشین نے اچانک اس سے پوچھا۔ وہ بری طرح چونکی، پھر اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔
"نہیں... نہیں تو... کیوں؟"
"پھر اس طرح گم صم کیوں ہو؟" نوشین کے لہجے میں تشویش تھی۔
"نہیں میں... میں کچھ سوچ رہی تھی۔"
"سالار کے ساتھ تو بات ہوتی ہے تمہاری... ؟ کوئی جھگڑا تو نہیں ہے؟"
"نہیں تو... روز بات ہوتی ہے۔" اس نے بے اختیار مسکرانے کی کوشش کے ساتھ ہی ڈسپلے پر لگے ایک سوٹ کی طرف نوشین کو متوجہ کیا۔ وہ اسے یہ کیسے بتاتی کہ یہاں اس کے ساتھ پھرتے ہوئے اسے سالار بری طرح یاد آ رہا ہے۔ وہ ہفتے میں دو یا تین بار اس کے ساتھ وہاں آ کر کافی یا چائے پیتے ہوئے اسی طرح ونڈو شاپنگ کرتے تھے، جس طرح اب وہاں سے گزرتے ہوئے کچھ دوسرے جوڑے کر رہے تھے... وہ اسے کیسے نہ یاد آتا؟



"میگزین میں آج تم نے کچھ نہیں پڑھا ان مردوں کے بارے میں' جو احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں' اور اپنی بیویوں کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں؟" سالار نے اگلے دن فون پر اس سے بات کرتے ہوئے اسے چھیڑا۔
امامہ کا موڈ بری طرح آف ہوا۔
"تم کیا کہنا چاہ رہے ہو کہ ایسے مرد نہیں ہوتے اور میں نے فضول بات کہی ہے۔"
"میں مذاق کر رہا تھا امامہ۔" وہ کچھ محتاط ہوا۔
"ایک سنجیدہ بات کو مذاق میں لے رہے ہو تم۔"
"کون سی سنجیدہ بات۔۔۔؟ امامہ! تم آج کل کون سے میگزین پڑھ رہی ہو؟" وہ کہے بغیر نہیں رہ سکا۔
"تمہیں اس سے کیا؟" وہ مزید بگڑی۔
"اگر تم مجھے اس طرح کے اسٹوپڈ ایکسرپٹس سناؤ گی تو میں پوچھوں گا تو سہی نا؟"
وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ بحث کرنے لگا تھا۔ اب تقریباً" ہر روز یہی کچھ ہو رہا تھا۔ پچھلے چار دن سے فون کال کے اختتام پر اسے معذرت کر کے فون بند کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ بھی صرف اس لیے تھا' کیونکہ وہ وہاں اپنی عدم موجودگی میں اس سے کوئی جھگڑا کر کے فون بند نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ خود اس کے لیے بہت مشکل کا باعث ہوتا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ امامہ کو کیا ہوا ہے۔ وہ ناراض پہلے بھی ہوتی تھی مگر اس طرح کی باتوں پر کبھی نہیں ہوتی تھی۔



سالار اگر اس کے بنتے بگڑتے موڈ کو نہیں سمجھ پا رہا تھا تو وہ خود بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ وہ سارا دن اس کے بارے میں سوچ سوچ کر اداس ہوتی رہتی اور اس سے بات کرتے ہوئے وہ بلاوجہ اس سے جھگڑتی۔ اسے اس پر شدید غصہ آتا تھا اور کیوں آتا تھا' یہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔
وہ کئی سالوں بعد اتنے لمبے ڈپریشن کا شکار ہوئی تھی اور زندگی میں پہلی بار تین ہفتوں میں وہ ایک ناول بھی مکمل نہیں کر پائی تھی' پینٹنگ تو خیر دور کی بات تھی۔
وہ سارا دن ٹی وی آن کیے اس کی کال کے انتظار میں بیٹھی رہتی یا پھر کمپیوٹر آن کیے پرانی ای میلز پڑھتے ہوئے کسی نئی ای میل کے لیے بیٹھی رہتی۔ چند لائنز کی وہ ای میلز جن میں وہ اس کا حال پوچھتا تھا' اور اپنی ایکٹویٹی بتاتے ہوئے اس سے پوچھتا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے' وہ ان ای میلز کو درجنوں بار پڑھتی۔ ایک لمبا چوڑا جواب لکھ کر اس کی ای میل کے انتظار میں ساری ساری رات اس کی چیزیں نکال کر صاف کر کے ری ارینج کرتی رہتی یا پھر اس کی کولیکشن میں موجود چارلیز تھیرون کی موویز دیکھتی رہتی۔ یہ واقعی بے بسی کی حد تھی کہ اسے وہ ایکٹریس بھی اب بری لگنا بند ہو گئی تھی' جس کو وہ پہلے سالار کے سامنے دیکھنا پسند نہیں کرتی تھی۔
ہر روز کھانے کی ٹیبل پر وہ اس کے برتن بھی لگا دیتی' یہ جیسے کھانے کی ٹیبل پر اپنی تنہائی دور کرنے کی کوشش تھی۔
رات کو سونے کے لیے اپنے بستر میں لیٹے' وہ لائٹ آف کرنے کے بعد بھی کروٹ لیے' کتنی کتنی دیر اس کے بستر اور سرہانے کو دیکھتی رہتی۔ وہ سونے سے پہلے لائٹ آف کرنے کے بعد بھی اس سے کچھ دیر باتیں کیا کرتا تھا اور اب یہ خاموشی اس کے اعصاب کو بری طرح مضمحل کر رہی تھی۔
عید کے لیے اسلام آباد جانے تک گھر کی اس خاموشی اور تنہائی نے اسے مکمل طور پر حواس باختہ کر دیا تھا۔

اسلام آباد سے آنے کے بعد بھی 'اس نے خود کو بہتر محسوس نہیں کیا تھا۔ سالار کی پوری فیملی میں سے صرف عمار اور یسریٰ عید منانے کے لیے وہاں موجود تھے' باقی افراد بیرون ملک تھے۔ پچھلی عید جیسی رونق اس بار وہاں نہیں تھی۔

سالار نے طیبہ کو اس کی عید کی شاپنگ کروانے کے لیے کہا تھا۔ وہ بڑے بجھے دل کے ساتھ ان کے ساتھ چلی گئی تھی' لیکن پچھلی عید جیسا اشتیاق اس بار اسے کپڑوں کے لیے نہیں تھا۔ اسلام آباد آکر یہ بھی پہلی بار ہوا تھا کہ اس نے گیسٹ روم کی کھڑکی سے لگ کر اپنے گھر والوں میں سے کسی کے نظر آنے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔

عید کی صبح پہلے کی طرح اس بار بھی وہ سالار کی کال پر ہی اٹھی تھی۔ وہ مانٹریال میں اپنا سیشن ختم کرکے کچھ دیر پہلے ہوٹل آیا تھا۔

"کون سے کپڑے پہن رہی ہو تم آج؟" اس نے مبارک باد دینے کے بعد اس سے پوچھا۔

"تمہیں بتانے کا فائدہ؟" اس نے بیڈ کے کراؤن کے ساتھ پشت ٹکاتے ہوئے کہا۔

"میں تصور کرنا چاہ رہا ہوں کہ تم کیسی لگ رہی ہوگی؟"

"میرے سامنے تم نے کبھی میرے کپڑوں کو غور سے دیکھا تک نہیں 'اب وہاں بیٹھ کر کیا تصور کروگے؟"

"امامہ! ہم کم از کم آج آرگیو نہیں کریں گے۔" سالار نے مداخلت کرتے ہوئے جیسے پیشگی جنگ بندی کا اعلان کیا۔ "تمہیں کیا چاہیے آج؟ فلاورز اور کیک تو ممی سے میں نے کہا ہے تمہارے لیے' کچھ اور چاہیے؟"

"نہیں۔" وہ بے حد اداس تھی۔

"مجھے مس تو نہیں کررہیں تم؟" سالار نے مذاق کیا تھا لیکن اس نے جیسے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ اس نے اپنی آستین کے ساتھ آنکھوں کو رگڑ کر صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس کی خاموشی پر غور کیے بغیر بات کر رہا تھا۔ کینیڈا میں عید پہلے ہی ہو چکی تھی اور وہ عید کے دن بھی کانفرنس اٹینڈ کرتا رہا۔ وہ زندگی میں کئی عیدیں اسی طرح گزار چکا تھا۔ پچھلی عید اسے کم از کم اپنی عید والے دن اپنی مصروفیات کی وجہ سے یاد نہیں آسکی تھی' لیکن پچھلی عید امامہ کو پچھلے دو دن سے تنگ کر رہی تھی۔

"کب کی فلائٹ ہے تمہاری؟" اس نے کوشش کی تھی کہ اس کی آواز بات کرتے ہوئے نہ بھرائے' یہ احمقانہ چیز تھی' باقی چیزوں پر رونا ٹھیک تھا۔ لیکن کم از کم وہ اس کے سامنے اس کے نہ ہونے کے لیے نہیں رو سکتی تھی۔ وہ بڑی شرمندگی محسوس کرتی اگر وہ یہ جان جاتا کہ۔۔۔۔

وہ اب اسے فلائٹ کا بتا رہا تھا۔

"تم نے مجھے کپڑوں کا کلر نہیں بتایا؟" سالار کو بات کرتے کرتے یاد آیا۔ "تم نے ممی کے ساتھ جاکر کپڑے لیے تھے؟"

"ہاں لیے ہیں میں نے۔۔۔ جو آج پہنوں گی وہ ہیزل گرین ہے۔"

"ہیزل گرین؟" وہ بے اختیار اٹکا۔ "وہ تو آنکھیں ہوتی ہیں۔"

"آنکھوں کا کلر ہوتا ہے۔" ہمیشہ کی طرح اس نے تصحیح کی۔

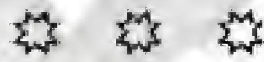
"اوہ۔۔۔ آج میں جینفر کی آنکھوں کو غور سے دیکھوں گا۔" اس نے ڈنر پر اپنی کسی ساتھی کا نام لیا۔

"کیوں؟"

"اس کی آنکھوں میں مجھے اپنی وائف کے کپڑوں کا کلر نظر آئے گا۔" وہ سنجیدہ تھا۔ وہ بے اختیار ہنس پڑی۔

"امامہ! جب سے میں یہاں آیا ہوں' آج پہلی بار تم ہنسی ہو۔" سالار نے اس کی ہنسی کو نوٹس کیا تھا۔

"اور شادی کے بعد اتنے مہینوں میں یہ پہلا کلر ہے جسے تم نے Identify کیا تھا اور وہ بھی کسی عورت کی آنکھوں کی وجہ سے۔"
"تم جیلس ہو رہی ہو؟" وہ بھی ہنس پڑا تھا۔
"ہاں اب بس یہی تو ایک کام رہ گیا ہے میرے کرنے کے لیے۔"
اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔
"یعنی نہیں ہو رہیں یا نہیں ہو سکتیں؟"
وہ پوچھ رہا تھا اور وہ جواب نہ دے سکی۔ اس کی خاموشی پر وہ ہنسا تھا۔
"اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے؟" وہ کچھ جز بز ہوئی تھی۔
"اپنی خوش فہمی پر ہنسا ہوں ہم کم از کم کسی عورت سے میرے لیے تو جیلس نہیں ہو سکتیں۔"
وہ اسے تنگ کر رہا تھا اور وہ جانتی تھی اس کا اشارہ رمشہ کی طرف تھا۔
"تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ کب آ رہے ہو؟"
اس نے بات بدلنا بہتر سمجھا تھا اور وہی گھسا پٹا سوال کیا جو وہ اس سے کرتی آ رہی تھی۔



وہ عید کے دوسرے دن رات کی فلائٹ سے واپس لاہور آگئی تھی۔ کیونکہ اگلی رات آٹھ بجے کی فلائٹ سے وہ واپس آ رہا تھا۔ وہ زود رنجی اور حساسیت جو پچھلے چار ہفتوں سے اسے ناخوش رکھے ہوئے تھی' وہ یک دم جیسے کہیں غائب ہو گئی تھی۔
اور چار ہفتے کے بعد بالآخر اس نے کیک کا وہ ٹکڑا اور وہ کین ڈسپوز آف کر دیے۔
اگر فرقان کو سیدھا ہاسپٹل سے ایئرپورٹ نہ جانا ہوتا تو وہ خود اسے ریسیو کرنے چلی جاتی' وہ کچھ اتنی ہی ایکسائیٹڈ ہو رہی تھی۔
نو بج کر پینتالیس منٹ پر بالآخر ڈور بیل بجی تھی اسے دروازے تک پہنچنے میں سیکنڈز لگے تھے۔
"خدایا! کیا خوشی اس کو کہتے ہیں جو اس شخص کے چہرے پر پہلی نظر ڈالتے میں نے محسوس کی ہے؟" اس نے دروازہ کھول کر ڈور ہینڈل پر اپنا کپکپاتا ہاتھ رکھے سالار کو دیکھ کر اچنبھے سے سوچا تھا۔
فرقان سے باتیں کرتا دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ سیدھا ہوا اور ان دونوں کی نظریں ملیں۔ وہی گرم جوش مسکراہٹ 'جس کی وہ عادی تھی اور ہمیشہ کی طرح سلام میں بھی پہل اسی نے کی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی چند لمحوں کے لیے جیسے ساکت ہو گئی تھی۔
"امامہ! سامان کی ڈلیوری دینے آیا ہوں' چیک کر لو کوئی بریکیج یا ڈیمیج تو نہیں ہے۔" فرقان نے ایک سوٹ کیس کھینچ کر اندر لے جاتے ہوئے اس کو چھیڑا۔ سالار مسکرایا تھا۔
امامہ نے سلام کا جواب دینے کی کوشش کی تھی 'لیکن اس کے گلے میں کوئی گرہ لگنے لگی تھی۔ بات گلے کی گرہ تک رہتی تو ٹھیک تھی 'لیکن آنکھوں میں پانی کیسے اور کیوں آگیا تھا؟ وہ آگے بڑھا اور اس نے ہمیشہ کی طرح اسے گلے لگایا' جیسے وہ آفس سے آنے کے بعد لگایا کرتا تھا بے اختیار' بے ساختہ آنسوؤں کا ایک اور ریلا آیا۔ یہی چیز تو وہ ڈھونڈتی پھر رہی تھی' پچھلے چار ہفتوں سے' یہی نرم لمس' اپنے گرد بازوؤں کا یہی حصار۔ اس کے ساتھ لگے اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ اس کے جسم سے اٹھتی کلون کی مہک' ڈریسنگ ٹیبل پر کلون کی شیشی سے اٹھتی

مہک سے بالکل الگ تھی۔ وہ اس کے جسم پر لگنے کے بعد زیادہ مسحور کن تھی' زیادہ جان لیوا تھی۔
"کیسی ہو تم؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ گلے کی گرہیں اور بڑھ گئی تھیں۔ اس نے اب اسے خود سے الگ کیا اور اس کا چہرہ اور آنسو دیکھے۔
"کیا ہوا؟" وہ ٹھٹکا اور سوٹ کیس اندر لے جاتے ہوئے فرقان نے پلٹ کر دیکھا۔
"میں ابھی... ابھی سلاد کے لیے پیاز کاٹ رہی تھی۔" اس نے کچھ گھبراہٹ میں مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ پھر شاید اسے خود ہی یہ بہانہ کمزور لگا۔ "وہ سر میں بھی کچھ درد تھا... اور فلو تھا۔" وہ فرقان کی مسکراتی ہوئی نظروں سے کچھ گڑبڑائی تھی۔
سالار نے فرقان کو نظرانداز کیا اور اسے ایک بار پھر ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔
"تو یار! کوئی میڈیسن لینی چاہیے تھی۔"
"کوکنگ رینج پر کچھ رکھ کر آئی ہوں۔" وہ رکے بغیر کچن میں چلی آئی۔
اس کے سامنے کھڑے رہ کر' اس سے نظریں ملا کر' جھوٹ بولنا بڑا مشکل ہو گیا تھا۔ سنک میں چہرے پر پانی کے چھپاکے مارنے کے بعد اس نے کچھ پانی پیا۔ آواز کی تھرتھراہٹ صرف اسی طرح ختم ہو سکتی تھی۔ وہ دونوں اب اس کے عقب' لاؤنج میں' کچن کاؤنٹر کے پاس کھڑے باتیں کر رہے تھے اور ان میں سے کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اپنا چہرہ کچن رول سے تھپتھپا کر اس نے چند گہرے سانس لے کر خود کو نارمل کیا۔
"بیٹھو! کھانا کھا کر جاؤنا۔" وہ جب لاؤنج میں آئی تو سالار' فرقان سے کہہ رہا تھا۔
"نہیں' اس وقت نہیں' کھانے پر انتظار کر رہے ہوں گے بچے۔ کچھ دنوں کے بعد چلیں گے کہیں ڈنر کے لیے۔" وہ بیرونی دروازہ کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ سالار دروازے تک اسے چھوڑنے گیا۔ وہ کچن میں آکر کھانے کے برتن نکالنے لگی۔
وہ دروازے سے واپسی پر کچن میں سیل فون پر بات کرتے ہوئے آیا تھا' فون پر سکندر تھے۔ امامہ نے اسے کچن کاؤنٹر پر رکھی پانی کی بوتل کو کھولتے دیکھا۔ فون کندھے اور کان کے بیچ دبائے اس نے بوتل کا ڈھکن کھولا۔ امامہ نے اس کے گلاس کی طرف جانے سے پہلے' ایک گلاس لا کر اس کے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ سالار کے ہاتھ سے بوتل لے کر اس نے گلاس میں اس کے لیے پانی ڈالا۔ سالار نے سکندر سے بات کرتے ہوئے سر کے اشارے سے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر پانی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔
"پاپا' خیریت پوچھ رہے ہیں تمہاری۔"
فریج کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ مسکرائی۔
"میں اب ٹھیک ہوں۔" سالار نے اس کے جملے پر غور کیے بغیر سکندر تک اس کا جملہ پہنچا دیا۔
کاؤنٹر پر پڑے سلاد میں سے سیب کا ایک ٹکڑا کانٹے سے اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے' وہ اسی طرح فون پر سکندر سے بات کرتے ہوئے کچن سے نکلا۔ امامہ نے اسے ٹیرس کا دروازہ کھول کر ٹیرس کے پودوں پر نظر دوڑاتے دیکھا۔ ٹیبل پر برتن رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر نمی آنے لگی۔ ایک مہینہ کے بعد یہ جگہ اسے "گھر" لگی تھی اور اس کی وجہ گھر میں گونجتی وہ "آواز" اور ادھر سے ادھر جاتا اس کا وجود تھا۔ برتن رکھنے کے باوجود وہ جیسے بے اختیاری کے عالم میں ٹیبل کے پاس کھڑی' فون کان سے لگائے' سالار کو ٹیرس پر ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ بات محبت کی نہیں' عادت کی تھی۔ اسے اس کی عادت ہو گئی تھی اور عادت بعض دفعہ محبت سے بھی زیادہ جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔

اسے اچانک خیال آیا کہ وہ کھانا کھانے سے پہلے کپڑے تبدیل کرے گا۔ بیڈ روم میں جا کر وہ اس کے لیے کپڑے نکال کر واش روم میں لٹکا کر آئی۔
وہ واش روم سے نکل رہی تھی' جب بیڈ روم میں داخل ہوا۔
"میں شاور لے کر کھانا کھاؤں گا۔" اس نے جیسے اعلان کیا تھا۔
وہ نہ بھی کہتا پھر بھی وہ جانتی تھی' وہ سفر سے واپسی پر ہمیشہ نہا کر ہی کھانا کھاتا تھا۔
"میں نے تمہارے کپڑے اور تاولز رکھ دیے ہیں اور یہ میں تمہارے لیے نئے سلیپرز لے کر آئی تھی۔" وہ سلیپرز کا ڈبا شو ریک سے نکالتے ہوئے بولی۔
"رہنے دو امامہ! میں خود ہی نکال لوں گا۔"
رسٹ واچ اتارتے ہوئے اس نے امامہ کو منع کیا۔ اسے کبھی بھی کسی دوسرے کا اپنا جوتے اٹھانا پسند نہیں تھا' وہ جانتی تھی۔ لیکن اس کے منع کرنے کے باوجود وہ سلیپرز نکال لائی تھی۔
"کچھ نہیں ہوتا۔" اس نے سلیپرز اس کے پاس رکھ دیے۔
وہ اب بیڈ پر بیٹھا اپنے جوتے اور جرابیں اتار رہا تھا اور وہ بے مقصد اس کے پاس کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ شادی کے اتنے مہینوں میں آج پہلی بار وہ اس طرح بے مقصد اس کے پاس کھڑی تھی۔ سالار نے کچھ حیرانی سے نوٹس کیا تھا۔
"یہ یلو کپڑے تم نے میرے انتظار میں پہنے ہیں؟" اس نے جرابیں اتارتے ہوئے امامہ کو چھیڑا۔ وہ بے وجہ ہنسی۔ وہ مسٹرڈ کو یلو کہہ رہا تھا' لیکن آج اس نے اس کی تصحیح نہیں کی اور اس نے آج بھی اس کی تعریف نہیں کی تھی' مگر اسے یہ بھی برا نہیں لگا تھا۔

"نائس سلیپرز!" اپنی جرابیں اور جوتے اٹھاتے ہوئے اس نے سلیپرز پہنے اور امامہ سے کہا۔
"میں رکھتی ہوں۔" امامہ نے جوتے اور جرابیں اس سے لینے کی کوشش کی۔
"کیوں یار' پہلے کون رکھتا ہے؟" سالار نے کچھ حیرانی سے اسے روکا' امامہ رک گئی۔ واقعی وہ اپنے جوتے خود اٹھانے کا عادی تھا۔ جوتے شو ریک میں رکھتے ہوئے اس نے لانڈری باسکٹ میں جرابیں ڈالیں اور واش روم میں گھس گیا۔
امامہ نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑی اس کی رسٹ واچ اور سیل فون کو دیکھا۔ ہر خالی جگہ بھرنے لگی تھی۔
وہ جب تک نہا کر آیا امامہ کھانا لگا چکی تھی۔ سالار نے ڈائننگ ٹیبل پر نظر ڈالتے ہی بے اختیار کہا۔
"امامہ! کیا کیا پکا رکھا ہے یار!"
"جو' جو تمہیں اچھا لگتا ہے۔" اس نے سادگی سے کہا۔
"مجھے۔۔۔؟" وہ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے ٹیبل پر پھیلی ہوئی ڈشز دیکھ کر جیسے کسی سوچ میں پڑا۔
"تم نے اپنا وقت ضائع کیا۔"
کوئی اور وقت ہوتا تو وہ پورے دن کی محنت پر بولے جانے والے اس جملے پر بری طرح ناراض ہوتی' لیکن آج اسے کچھ برا نہیں لگ رہا تھا۔ کسی بات پر غصہ نہیں آ رہا تھا' وہ اتنی ہی سرشار تھی۔
"میں نے اپنا وقت تمہارے لیے استعمال کیا۔" اس نے مدھم آواز میں سالار کی تصحیح کی۔
"لیکن تم تھک گئی ہو گی۔۔۔؟"
"نہیں۔۔۔ کیوں تھکوں گی میں؟" اس نے چاولوں کی ڈش سالار کی طرف بڑھائی۔

سالار نے اس کی پلیٹ میں ہمیشہ کی طرح' پہلے چاول ڈالے۔ اپنی پلیٹ کے ایک کونے میں پڑے ان چاولوں کو دیکھ کر اس کا دل بھر آیا تھا۔ تو اتنے دنوں سے یہ ایک چیز تھی جو وہ مس کر رہی تھی کھانے پر' اور یہ "ایک" چیز نہیں تھی۔ وہ اب اپنی پلیٹ میں چاول ڈال رہا تھا۔ ایک مہینے کے بعد وہ اس کے اتنے قریب بیٹھی تھی۔ کھانا سرو کرتے اس کے ہاتھ دیکھ رہی تھی۔ سفید شرٹ کی آستینیں موڑے' اس کے ہاتھوں نے ہمیشہ کی طرح اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ اس کا دل بے اختیار اس کے ہاتھ چھونے کو چاہا' اس نے بمشکل نظر ہٹائی' خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے یہ یک دم بہت مشکل ہو رہا تھا کہ وہ اس کے قریب ہو' اور وہ صرف کھانے کی طرف متوجہ رہے۔

"پینٹنگز مکمل ہو گئی ہیں تمہاری؟"

وہ کھانا شروع کرتے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا۔ امامہ نے چونک کر ٹیبل پر پڑا کانٹا اور چمچ اٹھایا۔

"کون سی پینٹنگز؟" اس نے بے خیالی میں کہا' وہ ٹھٹکا۔

"تم بنا رہی تھیں نا' کچھ؟" اس نے یاد دلایا۔

"یہ بھی لو۔" جواب دینے کے بجائے اس نے ایک اور ڈش اس کی طرف بڑھائی۔

"ڈر تو نہیں لگا تمہیں' یہاں اکیلے رہتے ہوئے؟" سالار نے اس سے پوچھا۔

"کھانا اچھا ہے؟" امامہ نے ایک بار پھر جواب گول کیا۔ وہ مزید جھوٹ نہیں بول سکتی تھی' بالکل ویسے ہی جیسے وہ سچ نہیں بول سکتی تھی۔

"ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔" وہ مسکرایا تھا۔

"کتنے ناولز پڑھے تم نے؟" وہ اب پوچھ رہا تھا۔

"یہ چوپس بھی ہیں۔" اس نے ایک اور ڈش سرو کی۔

"تمہاری فلائٹ ٹھیک رہی؟"

اس سے پہلے کہ وہ اس سے کوئی مشکل سوال کرتا' اس نے پوچھنا ضروری سمجھا تھا۔

"ہاں! اوور آل' کچھ bumpy رہی۔۔۔ لیکن ٹھیک ہی تھی۔" اس نے بتایا۔

"اور کانفرنس بھی اچھی رہی؟"

"ایکسی لینٹ" اس نے بے اختیار کہا۔

"کیا روٹین تھیں تمہاری؟" وہ اسے موضوع سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔

"میری روٹین۔۔۔" وہ سوچ میں پڑی۔

"ہاں! کیا کیا کرتی تھیں سارا دن؟" وہ اب چپاتی کا ٹکڑا توڑتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"جو پہلے کیا کرتی تھی۔" اس نے نظریں چرا کر ایک اور ڈش اس کی طرف بڑھائی۔

"لیکن تب تو بہت زیادہ وقت ہوتا ہوگا تمہارے پاس۔" اس نے کرید تھا۔

"بالکل ساری شام' ساری رات۔"

"پھر تو عیش ہو گئے ہوں گے تمہارے؟" اپنی پلیٹ میں قورمہ نکالتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا۔

امامہ نے جواب دینے کے بجائے اپنی پلیٹ کو دیکھا جس میں چیزوں کا ڈھیر بالکل اسی طرح پڑا تھا۔ اس سے کچھ کھایا نہیں جا رہا تھا۔ سالار کو اتنی رغبت کے ساتھ کھاتے دیکھ کر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا پیٹ بھر رہا ہو۔

"تم سعیدہ اماں کو یہاں لے آتیں۔" سالار نے یک دم اس سے کہا۔ اسے پتا نہیں کیا خیال آیا تھا۔

"میں نے کہا تھا ان سے ' لیکن تمہیں تو پتا ہے' وہ اتنے دنوں کے لیے اپنا گھر نہیں چھوڑ سکتیں۔"
اس نے جواب دیا۔
"That's understandable"۔ "سالار نے کھانا کھاتے ہوئے بے اختیار ایک نوالہ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ آخری لقمہ ہمیشہ اسے ہی کھلاتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ ٹھٹکی پھر اس نے لقمہ منہ میں لے لیا' لیکن وہ اسے چبا نہیں سکی۔ وہ لقمہ جیسے آخری حد ثابت ہوا' وہ بے اختیار رو پڑی۔ وہ پانی پیتے پیتے ایک دم رک گیا۔
"کیا ہوا؟" وہ ہکا بکا تھا۔ ہونٹوں پر ہاتھ رکھے وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔
"کیا ہوا ہے امامہ؟" وہ بری طرح بدحواس ہوا۔ کم از کم اس وقت اس طرح کی گفتگو کے دوران آنسو۔۔۔؟ وہ ان کی وجہ تلاش نہیں کر سکا۔
ایک دفعہ آنسو بہہ جانے کے بعد سب کچھ آسان ہو گیا تھا۔ مزید رونا' بے بسی کا اظہار اور کمزوری کا اعتراف۔ اب مزید دیواریں کھڑی رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔
"فار گاڈ سیک۔۔۔ تم بتا دو گی مجھے کیا ہوا ہے۔۔۔؟ سب کچھ ٹھیک رہا میرے بعد؟ کسی نے تمہیں پریشان تو نہیں کیا؟" وہ اب مکمل طور پر حواس باختہ تھا۔ ٹشو پیپر سے آنکھیں رگڑتے ہوئے امامہ نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سر ہلایا۔
"تو پھر کیوں رو رہی ہو؟" سالار مطمئن نہیں ہوا تھا۔
"ایسے ہی بس میں تمہیں بہت مس کرتی رہی اس لیے۔" وہ کہتے کہتے پھر رو پڑی۔
کیا شرمندگی سی شرمندگی تھی جو اس نے یہ اعتراف کرتے ہوئے محسوس کی تھی۔ سالار کو لگا اسے سننے میں کچھ غلطی ہوئی تھی۔
"کس کو مس کیا؟"
"تمہیں۔" اس نے سر جھکا کر روتے ہوئے کہا۔ وہ چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گیا۔

"مجھے کس لیے؟" یہ بے یقینی کی انتہا تھی۔
وہ روتے روتے ٹھٹکی۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا' پھر بے حد خفگی کے عالم میں ٹیبل سے اپنی ڈنر پلیٹ اٹھاتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی۔
"میرا دماغ خراب ہو گیا تھا اس لیے۔" وہ کچھ بول نہیں سکا۔
شادی کے تقریباً" چار ماہ میں اس نے پہلی بار یہ جملہ اس سے کہا تھا' ورنہ وہ آئی لو یو کے جواب میں بھی تھینک یو کہنے کی عادی تھی۔
وہ اب برتن اٹھا اٹھا کر اندر لے جا رہی تھی اور سالار بالکل ہونق سا پانی کا گلاس ہاتھ میں لیے' اسے اپنے سامنے سے برتن ہٹاتے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے رونے سے بھی اتنا حواس باختہ نہیں ہوا تھا' جتنا اس کے اس معمولی سے اعتراف سے ہو گیا تھا۔
وہ شاکڈ نہ ہوتا تو کیا کرتا۔ وہ چار ہفتے پہلے بڑے دھڑلے سے اسے کہہ رہی تھی کہ۔۔۔ اور پانی کا گلاس ہاتھ میں لیے بت کی طرح کرسی پر بیٹھے' کوئی اس کے سامنے جیسے کسی معمہ کے ٹکڑے ترتیب دینے لگا تھا۔ وہ چار ہفتے باہر رہ کر اس کے جس رویے کو سمجھنے کی کوشش میں ناکام ہو گیا تھا' وہ اب سمجھ میں آ رہا تھا۔ یہ ناقابل یقین تھا کم از کم اس کے لیے کہ امامہ اسے۔۔۔
اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ کچن میں ادھر سے ادھر جاتے ہوئے اسی طرح آنکھیں رگڑتے ہوئے چیزیں سمیٹ رہی تھی۔

وہ گلاس ٹیبل پر رکھ کر کچن میں آگیا' وہ فریج سے سویٹ ڈش نکال رہی تھی۔ سالار نے اس کے ہاتھ سے ڈونگا پکڑ کر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ کچھ کہے بغیر اس نے اسے گلے لگایا تھا۔ بڑی نرمی سے یوں جیسے تلافی کر رہا ہو' معذرت کر رہا ہو۔ وہ خفگی سے الگ ہونا چاہتی تھی' اس کا ہاتھ جھٹکنا چاہتی تھی' لیکن بے بس تھی۔ فی الحال دنیا میں وہ واحد شخص تھا جو اسے اس طرح گلے لگاتا تھا۔ برسات پھر ہونے لگی تھی۔ وہ اس کی عادتیں خراب کر رہا تھا کسی پیراسائٹ کی طرح اُسے اپنا محتاج کر رہا تھا۔

وہاں کھڑے دونوں کے درمیان ایک لفظ کا بھی تبادلہ نہیں ہوا تھا' کوئی معذرت' کوئی اظہار محبت' کچھ نہیں۔ زندگی کے اس کھیل میں لفظ فالتو تھے' جس میں وہ لیڈ کر رہے تھے۔

برسات تھمنے لگی تھی۔ وہ ہاتھ سے گال اور آنکھیں خشک کرتی اس سے الگ ہو گئی۔

"دراصل میں گھر میں اکیلی تھی اس لیے مس کرتی رہی۔"

انکار' اقرار' اعتراف' پھر انکار۔ یہ مشرقی عورت کی زندگی کا دائرہ تھا' وہ بھی اسی دائرے میں گھومنے لگی تھی۔ جھوٹ کی ضرورت پھر آن پڑی تھی۔ اپنے گرد کھڑی دیوار کے شگاف کو اس نے پھر سے بھرنا شروع کر دیا۔

"ہاں' اکیلے ہوں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" سالار نے اس جھوٹ کو سچ بنانے میں اس کی مدد کی۔ امامہ کا حوصلہ بڑھا۔

"دانت میں درد تھا تو... تو... اس لیے مجھے رونا آگیا۔" وہ اٹکی پھر اس نے کہا۔

"ہاں' مجھے اندازہ ہے دانت کا درد بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ہوا تھا مجھے... میں جانتا ہوں کیا حالت ہوتی ہے۔" ایک دوسرے کے سامنے کھڑے' وہ نظریں ملائے بغیر جھوٹ بول رہے تھے۔

"آ... آ..." وہ اٹکی' اب تیسرا جھوٹ ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ جو سوال آ رہا تھا' اس نے وہی پوچھا "تم نے مجھے مس نہیں کیا؟" وہ پھر گلی کے اسی موڑ پر آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

"ہر دن' ہر گھنٹہ' ہر منٹ' ہر سیکنڈ۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہا تھا اور امامہ کی آنکھوں میں جیسے ستارے جھلملانے لگے تھے۔ بعض دفعہ ہم کوئی فلاسفی' کوئی حقیقت نہیں سننا چاہتے' بس وہی روایتی باتیں سننا چاہتے ہیں' جنہیں فلم کے پردے اور کتاب کے صفحے پر ہم ہزاروں بار پڑھتے ہوئے ہنستے ہیں' وہ بھی روایتی باتیں کر رہا تھا' وہی جملے جو اس وقت اس کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔

"چار ہفتے تمہارے ساتھ نہیں تھا۔ اگر تمہارا خیال ساتھ نہ ہوتا تو میں مر جاتا۔"

"تم جھوٹے ہو۔" وہ بھرائی آواز میں روتے ہوئے ہنسی تھی۔

"تم بھی۔" سالار نے بے ساختہ جتایا۔

وہ روتے ہوئے ہنس رہی تھی یا ہنستے ہوئے رو رہی تھی' لیکن چار ماہ میں پہلی بار سالار کے لیے وہ برسات قابل اعتراض نہیں تھی۔ اتنے عرصے میں پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ "برسات" اسے کبھی بھی ڈبو سکتی ہے۔



وہ اس رات بیڈ پر اس سے چند انچ دور کروٹ کے بل لیٹے' کہنی تکیے پر ٹکائے اس سے باتیں کرتی رہی تھی۔ ایک مہینے کے دوران اکٹھی ہو جانے والی ساری باتیں۔ بے مقصد' بے معنی چیزوں اور واقعات کی تفصیلات' کس کی کال آئی' کس سے اس کی کیا بات ہوئی' ملازمہ نے اس سے کیا کہا' ٹی وی پر چلنے والے کسی پروگرام میں اس نے کیا دیکھا' کون سے میگزین میں اس نے کیا پڑھا۔ ٹیرس پر رکھے کتنے پودوں پر نئے پھول نکلے ہیں' فرقان اور

نوشین کے بچے کتنی بار اس کے گھر آئے' وہ نوشین کے ساتھ کتنی بار بازار گئی' کیا خریدا' کیا پسند نہیں آیا۔

اسے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ صرف وہ بول رہی تھی۔ سالار بالکل خاموش چت لیٹا اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے' اسے سن رہا تھا۔ ایک ہاتھ پر سر ٹکائے' وہ دوسرے ہاتھ سے غیر محسوس انداز میں اس کے بازو پر انگلی سے چھوٹے بڑے دائرے بناتے ہوئے اس سے باتیں کرتی رہی۔ وہ "خاموش سامع" پلکیں جھپکائے بغیر صرف اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

اس کی آنکھوں کے تاثرات' اس کے چہرے پر جھلکنے والے رنگ' اس کے ہونٹوں کی حرکت' بات کرتے ہوئے اس کی ہنسی کی کھلکھلاہٹ' اس کے چہرے پر کھلنے والے رنگ' وہ جیسے سینما کی فرنٹ رو میں بیٹھا ہوا ایک سحر زدہ ناظر تھا۔ کہنی کے بل نیم دراز' جب وہ تھک جاتی تو پھر اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہتی "اچھا' چلو اب سوجاتے ہیں۔"

یہ جملہ وہ شاید چھتیس دفعہ کہہ چکی تھی۔

اس کے کندھے پر سر رکھے اسے پھر کچھ یاد آتا تو وہ یک دم سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھتی "میں نے تمہیں یہ بتایا ہے کہ۔۔۔؟"

سالار نفی میں سر ہلا دیتا' گفتگو پھر دوبارہ وہیں سے شروع ہو جاتی۔ خاموش سامع پھر "وہی" فلم دیکھنے لگتا۔

"یہ کون سی اذان ہو رہی ہے؟" وہ بات کرتے کرتے چونکی۔

دور کہیں سے اس نے اذانوں کی آوازیں سنی تھیں۔

"فجر کی۔" سالار نے پرسکون انداز میں کہا۔ وہ بری طرح گڑبڑائی۔

"اوہ مائی گاڈ! فجر ہوگئی۔۔۔ اور میں۔۔۔ تمہیں تو سونا چاہیے تھا' تم تو تھکے ہوئے تھے۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ تم مجھ سے کہہ دیتے۔" وہ اب بری طرح نادم ہو رہی تھی۔ "مجھ سے کہنا چاہیے تھا تمہیں۔ کیوں نہیں کہا تم نے؟"

"کیا کہتا؟" وہ اب پرسکون تھا۔

"یہی کہ تم سونا چاہتے ہو۔"

"لیکن میں تو سونا نہیں چاہتا تھا۔"

"لیکن مجھے تو وقت کا پتا نہیں چلا' کم از کم تمہیں بتانا چاہیے تھا مجھے۔" وہ واقعی شرمندہ ہو رہی تھی۔

"تمہارا خیال ہے' مجھے وقت کا احساس تھا؟"

"تم سو جاؤ اب اور آئی ایم سوری۔۔۔ کتنی فضول باتیں کیں میں نے' تم بھی کیا سوچ رہے ہو گے؟" اسے اب احساس ہوا تھا کہ وہ کتنی دیر سے اکیلی ہی بول رہی تھی۔ وہ ہوں ہاں تک نہیں کر رہا تھا۔

"میں تو نماز پڑھ کر سوؤں گا اب اور میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ آج تم نے مجھ سے اتنی باتیں کیسے کرلیں۔"

"تم نے تو غور سے سنی بھی نہیں ہوں گی میری باتیں۔" وہ کچھ شرمندگی سے مسکرائی۔

"ایک ایک بات سنی ہے۔ چاہو تو شروع سے دہرا دیتا ہوں۔ آج تک تم نے جب جب' جو جو کہا ہے' مجھے یاد ہے۔ ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

اس کا لہجہ ہموار تھا' لیکن آنکھوں میں کوئی تاثر تھا جس نے چند لمحوں کے لیے امامہ کو باندھا تھا۔

"اسی طرح باتیں کرو گی تو ہر رات جاگ سکتا ہوں تمہارے لیے۔" امامہ نے نظریں چرالیں۔

بعض دفعہ اس سے نظریں ملانا' اس کی باتوں پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اور بعض دفعہ اس زندگی کے بارے میں بھی کچھ کہنا مشکل ہو جاتا تھا جو وہ اس کے ساتھ گزار رہی تھی۔

اس سے کچھ دور ہٹتے ہوئے اس نے تکیے پر سر رکھ دیا۔ وہ اب سیدھی لیٹی چھت کو دیکھ رہی تھی۔
سائیڈ ٹیبل پر پڑے سیل فون کے یکدم بجتے الارم کو بند کرتے ہوئے سالار نے اس کی طرف کروٹ لی۔ کہنی کے بل نیم دراز اس نے امامہ سے کہا۔

"کچھ اور بتانا ہے تم نے؟" امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ سنجیدہ تھا۔

"نہیں۔" اس نے مدھم آواز میں کہا۔

"آئی لو یو۔" جواباً" سالار کے جملے نے چند لمحوں کے لیے اسے ساکت کیا۔ وہ اس کے پاس تھا' اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا جیسے جواباً" اس سے کچھ سننے کی خواہش رکھتا ہو۔ امامہ نے کبھی اس کی آنکھوں کو اتنی آسانی سے نہیں پڑھا تھا۔ شاید وہ اتنے قریب تھا اس لیے... وہ جیسے اپنی آنکھوں سے اسے ہپناٹائز کیے ہوئے تھے۔

"تھینک یو۔"

وہ بے اختیار ہنسا۔ ایک گہرا سانس لے کر' ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کرتے ہوئے' اس نے جیسے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ بعض خواہشیں کوشش سے پوری نہیں ہوتیں اور بعض سوالوں کا کوئی جواب نہیں مل پاتا۔

وہاں اس کے اتنے قریب کوئی اور عورت ہوتی تو اسے "اظہار محبت" ہی ملتا۔ یہ امامہ ہاشم تھی' اس کا "اظہار تشکر" ہی کافی تھا۔ اس پر جھکتے ہوئے اس نے بہت نرمی سے اس کے ہونٹ چھوئے پھر اس کا ماتھا پھر وہ بیڈ سے اٹھ گیا۔



"یہ میں تمہارے لیے لایا تھا۔" وہ دس بجے کے قریب اس کے ساتھ ناشتہ کرنے کے بعد ٹیبل صاف کر رہی تھی' جب وہ بیڈ روم سے ایک خوب صورت پیکنگ میں ایک باکس لے کر اس کے پاس آیا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" وہ ٹیبل صاف کرتے کرتے رک گئی۔

"دیکھ لو۔" سالار نے باکس اس کی طرف بڑھایا۔

"جیولری ہے؟" اس کو ———— لیبل اور باکس کے ڈیزائن سے کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ سالار جواب دینے کے بجائے کندھے اچکا کر خاموش رہا۔ امامہ نے بڑے تجسس اور احتیاط سے اس باکس کی بے حد نفیس اور خوب صورت پیکنگ کو ہٹا کر باکس کھول لیا۔ سرخ مخمل جیسے ایک بے حد مہین اور چمک دار کپڑے کی تہوں کے درمیان ایک کرسٹل رنگ کیس تھا اور اس کیس سے نظر آنے والی رنگ نے کچھ دیر کے لیے اسے ساکت کر دیا تھا۔ اسکوائر ڈائمنڈز کے بینڈ کے ساتھ وہ ایک پلاٹینم ٹیولپ ڈائمنڈ رنگ تھی۔ چودہ قیراط کے اس ڈائمنڈ کے گرد ننھے ننھے نیلم کے گول گول نگینوں کا ایک دائرہ تھا۔ بہت دیر... مسمرائزڈ اس رنگ پر نظریں جمائے' اس نے بے اختیار گہرا سانس لے کر اپنا پہلا رد عمل دیا۔ یہ صرف ڈائمنڈ ہی نہیں تھے جو اس کی نظروں کو خیرہ کر رہے تھے' بلکہ وہ پیچیدہ ڈیزائن بھی جس میں وہ سارے جیولز جڑے تھے۔

"یہ بہت خوب صورت ہے۔" اس نے بمشکل کہا۔ سالار نے ہاتھ بڑھا کر کرسٹل کا کیس کھول کر رنگ کو نکال لیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے وہ رنگ اس کی انگلی میں پہنا دی۔

"ہاں یہ اب خوب صورت لگ رہی ہے۔"

رنگ پہنانے کے بعد اس نے اس کے ہاتھ پر ایک نظر ڈالنے کے بعد کہا۔

"اور دیکھو! یہ بالکل میری انگلی کے سائز کے مطابق ہے۔" وہ جیسے کچھ اور ایکسائیٹڈ ہوئی تھی۔

"تمہاری انگلی کا سائز لے کر بنائی گئی ہے کیونکہ تمہاری ایک رنگ لے کر گیا تھا میں۔"

اس نے اس ہاتھ کو چومتے ہوئے کہا جس میں وہ رنگ تھی۔ اس رنگ نے اس کے ہاتھ کو سجا دیا تھا۔ وہ جس ہاتھ میں بھی ہوتی دیکھنے والے پر ایسا ہی تاثر چھوڑتی۔

"یہ ویڈنگ گفٹ ہے تمہارے لیے۔" سالار نے اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔ اس نے کچھ حیران ہو کر سالار کو دیکھا۔

"ویڈنگ گفٹ۔۔۔؟ چار ماہ ہوگئے ہیں شادی کو۔"

"ہاں! میں نے تمہیں ویڈنگ گفٹ نہیں دیا تھا۔ پہلے یاد نہیں تھا' بعد میں پیسے نہیں تھے۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"اور اب کہاں سے آئے پیسے؟"

"آگئے کہیں سے۔" اس نے ٹالا۔ امامہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کوئی غلط کام نہیں کیا میں نے۔" وہ بے اختیار شرمندہ ہوئی۔

"میں نے کب کہا کہ۔۔۔"

"چلو! ڈاکٹر صاحب کے ہاں چلتے ہیں اور سعیدہ اماں سے بھی مل کر آتے ہیں۔ میرے بیگ میں کچھ گفٹس ہیں ان کے لیے' وہ نکال لو۔" سالار نے اسے بات مکمل کرنے نہیں دی تھی۔

"تھینک یو سالار!" وہ جاتے جاتے ٹھٹکا۔

"کس لیے؟"

"ہر چیز کے لیے۔"

"یہ سب تمہارا ہی ہے۔" امامہ نے نظریں چرائیں۔

"میں نے سوچا تمہیں یاد بھی نہیں ہو گا کہ تم نے مجھے شادی پر کوئی گفٹ نہیں دیا۔" اپنے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے خوشی سے سرشار ہو رہی تھی۔ وہ واحد گلہ تھا جو وہ اپنے دل میں سالار کے لیے رکھے ہوئے تھی۔

"نہیں بھولا نہیں تھا۔۔۔"

امامہ کو لگا کہ وہ کچھ اور کہنا چاہتا ہے۔ سالار نے بات ادھوری چھوڑی تھی یا بدلی تھی' یہ وہ سمجھ نہیں سکی۔



"مائی گاڈ۔۔۔! دیکھو۔" وہ واک وے پر چلتے چلتے بے اختیار ٹھٹکی تھی۔

سالار نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ وہ دونوں ریس کورس میں لگنے والے ایک میلے کو دیکھنے آئے تھے۔ اب بے مقصد میلے کی جگہ سے کچھ دور چہل قدمی میں مصروف تھے' جب امامہ اس واک وے کے داہنی طرف درختوں کے اطراف' پانی میں ڈوبی ہوئی گھاس میں نظر آنے والے عکس کو دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ وہ پچھلی رات کی بارش کا پانی تھا جو ابھی پوری طرح ڈرین آؤٹ نہیں ہو سکا تھا۔ دیو قامت درختوں کے تنوں اور شاخوں پر لگے رنگین برقی قمقموں اور ٹیوب لائٹس کا عکس نیچے جمع شدہ پانی میں پڑ رہا تھا۔

اس عکس کو دیکھتے ہوئے وہ بھی کچھ دیر کے لیے اسی طرح سحر زدہ سا ہو کر رہ گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی رنگ و نور سے بھری کسی وادی کے کنارے کھڑے' اس میں چمکتے ہوئے رنگین ہیرے جواہرات کے درخت دیکھ رہے ہوں یا الف لیلیٰ کا کوئی منظر دیکھ رہے ہوں۔ ہوا کے جھونکوں سے پانی میں بہت ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو رہا تھا اور ان روشنیوں اور درختوں کا عکس منعکس ہو کر جیسے محو رقص تھا۔ طلسم ہوشربا جیسے پانی کی لہروں پر ڈول رہی تھی۔

"یوں لگ رہا ہے جیسے جنت میں رات ہو گئی ہے۔"
طویل خاموشی کے بعد اس نے امامہ کی آواز سنی۔ اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ پلکیں جھپکے بغیر ابھی تک اس پانی کو دیکھ رہی تھی جس کی روشنیوں کا عکس اس کے چہرے پر پڑ رہا تھا۔
"ایسی ہوتی ہو گی جنت؟" سالار نے اسے کہتے سنا۔
وہ کچھ کہنے کے بجائے' دوبارہ اس پانی کو دیکھنے لگا۔ اس وسیع و عریض پارک کی روشنیوں سے بقعہ نور بنے ہوئے حصے میں گھومتے لوگوں کو اندازہ بھی نہیں ہو پا رہا ہو گا کہ وہاں سے بہت دور' ایک نیم تاریک روش پر کھڑے دو لوگ' پانی میں نظر آنے والے ایک عکس میں جنت ڈھونڈ رہے تھے۔
"جنت میں ستارے ہوں گے؟" وہ پوچھ رہی تھی۔
"ہاں! بہت سارے ہوں گے۔" اس نے اندازہ لگایا۔
"اتنے رنگوں کے؟" اس نے ان روشنیوں کے رنگ گنے۔
"کائنات میں موجود ہر رنگ۔" وہ بے اختیار محظوظ ہو کر ہنسی' اسے جواب پسند آیا تھا۔
"رات ایسے ہی منور ہوتی ہو گی؟" عکس پر نظریں جمائے وہ جیسے بے خود ہو رہے تھے۔
"اس سے زیادہ روشن' اس سے زیادہ منور۔" سالار نے بے اختیار کہا۔ وہ جھکی اور اس نے اپنی انگلیوں سے عکس کو چھونے کی کوشش کی۔ سالار نے بروقت اسے کھینچا۔
"درختوں پر لائٹس آن ہیں' پانی میں کرنٹ بھی ہو سکتا ہے۔" وہ ناراض ہوا تھا۔
"میں اسے چھونا چاہتی تھی۔"
"یہ عکس جنت نہیں ہے۔"
"جنت میں اور کیا ہو گا؟"
"تم؟" اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا وہ عکس کو دیکھ رہا تھا۔
"صرف میں اور تم نہیں ہو گے؟" 'پتا نہیں' اس نے گردن موڑ کر بے حد عجیب مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔
"تو پھر تم کیسے جانتے ہو کہ میں وہاں ہوں گی؟" اس نے اسے تنگ کیا۔
"جنت کے علاوہ کہیں اور رکھا جا سکتا ہے تمہیں؟" اس نے جواباً سوال کیا۔ اس کے لہجے میں رشک تھا' وہ ہنس پڑی۔
"اتنی آسانی سے مل جاتی ہے جنت؟" اس نے جیسے سالار کو جتایا۔
"مجھے آسانی سے نہیں ملے گی' تمہیں آسانی سے مل جائے گی۔" اس کا لہجہ پھر عجیب سا تھا۔
"کیوں؟" وہ حیران ہوئی۔
"تم جتنی آسانی سے ہر چیز میں "جنت" ڈھونڈ لیتی ہو' میں آج تک نہیں ڈھونڈ سکا۔ اس لیے کہہ رہا ہوں۔" وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔
دو دن پہلے وہ گھر کے لیے لیمپ خریدنے گئے تھے۔ انہوں نے بیڈ روم کے لیے لیمپس کا ایک سیٹ خریدا اور وہ رات کو ناول پڑھتے پڑھتے لیمپ شیڈ کو دیکھنے لگی۔ وہ ای میل چیک کرنے کے بعد اپنا لیپ ٹاپ بند کرنے لگا تو اس نے امامہ کو دیکھا۔ وہ اب بھی اسی طرح لیمپ شیڈ پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔
"کیا دیکھ رہی ہو تم؟" وہ حیران ہوا۔
"بیوٹی فل۔" اس نے جواباً بے ساختہ اسی طرح لیمپ شیڈ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

سالار نے قدرے حیرانی سے اپنے سائیڈ ٹیبل پر پڑے لیمپ شیڈ کو دیکھا۔
"ہاں! اچھا ہے؟" اس نے سرسری انداز میں کہا۔ وہ خوب صورت لیمپس تھے لیکن اتنے بھی نہیں تھے کہ وہ ان پر یوں نظریں گاڑ کر بیٹھ جاتا۔
"یہ کون سے پھول ہیں؟" وہ ابھی بھی لیمپ شیڈ پر نظریں جمائے کہہ رہی تھی۔
"پھول؟" سالار نے حیرانی سے لیمپ شیڈ کو دوبارہ دیکھا۔ اس نے پہلی بار اس پرل کلر کے شیڈ پر بنے پیٹرن کو دیکھا۔ اس شیڈ کا ٹیکسچر کچھ عجیب تھا۔ کاغذ نما اس کپڑے پر سنہری مائل پیلے پھولوں کا ایک بے حد مہین اور نفیس پیٹرن تھا جو صرف لیمپ کے آن ہونے پر نظر آرہا تھا۔ ان پھولوں میں کہیں کہیں کرمزن کلر کی کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آتی' مدھم پڑتی' پھر چند لمحوں کے بعد وہی چیز چمکتی۔
"نہ یہ گلاب ہیں اور نہ ہی ٹیولپ ہیں' تھوڑا سا بلوبیل سے ملتا جلتا ہے لیکن وہ بھی نہیں۔" وہ جیسے پھولوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی' پھر جیسے اس نے ہتھیار ڈال دیے۔
"ایسے پھول جنت میں ہوں گے۔" وہ ہنس پڑا۔
"اچھا۔"
"دیکھو یہ پھول رنگ بدل رہے ہیں۔۔۔ لیکن یہ رنگ نہیں بدل رہے بلکہ یہ کھل رہے ہیں۔" وہ لیمپ شیڈ پر بنے پھولوں پر اب انگلی پھیر رہی تھی۔ سالار جیسے کسی سحر میں آیا تھا۔ وہ پھول واقعی بار بار کھلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔
"Lovely۔" وہ سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ انہیں اب سمجھ آیا تھا کہ وہ لیمپ اتنے مہنگے کیوں تھے۔ دن کی روشنی میں سیلز مین کبھی انہیں وہ پیٹرن نہیں دکھا سکتا تھا۔ شاید اس لیے اس نے انہیں صرف ڈیزائن اور روشنی ہی کے حوالے سے بتایا تھا۔
اور ایک ہفتہ پہلے اس کی دراز صاف کرتے ہوئے' سالار کی ویسٹ پیپر باسکٹ میں سے وہ ایک پوسٹ کارڈ اس کے پاس لے کر آئی۔
"ہاں! اسے پھینک دیا ہے میں نے۔۔۔ بے کار ہے۔" اس نے ٹی وی دیکھتے ہوئے امامہ کے ہاتھ میں وہ پوسٹ کارڈ دیکھ کر کہا تھا۔ وہ اس کارڈ کو لیے اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔
"سالار! یہ دیکھو کتنی خوب صورت جھیل ہے اور دیکھو کتنا سکون ہے اس جگہ پر۔" سالار نے اس کے ہاتھ سے پوسٹ کارڈ لے کر اس پر ایک نظر دوڑائی۔ وہ کسی پینٹنگ کا پوسٹ کارڈ تھا۔ کسی پینٹر کا بنایا ہوا لینڈ اسکیپ' ایک بہت چھوٹی سی کم گہرے کنارے والی جھیل' جس کے کنارے جنگلی پھولوں سے بھرے ہوئے تھے اور ان پھولوں کا عکس جھیل کے پانی میں نظر آرہا تھا۔ کچھ پھول ٹوٹ کر پانی کی سطح پر تیر رہے تھے۔ جھیل کے کنارے ایک چھوٹی سی لکڑی کی کشتی تھی جس میں صرف ایک چپو پڑا تھا اور وہ کشتی صرف دو افراد کے لیے تھی۔ جھیل کی سطح پر کچھ آبی پرندے تیرتے نظر آرہے تھے۔
"یہ صندل کی لکڑی سے بنی ہوئی ہے۔ اس کشتی کا رنگ دیکھو' یہ صندل کا رنگ ہے۔"
وہ پوسٹ کارڈ پر انگلی پھیرتے ہوئے اسے بتانے لگی تھی۔
"ایسا لگتا ہے جیسے صبح سویرے کوئی اس کشتی میں بیٹھ کر کہیں جاتا ہو۔۔۔ ایک مہکتی' خوشبودار بھیگی ہوئی کشتی میں۔۔۔ اور ہوا چل رہی ہو۔۔۔ اور جھیل میں اس کشتی میں بیٹھے خوشبودار ہوا کے جھونکے۔۔۔ ذرا تصور کرو۔" اس نے بے اختیار گہرا سانس لیا یوں جیسے اپنی فلمی تصویر سے خود محظوظ ہوئی ہو۔
"کتنی Screnity ہے اس سین میں۔۔۔ ایسے جیسے یہ جنت ہو۔۔۔ میں نہ بتاتی تو تم تو اسے پھینک رہے تھے۔"

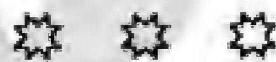
وہ بے اختیار اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ واقعی اس کی زندگی میں نہ آتی تو وہ جنت کو۔۔۔
"اس کی پکچر بنالو سیل فون کے ساتھ۔" امامہ کی آواز نے یک دم اسے چونکا دیا۔ وہ اب بھی اسی عکس کو دیکھنے میں مصروف تھی۔ سالار نے سیل فون نکال کر چند تصویریں کھینچیں اور سیل اسے تھما دیا۔ اس نے باری باری ان تصویروں کو دیکھا اور پھر مطمئن ہو گئی۔
"چلیں؟" سالار نے کہا۔
"ہاں۔" ان دونوں نے ایک آخری نظر اس عکس پر ڈالی اور پھر آگے چل پڑے۔
سالار نے چلتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"خاموش کیوں ہو گئے۔۔۔؟ کوئی بات کرو۔" امامہ نے چند قدم چلنے کے بعد اس سے کہا۔
"تم کرو میں سن رہا ہوں۔"
"ہو سکتا ہے تمہیں مجھ سے پہلے جنت مل جائے۔" امامہ نے اپنے جملے کا مفہوم سمجھے بغیر اسے تسلی دی۔ وہ ہنس پڑا تھا۔
"چاہتا تو میں بھی یہی ہوں۔" وہ مدھم آواز میں بڑبڑایا۔
"تم سے پہلے مرنا چاہتا ہوں میں۔" اسے چلتے ہوئے ٹھوکر لگی۔ کوئی چیز جیسے اس کے جسم سے ایک لمحہ کے لیے اسے تھراتی ہوئی گزری تھی۔ وہ جو جنت ڈھونڈتی پھر رہی تھی' اس سے پہلے جو "شے" سامنے کھڑی تھی' وہ اسے بھول گئی تھی۔ ان کا ساتھ سالوں کا تھا اور ان کا ساتھ مہینوں کا تھا۔ اس نے سالوں میں کبھی جدائی محسوس نہیں کی تھی' لیکن وہ ان ہفتوں کا ساتھ ختم ہونے کا سوچ کر بھی لرز گئی تھی۔
"تم کیوں کہہ رہے ہو اس طرح؟" وہ رک گئی اور اس نے سالار سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔
"تم نے ہی تو کہا تھا کہ شاید مجھے تم سے پہلے جنت مل جائے۔"
"لیکن میں نے مرنے کا نہیں کہا۔"
"کیا اس کے بغیر مل سکتی ہے؟" وہ بول نہیں سکی۔ نیم تاریکی میں اس روش پر ایک دوسرے کے مقابل کھڑے

وہ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے رہے۔ پھر سالار نے اس کی آنکھوں میں پانی اڈتے دیکھا تھا۔
"ٹھیک ہے' جو مرضی کہو۔" اس کی آواز میں خفگی تھی۔
سالار نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے جیسے معذرت خواہانہ انداز میں دبایا۔
"میں نے صرف تمہاری بات دہرائی تھی۔"
"اور میرا وہ مطلب نہیں تھا' جو تم نے نکالا ہے۔"
"میں سمجھتا ہوں۔" وہ دونوں پھر چلنے لگے۔
"کیا تم جنت میں مجھے اپنا پارٹنر منتخب کرو گی؟"
چند قدم چلنے کے بعد اس نے سالار کو نرم آواز میں کہتے سنا۔ وہ بول نہیں سکی۔ وہ ہنس پڑا۔
"یعنی نہیں۔"
"میں نے یہ کب کہا؟" وہ رک گئی۔
"لیکن تم نے کچھ بھی کب کہا؟"
"میں سوچ رہی تھی۔"
"سوچ لیا؟ پھر اب بتاؤ۔" وہ ہنس پڑی۔
"تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"جنت کی بات تم نے شروع کی تھی۔" اس نے سالار کا چہرہ دیکھا۔
"شاید۔" وہ خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔
"تمہیں یقین نہیں ہے؟" اس نے ہنس کر اس سے پوچھا۔
"یقین کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"
"اگر تم جنت میں پہنچ گئے تو پھر تمہیں ہی چننا پڑے گا۔" اس نے مذاق کیا۔
"اور اگر کوئی اور بھی پہنچ گیا تو؟" اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔

دونوں کے درمیان خاموشی کا لمبا وقفہ آیا تھا۔ اس "اور" کا تعارف نہ امامہ نے مانگا تھا' نہ سالار نے کروایا تھا' مگر اس "اور" نے اس کو سالار سے نظریں چرانے پر مجبور کیا تھا۔ وہ نظریں نہ چراتی تو اتنی تکلیف نہ ہوتی سالار کو جتنی اب ہوئی تھی۔ وہ اس سے کہہ نہیں سکی' بات اس کے انتخاب پر کبھی نہیں رہی تھی' بات جلال کے انتخاب پر تھی۔ اس کا انتخاب جنت میں بھی شاید وہ کبھی نہ ہوتی' لیکن یہ اعتراف کرنے میں کوڑے کھانے جیسی ذلت تھی۔ چپ بہتر تھی لیکن اسے یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ اس کی چپ سالار کو اس وقت کوڑے کی طرح لگی تھی۔

اس روش سے روشنیوں تک کا باقی فاصلہ خاموشی میں طے ہوا تھا۔



سکندر عثمان کو چند لمحوں تک اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔
"آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے' وہ پلاٹ تو بک ہی نہیں سکتا۔ سالار کے نام ہے وہ۔"

انہوں نے احتشام الدین سے کہا۔ وہ ان کے ایک کاروباری دوست تھے' اور چند منٹ پہلے انہوں نے سکندر عثمان کو فون کر کے ایک پلاٹ کی فروخت کے بارے میں شکایت کی تھی۔ ان کے کسی دوست نے ان ہی کے وکیل کے ذریعے ایک ایسا پلاٹ کچھ دن پہلے خریدا تھا جو سکندر عثمان کا تھا' اور جس کو ایک ڈیڑھ سال پہلے احتشام الدین نے خریدنے کی آفر کی تھی' لیکن سکندر نے تب انہیں یہ بتایا تھا کہ وہ پلاٹ جائیداد کی تقسیم کے دوران سالار کے نام کر چکے تھے۔ البتہ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر کبھی اس پلاٹ کو فروخت کرنے کی ضرورت پڑی تو وہ احتشام الدین کو ترجیح دیں گے۔

"میرے وکیل کے ذریعے سارا پیپر ورک ہوا ہے۔ آپ کہیں تو آپ کو نیوز پیپر میں پلاٹ کی منتقلی کا ایڈ بھی بھجوا دیتا ہوں۔ آپ کے بیٹے نے یہ پلاٹ ڈیڑھ کروڑ میں بیچا ہے... مجھے تو افسوس اس بات کا ہے کہ میرے وکیل نے منتقلی کے بعد بتایا مجھے' وہ بھی اتفاقاً" کچھ دیر پہلے بتا دیتا تو میں کبھی یہ پلاٹ کسی اور کو خریدنے نہ دیتا۔"

چند لمحوں کے لیے سکندر عثمان کا سر گھوم کر رہ گیا۔ پچھلے سال انہوں نے اپنی جائیداد کی تقسیم کر دی تھی۔ یہ ان دو پلاٹس میں سے ایک تھا جو سالار کے حصے میں آیا تھا۔

"میں ابھی سالار سے بات کر کے دوبارہ آپ سے بات کرتا ہوں۔" سکندر عثمان نے یکدم کہا۔
انہیں ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان کو بتائے بغیر پلاٹ بیچ سکتا ہے۔

سالار اس دن اسلام آباد میں تھا اور اس وقت اپنے کسی کام سے مارکیٹ کی طرف جا رہا تھا جب اسے سکندر کی کال ملی۔

"سالار! تم نے اپنا پلاٹ بیچ دیا ہے؟"
وہ اس وقت ایک سگنل پر رکا تھا اور اس کے ہیلو کہتے ہی سکندر نے دوسری طرف سے کہا۔

چند لمحے سالار کچھ بول نہیں سکا۔ پلاٹ کی فروخت کا سکندر کو اتنی جلدی پتا چل جائے گا' اسے اندازہ نہیں تھا۔ اس کی چند لمحوں کی خاموشی نے سکندر کے بدترین خدشات کی تصدیق کردی تھی۔

"تم میرے آفس آؤ۔" انہوں نے بے حد سرد مہری سے کہہ کر فون بند کردیا۔

"کب بیچا تھا پلاٹ؟" اس کے آفس پہنچ کر کرسی پر بیٹھتے ہی سکندر نے اس سے کہا۔ ان کا لہجہ قطعی خوشگوار نہیں تھا۔ وہ اس کی جائیداد تھی لیکن وہ بیچنے کے لیے نہیں دی گئی تھی۔

"پچھلے مہینے۔" اس نے لہجہ ہموار رکھنے کی کوشش کی۔

"کیوں؟"

"مجھے کچھ رقم کی ضرورت تھی۔"

"کس لیے؟" سالار اس بار جواب دیتے ہوئے جھجکا۔

"کس لیے رقم کی ضرورت تھی؟"

"مجھے امامہ کو ایک رنگ خرید کردینی تھی۔" سکندر کو لگا کہ انہیں سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

"کیا؟"

"امامہ کے لیے ایک رنگ خریدنی تھی۔" اسی نارمل انداز میں اس نے اپنا جواب دہرایا تھا۔

"لاکھ دولاکھ کی رنگ کے لیے تم نے پلاٹ بیچ دیا؟"

سکندر نے اس کے جواب سے بالکل غلط نتیجہ نکالا۔

"اپنا کریڈٹ کارڈ استعمال کرتے' بینک سے پرسنل لون لے لیتے یا مجھ سے کہتے۔"

"میں لون لے کر اسے گفٹ نہیں کرنا چاہتا تھا اور ایک دولاکھ کی انگوٹھی نہیں تھی' کچھ زیادہ مہنگی تھی' آپ اتنے پیسے کبھی نہ دیتے مجھے۔" وہ بڑی رسانیت سے کہہ رہا تھا۔

"کتنی مہنگی ہوتی' چار یا پانچ لاکھ کی ہوتی۔۔۔ چلو دس لاکھ کی ہوتی۔۔۔ دے دیتا میں تمہیں۔"

سکندر بے حد خفا تھے۔ وہ پلاٹ پونے دو کروڑ کا تھا جسے وہ ڈیڑھ کروڑ میں بیچ آیا تھا۔

"دس لاکھ کی بات نہیں تھی۔" سکندر نے اسے کہتے سنا۔

"پھر؟" سکندر کے ماتھے پر بل آئے۔ سالار نے اپنا گلا صاف کیا۔

"13.7" یہ واحد طریقہ تھا جس سے وہ اس انگوٹھی کی قیمت تین ہندسوں میں کرپایا تھا۔

"کیا۔۔۔؟" سکندر کو کچھ سمجھ نہیں آئی۔

"13.7" سالار نے ایک بار پھر گلا صاف کرکے اگلا لفظ کہا۔ سکندر کو چند لمحے سانس نہیں آیا۔ انہیں پہلی بار اس کی بات سمجھ میں آئی تھی۔

"13.7 ملین کی رنگ دی ہے تم نے اسے؟" ان کا ذہن جیسے بھک سے اڑ گیا تھا۔ سالار سر جھکائے ٹیبل پر پڑے پیپرویٹ پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔ فی الحال وہ اس کمرے میں کچھ اور نہیں کرسکتا تھا۔

"سالار ایک کروڑ سینتیس لاکھ روپے کی رنگ خرید کردی ہے تم نے اسے؟"

سکندر عثمان کی خود بھی سمجھ نہیں آیا کہ انہوں نے اس سے دوبارہ یہ کیوں پوچھا تھا۔

"جی۔۔۔" اس بار سالار نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

سکندر بے یقینی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ سالار نے نظریں چرالیں' وہ اب ان کے عقب میں دیوار پر لگی پینٹنگ دیکھ رہا تھا' اس کے علاوہ وہ اور کیا کرتا؟ اس کے چہرے پر نظریں جمائے سکندر نے ریوالونگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگالی۔ وہ اگر اسے الو کا پٹھا کہتے تھے تو ٹھیک ہی کہتے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

صبا سحر

خزاں کے چاند ملے

"ہاجرہ —!

خوش نصیبی کی بلندی پہ کوئی خود کو اگر پاتا ہے تو بلاشبہ وہ میں ہوں۔۔۔ اپنی خوش نصیبی کو بیان کرنے کو اگرچہ میرے پاس وہی روایتی باتیں ہیں۔۔۔ والدین کی محبت' ان کی دعائیں۔۔۔ اچھی صحت۔۔۔ وطن میں روزگار۔۔۔ مٹی پہ پرجان دینے کا عزم بھی موقع بھی اور۔۔۔ اور تم۔۔۔

تم میری خوش نصیبی ہو یا خوش نصیب ہونے کا سبب۔۔۔ میں فیصلہ نہیں کرپاتا۔۔۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ تم ہو تو میں ہوں۔۔۔ ورنہ عدم ہوں۔

امن کے دن ہیں۔ سب پرسکون ہے۔ اور اندر کی دنیا باہر کی دنیا سے یکسر مختلف ہے۔ تلاطم' تصادم۔۔۔ بناؤ' تناؤ۔۔۔ بے چینی دبے کیفی کی صورت میں تمہارا تصور سکون کا ضامن ہے۔

اس مختصر سی زندگی اور اب تک گزاری عمر میں' میں دو باتیں جان پایا ہوں۔ ایک یہ کہ۔۔۔ ہر وہ شخص نامراد ہے' جو بزدل ہے' شریف ہے۔۔۔ نامراد نہیں تو گھائل ضرور ہے۔ جیسے میں۔۔۔ جسم پر اب کسی زخم کا نشان نہیں۔ سب مندمل ہوگئے مگر۔۔۔ دل تار تار ہے۔۔۔ جانے کس چیز سے چھلنی کیا تھا کہ رفو ہونے نہیں پاتا۔ دوسری بات جس پر میں آج سب کو قائل کرتا پھرتا ہوں۔ وہ یہ کہ۔۔۔ رشتے بڑے مجبور کرتے ہیں۔ رشتے بڑے مجبور ہوتے ہیں۔ اب میری ہی مثال لو۔۔۔ میں کیپٹن ابوبکر۔۔۔ تمغۂ جرات۔۔۔ مخالف کے ٹینک تباہ کرنے والا۔۔۔ دشمن کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر چھاتی پہ گولی کھانے کو تیار۔۔۔ ایک تمہارے ابا کو راضی نہ کرسکا۔ ان کے سوال کا جواب نہ دے سکا کہ تئیس سال قبل میرے باپ نے تمہاری پھوپھی کو میرے چچا کا رشتہ کیوں نہیں دیا تھا۔۔۔

تم حیران ہو رہی ہوگی' یہ آج مجھے کیا ہوا۔۔۔ بیٹھے بٹھائے کون سے غم یاد آگئے۔۔۔

شاید کہنے کو کوئی خاص بات نہیں ہے آج۔۔۔ یا شاید۔۔۔ اپنے ساتھی کے نام آئے اس کی بیوی کے خط کو دیکھ کر میرے دل کا کوئی ٹانکا ادھڑ گیا ہے۔۔۔ اس کے بچپن کی محبت آج اس کی بیوی اور دو بچوں کی ماں ہے۔ بہت خوش نصیب ہے وہ۔۔۔ میں بھی ہوں۔۔۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

میں تم سے دور رہ سکتا ہوں ہاجرہ۔۔۔ تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔۔۔

قربتیں لاکھ خوب صورت ہوں
دوریوں میں بھی دلکشی ہے ابھی

میں اور تم۔۔۔ ایسے ہی خود کو بہلائیں گے بالآخر۔۔۔ شریف' بزدل' نامراد اور گھائل لوگ۔۔۔ میں اور تم۔۔۔

"کیا لکھوں' سمجھ میں نہیں آرہا۔ دنیا کا سب سے مشکل امر ہے اپنے احساسات کی لفظوں میں ترجمانی کرنا۔۔۔ اس طرح کہ سننے والا اسی طرح ایمان لے آئے کہ جس طرح کہنے والے کے دل پہ اس کا نزول ہوا تھا۔۔۔ زندگی کے کسی موڑ پہ' دن کے کسی حصے میں تم نے مجھے جھوٹا اور بے وفا تو سمجھا ہوگا۔۔۔ کہ جس نے محبت کے اظہار کیے بس۔۔۔ محبت نہیں کی۔۔۔ سوا اسی شرمندگی کے باعث آج میں کچھ نہیں لکھ پارہا۔۔۔ مگر کوئی تو بات ہونی چاہیے۔۔۔



چلو یوں کرتا ہوں' میں تمہیں اپنی آنکھیں بنا کر بھیجتا ہوں۔ تم دیکھنا کہ ان میں صرف تم ہی دکھتی ہو۔ جو سوتی ہوں تو خواب کی صورت۔ جاگتی ہوں تو عکس بن کر۔

میں تمہیں اپنے خواب بنا کر بھیجتا ہوں۔ رات کے پچھلے پہر کے ہوں تو تعبیر کی صورت۔ صبح کاذب کے ہوں تو بشارت تم ہو۔

میں تمہیں اپنے لب بنا کر بھیجتا ہوں۔ پکار کی صورت۔ بازگشت کی صورت۔ سوال تمہارا' جواب بھی تم ہو۔ گنگناتے ہوں تو نغمہ تم' نغمگی بھی تم۔ مسکاتے ہوں تو باعث تم۔

میں تمہیں اپنا دل بنا کر بھیجتا ہوں۔ نہیں اپنی سانسیں۔ ایسا کرتا ہوں اپنے تخیل' اپنے دکھ۔ اپنا۔

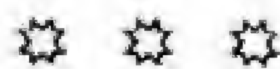
میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں اور کیا کہہ رہا ہوں۔ شاید میں اپنی زندگی میں تمہاری اہمیت بتانا چاہ رہا ہوں۔ مگر وہ تو تم جانتی ہو۔ یا شاید۔ میں تمہارے ساتھ کچھ وقت گزار کر اپنی تھکن اتارنا چاہتا ہوں۔ اور اس کے لیے تو ہمیں ماضی میں جانا ہوگا۔ مستقبل میں تو ہم ساتھ ہو ہی نہیں سکتے۔ تمہارا مستقبل تو۔

اپنے شوہر کو میرا اسلام تو تم خیر نہیں کہہ سکتیں۔ اپنے بچوں کو میری طرف سے پیار ضرور کرنا۔ ہمارا مستقبل میں بس یہی تعلق ہے۔

اب اجازت دو۔ ہاں یاد آیا۔ ایک آخری بات۔ شاید خط اسی لیے لکھا تھا۔

اپنا خیال رکھنا۔ پتا ہے نا کیوں۔ کیونکہ میں نے شہید ہونے تک زندہ رہنا ہے۔

تمہارا۔ ابوبکر



پچھلے چند سالوں سے اس کمرے کا موسم نہیں بدلا تھا اور وقت بھی جیسے رکا ہوا تھا۔ اس کمرے میں ہر چیز معدوم تھی یا مدھم۔ باہر دنیا بدل جاتی۔ یہاں گرد تک نہ اڑتی۔ احساسات تک منجمد تھے۔

کمرے کا روغن خراب ہو چلا تھا مگر اس حد تک نہیں کہ نیا کروانے کا خیال آتا۔ سامنے والی دیوار سے لگا منقش لکڑی کا پلنگ' اس کے ساتھ رکھی چھوٹی تپائی اور دو کرسیاں' پائنتی کی طرف ایک میز اور کرسی۔ کمرے کے بائیں دیوار کے ساتھ رکھی لکڑی کی الماری' سامنے والی دیوار پہ جڑی چھوٹی سی کھڑکی' پلنگ اور الماری کے درمیان تھوڑی سی جگہ پہ بچھی رنگین دری۔

ہاجرہ کے ہاتھوں ہر ماہ بدل جانے والی کمرے کی ترتیب اس دن کے بعد سے یوں ہی رہ گئی تھی۔ اس دن کے بعد سے وہ خود بھی اس کمرے کے سازو سامان کی طرح اپنی جگہ پر سیٹ ہو گئی تھی۔ جیسے میز پہ رکھی کتابیں' قلم۔ تپائی پہ رکھی دوائیں۔ پیچھے میدان میں کھلنے والی کھڑکی پہ لٹکا بڑے بڑے پھولوں والا پردہ

اور جیسے۔ پلنگ پر چادر کی طرح بچھا اس کا وجود۔ ساکت اور بے جان۔

اڑے ہوئے نیلے رنگ کی لکڑی کی خستہ بوسیدہ کھڑکی کھلتی تو پتا چلتا تھا کہ سورج سوا نیزے پہ ہے' یا بارش بس برسنے کو ہے۔ آندھی آنے والی ہے یا طوفان گزر چکا ہے۔ مگر بستر پہ پڑا وجود ان موسموں کے آنے جانے سے بے نیاز اور یکسر لاپروا تھا۔ اس کی دن بہ دن معدوم ہوتی سماعتوں کو اگر کسی سے فرق پڑتا تھا تو طیبہ کی آواز سے۔ وہ جو مژدۂ جاں فزا سنایا کرتی تھی۔

اس کمرے میں شور بالکل نہ تھا۔ بس ارتعاش تھا۔ کھلی کھڑکی سے آنے والی ہواؤں کی سرسراہٹ۔ گرمیوں میں چلتے پنکھے کی آواز۔ آتے جاتے لوگوں کے قدموں کی چاپ اور اس کی عیادت کو آئے لوگوں کی افسوس' ترحم' ہمدردی' عبرت میں ڈوبی آہ۔

اس کا دھڑکتا دل اس کو دفنانے نہیں دیتا تھا ورنہ وہ کب کی میت بن چکی تھی۔

کمرے کے دروازے پہ جانے کو تیار کھڑی زندگی اور آنے کو تیار کھڑی موت۔ آپس میں اس جیتے جی

مگر جانے والے شخص کے بارے میں بات کرتیں۔ گویا عالم برزخ تھا۔ کوئی دن جاتا تھا کہ زندگی ایک طرف کو ہو کر موت کو اندر آنے کا راستہ دے دے۔



ہاجرہ اور طیبہ کے ابا خاندانی تھے' نہ زبان و وعدے کے پابند۔ ہاں مگر انا پرست تھے۔ شملہ اونچا نہ تھا۔ ناک اونچی تھی۔ جب ابوبکر کے والد نے ان کی بہن کو اپنے چھوٹے بھائی کے لیے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ عمر میں بڑی ہے تو اس کا بدلہ انہوں نے اس طرح لیا کہ ابوبکر کو ہاجرہ کا رشتہ نہ دیا۔ جب بہن نہیں لی تو بیٹی کیوں دوں۔ ایک دفعہ نہیں' ابوبکر کے والد پانچ دفعہ ان کی دہلیز پہ آئے تھے مگر پانچوں مرتبہ پانچ عذر پیش کر دیے رشتے سے انکار کے۔ ساتھ میں پرانا حوالہ دینا بھی کبھی نہ بھولے۔ ان کے انکار سے ابوبکر کے چچا اور ہاجرہ کی پھوپھی کو کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ دونوں کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ دونوں ہی اپنے گھروں میں خوش تھے۔ مگر اب کے دل کا معاملہ تھا۔ ہر دفعہ ابوبکر کے والد کے ان کے ہاں آنے پر دونوں کی امید بندھ جاتی اور ہر دفعہ ہاجرہ کے ابا کے انکار پر وہ سولی پہ لٹک جاتے۔

ابوبکر فوج میں بھرتی ہوا تو ابا نے گھر میں تبصرہ کیا۔ ہاجرہ چپ سے پانی بھر رہی تھی۔

"اچھا ہوا منع کر دیا میں نے۔ آئے روز محاذ پر جانا پڑتا۔ نس جاتا تو ناک کٹ جاتی میری خاندان میں۔" وہ تمسخرانہ ہنکارا بھرتے۔ طیبہ کن انکھیوں سے ہاجرہ کو ضبط کرتے دیکھتی۔

"اور شہید ہو جاتا تو... میری ہاجرہ کی تو زندگی برباد ہو جاتی۔" ابا بے نیاز بولے جا رہے تھے۔ انہیں احساس ہی نہیں ہوا ان کے شہید کہنے پہ کیسا گھونسا پڑا تھا اس کے دل پہ۔ انہوں نے بس اتنا دیکھا کہ بالٹی بھرتے ہوئے پانی چھلکا ہے۔ جبکہ طیبہ نے دیکھا اس کی آنکھیں بھی چھلکی ہیں۔

"اب شہید کی بیوہ بنا کر بٹھا رکھوں تو بیٹی پاگل ہو جائے۔ دوسرا کہ بیاہ دوں تو لوگ تھو تھو کریں۔ نہ بابا نہ۔ میں ایسا ماٹھا کام نہیں کرتا۔"

اس سے زیادہ برداشت نہ ہوا تھا ہاجرہ سے۔ باورچی خانے میں جا بیٹھی۔ چولہے کے پاس آسان تھا رونا۔ آنکھیں سرخ ہو جائیں یا آنسوؤں سے بھر جائیں' کوئی نہیں پوچھتا۔ اور طیبہ سے کچھ چھپا نہ تھا۔

ابا کو خبر نہ تھی بیٹی کی خواہش کی' شدت کی' حالت کی۔ جانتے اگر تو بھی محبت پہ غیرت کو فوقیت دیتے جو کہ اصل میں تھی ہی نہیں۔ ناک تھی بس۔ دکھاوا تھا۔ نام نہاد ٹھسہ تھا۔ جو چوہدری یا جاگیردار نہ بن پانے کے سبب خود میں پیدا کر لیا گیا تھا۔

بہن کے دل کی خواہش باپ کے علم میں لانے کی جرات طیبہ میں نہ تھی۔ ہاجرہ میں کہاں ہوتی۔ دعاؤں کا آسرا تھا بس۔ پھوپھی سے مدد لینی چاہی۔ وہ دہل کر بولیں۔

"غلطی سے بھی نہ بتانا۔ ابوبکر کے ابا پانچ دفعہ آئے تھے تمہارا ہاتھ مانگنے۔ باوجود ذلیل کر کے لوٹانے کے۔ عام بات نہیں ہے۔ بھائی صاحب کو پتا چلا کہ اس میں ابوبکر کی مرضی ہے تو مانتے ہوتے بھی پلٹ جائیں گے۔ ہاجرہ کو تو بھول ہی جائیں گے۔ ابوبکر سے بیر باندھ لیں گے۔ ان کو اپنے انتقام کا مزا ہی تب آئے گا۔ ایسا غضب مت کرنا ہاجرہ! وہ اس بات کو جلال بھائی کی کمزوری بنا دیں گے۔"

اس کی یہ آس بھی ٹوٹی۔ انہوں نے ہاجرہ کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

"خود کو لاپروا کر لو ہاجرہ! اپنے ابا کو بھنک تک نہ پڑنے دینا کہ تم کیا چاہتی ہو۔ اسی میں کچھ گنجائش نکل سکتی ہے۔"

ہاجرہ کچھ نہ بول پائی۔ حلق میں آنسوؤں کا گولا سا پھنس گیا تھا۔ ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ بے بسی سے انگلیاں موڑتی' پلکیں جھپک جھپک کر آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں اس کی ٹھوڑی لرز رہی تھی۔

ابرو سکڑے ہوئے تھے۔ پھوپھی کو اس پہ بے حد ترس آیا۔

"مجھ سے بدگمان نہ ہونا ہاجرہ! میں نے ذرا بھی حمایت لی نا اس رشتے کی تو تمہارے حق میں برا ہو جائے گا اور میں جو تقریباً" اپنی عمر گزار چکی صاف ستھرے دامن کے ساتھ' بھائی صاحب سمجھیں گے میں کوئی پرانی محبت کے راستے ہموار کر رہی ہوں۔"

پھوپھی کو بھی احساس ہوا کہ جوان بچوں کی ماں ہونے کے بعد آج بھی وہ کتنی بے بس ہیں۔ اسی بے بسی کے احساس تلے وہ ہاجرہ کے سامنے ہاتھ جوڑ گئیں۔

"مجھے معاف کرنا ہاجرہ! میں تیرے لیے کچھ نہ کر سکی۔"

ہاجرہ نے تڑپ کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔ اور پھر دونوں پھوپھی' بھتیجی دل کھول کر روئیں۔ دروازے میں کسی کے آنے جانے کے خیال سے پہرے کو بٹھائی طلیبہ بھی منہ پر دوپٹے کا پلو رکھ کر سسکی دبانے لگی۔

اور پھر ہاجرہ اور ابوبکر کی بدقسمتی۔۔۔ ابا کو پتا چل گیا۔

ابوبکر کے ٹریننگ پہ جانے سے ایک دن قبل جب وہ اس سے مل کر آرہی تھی۔ روتی کرلاتی گرتی پڑتی' نڈھال' نیم جاں ہاجرہ کو گھسیٹتی طلیبہ خود بھی بس گرنے کو تھی۔ وہ جھلستی دوپہر میں نکلی تھیں۔ تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ اس وقت ابا بھی عموماً" گھر پہ نہیں ہوتے تھے۔

ابا کا مسلسل انکار مستقبل میں دوریوں کے اندیشے لاحق کرتا تھا۔ مگر وہ کم از کم اسے روز دیکھ تو لیا کرتی تھی۔ کبھی کھڑکی سے' کبھی چھت سے' کبھی سہیلی کے گھر جاتے' کبھی پھیری والے سے سبزی خریدتے۔

لمحوں پہ محیط ملاقات۔۔ نظر ملتی' مسکراتی' جھکتی' ختم۔۔۔ اسی میں حال احوال' اسی میں قول قرار۔۔۔ کبھی جو موقع ملے تو' وہ میدان کو کھلتی کھڑکی پہ آجاتا۔ اور اس وقت میدان سے گزرتے کسی کے دیکھ لیے جانے کا ڈر' ابا کے اچانک چلے آنے کا ڈر' دو گھڑی سکون سے ایک دوسرے کو دیکھنے دیتا نہ کہنے دیتا۔

"ابا آجائیں گے۔ اب جاؤ۔" ہر دوسری بات کے جواب میں ہاجرہ کے منہ سے نکلتا تھا۔

وہ جھلاتا' گھورتا' مسکراتا۔۔۔ پھر اچھل کر کھڑکی کی خستہ چوکھٹ پہ دھری اس کی گلابی انگلیوں کو چھوتا اور چلا جاتا۔

کیسے آتا اور وہ کیسے بلاتی۔۔۔ یہ بھی بڑا دلچسپ تھا۔ جب ابوبکر کو بات کرنی ہوتی۔ وہ ایک چھوٹا سا پتھر اندازے سے اس کے باورچی خانے کی سمت پھینکتا۔ وہ کمرے کی طرف لپکتی۔ پھر کھڑکی کے پٹ پر دوسرا پتھر لگنے پہ کھڑکی کھول دیتی۔

اور جب ہاجرہ نے بلانا ہوتا۔۔۔ وہ اپنے گھر کا دروازہ کھول کر صحن میں اندر کی طرف کھڑی ہو جاتی۔ تاکہ گلی میں آتے جاتے لوگ اس کو دیکھ نہ سکیں۔ پھر اپنے بالکل سامنے والے مکان کی کھڑکی پہ زور سے پتھر مارتی۔ لوہے کی کھڑکی بج اٹھتی۔ اس کے بعد اس کے دوست کی ڈیوٹی ہوتی کہ وہ ابوبکر کو بتانے جاتا کہ کوئی اسے یاد کر رہا ہے۔ اس کے بعد محسن تین دفعہ اپنی کھڑکی کھول کر بند کرتا۔ یہ اس بات کا اشارہ ہوتا کہ

اس کا پیغام آگے پہنچا دیا گیا ہے۔ دس منٹ میں آرہا ہے۔

اب وہ ٹریننگ پہ جا رہا ہے۔ پتا نہیں کب آئے۔ روح کانپنے لگتی تھی یہ سوچ کر۔ حالانکہ اس نے کہا تھا۔ وہ ہر چھ ماہ بعد آئے گا مگر خوف تھا کہ کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ یہ عارضی جدائی مستقل جدائی کا اعلان کرتی لگتی تھی۔ وہ اس کی قمیص کی آستین پکڑ کر رو پڑی تھی۔

"بہت مشکل لگتا ہے ابوبکر! مت جاؤ۔ کچھ ہو جائے گا۔ کچھ غلط ہو جائے گا میرے ساتھ۔" جواباً" وہ اسے بے بسی سے دیکھتا رہا تھا۔

"میں نہیں رہ سکوں گی ابوبکر۔۔۔" اس نے اس کے شانے پہ پیشانی ٹکا لی۔

وہ فوجی بننے جا رہا تھا۔ جرات' شجاعت اور دلیری کا نشان' دشمن کو تہ تیغ کرنے کا عزم رکھنے والا اپنی ذاتی

زندگی کی خوشیوں کو چھیننے والے کا کچھ نہ بگاڑ سکتا تھا۔ اس نے اپنے شانے سے لگی ہاجرہ کے کندھے پہ جھجکتے ہوئے ہاتھ رکھا۔

مدرسے جانے والی عمروں کا ساتھ تھا۔ پانچویں تک اسکول بھی ساتھ پڑھے تھے ایک بینچ پہ بیٹھ کر۔ پھر تین سال الگ الگ جماعتوں میں پڑھا مگر اسکول ایک ہی تھا۔ پھر دو سال بعد اسکول بھی الگ ہوا۔ اس کے بعد ابوبکر نے شہر جاکر پڑھا۔ اور اس کی کتابوں کو ہاجرہ نے گھر میں پڑھا۔ یوں ہاجرہ نے بغیر امتحان دیے ابوبکر کے ساتھ بارہ جماعتیں پڑھ لیں۔

کھڑکی کی چوکھٹ پہ دھرے اس کے ہاتھ کی' کھڑکی کے باہر قدرے نیچے کھڑے ابوبکر کو تراشیدہ ناخنوں والی صرف تین انگلیاں نظر آتی تھیں۔ جنہیں اچھل کر چھونے میں اسے لمحے سے بھی کم وقت لگتا تھا۔ آج اتنے برسوں کے ساتھ کے باوجود پہلی مرتبہ اس نے ہاجرہ کو چھوا تھا۔ دھڑکنیں بے ترتیب ہوئی تھیں۔ ٹرینگ پہ جانا گراں لگا تھا۔

بچھڑنے سے پہلے ملنے میں ملنے کی لذت سے زیادہ بچھڑنے کا خوف دل میں — جگہ گھیرے ہوتا ہے۔

ابوبکر نے اس سے پہلے کبھی اپنے آپ کو اتنا بے بس محسوس نہیں کیا تھا۔ ہاجرہ اب ہچکیاں لے رہی تھی۔ وہ ہاجرہ کے ابا کو منا سکتا تھا۔ ہاجرہ کو بھگا سکتا تھا۔ نہ ہاجرہ کو بھلا سکتا تھا۔ اس نے ضبط کرنے کی کوشش میں اپنا نچلا لب دانتوں میں دبالیا۔

"ابوبکر..."

ہاجرہ نے آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھایا۔ لرزتی' کانپتی' خوف زدہ آواز... بھیگا' متورم' سرخ چہرہ... کپکپاتے ہونٹ اور آنکھیں... جیسے... پانی کے کٹورے میں دو کنچے رکھ دیے گئے ہوں۔ ابوبکر ڈوب کر ابھرا۔ بے اختیار بے تاب ہوا اور اپنی ہتھیلیوں میں اس کا چہرہ بھرلیا۔

ہجر کا خوف سارے خوب صورت جذبوں کو ماردیتا ہے۔

اس کا دل بھر آیا تھا۔ آنکھیں کیوں نہ بھرتیں۔ ابوبکر نے اپنی پیشانی اس کی پیشانی سے ٹکادی۔ آبشار کی صورت دونوں کی آنکھوں سے گرتے آنسو ایک دوسرے میں جکڑے ان دونوں کے ہاتھوں کی پشت بھگونے لگے۔

اور جس دم وہ شکستہ جاں طیبہ کے سہارے گھر میں داخل ہوئی۔ ابا دھوپ میں ٹہل رہے تھے۔ دونوں کے قدم رک گئے۔ سانسیں بھی۔ طیبہ کو اپنے ہاتھوں پہ بوجھ بڑھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اور جب تک وہ اسے سنبھالنے کو تیار ہوتی۔ ہاجرہ کے ساتھ ہی گر پڑی تھی۔



"روزماتم کرو۔ مزار پہ جاکر بیٹھ جاؤ۔ پنکھے سے لٹک جاؤ۔ مرضی تمہاری مگر۔ کھول کر بی لو یہ بات کہ جلال کی بیٹے سے تمہاری شادی نہیں ہوگی۔" ابا نے کہہ دیا تھا۔ پھوپھی کی بات سولہ آنے درست ثابت ہوئی تھی۔

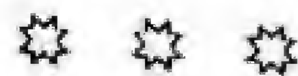
ہاجرہ چار دن بخار میں پھنکتی رہی۔ ابوبکر کے جانے کا دکھ... ابا کو پتا چلنے کا صدمہ... اور ان کا پتھر کی لکیر جیسا فیصلہ۔ ابا نے دوا لا کر دی نہ حال پوچھا۔ پانچویں روز وہ خود ہی کمرے سے نکل آئی۔ البتہ کوشش کرتی کہ ابا سے سامنا نہ ہو۔ خود ابا بھی نہیں چاہتے تھے۔

چھ ماہ بعد خبر ملی' ابوبکر آیا ہے۔ ابا تالا ڈال کر جانے لگے۔ صحن میں چارپائی ڈال کر سونے لگے۔ ایک دن وہ کھڑکی پہ آگیا۔ پہلے کے مقابلے میں زیادہ دیر ملاقات رہی۔ مگر بات دونوں میں سے کسی نے نہ کی۔ نہ پوچھا کچھ' نہ بتایا کچھ۔

ہاجرہ کی زردی مائل رنگت' ابوبکر کی بے بس مسکراہٹ حاصل کلام رہیں۔

اگلی دفعہ کی ملاقات میں طیبہ نے کھڑکی میں آکر کہا تھا۔ "اس کی طبیعت بہت خراب رہنے لگی ہے۔ ابا نے کہا ہے' جیسے ہی طبیعت سنبھلی' اعجاز چاچا کے بیٹے سے بیاہ دیں گے۔"

اس کے دل میں بھالا گھس گیا تھا۔
پھر لیفٹیننٹ بن کر آیا تو طیبہ کو محسن کے گھر بلوایا۔
"ہاجرہ سے کہو میرے ساتھ شہر چلے۔ اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔" ہاجرہ دہل گئی۔
"پورے گاؤں میں بات پھیل جائے گی۔ ابا کی بے عزتی ہو گی۔ پھر ابا طیبہ پہ بہت ظلم کریں گے۔ میرے بدلے بھی اس سے لیں گے... نہیں نہیں۔" وہ رو دی تھی۔ "کوئی اور حل سوچو۔ ایک دفعہ اور ابا سے بات کر لو۔"
ابوبکر نے اس کی سادگی پہ سر پیٹا تھا۔ اس کی پھوپھی کے بچے کالج میں پڑھنے لگے ہیں اور اس کے ابا اس انکار کو نہیں بھولے۔ یہ ابھی تک کس خوش فہمی میں ہے۔ اسی کشمکش میں اس کی چھٹیاں پوری ہو گئیں۔ وہ چلا گیا۔
ہاجرہ سوچ سوچ کر بیمار پڑتی جا رہی تھی۔ اعجاز چاچا نے خود ہی منع کر دیا۔
"تمہاری لڑکی بیمار رہنے لگی ہے۔ شہر جا کر علاج کرواؤ۔ کہیں دق نہ ہو گئی ہو اس کو۔" ابا نے نفرت سے سر جھٹکا تھا۔
پھر گاؤں میں بات پھیل ہی گئی، جس کا ہاجرہ کو خوف تھا۔ مگر ہاجرہ کی بیماری کا سن کر نہیں۔ ابا کی جلال چاچا سے عداوتوں کے کھلے عام مظاہرے سے۔ پھر اعجاز چاچا تو کیا گاؤں کے کسی گھر سے اس کا رشتہ نہ آیا۔ ہاجرہ کو تسلی سی ہوئی۔ آس کا دامن پھر ہاتھ آ گیا۔ مگر جب ابا کا اطمینان دیکھا تو دل دکھ سے بھر گیا۔
"چلو خیر ہے۔ طیبہ کو بیاہ دوں گا۔ تو میرے ساتھ ہی رہنا۔ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ دونوں بیاہ جاتیں تو میرے بڑھاپے میں کون سہارا بنتا۔ پر تو تو خود بیمار رہنے لگی ہے اب... جلدی سے ٹھیک ہو جا ہاجرہ! شاباش میرا بچہ!" ابا کا اطمینان کمال کا تھا۔



محسن ابا کے کمرے کا نیا پنکھا لگانے آیا تو نظر بچا کر پانی کے خالی جگ میں ایک کاغذ پھینک دیا اور ہاجرہ سے پانی مانگنے کے بہانے اشارہ کر دیا۔ ہاجرہ کو اچنبھا ہوا مگر چپ چاپ جگ اٹھا کر باورچی خانے چلی آئی۔ طیبہ کے ہاتھ پانی بھجوایا اور کاغذ کھول کر پڑھا۔ ابوبکر نے خط بھیجا تھا۔ ہاجرہ پہ شادیٔ مرگ طاری ہو گیا۔
آنکھوں سے لگایا۔ سینے سے لگایا۔ ہونٹوں سے لگایا۔ بارہ سطریں لکھی تھیں۔ باورچی خانے میں بیٹھے بیٹھے بارہ دفعہ ہی پڑھ لیں۔ خط دیکھ کر جہاں خوشی سے دل دھڑکنے لگا، خط پڑھ کر وہیں خوف سے دل رکنے بھی لگا۔ پڑوسیوں سے جھڑپیں ہو رہی تھیں۔ ابوبکر کو آپریشن پہ جانا تھا۔ ابا کی بات یاد آ گئی۔ شہادت والی۔ اس کا دل... جیسے کسی نے ہاون دستے میں ڈال کر کوٹ ڈالا ہو۔
ابا اور محسن باہر نکلنے لگے۔ اس نے خط دوپٹے میں چھپایا۔
"آواز کر رہا ہے چاچا... دو دن دیکھ لیں۔ پھر بدلوا دوں گا۔" محسن نے باورچی خانے کے باہر کھڑے ہو کر کہا اور چلا گیا۔
دوسرے ہی دن ہاجرہ نے اس کی خیریت، عافیت اور سلامتی کی ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اس کو جلد آنے کی تاکید والا جواب لکھا اور عثمان کو بھجوا دیا۔ پھر یہ سلسلہ باقاعدہ چل نکلا۔ محسن ان کا قاصد بن گیا تھا۔
جب تک اس کا جواب نہیں آیا، وہ دہلتی رہی۔ خوف نوعیت بدل کر اس کے مساموں سے پھوٹنے لگا۔ اس کی نمازیں بڑھ گئیں۔ دعائیں طویل ہو گئیں۔
"یا اللہ! بے شک مجھے ابوبکر نہ دے۔ مگر اسے سلامت رکھنا۔"
دعا کے الفاظ بدلے تھے، شدت وہی تھی۔ مہینوں بعد سہی، مگر وہ اسے دیکھ لیا کرتی تھی۔ یہ بھی کیا کم تھا اگر... وہ اس سے آگے سوچ نہ پاتی۔ ابا کو دیکھتی تو شہادت والی بات یاد آ جاتی۔ سینے میں نیزہ سا گڑنے لگتا تھا۔ اور پھر اس دن...

اس روز صبح سے ہی ہوا تھمی ہوئی سی تھی۔ اس ٹھہراؤ میں سکون نہیں تھا۔ اضطرار تھا، اضطراب تھا... نہ سمجھ میں آنے والا۔ بے نام سی اداسی نے اس کے اندر باہر گھیرا ڈالا ہوا تھا۔ آسمان پر دور دور تک بادل نہیں تھے۔ موسم اچھا محسوس ہو رہا تھا نہ بُرا۔ اسی کیفیت کے زیر اثر اس نے ٹالتے ٹالتے دوپہر کے بعد کپڑے دھوئے تھے۔ چھت پر پھیلا کر نیچے اتر رہی تھی۔ ابھی سیڑھی کے پہلے قدم پر ہی تھی کہ دروازہ دھڑدھڑاتے ہوئے محلے کا ایک بچہ تقریباً" بھاگتے ہوئے اندر آیا۔ طیبہ باورچی خانے سے نکل رہی تھی۔ اسے روکا۔

"باجی باجی..." اس کا سانس پھول رہا تھا۔ ہاجرہ اوپر ہی رک کر دیکھنے لگی۔

"اپنے ابا کو جلال چاچا کے گھر بھیجو۔ سب وہاں جمع ہو رہے ہیں۔ اطلاع آئی ہے۔ ابوبکر بھائی شہید ہو گئے ہیں۔ جلدی بھیجو انہیں۔" اس نے کہا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ غالباً" سب کو اطلاع دے رہا تھا۔

"ابا...!" سینے پہ ہاتھ رکھ کر چیختے ہوئے طیبہ مڑی تو نظر اوپر کھڑی ہاجرہ پر پڑی۔ ایک لمحہ کو خیال آیا کہ اس سے چھپالے۔ مگر وہ اور ساکت کھڑی جس طرح دیکھ رہی تھی۔ طیبہ سمجھ گئی کہ اس نے سن لیا ہے اور اب وہ کچھ اور نہیں سنے گی۔ اور پھر اس کے کچھ کہنے اور کچھ کرنے سے پہلے ہی ہاجرہ کھڑے کھڑے گر گئی۔ اس کا سر درمیانی سیڑھی پہ لگا اور طیبہ کے اگلے سانس سے پہلے وہ نیچے اس کے قدموں میں پڑی تھی۔ سیمنٹ کی پکی گیارہ سیڑھیاں تھیں، جن کے بیچ میں وہ سر کے بل ٹپہ کھا کر سیدھی نیچے آئی تھی۔ اس کے سر کے نچلے حصے سے خون یوں بہا کہ ایک لحظہ طیبہ کو لگا، اس کا بھیجا باہر آگیا ہو۔ اس کے بعد خود طیبہ کو بھی نہیں معلوم کیا ہوا۔

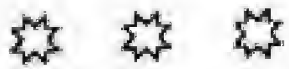
بہت سارے دن اسپتال میں رہ کر آئے تو پتا چلا وہ خبر جھوٹی تھی۔ ابوبکر عافیت سے ہے۔ ہاجرہ ایک دم چپ ہوئی اور پھر رو پڑی۔ ہوش میں آنے کے بعد اس کا خون تو رک گیا تھا، آنسو نہیں رک رہے تھے۔ کبھی کبھی طیبہ کو لگتا، وہ اتنا روتی ہے۔ کہیں اندھی نہ ہو جائے۔

ابا کا دل نہ پسیجا۔ انہوں نے ابوبکر سے اور عناد پال لیا۔

"قلم کاپی لاؤ طیبہ! ابوبکر کو خط لکھو۔ اسے لکھو، اسے بتاؤ۔ میں اس لیے نہیں مر سکی کہ وہ زندہ تھا۔ اسے لکھو... میں مرنا نہیں چاہتی مگر اس کے بغیر جینا بھی نہیں چاہتی۔ اس سے کہو... شہادت بھلے عظیم رتبہ ہو مگر اسے میرے لیے غازی رہنا پڑے گا۔ اس سے کہو طیبہ... میں اس ہوا میں سانس کبھی نہ لوں گی، جس میں وہ سانس نہیں لیتا ہو گا۔ وطن کے جیالے لاکھوں ہوں گے مگر میرا ابوبکر ایک ہے... بس وہ ایک۔ اسے میری خاطر زندہ رہنا ہو گا۔ اس سے کہو طیبہ...! قسمت بار بار ساتھ نہیں دے گی میرا۔ مجھے ہوش اسی لیے آگیا تھا کہ وہ مرا نہیں تھا۔ مگر اگلی دفعہ میں آنکھیں نہیں کھولوں گی۔ میں سانس نہیں لوں گی۔ اسے لکھ دو طیبہ... اسے بتا دو..."

وہ بولتے بولتے ہانپ گئی۔ اس کی رگیں پھولنے لگی تھیں۔ وہ زرد پڑ رہی تھی، ایک دم سرخ ہو گئی۔ طیبہ کو ڈر لگا کہ اس کے ٹانکے نہ پھٹ جائیں۔ طیبہ نے اسے خود میں بھینچ لیا۔

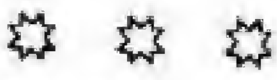
"اسے کہہ دو، مجھے آکر لے جائے۔ میں تیار ہوں۔" وہ اس کے سینے میں منہ گھسا کر بولی تھی۔



دو دن بھی نہ گزرے تھے، محسن نے طیبہ کو خط پکڑا دیا۔ وہ حیران ہوئی کہ ابھی تو اس تک خط پہنچا بھی نہیں ہو گا پھر جواب...

مگر خط کھولنے پہ معلوم ہوا کہ جب تصدیق کے لیے اس کے گھر والے کیمپس گئے تو اسے زخمی حالت میں دیکھ کر شکر ادا کیا اور اس افواہ پر اپنے گھر میں ٹوٹنے والی قیامت کے ساتھ ہاجرہ کے بارے میں بھی بتا دیا کہ وہ سیڑھیوں سے گر گئی ہے۔ اٹھارہ ٹانکے آئے ہیں

صرف سر پہ۔ اس نے تڑپ کر خط لکھ ڈالا تھا۔
اس کے خط کا متن بھی ہاجرہ کے خط سے مختلف نہ تھا۔ اس نے لکھا۔
"ایک گولی بایاں کندھا چیرتے ہوئے نکل گئی۔ دھماکے کے سبب ایک لوہے کا ٹکڑا پنڈلی میں پیچھے کی طرف گھس گیا۔ ٹھنڈ اور دھند نے تکلیف کو حد سے سوا کر دیا تھا۔ مگر اڑتالیس گھنٹے بعد یہ تکلیف دس گنا بڑھ گئی۔ جب مجھے اطلاع ملی کہ تم... سیڑھیوں سے گر گئی ہو۔
میں اشتعال میں اپنی پوزیشن سے بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ پکڑا بھی جا سکتا تھا... مارا بھی جا سکتا تھا۔ مگر کیمپس کے بستر پہ لیٹے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ گولی محض میرا کندھا چیرتے ہوئے کیوں نکل گئی۔ دھماکے میں لوہے کا ایک ٹکڑا ہی میری پنڈلی میں کیوں گھسا... اس لیے کہ آٹھ گھنٹے بعد ہی سہی مگر میری ہاجرہ کو ہوش آ گیا تھا۔ جب تم زندہ تھیں تو میں کیسے نہ بچ پاتا۔
مگر تمہیں میری قسم ہے ہاجرہ! تم اپنا خیال رکھو۔ اگر مجھے غازی دیکھنا چاہتی ہو تو تمہیں خود بھی زندہ رہنا ہو گا۔ ورنہ اگلی دفعہ میری دعا ہو گی کہ گولی صرف میرا بازو چیرتے ہوئے نہ نکل جائے۔ دل میں پیوست ہو جائے..."
ہاجرہ نے کرب سے آنکھیں بھینچ لی تھیں۔ محبت اور تکلیف آج دونوں اپنی انتہاؤں پہ پہنچی محسوس ہو رہی تھیں۔ طیبہ نے دیکھا۔ اس کی بند آنکھیں لرز رہی ہیں۔ ہونٹ کپکپا رہے ہیں۔ اس نے ضبط کی کوشش میں پلنگ کی چادر مٹھی میں سمیٹ لی ہے۔
"ہاجرہ...!" اسے لگا اس کے دماغ کی رگ پھٹ جائے گی۔
"طیبہ...!" اس نے آنکھیں کھولیں۔ ایک ساتھ ڈھیر سارے آنسو اس کے گالوں پہ گرے۔ وہ آگے بڑھی۔ اسے اٹھنے سے روکا۔ ہاجرہ نے اس کے ہاتھ تھام لیے اور بڑی لجاجت سے کہا۔
"طیبہ... ابوبکر کو کبھی میری کسی تکلیف کا نہ بتانا۔ میں مر بھی جاؤں تو اسے نہ بتانا۔ مجھے اس کی زندگی چاہیے۔ اس کی سلامتی... بس!"
طیبہ نے اس کے ہاتھ دبا کر اس کا ماتھا چوم کر اس سے وعدہ کیا تھا۔



کچھ لوگوں کی عداوتوں میں، کچھ لوگوں کی محبتوں میں اضافہ کرتے کچھ دن آگے بڑھے۔ ایک ایک پل کو ماضی بناتے وقت نے ان دونوں کی جھولی میں کوئی خوشی نہیں ڈالی تھی۔ سوائے ایک کے...
ابوبکر کیپٹن بن چکا تھا۔ بہت خوش تھا۔ ہاجرہ اس کی خوشی میں خوش تھی۔ ایک دکھ بھی تھا۔ ہاجرہ کے سر میں اس دن کے بعد سے مستقل درد رہنے لگا تھا۔ اکثر آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا۔ اکثر ہی وہ بے ہوش بھی ہو جاتی۔ ٹیسیں اٹھتیں مگر دل میں اٹھنے والی ٹیسوں سے مقابلتاً "کم درد" کی حامل ہوا کرتی تھیں۔ سہ جاتی تھی۔ ابوبکر اس کے درد میں شریک نہ تھا۔ بے خبر جو تھا۔
گزرتے دنوں میں جلال چاچا شہر میں جا بسے تھے۔ ان کے چھوٹے بیٹے کو شہر میں پکی نوکری مل گئی تھی۔ ہاجرہ نے گھر سے باہر جھانکنا ہی چھوڑ دیا۔ ایک تو وہ اب بیمار رہنے لگی تھی۔ دوسرا اب ان گلیوں میں اس کے قدموں کے نشاں تھے، نہ خوشبو۔ رابطے کا بظاہر ذریعہ محسن تھا۔ مگر کبھی کبھی اپنے اپنے آسمانوں پہ دکھتے چاند کو اپنے دل کی کیفیت سنا دیتے اور مطمئن ہو جاتے کہ جب وہ اس کے آسمان پہ چمکے گا تو ہمارا پیغام بھی دے دے گا۔ پھر جو چاند مسکراتا دکھتا۔ تو سمجھ جاتے ہمارا محبوب خوش ہے۔ بجھا بجھا سا لگتا تو مسکراہٹ تھم جاتی کہ اس طرف اداسی ہے۔ کبھی جو شرمندہ دکھتا تو بھی سمجھ جاتے کہ ابھی چاند نے پیغام پہنچایا نہیں ہے پھر... ایسا کرتے کہ چاند سے ہی خفا ہو کر سونے کی تیاری کرتے کہ اب خواب میں ہم خود ہی بتا دیں گے... تم رہنے دو!!

رات کے ڈھلنے میں اور صبح کے ہونے میں کچھ وقت تھا۔ جب زور سے الارم بجا۔ سب ہڑبڑا کر اٹھے اور اٹھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ پہلے سے ہی جاگ رہا تھا اور بستر چھوڑنے میں اس نے کبھی لحہ نہیں لگایا۔ بنیان پہنی اور بیلٹ کستے ہوئے باتھ روم سے نکلا۔ برابر والے بستر پہ اب تک سوئے پڑے رافع پہ نظر ڈالی۔ وہ نیند کا دھنی تھا۔ اس نے شرٹ کی آستین میں ہاتھ ڈالے اور اسے آواز دی۔

"رافع!" اس کی بند آنکھوں میں ذرا سی جنبش ہوئی۔

بٹن لگائے بغیر وہ جوتے پہننے لگا۔ ایک جوتے کے تسمے باندھ کر اس نے رافع کا پاؤں پکڑ کر جھٹکا دیا۔

"اٹھ جلدی۔" وہ ذرا سا کسمسایا۔ وہ بیدار ہو چکا تھا مگر اس کی نیند نہیں ٹوٹ رہی تھی۔ اس نے دوسرے جوتے کے تسمے کسے اور بٹن لگاتا تیزی سے باہر کی طرف بڑھا۔

"میرے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے کمرے سے باہر آجا۔" اس نے باہر نکلنے سے پہلے رک کر کہا اور دروازے کے ساتھ والے بستر سے تکیہ اٹھا کر زور سے رافع کے منہ پہ پھینکا اور نکل گیا۔

وین کی طرف بھاگتے ہوئے وہ قمیص بیلٹ میں اڑس رہا تھا۔ گاڑی کے پائیدان پہ پاؤں رکھ کر اس نے پلٹ کر دیکھا اور مسکرا دیا۔ رافع بھاگتا ہوا آرہا تھا۔ اس طرح کہ اس نے شرٹ کا ایک کندھا ڈال لیا تھا اور دوسرے ہاتھ میں جوتے پکڑے ہوئے تھے۔ تاریکی میں دور سے نظر نہیں آرہا تھا مگر اسے یقین تھا کہ اس کی آنکھیں ابھی بھی نیند سے بند ہیں اور وہ اندازے سے بھاگ رہا ہے۔ اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

رافع گاڑی کی طرف آنے کے بجائے گیٹ کی طرف دوڑ رہا تھا۔ وہ راستہ کم تھا۔ گاڑی کے پہیے چرچرائے اور وہ تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھی۔ گیٹ سے نکلنے سے قبل اس کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے اس نے وین کا سائیڈ والا ڈنڈا پکڑا اور اچھل کر پائیدان پہ قدم جمایا اور دوسرا پاؤں اندر رکھا۔

"نیند کی گولی کھا کر نہ سوؤ تو کبھی بلاوجہ ایسے بہادری کے مظاہرے نہ کرنے پڑیں۔" اس نے پیار سے طنز کیا۔ رافع نے گہری گہری دو تین سانسیں بھریں پھر اسے گھورتے ہوئے جواب دیا۔

"ہمیں بھی کسی سے اتنا پیار ہو گیا ہوتا تو ہم بھی گھنٹی بجنے سے پہلے تیار بیٹھے ہوتے۔" وہ جوتے پہننے لگا۔ وہ مسکرا دیا۔

"ٹارگٹ پورا نہیں کیا تم نے۔۔۔ میں گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔" اس نے دوبارہ چوٹ کی۔

"آپ کے خطوط سنبھال کر رکھ رہا تھا۔ جو جناب لکھتے لکھتے چھوڑ آئے تھے اور جو تکیہ تحفے میں دیا تھا نا' اسی کے نیچے حفاظت سے رکھ کر آیا ہوں۔"

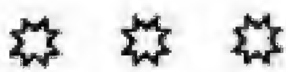
"واپس نہ آیا تو یاد سے بھجوا دینا مکمل کر کے۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"اور حکم؟" رافع چڑ گیا تھا۔

"بس یہی۔" اس نے ہنوز مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"میرے خیال میں اب تمہیں تسمے بھی باندھ لینے چاہئیں اور بٹن بھی لگا لینے چاہئیں۔" عبدالسلام نے دونوں کو ٹوکا تو رافع اسے گھورنے کا سلسلہ بند کر کے نیچے جھک گیا۔ ابوبکر نے آسمان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ خط تو پتا نہیں کب پہنچتا۔ اس نے چاند کو پیغام دے دیا۔

وہ آپریشن پر جا رہا تھا۔۔ اس کا پچھلا زخم بھر چکا تھا۔ وہ دور تھے مگر ایک ہی چاند تلے تھے۔ یہ یقین بڑا جاں نواز تھا۔



"ابوبکر۔۔۔

ہمیشہ کی طرح خیریت' عافیت اور صحت و سلامتی کی ڈھیروں دعائیں۔۔۔ گاؤں نہ آنے کی تاکید اور خود آنے کے وعدے کے ساتھ تحریر کی صورت میں تمہارے سامنے ہوں۔۔۔

مجھے اندازہ ہے۔ تم اب تک مجھے وعدہ خلاف سمجھنے لگے ہو گے۔ میں ہر خط میں شہر آنے کا وعدہ کرتی ہوں اور۔۔۔ کتنے ہی سال ہو گئے یہ وعدہ کرتے ہوئے۔ تم جانتے ہو' سمجھتے ہو اچھی طرح میری مجبوریاں۔۔۔ میں تم سے ملنے تب ہی آسکتی ہوں کہ جب میرا شوہر شہر گیا ہوا ہو اور طیبہ فارغ ہو۔ اور یقین کرو یہ دونوں سہولیات ایک ساتھ مجھے میسر ہی نہیں آتیں۔۔۔

تم نے پوچھا تھا۔ کیا تم یاد آتے ہو مجھے؟

اس سوال میں چھپی تمہاری ناراضی میں جان سکتی ہوں۔۔۔ میں بڑی دیر میں خط لکھ پاتی ہوں تمہیں۔۔۔ اور تاخیر سے بھیجے ہوئے ان خطوط میں بھی بس ادھر ادھر کی فضول بے سروپا باتیں۔۔۔ جو ستر بار تمہیں لکھ چکی ہوں اور تم خود بھی جانتے ہو جیسے۔۔۔ اعجاز چاچا کے پورے گھر والے دوبارہ عمرہ کر آئے۔۔۔ بی بی خالہ نے تین منزلہ گھر بنا لیا۔۔۔ فضل دین چاچا نے اور زمینیں خرید لیں۔۔۔ میری پھوپھی کا بڑا بیٹا شہر میں ڈاکٹری پڑھنے گیا ہے۔ اس کا پہلا سال ہے۔ دوسرا سال ہے۔۔۔ تیسرا۔ اس کی تو ایسے خبر دیتی ہوں تمہیں جیسے ڈاکٹر بن کر وہ ہمارا ہی علاج کرے گا۔۔۔ کیا پتا کرے بھی۔۔۔ جب ہم بہت زیادہ بیمار ہو جائیں۔ قریب المرگ۔۔۔

ابوبکر۔۔۔ تم کوئی سبق نہیں ہو۔۔۔ کہ جسے کسی مخصوص وقت میں' باقاعدہ بیٹھ کر' سامنے رکھ کر' ٹل ٹل کر یاد کیا جائے۔۔۔ تم۔۔۔ میرا معمول ہو۔۔۔ روزانہ نپٹائے جانے والے کاموں کی طرح۔ جسے کرنے کو کوئی کہتا نہیں ہے اور جسے کرنے کے لیے میں سوچتی نہیں ہوں۔۔۔ جیسے دھڑکنوں کا تسلسل' جیسے سانس کی روانی۔۔۔ کوئی بھی کام نمٹاتے ہوئے ان میں کبھی خلل نہیں پڑتا۔ ایسے ہی تمہاری یاد بھی رہتی ہے میرے پاس پاس' میرے ساتھ ساتھ۔۔۔ میرے اندر' میرے باہر۔ روٹی پکاتے ہوئے' ترپائی کرتے ہوئے' کاجل لگاتے ہوئے' کھانا کھاتے ہوئے۔ پر جب کوئی شناسائی باتوں میں پرانے حوالے نکالتا ہے تو بڑی اذیت ہوتی ہے۔ تمہارے ذکر پہ ہونٹوں پہ پھیلنے والی مسکراہٹ اور سینے میں اٹھنے والے کرب کو چھپانا سخت دشوار ہو جاتا ہے۔

محلے سے جانے والے لوگوں کے محض ذکر پہ رونا کیوں آ گیا۔ خاموشی اور بہت دھیان سے چائے پینے کے باوجود پھندا کیوں لگ گیا۔ ہاتھ سے چیز اچانک کیوں چھوٹ کر گر پڑی۔۔۔ میرے پاس بہانے ختم ہو گئے ہیں ابوبکر۔۔۔

میں بہت خوش ہوں۔۔۔ مجھے کوئی یاد نہیں آتا۔ یہ ظاہر کرتے کرتے تھک چکی ہوں۔ ہر دوسری نظر مجھے مشکوک لگتی ہے۔ ایسے میں یہ مصنوعی زندگی بہت بھاری لگتی ہے مگر تم اور تمہاری یاد۔۔۔ اس مصنوعی زندگی کا حسن ہے۔ اور حسن بھلا کب دل و نظر کو گراں گزرتا ہے۔۔۔

گاؤں مت آنا۔۔۔ پرانی تاکید کے ساتھ خط سمیٹتی ہوں۔ مشکوک نظروں کو زبان مل جائے گی۔ میری کوششیں تو بے کار ہیں۔ تم دعا کرو۔ دل سے۔ شاید میں تم سے ملنے آسکوں بلکہ شاید تمہاری دعاؤں سے ہی آسکوں۔۔۔ ورنہ تو میں مجبور ہوں۔۔۔ بے بس ہوں۔۔۔ بے حد۔۔۔!"

رافع نے خط پڑھا اور موڑ کر وہیں مٹی پہ رکھ دیا۔

کچھ دیر یوں ہی بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے معمول بنا لیا تھا۔ جب وہاں سے خط آتا۔ اس کی قبر کے پاس بیٹھ کر باآواز بلند سناتا۔۔۔ وہ سنتا تھا یا نہیں۔۔۔ بس سنا دیتا تھا۔

اس دن آپریشن سے ابوبکر زندہ نہ لوٹا تھا۔ اور ہنسی مذاق میں کہی اس کی بات کو رافع نے اپنی شہادت تک نبھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اس کا ہمراز تھا۔

وہاں۔ طیبہ اس کی ہمراز تھی۔

ہمراز جانتے تھے۔ دو زندگیاں ایک دوسرے سے مشروط ہیں۔ ع

ابوبکر کے خط بنام ہاجرہ۔ ہاجرہ کے سرہانے جمع ہو رہے تھے۔۔۔ تکیے میں۔۔۔

اور ہاجرہ کے خط بنام ابوبکر۔ ابوبکر کے سرہانے جمع ہو رہے تھے۔۔۔ کتبے میں۔۔۔!



ثمینہ عظمت علی

کالج جہاں کی دادا ہے

گئے دنوں کی بات ہے۔ خاصے دنوں کی۔

ملنگا کو گیند اور کوہلی کو بلا گھماتے دیکھ کر میرا سر گھوم گیا' جو کہ پہلے ہی سالن میں ڈوئی گھما گھما کر گھوما ہوا تھا۔ اسی گھمن گھیریوں میں... میں ان کی طرف گھوم گئی۔

"آخر آپ یہ فائنل دیکھ ہی کیوں رہے ہیں؟" میں نے تلملا کر کہا۔

"کیوں بھئی؟" انہوں نے مزا لے کر کہا۔ میرے میاں کرکٹ کے شائق تھے' جبکہ میرے لیے پاکستان کے ہارنے کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہتی تھی۔

"تم خود کو بڑا محب وطن سمجھتی ہو کہ بس ہم انڈیا سے ہار گئے تو تم ٹورنامنٹ کا بائیکاٹ کر کے بیٹھ گئیں جبکہ اصل محب وطن میں ہوں۔ انڈیا کو فائنل ہروا کر... ہی اٹھوں گا ٹی وی کے آگے سے..." وہ جوش سے بولے۔

"کیسے اٹھیں گے... یہ کوئی آخری میچ ہے؟ اس کے بعد ومبلڈن' فیفا' آسٹریلین اوپن... میں کہے دیتی ہوں کہ اس کمرے میں اب یہ ٹی وی رہے گا یا میں؟" میں نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔

"لیکن اتنی گرمی میں تم بغیر اے۔ سی کے کیسے رہوگی۔"

وہ معصومیت سے بولے تو میں واک آؤٹ کر کے کچن میں آگئی۔ اور اپنے لیے چائے کا ایک اور کپ بنایا۔

"یوں چائے پی پی کر دل جلانے سے بہتر ہے کہ اس کے ساتھ ہاتھ میں کاغذ اور قلم ہی لے لو اور ایک عدد افسانہ ہی لکھ لو۔ کتنا عرصہ ہوگیا تمہیں کچھ لکھے ہوئے۔"

"لکھتی تو رہتی ہوں ہر وقت..." میں نے کچن میں رکھے کاغذات کے پلندے اٹھائے۔ سامان کی لسٹ' بجٹ' کھانے کی ترکیبیں ٹوٹکے وغیرہ وغیرہ۔"

"افسانہ کہہ رہا ہوں بھئی۔"

"وقت بھی تو ملے... گھر کی مصروفیات..."

"ایسی بھی کیا مصروفیات ہیں۔" وہ چڑ گئے۔ "ہم دو ہی تو ہیں... پھوہڑپن بھی آتی ہے۔ اپنی سستی اور کاہلی پر مصروفیات کا پردہ نہ ڈالو۔"

ہم دونوں کی یہ ہی کمزوری تھی۔ وہ مصروفیات کا سن کر چڑ جاتے اور میں ان کی چڑ پر چڑ جاتی... یعنی میرا کام نظر ہی نہیں آتا... اف...

"سبحان اللہ... باقی سارا دن تو چھوڑیں... صرف آفس جانے کے بعد گھر کا منظر ہی دیکھ لیا کریں۔" میں نے جتایا۔

"لیکن آفس جانے کے بعد میں گھر کا منظر کیسے دیکھ سکتا ہوں۔" بھولپن کی انتہا...

"تو جاتے وقت ہی دیکھ لیا کریں۔"

"سارے گھر کے پنکھے رواں دواں... پوری طرح بیدار... حالانکہ پورے بیدار آپ مجھے کبھی نظر نہیں آئے' تین جگہ آپ آرام فرماتے ہیں۔ کمرے سے اٹھ کر لاؤنج میں استراحت فرماتے ہیں۔ پھر کبھی ادھر کبھی ادھر... تکیہ' تولیہ' کپڑے' چادر کوئی یہاں گرا' کوئی وہاں گرا' ہر طرف کی لائٹ کھلی ہوئی' چائے کا

کپ اوندھا، کنگھی پلیٹ میں، کمرہ ہولناک، باتھ روم ہیبت ناک، صابن زمین بوس، شاور الگ گریہ کرتا ہوا اور… اور…"

"اف بس کرو اب… تمہارے گھر کے منظر نے تو موت کے منظر کو بھی مات دے دی… ممتاز مذہبی اسکالر کی طرح بولے چلی جارہی ہو۔"

"اچھا… آپ کب سے سینئر تجزیہ کار بن گئے۔"

"ارے میں کیسے بن سکتا ہوں… ابھی تو میں نیوز کاسٹر بھی نہیں بنا۔"

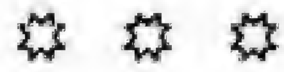
"تو اس میں بھلا کتنا وقت لگتا ہے۔ دو ہفتے خبریں پڑھیں، پھر اگلے ہفتے پروگرام اینکر بن جائیں۔ اس سے اگلے ہفتے تجزیہ کار اور اس سے اگلے ہفتے سینئر تجزیہ کار…"

"یعنی… تجزیہ کار نہ ہوا… سلمان گرنڈی ہوگیا۔"

"آف… اس کا ساتویں دن اینڈ تو ہوا تھا۔ یہاں تو ادھر ڈوبے، ادھر نکلے، ایک چینل پر ڈوبنے والا ستارہ



دوسرے چینل پر سورج چن کر طلوع ہوتا ہے۔"
"تو اس پر ہی لکھ ڈالو کچھ۔"
"ہاں کار جہاں دراز ہے۔"



شام کو آپا' بھائی جان' چھوٹے بھیا' سب آدھمکے اور میری بنی ہوئی چائے اور پکوڑوں پر میری قبل از وقت ریٹائرمنٹ کا جشن منایا۔
"مان لو کہ ایک وقتی ابال کے تحت تم نے چند کہانیاں لکھ ماریں۔ اب تم سے کچھ نہیں ہو سکتا۔"
پکوڑوں کی چوتھی پلیٹ لے جانے پر بھائی جان نے مصرعہ طرح کی طرح یہ جملہ پھینکا۔ دل تو چاہا کہ جوابا" پوری غزل عرض کر دوں' لیکن اس وقت شمع محفل اپنی طرف کرنے کا وقت نہیں تھا۔ پیچھے کڑاہی میں پکوڑے جل رہے تھے۔
"یار! بہت دن سے تمہارے ہاتھ کی بریانی نہیں کھائی۔" چھٹی پلیٹ پر چھوٹے بھیا نے باؤنسر پھینکا۔
"جمعہ رکھ لیتے ہیں۔" انہوں نے فورا" کہا۔ میں نے گھور کر انہیں دیکھا۔
"کیوں بے چارے کو دیکھ رہی ہو۔" آپا نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے اس مسکین کو کچھ کھانے کو نہیں دیتیں۔"
مسکین نے یہ سن کر اپنے اوپر مزید مسکینی طاری کرلی۔
میرے میاں بھی' میاؤں کی اس قسم سے تھے جو سسرالیوں کے ساتھ اس قدر بنا کر رکھتے ہیں کہ اگر میاں' بیوی کے درمیان کچھ مسئلہ ہو جائے تو سارے سسرالی ان کی طرف ہو جائیں اور بیٹی منہ دیکھتی رہ جائے۔
وہ سب لوگ تو ہم پر جملے کس کس کر... طعنے دے کر چلے گئے۔ رات کو یہ بھی سو گئے' لیکن میں دیر تک "ٹارزن کی واپسی" کی طرح کہانیوں کے آئیڈیاز پر غور کرتی رہی۔



اگلے دن ان کے آفس چلے جانے کے بعد ادھر ادھر کے کام کے بجائے اپنی فائل نکالی۔ کاغذات چھانٹے' رف نوٹس پڑھے۔
"ارے میرے پاس تو اچھے خاصے آئیڈیاز رکھے ہیں۔"
چائے کا کپ بنایا کہ... کافی کے کپ جتنی انٹلکچوئل نہیں تھی اور ایک موضوع منتخب کرکے لکھنا شروع کیا۔ دو' تین صفحات جم کر لکھے' پڑھے تو مزا آیا۔
"ٹھیک ہی تو کہتے ہیں سب... خوامخواہ میں اپنا ٹیلنٹ ضائع کر رہی ہوں۔ یوں ہی باقاعدگی سے لکھتی رہوں تو..."
ابھی باقاعدگی سے چھ سات افسانوں تک خیالوں کی اڑان نہیں گئی تھی کہ فون بجنے لگا۔
"کیا ہے بھئی... فون ہی نہیں اٹھاتیں... اوپر سے یہ انیس سو تاریکی کا گانا لگایا ہوا ہے... کل بھی اتنی مرتبہ نمبر ملایا... نہ کال بیک' نہ کوئی میسج' بندہ ایک مس کال ہی دے دیتا ہے۔" یہ ہماری دوست نوشین تھی' جو ہمیشہ کسی نہ کسی کا کفن پھاڑ کر ہی بولتی تھی۔
"کب بھئی..." میں نے ذرا صفائی دینے کی کوشش کی۔
"ہاں تم تو بڑی مصروف ہو' بڑی آئیں خادم اعلا..."
"لیکن اس وقت تو تمہارا جوش خطابت خادم اعلا کو بھی مات دے رہا ہے۔" میں نے قدرے تحمل اختیار کرتے ہوئے کہا۔
"اچھا... اچھا... اب زیادہ یونس بٹ بننے کی ضرورت نہیں اور ہاں... یہ فون ہے نا تمہارا... میرا پیکج ہے۔"
اس نے اپنا ہر فون کال پر کیا جانے والا سوال دہرایا اور حسب معمول جواب کا انتظار کیے بغیر اپنا بیان جاری رکھا اور وہ کوئی بے وقوف نہیں تھی۔ اچھی طرح چیک کرنے کے بعد ہی نمبر ملاتی تھی۔
"کل میری بہن آئی تھی۔ تمہارا پوچھ رہی تھی

یار۔ تم نے بہت عرصے سے کوئی افسانہ نہیں لکھا' شکایت کر رہی تھی وہ۔"

"ہیں؟ شکایت۔ میں نے کیا اسے ہر ماہ ایک افسانہ پہنچانے کا وعدہ کیا تھا؟"

"تو۔ ایک تو وہ تمہارے افسانے پڑھتی ہے۔ میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ میری دوست لکھتی ہے۔ وہ جتنی خوش ہو کر سسرال میں اتراتی پھری کہ اس کی بہن کی دوست رائٹر ہے۔ اب اس کی نند کہہ رہی ہیں کہ تم نے لکھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔"

"تب مجھے کیا معلوم تھا کہ میرا افسانہ بھی تمہاری بہن کے جہیز کا کوئی آئٹم ہے اور تمہاری۔ تمہاری بہن اور اس کی نند اور ان کے تمام اہل خانہ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں اس وقت ایک عدد افسانہ ہی لکھ رہی ہوں۔"

یہ دراصل اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اب وہ فون بند کردے' لیکن اس نے ماہانہ پیکیج اس لیے تو نہیں لیا تھا کہ بات صرف چار منٹ میں ختم کردے۔

"ارے تمہیں پتا ہے۔ وہ جو۔"

پھر جو وہ اپنی ساس' نند کے قصوں سے شروع ہوئی تو لان کے نئے پرنٹس تک جا پہنچی' وہاں سے لیفٹ ٹرن لیا تو بات ترکی ڈراموں سے شروع ہو کر "پیارے افضل" پر آن رکی اور بلا مبالغہ پچیس منٹ رکی رہی' پھر ٹاک شوز کی طرف مڑ گئی۔ پھر ایوارڈز شو۔ حتیٰ کہ ٹی وی نہ دیکھنے' فون نہ اٹھانے' اس کی دوست ہونے اور وہ سروس استعمال کرنے پر جس کا اس نے پیکیج لیا ہوا تھا کی اچھی طرح سزا دینے کے بعد آخر کار بولی۔

"اچھا۔ اب افسانہ لکھ دینا جلدی۔"

میں نے ادھورے افسانے' سن ہاتھ' گرم کان' گھومتے دماغ' لو بیٹری کا سگنل دیتے فون' خشک حلق اور سوتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ "اچھا" کہنے کی کوشش کی' لیکن ناکام ہوئی۔ لیکن اس کا کچھ فائدہ بھی نہیں تھا۔ وہ اچھا برا سب کہہ کر فون بند کر چکی تھی۔ میں نے بھی افسانہ بند کر کے رکھ دیا۔

☆ ☆ ☆

دو دن پھر یوں ہی گزر گئے۔ تیسرے دن ہمت کر کے پھر فائل سنبھالی۔ ابھی تین صفحے ہی لکھے تھے کہ فون کی بیل بجی۔ پچھلی بار کے تجربے کے بعد اس بار عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے موبائل فون آف کر دیا تھا۔ لیکن یہ عقل مندی کام نہ آئی اور لینڈ لائن نمبر بجنا شروع ہو گیا۔ فون کرنے والے سے پہلے تو میاں پر غصہ آیا۔ کئی بار کہا تھا کہ موبائل فون کے ہوتے ہوئے اس کی ایسی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ لیکن جواباً" وہ اس کی افادیت پر ایک لمبی چوڑی تقریر کرتے جس کے اختتام سے پہلے ہی میں فون کے حق میں دستبردار ہو جاتی۔

بادل نخواستہ کاغذ اور قلم پٹخے اور نہایت غصے سے ریسیور کان سے لگایا' اور ایسا کرتے ہی کان پھٹنے لگے۔ پہلے تو سمجھ ہی نہیں آیا کہ کس نے ہمیں فون کر کے بم دھماکے کی ریکارڈنگ لگا دی ہے یا سچ مچ کہیں بم پھٹ رہے ہیں۔

"الٰہی خیر۔" کچھ اوسان بحال ہوئے تو اس آواز سے کچھ قریبی رشتہ محسوس ہونے لگا۔ حتیٰ کہ وہ آواز پہچان ہی لی۔

"کہاں مر گئی ہو۔ موبائل آف اور یہ فون ہے کہ اس کی بیل بج بج کر سنچری کرنے والی ہے۔" آپا مجھ پر برس ہی پڑیں۔

لفظ "سنچری" سن کر ایک جھٹکا سا لگا۔ افسانہ' دھماکے' فون آپا سب ذہن سے ہٹ گئے اور یاد آیا کہ میں تو اپنے میاں سے پوچھنا ہی بھول گئی تھی کہ اس دن ویرات کوہلی کی سنچری ہوئی تھی یا نہیں۔ اس وقت ساری خواہشات پس پشت چلی گئیں۔ سوائے اس کے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ کوہلی کی سنچری ہوئی تھی یا نہیں۔ (یعنی اصل خواہش یہ تھی کہ کہیں ہوئی تو نہیں؟)

"آپا! یہ بتاؤ تم نے ٹی ٹوئنٹی کا فائنل دیکھا تھا۔ کوہلی کی سنچری۔ ہوئی۔ تھی۔"

"ہیں۔" یہیں سے آپا کا کھلا ہوا منہ نظر آنے لگا۔ "لگتا ہے کہ پاکستان کی شکست نے تمہاری ذہنی

حالت پر مضر اثرات ڈالے ہیں۔ اس کو تو بہت دن ہو گئے اور آج کہاں سے یاد آگیا اور مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو' جانتی ہو کہ مجھے ان "خرافات" سے کوئی دلچسپی نہیں اور میں کوئی نجم سیٹھی ہوں۔ یا محی حسینی کہ ماجد بھٹی۔۔؟ آپا کا غصہ تو عروج پر تھا ہی معلومات عامہ بھی اس "خرافات" سے دلچسپی نہ ہونے کے باوجود غضب کی تھیں۔

"اور نہ ہی مجھے کسی کوئز پروگرام میں واٹر کولر جیتنا ہے۔" آپا نے مزید اضافہ کیا اور بس الٹی سیدھی ہانکے جا رہی ہو۔ یہ بھی نہیں پوچھ رہیں کہ فون کیوں کیا ہے؟"

"فون کیوں کیا ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا مبادا ان کا زور خطابت مزید زور نہ پکڑ جائے۔

"کیوں؟" وہ برا ہی مان گئیں۔ "بڑی بہن ہوں تمہاری۔۔ فون بھی نہیں کر سکتی؟"

"ایں۔۔" میں تو ہکا بکا ہی رہ گئی۔

"اوہو بھئی۔۔ ان نالائقوں نے سر ہی گھما دیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ جنوں میں کیا کیا بک رہی ہوں۔" آپا نے کہا۔

"کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر اپنی فائل کو دیکھا۔

آپا کے اپنے ہونہار اور لاڈلے سپوتوں کے ذکر نے ہی مجھے باور کروا دیا کہ آپا کی طرف سے مجھے کوئی "مشن امپاسبل" تفویض ہونے والا ہے۔ جس کی تکمیل تک کوئی کام کرنا تو دور کی بات' سوچنے تک کی مہلت ملی ہو' تاریخ ایسی گواہی دینے سے قاصر ہے۔

"ویسے تو پڑھائی میں اچھے ہیں' لیکن بس اردو پڑھ کے نہیں دیتے۔" آپا نے بیان جاری رکھا۔ "آج تمہارے بھائی جان سے کہا ہے کہ اسکول سے واپسی پر تمہارے گھر چھوڑ دیں۔ ذرا ان کو تیاری کروا دو۔ دو دن بعد ان کا گرینڈ ٹیسٹ ہے۔"

"جی آپا! ضرور۔۔" کچھ بھی تھا۔۔ اپنے بھانجے مجھے جی جان سے عزیز تھے۔

"اور دیکھو لنچ پر نوڈلز وغیرہ بنا لینا یا نگٹس۔۔ ہزار نخروں سے تو کھاتے ہیں۔"

"جی اچھا۔۔"

"اور بتاؤ افسانہ لکھا کہ نہیں؟" (گویا اس کے بعد بھی افسانہ لکھنے کی گنجائش تھی؟)

"کہاں آپا۔ وقت ہی۔۔"

"وقت کی اچھی کہی تم نے۔" انہوں نے بات کاٹ دی۔ "بس خود کو مورد الزام نہ ٹھہرانا' سدا کی کاہل' کام کی نہ کاج کی' میاں تمہارا اللہ میاں کی گائے' ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا ہوا ہے۔ راوی ہر طرف چین لکھتا ہے اور تم سے دو حرف لکھے نہیں جاتے' ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔"

اور میں سخت برا مان گئی۔ اس لیے نہیں کہ آپا نے مجھ پر تنقید کی تھی' بلکہ اس لیے کہ آپا کو اردو پڑھانے کے لیے بچے میرے پاس بھیجنے کی ضرورت تھی بھلا۔۔

☼ ☼ ☼

"خالہ۔۔" کامران اور سلمان نے آتے ہی نعرہ بلند کیا۔

"Wifi کا پاس ورڈ بتایے جلدی سے۔"

"ارے۔۔ یہ کہاں سے آئے؟" ہم نے ان کے ٹیبس کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ "اسکول میں اجازت ہے لے جانے کی؟"

"نہیں ہم نے بابا سے کہا تھا کہ ساتھ لے آئیں۔ ان کے بغیر پڑھائی کیسے ہو گی۔"

"جن سے پڑھتے ہو نا۔۔ وہ سب ان کے بغیر ہی پڑھے تھے۔" میں نے جتایا۔

"لیکن ہم تو کسی جن سے نہیں پڑھتے۔" کامران نے سنجیدگی سے کہا۔

"اوہ میرے ننھے جن! پہلے کھانا تو کھا لو۔"

کھانے کے بعد کتابیں لے کر بٹھایا۔

"بتاؤ کیا پڑھنا ہے؟ کیا پوچھنا ہے۔"

"خالہ! یہ مذکر مونث سمجھ میں نہیں آ رہے۔" سلمان بولا۔

"لو بھلا ان میں کیا مسئلہ ہے۔"

"جگنو!" وہ بولا۔ "جگنو۔" میں بھونچکی رہ گئی۔ جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کرنے والے بچے تو سنے تھے۔ جگنو کی مونث پوچھنے والا یہ پہلا بچہ تھا۔

"باز۔۔۔" اس نے دوسرا لفظ بتایا۔

اپنے زمانہ طالب علمی میں تو ہم بس لڑکا۔ لڑکی۔۔۔ اماں۔۔۔ ابا۔۔۔ بہن 'بھائی کارٹا مار کر مذکر مونث سے فارغ ہو جایا کرتے تھے اور کسی دن حقوق حیوانات کا خیال آیا تو شیر 'شیرنی' مرغا' مرغی اللہ اللہ خیر صلا۔

"خالہ! یہ ایک ہی آواز کے اتنے مختلف لیٹرز کیوں ہیں ز۔۔۔ ذ۔۔۔ ض۔۔۔ ظ۔ ہمیں کیسے پتا چلے گا کہاں کیا لکھنا ہے۔"

ابھی میں باز اور جگنو میں ہی پھنسی ہوئی تھی کہ ایک اور سخت سوال۔۔۔

"یہ تو کسی ماہر لسانیات سے ہی پوچھنے پڑیں گے۔" میں نے کہا۔

"تو امی ہمیں پہلے ہی کسی ماہر نفسیات کے پاس بھیج دیتیں۔ آپ کے پاس کیوں بھیجا؟"

"ماہر نفسیات نہیں الو! ماہر لسانیات' لیکن تم دونوں نے مزید دو ایسے سوالات پوچھے تو شاید مجھے کسی ماہر نفسیات سے رجوع کرنا پڑ جائے۔ اچھا اور کیا ہے؟ ان کو پھر دیکھتے ہیں۔"

میں نے ذہن میں اپنے اردو دان نیٹ فرینڈز کے نام یاد کرنا شروع کر دیے۔

"کبری 'اصغری ہے۔ دو بہنوں کی کہانی' پہلا حصہ میری کلاس میں ہے' دوسرا بھائی کی۔" کامران نے بتایا۔

"اچھا ٹھیک ہے' ایسا کرو۔۔۔" میں نے کہا۔۔۔ "میرے پاس اوریجنل ناول "مراۃ العروس" موجود ہے' میں وہ لے کر آتی ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے۔۔۔" ایک دم سے میرے ذہن میں جھما کا ہوا۔

کچھ دن پہلے نیٹ پر شغلا "سرفنگ" کرتے ہوئے پرانا ڈراما مراۃ العروس ملا تھا جو کسی زمانے میں صبح کی نشریات میں دکھایا گیا تھا اور بے حد مقبول ہوا تھا۔ ارسہ غزل اور عارفہ صدیقی کے یادگار کردار۔۔۔

"میں تم لوگوں کو ایک ٹی وی پلے دکھاتی ہوں۔ اس سے پورا ناول بھی سمجھ آئے گا اور اردو کا تلفظ بھی صحیح ہوگا۔"

پلے کے نام پر وہ خوش ہو گئے۔

"خالہ! یہ ابھی تک چلتا ہے۔" سلمان نے ہمارے پیارے اکلوتے لاڈلے کمپیوٹر کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں نہیں چلتا' پاگلو خبردار۔۔۔ جو اس پر تنقید کی۔۔۔ کمیٹی ڈال کر لیا تھا۔"

سلمان اور کامران "کھی کھی" کرنے لگے' لیکن میں نے مطلق پروا نہ کی۔ انہیں وہاں بٹھا کر میں ان کے ٹیب پر سرچ کرنے لگی۔ وہی مذکر مونث' پھر چائے بنا کر پینے لگی۔

"ارے تم یہاں بیٹھی چائے پی رہی ہو۔ وہ دونوں کہاں گئے۔ کچھ پڑھایا نہیں۔"

"ارے آپا۔۔۔ تم۔۔۔ اچانک۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ بس اکیلے میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ اس لیے چلی آئی۔۔۔ چائے پلا دو اور یہ ہیں کہاں؟"

"مراۃ العروس دیکھ رہے ہیں ایک گھنٹے سے۔۔۔" میں نے فخریہ بتایا۔

"کیا پڑھنے کی چیز کو دیکھ کیسے رہے ہیں؟" وہ حیران تھیں۔

میں نے انہیں اپنا ڈاؤن لوڈڈ کارنامہ بتایا' لیکن انہیں یقین نہ آیا کہ ان کے مستی لوڈڈ بچے ایک پرانا ڈراما اور وہ بھی پی ٹی وی کا اتنے سکون سے دیکھ سکتے ہیں۔

"اور اگر وہ واقعی دیکھ رہے ہیں تو۔۔۔" آپا گھبرا گئیں۔

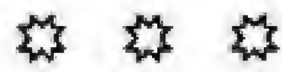
"تو گھبرانے کی کیا بات ہے اس میں۔"

"کہیں عاقل جیسے ڈفر ہی نہ ہو جائیں یا کامل جیسے گھامڑ۔"

"اور ہو سکتا ہے کہ اصغری سے اچار اور مربوں کی ترکیبیں ہی سیکھ لیں۔" میں نے شرارت سے کہا۔

"لیکن ماما عظمت کی مکاریاں سیکھ لیں تو۔" آپا کا سوال۔ ہم نے کمرے میں جاکر دیکھا تو حق دق رہ گئے۔ ڈھنکا چھکا ڈھنکا چھکا۔

نہ ماما عظمت کی چالاکیاں، نہ عاقل کی نالائقیاں وہ دونوں تو سلمان خان سے بارہ مہینوں میں بارہ طریقوں سے پیار جتانے کے طریقے سیکھ رہے تھے۔



کچھ دن مزید سستی، کاہلی، گرمی اور لوڈشیڈنگ کی نذر ہوتے رہے، پھر بالآخر کسی سرکاری محکمے کی طرح پرانی فائل باہر نکالی اور آئیڈیاز کا نئے سرے سے جائزہ لیا۔ پچھلی کہانی سے تو دل اٹھ گیا تھا۔ اسے ادھوری کہانیوں والی فائل میں ڈال دیا، جس میں کہانیوں کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھتی جارہی تھی۔ جسے پورا کرنے کا عہد ہمیشہ خود سے کیا کرتی تھی، لیکن وہ وعدے بھی حکومتی وعدوں کی طرح ہی تھے۔ ہر بار پچھلے پلان ٹال کر نئے پلانز شروع ہوجاتے۔ اگڑ بکڑ کرکے ایک آئیڈیا منتخب کیا اور ابھی لکھنے کا سوچ رہی تھی کہ۔۔۔ ڈنگ ڈونگ۔۔۔

میں نے کان نہیں دھرے اور کاغذات کھولنا شروع کردیے، لیکن ڈنگ ڈونگ ڈنگ ڈونگ کا سلسلہ قیامت تک رکنے کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ آخر اٹھنا ہی پڑا۔

"آنٹی! السلام علیکم!" ایک ٹین ایجرلڑکا تھا کوئی۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ اپنے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آیا۔

"آنٹی! مجھے بلو پھپھو نے بھیجا ہے۔"

"بلو پھپھو؟"

"وہ سامنے۔" اس نے سامنے والے سفید گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا اچھا۔ وہ بلقیس باجی۔"

"جی۔۔۔ جی۔۔۔ وہ ہی۔۔۔ ہمارے اسکول میں ڈیبیٹ ہے۔ پھپھو نے کہا کہ آپ بہت اچھی تقریر لکھتی ہیں۔" اس نے ایک کاغذ میری طرف بڑھایا۔ "اس پر ٹاپک لکھا ہے۔ اس کی مخالفت میں پوائنٹس لکھنا ہیں۔"

"اچھا۔" میں نے کاغذ لیا اور اندر آگئی۔

غضب خدا کا، بلو باجی جنھوں نے ہمیں گودوں میں کھلایا اور اب ان کا اتنا لمبا تڑنگا بھتیجا آنٹی کہہ کر چلا گیا۔ تسلی نہ ہوئی تو جاکر آئینے کے آگے کھڑی ہوگئی، لیکن اپنے آپ میں آنٹی پن کے کوئی آثار ۔۔۔ نظر نہ آئے۔

"تو۔۔۔ شادی ہوجانے کا مطلب یہ ہے کہ کل تک جو نام لے کر بلاتے تھے یا زیادہ سے زیادہ باجی کہتے تھے وہ آنٹی کہنے لگ جاتے ہیں اور چلے ہیں تقریریں لکھوانے۔"

دل تو چاہا کہ کاغذ ہی پھاڑ کر پھینک دوں، لیکن ایک تو طبیعت کی مروت۔۔۔ اوپر سے جوش خطابت۔۔۔ کہاں جاتا۔۔۔ موضوع پڑھا۔

لازم ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

ارے۔۔۔ میں تو خود کبھی کبھی تو کیا ہمیشہ کے لیے دل کو تنہا چھوڑنے کی قائل تھی اور عقل کو اس کے پاس بھٹکنے سے بھی حتی المقدور روکنے کی حامی۔۔۔ تو اب اس کی مخالفت میں کیا لکھا جائے۔ یعنی عقل کو دل کا چوکیدار بنا دیا جائے، جو دن رات سیٹیاں بجاتی رہے اور ایسے دلائل دیے جائیں کہ حاضرین سیٹیاں بجاتے رہ جائیں۔۔۔ لیکن اقبال کا شعر تھا اور وہ ان کا کوئی واحد شعر تو نہیں تھا۔ ان کے اشعار کا سب سے بہترین مصرف تو ہماری قوم کے لیے یہ ہی ہے کہ تقریروں میں ہر دوسری سطر کے بعد پڑھے جائیں اور مکے مار مار کر ڈائس توڑ دیا جائے۔ "شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات" سے شروع کرکے "لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا" پر ختم کیا جائے۔ زمانہ طالب علمی گواہ ہے کہ جج صاحبان ابتدائی اور اختتامی اشعار اور مکوں کی آواز کے علاوہ کچھ نہیں سنتے اور انعام کا فیصلہ ان ہی اشعار اور مکوں کی تعداد پر ہوتا ہے۔

تقریر لکھنے بیٹھی تو افسانے کا فسانہ ہی بھول گئی۔ تقریر پوری ہوئی تو کمے مار مار کر اس قدر نڈھال ہو چکی تھی کہ کچھ اور کرنے کی ہمت نہیں رہی، بلکہ مزید کچھ بھی کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ بلوباجی کا بھتیجا تقریر لے کر اور "تھینک یو آنٹی" کہہ کر چلا گیا تو پھر گویا یادداشت واپس آگئی۔ آئینے میں دوبارہ چہرہ کا جائزہ لیا اور خواتین ڈائجسٹ کے پرانے شمارے نکال کر خوب صورت بننے کی ترکیبیں پڑھتے ہوئے خیالوں ہی خیالوں میں ابٹن بیسن، عرق گلاب، ملتانی مٹی چہرے پر لگاتی رہی۔ پھر پانچ منٹ میں چہرہ چمکانے کی ترکیب پڑھی جس کے لیے "دو دن پہلے" تیاری کرنی تھی۔ ابھی اس پر غور ہی کر رہی تھی کہ بلوباجی کا میسج آیا۔

"بہت اچھی تقریر لکھی ہے، لیکن افسانہ کب لکھو گی؟" یعنی ہر اس شخص کا میرے افسانے سے کام تھا جسے مجھ سے کچھ کام تھا۔"

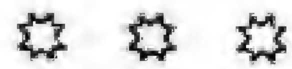
سر جھٹک کر فرحت اشتیاق کا ناول پڑھنا شروع کیا اور خیالوں ہی خیالوں میں دو خواب دیکھتی رہی۔ ایک اٹالین پزا کھانا اور دوسرا۔۔۔ آہ۔ خواب دیکھنے میں کیا ہے۔

"فرحت جیسا دو ہزار صفحات کا ناول لکھنا۔"



"کیا لکھا؟" رات کو شوہر صاحب نے پوچھا۔

"اٹھارہ اشعار والی ایک تقریر اور پانچ منٹ میں چہرہ چمکانے کا نسخہ جس کے لیے دو دن پہلے تیاری کرنی پڑتی ہے۔"



"دراصل میں ساری کمزوری تمہاری ہے۔"

ناشتے کی ٹیبل پر انہوں نے رات سے اچانک اختیار کر لینے والی خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

"تو کیا ساری رات کی سوچ و بچار کے بعد آپ پر یہ انکشاف ہوا۔" میں نے چائے کا گرم گھونٹ بے صبری سے لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔۔۔ یہ تو مجھے پہلے سے پتا تھا، بس رات سکون سے گزارنے کے لیے تمہیں صبح بتانے کا فیصلہ کیا۔" انہوں نے اطمینان سے ارشاد کیا۔ "یہ کیا بہانے ہیں کہ کوئی آگیا، کسی کا فون آگیا، کسی نے تقریر لکھوالی۔۔۔ وغیرہ تم خود ہی مصنفین کے قصے سناتی ہو کہ فلاں کے اتنے بچے ہیں، کوئی جاب کرتی ہے، کسی کا بھرا پرا گھر ہے۔"

"لیں جی! قصہ ہی ختم، اب سارے دن کی گپ شپ کے لیے ایک وہی میسر تھے، اسی اکلوتے پن کی وجہ سے میں ہر بات ان سے شیئر کر لیتی تھی، جو کہ بعد میں میرے لیے باعث آزار ہوتی۔ وہ کسی ظالم ساس کی طرح کوتاہی گنواتے، چالاک نند کی طرح طنز فرماتے، مخالف دیورانی، جٹھانی کی طرح خامیوں پر نظر رکھتے، یعنی پوری سسرال کا کردار بخوبی ادا کرتے۔ میری تمام ماؤں سے اپیل ہے، جو چھڑے چھانٹ رشتے پر خوش ہوتی ہیں کہ بچی ساس، نند کے جھنجھٹ سے بچی رہے گی تو وہ لڑکے سے ذرا تفصیلی تعارف اور جان پہچان ضرور پیدا کریں کہ سارا پیکج اسی ایک بندے میں تو نہیں ہے۔"

"اچھا رہنے دیں۔" میں نے برا مانتے ہوئے کہا۔

"آپ کو بھلا اتنی دلچسپی کیوں ہے، افسانہ نگار کا میاں بننے سے کون سا میڈل مل جاتا ہے۔"

"وہ افسانہ نگار کو ہی نہیں ملتا تو اس کے شوہر کو کیا ملے گا۔"

وہ آفس جانے کے لیے کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔



اس دن تو بس فیصلہ کر لیا کہ اب تو دنیا تیاگ کر لکھنا ہے اور دنیا ہی کو دکھانا ہے۔

سوان کے آفس جانے کے بعد سارے فون آف کر کے ملازمہ کو سختی سے تاکید کی کہ کسی سے نہیں ملنا اور کمرہ بند کر کے بیٹھ گئی کہ آج تو باہر ایک کہانی لکھ کر ہی نکلنا ہے۔

اب کہانی لکھنے کسی بونے نے تو آنا نہیں تھا، سو خود

ہی کہانی لکھنا شروع کی اور لکھتی رہی، لکھتی رہی، حتیٰ کہ بچپن کے بچھڑے ہوئے ہیرو، ہیروئن ایک جگہ آ ملے۔ ہیروئن کا دل دھڑ دھڑ دھڑک رہا تھا کہ ادھر دھڑ دھڑ دروازہ بجنے لگا۔ پہلے تو اسے اپنے قلم کا کرشمہ ہی سمجھا کہ ہیروئن کے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی ہے۔ لیکن پھر احساس ہوا کہ مبالغے کی ساری حدیں پھلانگ کر بھی دل بھری جگانے والے کے ڈھول کی طرح نہیں دھڑک سکتا۔ اس دھڑ دھڑ کے پیچھے ضرور کوئی اور ہاتھ تھا۔

"آخر کون ہو سکتا ہے؟" شدید بے زاری کے ساتھ دروازہ کھولا تو سامنے میری بہن گڈی کھڑی تھی۔

"کیا ہے بھئی۔۔۔ تم کیا رجب میں ہی اعتکاف میں بیٹھ گئیں یا پھر سے ماہوں بیٹھنے کا شوق چرایا ہے۔ اوپر سے وہ تمہاری ملازمہ کہتی ہے کہ آپ اندر نہیں جاسکتیں۔ میں نے اس سے کہا کہ اس بات پر تو میں تمہیں اندر کرواسکتی ہوں۔ بھلا مجھے کون روک سکتا ہے۔ آفٹر آل چھوٹی بہن ہوں اور تم سے زیادہ تو دولہا بھائی مجھے اپنی بہن سمجھتے ہیں اور امی کے گھر تو سب سو رہے ہیں۔ میں تھکی ہاری، گھر کو ترسی ہوئی، اتنا سفر کرکے آئی اور خواب میں بریانی کھاتی ہوئی آئی، لیکن یہاں سب خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہیں، آپا کو فون کیا تو کامران نے بتایا کہ وہ بھی محو خواب ہیں۔ آخر یہاں سب کو اتنی نیند کیوں آتی ہے؟ ادھر میرا یہ حال ہے کہ ایگزامز کی ٹینشن نے دن رات کی نیند اڑا رکھی ہے۔"

دراصل گڈی اعلا تعلیم کے لیے کراچی میں رہتی تھی، وہاں وہ چند اور کالج فیلوز کے ساتھ رہتی تھی، لیکن پڑھائی کی شدید مصروفیات اور ایک دوسرے سے علیحدہ ٹائم ٹیبل کی وجہ سے گڈی کو اپنے خطیبانہ جوہر دکھانے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔ اس لیے وہ اپنے الفاظ کا ذخیرہ بڑی فیاضی سے ہم پر لٹایا کرتی تھی۔ لہٰذا گڈی کو دیکھتے ہی سب کو نیند آنے لگتی اور جسے نہیں آتی، وہ کم از کم نیند کی ایکٹنگ ضرور کرلیتا تھا، لیکن آج تو گڈی نے مجھے بیاہی بے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ میرے پاس اب اداکاری کے جوہر دکھانے کا موقع نہیں بچا تھا، سو وہ اپنے بیان کے جوہر دکھائے چلی جارہی تھی۔

"کیسی ہو گڈی؟ اچانک چلی آئیں۔"

میں نے بمشکل کہا اور حیرت انگیز طور پر جملہ پورا کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ وجہ دیوار پر لگی وہ تصویر تھی جس کی طرف وہ لمحہ بھر کو متوجہ ہوئی تھی اور میں اپنے لبوں سے کچھ الفاظ ادا کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

کیا ہی اچھا ہوتا اگر گڈی اس اعلا تعلیم کے بجائے کسی اسکول میں بچوں کو مباحثوں کی تیاری کرواتی، وہ۔ وہ شعلہ بیاں مقرر پیدا ہوتے کہ اسکول کا نام ملک بھر میں روشن ہوجاتا اور کسی ٹاک شو میں اپلائی کرنے کے لیے صرف یہ کہہ دینا ہی کافی ہوتا کہ امیدوار اس تعلیمی ادارے سے فارغ التحصیل ہے جہاں گڈی مباحثوں کی تیاری کرواتی تھی، بلکہ وہ خود کسی چینل کو اپنی صلاحیتوں سے مستفید ہونے کا سنہری موقع فراہم کرتی تو سب کا فائدہ ہوتا اور سب سے زیادہ فائدہ تو خود ہم گھر والوں کو ہوتا کیونکہ ٹی وی تو پھر بھی بند کیا جاسکتا ہے۔

لیکن اس وقت تو یہ جیتی جاگتی گڈی میرے آگے کھڑی تھی، سونے پہ سہاگہ میں اس سے ہنڈرڈ ملین ڈالرز کا سوال بھی پوچھ چکی تھی کہ۔۔۔

"کیسی ہو؟"

"تو۔۔۔ کیسی ہو سکتی ہوں کتنا کہا تھا کہ میرا ایڈمیشن حیدر آباد ہی کروادیں، وہاں ہاسٹل تو ہوتا یا میں ماموں کے گھر ہی رہ لیتی۔۔۔ اور ہاں۔۔۔"

اس نے اچانک رک کر مجھے ضروری اطلاع دینے کے انداز میں دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ وان گوگ کی پینٹنگز لگانا کوئی صحت مند رجحان نہیں ہے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ وہاں تو اس فلیٹ میں، میں خوار ہوگئی ہوں۔ ایک تو ساتویں منزل پر فلیٹ۔ یہ جو آج اچانک آکر میں نے تمہیں

گرائنے (سرپرائز) دیا ہے اس کی وجہ بھی یہ ہی ہے گیٹ پر ہی چاچا گارڈ نے بتادیا کہ لفٹ خراب ہے۔ میں نے سڑک کی طرف دیکھا تو بس آرہی تھی۔ بس پھر کیا تھا میں بس میں بیٹھی اور یہاں آگئی۔ اتنی بدتمیز لڑکیاں ہیں پھوہڑ بدسلیقہ کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرتیں۔"

"پھوہڑ بدسلیقہ۔ تم کیا ہوم اکنامکس پڑھ رہی ہو؟"

میں نے بیچ میں جلدی سے کہا۔ حالانکہ پوچھنا تو یہ تھا کہ وان گوگ کی پینٹنگز کا ذہنی صحت سے کیا تعلق تھا لیکن اس کی باتیں تھیں کہ اچھے بھلے انسان کے اوسان خطا ہوجائیں۔

"اوفوہ! یہ کیا بے تکی بات کی تم نے۔ کیا سلیقہ بس ہوم اکنامکس پڑھنے کے لیے چاہیے! تم سے اس کے علاوہ توقع ہی کیا کی جاسکتی ہے۔ تم تو بقول امی کے سدا کی ست اور کاہل واقع ہوئی ہو۔"

"ارے۔ ارے۔" میں نے کہنا چاہا کہ بھلا میرے اس سوال کا سستی اور کاہلی سے کیا تعلق ہے اور کب امی نے مجھے ست اور کاہل کہا۔ لیکن گڈی کی گڈی اپنے سے چلی جارہی تھی۔

"نیلی فریج لے کر آئی اور بڑی فراخ دلی سے سب کو استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ میں بھی خوش ہوگئی۔ آپا سے سالن امی سے کباب اور تم سے دہی پھلکیاں چنے نگٹس (پھر بھی سستی کا طعنہ؟) بنوائے کہ رمضان آنے والا ہے اس نیلی کی بچی نے میرا اور ریما کے ساتھ سب اڑادیا۔"

"کیوں انہوں نے جاوید شیخ کو افطاری پر بلوایا تھا یا شان اور معمر رانا کو۔؟" میرا سوال۔

"معمر رانا کو بلائیں یا شکور رانا کو لیکن میرے کھانے کی ساری چیزیں اڑادیں اور ذرا جو شرمندہ ہوں۔ نیلی صاحبہ فرمانے لگیں کہ فریزر اتنا بھر گیا ہے کہ کچھ پتا ہی نہیں چلتا۔ بائی داوے تمہیں یہ پاکستانی ہیرو کہاں سے یاد آگئے بھلا وہ کیوں اتنے "معمر" رانا کو بلانے لگیں اور وہ تو پاکستانی فلمیں دیکھتی بھی نہیں ہاں بریڈپٹ کو بلالیں تو اور بات ہے لیکن وہ کیا قورمہ اور دہی پھلکی کھائے گا؟"

"پھر وہ اپنے نام۔"

"کیا ہے بھئی۔ خود ہی بولے چلی جارہی ہو اتنی توفیق نہیں کہ چھوٹی بہن اتنے عرصے کے بعد (پچھلے ہفتے ہی آئی تھی۔) آئی ہے کہ چار باتیں اس کے دل کی بھی سن لو۔ پھر کیا ہوا۔ اگلے دن میرا استری کیا ہوا سوٹ پہن کر چلی گئی۔ میں نے شام کو پوچھا کہ "کیا سوٹ بھی فریزر میں گڈمڈ ہوگئے تھے؟ (الحمدللہ میرے پاس اپنی الماری موجود ہے) تو کہنے لگی کہ "میرے پاس بھی بالکل ایسا ہی سوٹ ہے۔ غلطی ہوگئی۔" پھر ریما بے منہ بنا کر کہنے لگی۔ "آج کل تو ڈیزائنر سوٹس کے نقل بھی آجاتے ہیں۔" مجھے تو اس قدر تاؤ آیا۔ وڈی آئی امیر عدنان کی سگی۔"

گڈی کی باتیں سن سن کر میرا سر چکرا گیا تھا۔ بھلا ہو میری ملازمہ کا جو ہمارے لیے چائے لے آئی۔

"یہ کیا ہے؟" گڈی نے کاغذات اٹھائے۔

"میں افسانہ لکھ رہی تھی۔" میں نے جتا کر کہا۔

"اچھا؟ واقعی۔ اللہ کرے کہ یہ مکمل ہوجائے۔ خوامخواہ میں نے کالج میں اور ان نیلی میرا ریما کی بچیوں کو بھی غلطی سے بتادیا۔ ایک سال ہونے کو آیا۔ اب تو وہ میرا مذاق اڑاتی ہیں۔ میں نے انہیں پرانے ڈائجسٹ دکھائے لیکن وہ کہتی ہیں کہ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ کوئی اور ہیں۔ لوجی۔ محض تمہاری سستی کی وجہ سے ان نالائقوں نے مجھے وہم کا مریض قرار دے دیا۔"

"کیا ہے بھئی۔ سُستی سُستی۔ سب نے شور مچا رکھا ہے لکھنا کوئی بٹن دبانے پر ہے تخلیقی کام ہے۔ موڈ اور ماحول سے ہوتا ہے۔"

"ہاں۔ ہاں۔ تم آخر آگ کا دریا کے پائے کے ناول لکھتی ہو کوئی آسان کام تھوڑا ہی ہے۔ بڑی محنت چاہیے۔" اس نے چائے پیتے ہوئے نہایت اطمینان سے کہا۔

اف یہ لڑکی کس قدر چالاک ہے۔ گھر کا کوئی کام ہو

تو سخت پڑھائی کا شور مچاتی ہے اور کم بخت کوئی کتاب نہیں چھوڑتی۔

"ڈراما کیوں نہیں لکھ رہیں' لوگ پڑھتے کم ہیں' ٹی وی زیادہ دیکھتے ہیں۔" ایک اور فرمائش۔

لیجیے یہاں افسانہ لکھنے کا ٹائم نہیں اور اسے ڈرامے کی پڑی ہے۔ لیکن اس بار بھی وقت کا رونا رو کر ایک بار پھر کاہلی کا طعنہ سنتی؟

"چھوڑو۔ سارے ایک سے ٹاپک' ایک سے ڈرامے۔"

"کوئی نہیں اتنے اچھے آرہے ہیں سب۔" گڈی نے یوں برا مانا گویا سارے ڈراموں کی رائٹر' ڈائریکٹر' پروڈیوسر اور وہ' ہاں کیا کہتے ہیں اسکرپٹ ایڈیٹر وہ خود ہی ہو۔

"وہ دیکھا ہے۔" گڈی نے کسی ڈرامے کا نام لیتے ہوئے کہا۔ "اللہ دیورانی اور جٹھانی ایک ہی ہیرو کے پیچھے پاگل ہو رہی ہیں۔"

"خدا کا خوف کرو گڈی! اس سے پہلے بھی تم نے جس ڈرامے کا ذکر کیا تھا' اس میں بھی یہ ہی قصہ تھا۔" میں نے کہا۔

"ارے نہیں' اس میں دیورانی' جٹھانی نہیں تھیں۔ بھابھی اور نند تھیں۔"

"وہ تو اس سے پہلے بتایا تھا۔" میں نے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھئی' وہ دونوں تو کزنز تھیں۔"

"اور اس سے پہلے۔"

"وہ۔ وہ تو دونوں پڑوسنیں تھیں۔"

"پڑوس والا بھی بتایا تھا' اس سے پہلے گڈی۔" میں نے عاجز ہو کر کہا۔

"تم تو بالکل بھلکڑ ہو۔ وہ تو پھوپھی اور بھتیجی تھیں۔"

"اور اس سے پہلے والا۔"

"ہاں۔ وہ دونوں بہنیں تھیں۔" آخرکار اس نے اعتراف کر ہی لیا۔

"تو اس میں بھی تو دو بہنیں ہی تھیں نا۔"

"بے وقوف پہلے وہ دونوں بہنیں تھیں۔ اب دو بھائیوں سے ان کی شادی ہو گئی تو وہ دیورانی اور جٹھانی بن گئیں۔" گڈی نے فخریہ انداز میں کہا۔

"تو ان کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اب وہ دیورانی اور جٹھانی بن چکی ہیں۔"

"پھر ڈراما کیسے چلے گا۔"

"یہ ڈراما چلا رہے ہیں یا ناظرین کا دماغ۔ ایک ہیرو ہے تو سارے شہر کی لڑکیاں اس کے پیچھے پاگل ہو رہی ہیں۔ ایک لڑکی ہے تو گلی' محلے' گھر خاندان' کالج' آفس کا ہر لڑکا اس کے لیے سرگرداں و پریشان ہے۔ اب لڑکے کو جو لڑکی پسند ہے تو پورا خاندان اس کے پیچھے اور لڑکی کو جو لڑکا پسند ہے۔ اس کے پیچھے پولیس لگا دو۔ لو جی۔ چھتیس قسطیں تو اس میں نکل گئیں۔ اب کچھ صلح صفائی ہونے لگی تو بیرون ملک سے یا یہیں سے چک تعلقے سے ایک نیا ہیرو بر آمد۔" میں ہانپ گئی۔

"تم جانتی ہو کہ کیا کہے جا رہی ہو؟" گڈی نے حیرت سے کہا۔

"تو تمہارے خیال میں ڈرامے کو معلوم ہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔"

"اب کیا ڈراموں کی باتیں کرتی رہو گی۔ اتنی بھوک لگی ہے۔" گڈی نے دہائی دی۔

"ڈراموں کی باتیں۔ میں کر رہی تھی؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"تو کیا میں کر رہی تھی؟" گڈی نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک نظر کاغذات اور دوسری ایک بجاتی گھڑی پر ڈالی۔ ہیروئن کا دل تو دھک دھک کرنا بند کر چکا تھا۔ میں دھپ دھپ کرتی کچن میں آگئی۔



گڈی کے اس طوفانی و ہنگامی دورے کے آفٹر شاکس نے کئی دن مجھے اپنی لپیٹ میں رکھا اور میں نے اپنی حسیات لپیٹ کر رکھ دیں اور بس چادر لپیٹ کر بیٹھا کیے۔ آخر ایک دن بستر لپیٹ کر رکھا۔ فائل نکالی اور

میں کو کانوں میں اڑس کر ایک نہایت ادیبانہ آسن جمایا۔ آنکھیں بند کر کے اپنے سارے پسندیدہ مصنفین کا تصور باندھا اور ان سے روحانی طور پر قوت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس مشق کے بعد خود کو خاصا تازہ دم محسوس کیا اور گماں ہوا کہ آج تو ضرور کوئی شہرہ آفاق چیز تخلیق ہونے والی ہے۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو چکے تھے اور میاں لاؤنج میں بیٹھے نیوز کے اوپر ویوز اور پھر ویوز کے بعد دوبارہ نیوز کا سلسلہ لگائے ہوئے تھے اور قوی امکان تھا کہ رات دیر تک یہ سلسلہ جاری رہے گا' کیونکہ کل اتوار تھا۔ یعنی قدرت نے ایک شاہکار تخلیق کے لیے سازش مکمل کرلی تھی۔

درد اتنا تھا کہ اس رات دل وحشی نے
رگ جاں سے الجھنا چاہا

فیض صاحب کا "ہارٹ اٹیک" میری کہانی کا بنیادی خیال تھا اور خیال اس وقت بڑی سبک خرامی سے کاغذ پر بہے چلے جا رہے تھے۔

"سنو!" دروازہ کھلا۔

"یارو۔"

"کیا کر رہی ہو؟ اوہ۔ لکھ رہی ہو۔ سوری۔" وہ ذرا ہچکچائے۔

"ایک دوست آگیا ہے اچانک۔" وہ قریب آکر بولے تو میں چونک گئی' اور نا سمجھی سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"جی۔ کیا ہوا؟"

"تم نے کچھ نہیں سنا۔"

"نہیں۔ آپ نے کچھ کہا؟"

"اوفوہ۔ میرا ایک دوست اچانک آگیا ہے۔ کراچی سے کسی کام سے آیا تھا' گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ یہاں آگیا ہے' صبح جائے گا۔"

"ہاں۔ تو ٹھیک ہے۔ گیسٹ روم میں سو جائے گا۔"

"بھوکا؟"

"مطلب۔"

"بھوکا سلا دوں کیا؟ کچھ بنا دو۔"

"ایں۔" ہارٹ اٹیک کے بارے میں لکھنے اور اسے خود پر محسوس کرنے کا فرق اب معلوم ہوا۔

ایک تو کہانی کی روانی ٹوٹ گئی۔ دوسرا یہ کہ اب کیا بنایا جائے۔

میں کچن میں کھڑی ہوئی سوچ رہی تھی۔ ہفتے کا بھی اختتام تھا اور مہینے کا بھی' کل صبح سارا سامان آنا تھا۔ فریزنگ بھی ختم ہو چکی تھی۔ کوئی افسانہ تو نہیں تھا کہ مہینے کے کسی دن' دن کے کسی پہر مہمان آجائیں تو گھر میں کباب' چکن مسالہ' یخنی پلاؤ کی یخنی اور نہ جانے کیا کیا موجود ہو کہ مہمان پانچ منٹ میں شان دار کھانا ملنے پر حیران پریشان رہ جائے۔

نہ ہی لیفٹ اوور کو ری میک کرنے کا امکان۔

یا اللہ! مراقبے میں پسندیدہ مصنفین کے تصور میں ایک جھلک انور مقصود صاحب کی بھی دیکھی تھی۔ زبیدہ آپا بھی کسی کونے میں موجود ہوں گی جو یہ افتاد آن پڑی۔

ہمارے افسانے کی ہیروئن کی سب سے زیادہ آزمودہ اور پسندیدہ ڈش ہوتی ہے۔ بچے ہوئے قیمے کے پراٹھے بنانا جو آج تک میں بنا نہیں سکی' کیونکہ قیمہ تو بچتا ہی نہیں' بلکہ آج رات کے کھانے میں بھی قیمہ مٹر بنائے تھے' لیکن وہ پیالہ تو ایسا صاف ہوا کہ۔

اب کیا کروں' کتنی بری بات ہے۔ کباب ہی ہوتے تو کام ہو جاتا۔

لیکن میرے میاں کو جوں ہی معلوم ہوتا کہ کبابوں کا نیا اسٹاک فریزر میں بن کر پہنچ چکا ہے' تو دنیا کی ہر غذا سے ان کا دل اچاٹ ہو جاتا۔ کسی میں نمک کم لگتا تو کسی میں مرچ زیادہ۔ کسی سے پیٹ میں درد ہونے لگتا تو کسی سے ہاضمہ خراب۔

"یار۔ چکن میں تو آج بالکل مزا نہیں آرہا۔ دو کباب بنا دو۔"

"چائے کے ساتھ کچھ کھانے کا دل چاہ رہا ہے' دو کباب تل دو۔"

"کھانا کھانے کا دل نہیں چاہ رہا۔ دو کباب تل کر

سینڈوچ بنادو۔"

"آج تو ناشتے میں پراٹھے کے ساتھ دو کباب۔۔۔ دو کباب کا یہ پہاڑہ جاری رہتا' تو قتیلہ تقسیم کے اس عمل میں صفر جواب آجاتا۔ اوہو۔۔۔ اب کیا بناؤں ان کے دوست کے لیے۔

بچے ہوئے چکن کے ریشے کرکے چائنیز' اٹالین' اسپینش آملیٹ۔۔۔

نہ جانے کون سے خوش نصیب گھر ہوتے ہیں جہاں سالن میں اتنا بون لیس چکن بچ جائے کہ اس سے ایک نئی ڈش بنائی جائے۔ ہمارے گھر میں گوشت' مرغی میں جو ہڈیاں باقی رہ جاتیں انہیں شاید سفلی علوم میں استعمال کرکے اچانک آنے والے مہمان کو کبوتر بنا کر اڑایا تو جاسکتا ہے' لیکن اس سے بنی ہوئی کوئی ڈش اسے کھانے کے لیے پیش نہیں کی جاسکتی۔

"کیا ہوا بھئی۔۔۔ اتنی دیر ہوگئی۔ کسی تکلف کی ضرورت نہیں' بس آملیٹ اور پراٹھا بنادو اس کے بعد چائے۔"

شکر کہ انڈے موجود تھے۔ سادہ آملیٹ ہی بنادیا اور کمرے میں آکر۔۔۔

درد اتنا تھا کہ اس سے بھی گزرنا چاہا۔

چپ کرکے سوگئی۔



صبح ان کا دوست ڈنر سے ملتا جلتا بلکہ تقریباً" ویسا ہی ناشتا کرکے روانہ ہوگیا۔

"یہاں آنا میرے دوست کے لیے بہت سبق آموز اور اس کی بیوی کے لیے نیک ثابت ہوگا۔"

"اچھا۔۔۔ وہ کیسے۔۔۔"

"وہ ایسے کہ اب اسے سمجھ آجانا چاہیے کہ ساری بیویاں ایک جیسی ہوتی ہیں' بلکہ شاید وہ اپنی بیوی کو دو نمبر زیادہ دے دے' کیونکہ وہ آملیٹ میں نمک بالکل صحیح ڈالتی ہے۔" وہ سودے کی لسٹ اٹھا کر چلے گئے۔

"اونہہ۔ لفاظی تو دیکھیں۔۔۔ خود ہی بن جائیں رائٹر' جلدی مشہور ہوجائیں گے۔" میں نے جل کر سوچا۔

"ویسے کوئی بات نہیں۔" چند گھنٹوں تک میرا پھولا ہوا منہ دیکھنے کے بعد انہوں نے پھر بات شروع کی۔ "میرے دوست کو ایک وقت کم اور ایک وقت زیادہ نمک والا آملیٹ کھلایا تو کیا ہوا۔۔۔ میرے بعض دوستوں کی بیویاں تو اتنا بھی نہیں کرتیں۔۔۔ پھر تم بہت سی اور ڈشز اچھی بناتی ہو۔ تقریریں اچھی لکھتی ہو اور سب سے بڑھ کر افسانے لکھتی ہو۔"

"اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ سب سننے کے بعد میں آپ سے آپ کے خراٹوں کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گی تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔"

میں نے ان ہی جیسا اطمینان اختیار کرتے ہوئے جواب دیا۔



اگلی شام آپا' بھائی جان' چھوٹے بھیا اور گڈی نے اس ماہ بھی ڈائجسٹوں میں میری کوئی تحریر نہ ہونے پر میری بنی ہوئی چائے اور پکوڑوں پر میری قبل از وقت ریٹائرڈمنٹ کا جشن منایا۔

"مان لو کہ ایک وقتی ابال کے تحت۔۔۔" بھائی جان۔

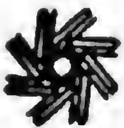
"ایک ماہ میں ایک کہانی بھی نہیں۔۔۔" چھوٹے بھیا۔

"ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔۔۔" آپا۔

"سدا کی ست اور کاہل۔۔۔" گڈی۔

"اصل میں ساری کمزوری۔۔۔" میاں۔

آہ۔۔۔ کار جہاں دراز ہے۔



اس نے پیروں کے دونوں انگوٹھوں پر زور دے کر خود کو جھولے میں اور بلند کیا۔ چند سیکنڈز میں وہ ہوا کو چیرتی پھر زمین کے نزدیک تھی۔ اس نے ہولے سے آنکھوں کو بھینچا اور پہلے سے زیادہ پیروں کے انگوٹھوں پر دباؤ دیا۔ یہ عمل کا ردعمل تھا۔ وہ جتنا پیروں کے انگوٹھوں پر زور لگاتی' خود کو ہوا میں اتنا ہی بلند پاتی۔ پستی سے بلندی کے سفر میں کیف تھا' سرور تھا اور ہواؤں میں اڑنے کا غرور تھا۔

وہ ایک سنہری جھولا تھا۔

اور وہ کانچ کی گڑیا تھی۔



"آپا میرا سب کچھ ہیں۔ ماں' باپ' دوست۔ ان کے بچوں کو کبھی غیر مت سمجھنا۔ انہیں میری ہی اولاد سمجھنا۔"

شرم و حیا سے جھکے چہرے کو اس کے آخری جملے سے جھٹکا لگا تھا۔ پہلی ہی رات اس شخص کے پاس اتنی روکھی پھیکی باتیں؟ اس نے نگاہ اٹھا کر سامنے بیٹھے سرد سے شخص کو دیکھا۔ اس کی بے تاثر آنکھیں بھی سرد تھیں۔ اس نے نگاہ اٹھا کر اسے دوبارہ دیکھنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ اس نے اس رات کے بارے میں جو کچھ سنا تھا' سب جھوٹ بکواس تھا۔

پوری رات اس کا "آپا نامہ" ختم نہ ہوا۔ اس نے رنگوں کی برسات کا سنا تھا۔ کوئی رنگ اس کی آنکھوں میں اتر نہ سکا۔ نہ ہی چاندنی و خوشبو کا کوئی جھونکا گزرا۔ اس نے اتنے خوابوں کو آنکھوں میں سجایا کیوں تھا۔ کچھ بھی ایسا نہ تھا جس کا تصور اسے گدگدایا کرتا تھا۔ سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی ساری "سردی" اس کے دل میں اترنے لگی تھی۔ وہ سرد نہیں تھا' برف تھا برف۔



"اس دفعہ ہونے والے کارنیوال میں تم کس نئی سوچ کے ڈرامے میں پرفارم کرو گی دیا؟"

ماہم نے چپس کا پیکٹ کھولتے ہوئے اس سے

مکمل ناول

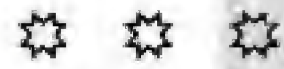
وجیہہ احمد







سوالیہ انداز میں پوچھا تھا۔ اس نے آخری گھونٹ بھر کر سوفٹ ڈرنک کے کین کو کچرے دان میں اچھالتے جواب دیا۔
"ایک نیو آئیڈیا پر سوچ رہی ہوں۔ جتنا شان دار یونیورسٹی کا میلہ ہوگا' وہ میرے آئیڈیا سے "لٹ" جائے گا۔"
"یعنی میلہ لوٹ لینے والی اسکیم بنا رہی ہو تم!" ماہم نے ہنستے ہوئے کہا تو بھی ہنسنے لگی۔
"کل فائنل کرکے بتاؤں گی تمہیں کہ میں کیا پیش کرنا چاہتی ہوں۔"
وہ دونوں کیفے ٹیریا کی حدود سے نکل کر ڈپارٹمنٹ کی طرف جانے والی روش پر چلنے لگیں۔



کل کی رات جتنی "سرد" تھی اس کی نسبت آج موسم کچھ معتدل تھا۔ "سنو مین" نے آج اس کا مہندی والا ہاتھ تھاما تھا۔
"آپ کافی خوش شکل ہیں۔"
یہ پہلی تعریف تھی' جو اس نے سترہ گھنٹے اور چوبیس منٹ بعد کی تھی۔ اس نے کل سے اس کمرے میں گھٹنے گنتے میں ہی تو وقت گزارا تھا۔ "آپ کافی خوش شکل ہیں" کے جواب میں کرارا سا جواب اس کے ہونٹوں پر آکر دم توڑ گیا تھا۔ اسے بالکل ایسا لگا تھا جیسے ماما نے کان میں کہا ہو۔ "اچھی بیٹیاں سسرال میں نرم لہجے میں بات کرتی ہیں۔"
اس نے کمرے کے حبس زدہ ماحول میں دراڑ محسوس کی تھی۔ عورت ازل سے مرد کی تعریف ہی کی تو متلاشی رہی ہے نا' سو وہ بھی عورت تھی اور اسے اپنی تعریف اچھی لگی تھی۔ وہ گزر جانے والی سرد ترین رات کو بھلانے لگی اور اپنے اندر اٹھنے والے جوار بھاٹا کو بھی ہولے ہولے بٹھانے لگی تھی۔
"آپ کو تعریف کرنا بھی آتی ہے؟ حیرت ہے۔"
اور وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنسا تھا اس کے اس انداز پر۔ اس کی چوڑیوں کو آگے پیچھے کرتا گویا ہوا تھا۔
"حیرت کی بات کیا ہے اس میں۔ اب ضروری تو نہیں بس بندہ بیوی کو دیکھتے ہی تعریفوں کے پل باندھنے لگ جائے۔ اپنی ہی چیز ہے بھئی! جب جی چاہے انسان تعریف کردے۔"
"اچھی منطق ہے آپ کی۔"
وہ صرف یہ کہہ سکی تو وہ بھی کچھ مسکراتا مزید تعریف کے موڈ میں آیا ہی تھا کہ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور آپا بڑے کروفر سے چلتی عین بیڈ کے سامنے آن رکی تھیں۔ اس نے شرم محسوس کرکے چوڑیوں سے کھنکتے ہاتھ کو اپنے مجازی خدا کے ہاتھ کی گرفت سے چھڑا کر اپنی گود میں رکھا تھا اور وہ بھی آپا کی مخصوص "آمد" سے گھبرا کر سیدھا بیٹھا تھا۔
"تم ابھی تک کمرے میں گھسے بیٹھے ہو۔ باہر اتنے کام ہیں۔ میں اکیلی جان کون کون سے کام نبٹاؤں اے بھیا! شادیاں تو سب کی ہوتی ہیں۔ ایک ہی رات میں بیویوں کے عاشق بننے کا رواج ہمارے خاندان میں نہیں۔ شام کو ولیمہ ہے۔ جاکر شادی ہال کا جائزہ لے کر آؤ۔ اٹھو۔"
وہ بے تکان بولتی تھیں یا انہیں بولنے کا خبط تھا۔ وہ جز بز سی حیرت کدہ میں تھی۔ شادی کے دوسرے ہی دن اتنی چبھتی ہوئی باتیں بھی برداشت کی جاتی ہیں؟
مگر عورت کو تو اللہ نے بنایا ہی برداشت کے لیے ہے۔
اور برداشت ہڈیوں کو چیرتی' دلوں کی دیواروں کو ڈھاتی' دلوں کو مار دیتی ہے تو پھر گھر ٹوٹ جاتے ہیں اور اس وقت ماں کے دیے ہوئے سارے اسباق خلاصے کی صورت اس کے کانوں میں سنائی دے رہے تھے۔
اس نے جھجکتی ہوئی آواز میں آپا کو بیٹھنے کے لیے کہا تو وہ اسے کھوجتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتی باہر ہزار بکھیڑوں کو سمیٹنے کا کہہ کر چل دیں۔ وہ ان کے جانے کے بعد بھی ان کی موجودگی کو محسوس کرتی پھر گھڑی کو تکنے لگی تھی۔ گھڑی کی سوئیوں کا سفر تھا اور وہ پہلی ہی منزل پر تھکنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے برسوں پرانا کٹھ پتلیوں سے بھرا بیگ اسٹور میں رکھے بکس میں سے نکالا تھا۔ اس نے بیگ کی زپ کھولی تو مانوس سی بو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تھی۔ روئی سے بھرا اسفید سلک کے کرتے میں ایک گڈا تھا۔ سر پر براؤن پگ بھی تھی۔ سفید لٹھے کی شلوار تھی۔ اس نے گڈے کو اٹھا کر چہرے کے سامنے کیا اور سنہری یادیں اس کے چاروں طرف پھیل گئی۔ وہ گڈا اس کی دادی کے ہاتھوں سے تیار کیا گیا تھا۔ اس نے گڈے کو سائیڈ میں احتیاط سے لٹایا' حالانکہ وہ کانچ کا گڈا نہیں تھا۔ پھر اس نے ایک روئی بھری گڑیا کو نکالا۔ سرخ لاچے اور سبز قمیص' سرخ گوٹا کناری لگے دوپٹے میں وہ موتی موتیوں سے بنی بندیا لگائے آج بھی ویسی کی ویسی تھی۔ خوب صورت اور بہت حسین۔

پھر سنہری یادوں نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور اسے یاد آیا۔ کتنا ضد کر کر کے وہ دادی کے ساتھ بازار سے آدھے آدھے گز کے کپڑے خرید کرلائی تھی اور نہ نہ کرتی دادی سے ضد کر کے اس کا گوٹے سے بھرا عروسی لباس تیار کرایا تھا۔ پھر ایک کے بعد کئی چھوٹے بڑے سائز کی ننھی پتلیاں اس کے اطراف میں پھیل گئی تھیں۔ ہر رنگ میں موجود روئی کی گڑیا اور گڈے۔

اس نے ایک جوڑے کو الگ کیا۔ باقی گڑیا گڈوں کو ایک خاندان بنا کر ایک دوسرے بیگ میں بھر لیا۔ اسے کارنیوال میں ایک ڈراما پیش کرنا تھا۔ کاسٹ مکمل تھی۔ کہانی کی ترتیب باقی تھی اور اسے آج یہ سارا کام مکمل کر کے سونا تھا۔ وہ کٹھ پتلیوں کے درمیان بیٹھی قلم تھامے ڈائیلاگ لکھتی رہی۔ اسے خبر نہیں تھی' بے جان کٹھ پتلیوں میں جان بھی آجائے تو وہ کٹھ پتلی ہی رہتی ہیں۔ انہیں چلانا کوئی اور ہے اور ان کے پیچھے سے آوازیں کسی اور کی ہوتی ہیں۔ بے خبری کی مار لگ جائے تو جیون میں باقی بھی کچھ رہتا ہے؟



"کیا اسپیشل ہے یار دریا! بتا بھی دو کیا ڈیزائن کیا ہے تم نے اپنے گروپ کے لیے؟" ماہم کے لہجے میں تجسس اور جھنجلاہٹ کے عناصر تھے۔ اس نے مزا لے کر بتانا شروع کیا۔

"ڈراما پیش کریں گے ہم لوگ "کٹھ پتلی۔" رات بھر لکھا ہے جاگ کر میں نے۔"

"اچھا! کون کون پرفارم کرے گا اور دیکھو! حسن کو اس دفعہ لیڈنگ رول مت دینا۔ بہت اِترا تا پھرتا ہے۔ ہیرو سمجھنے لگتا ہے اپنے آپ کو۔"

وہ ماہم کی بات پر مسکرانے لگی تھی اور جب وہ مسکراتی تھی اس کی بائیں آنکھ کے نیچے بھنور بنتا تھا۔ اور کوئی اس بھنور میں آجائے تو۔

زندگی کسی مرکز پر ٹھہاتی ہے؟ نہ حیاتی بچ پاتی۔

"اس دفعہ ہیرو حسن نہیں ہوگا اور نہ ہی ہیروئن ماہم۔"

"پھر کاسٹ میں کون ہے؟"

"کاسٹ۔ کاسٹ میں روئی بھری گڑیا گڈے ہیں' جنہیں کٹھ پتلیاں کہا جاتا ہے۔" اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ ماہم کنفیوز تھی۔

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہم پس پردہ پرفارمنس دیں گے' یعنی وائس پرفارمنس اور باریک ڈوریوں سے بندھی

کٹھ پتلیاں فزیکل پرفارمنس (جسمانی پرفارمنس) دیں گی۔"

"اچھا اسی طرح نا' جیسے دادی کے زمانے میں چار پائی کو کھڑا کر کے اس پر پردہ ڈال کر پیچھے سے کچھ لوگ آوازیں نکالا کرتے تھے اور باریک ڈوریوں سے بندھے گڑیا گڈے کریکٹر پرفارمنس دیا کرتے تھے نانی اور دادی وغیرہ اپنے بچپن کی باتیں اسی طرح کی بتاتی ہیں نا؟"

ماہم کی بات پر دریا نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"ہاں اسی طرح کی پرفارمنس ہوگی۔ گڈے کا کریکٹر نیم جوہر ہوگا یعنی ہیرو' اور ہیروئن کا کریکٹر نیم صدف ہوگا۔ ایک کردار ہیرو کی ماں کا۔ دوسرا کردار



اس کی بن کا ہوگا۔ کچھ ایکسٹرا کٹھ پتلیاں سپورٹنگ رول کریں گی۔ جیسے ہیروئن کی فرینڈز وغیرہ ہیروئن کی آواز زنیو کی ہوگی۔ ہیرو کی آواز ارباز کی ہوگی۔ تم اور حسن تانت کے تاروں کو انگلیوں سے حرکت دو گے، یعنی ان کی باڈی لینگویج کی ذمہ داری تمہاری ہوگی۔ یہی کام سب سے اہم ہوگا۔ ہمارے پاس سات دن ہیں، اور سات دن تم دونوں کو پریکٹس کے لیے کافی ہوں گے۔ اصل پرفارمنس تمہاری ہوگی۔ کٹھ پتلیوں کو آواز کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ آگے پیچھے کرنا آسان کام نہیں۔ آج بھی یہ تماشا دور دراز کے گاؤں میں پروفیشن کے طور پر کہیں نہ کہیں دکھائی دیتا ہے۔ پر وہ لوگ پروفیشنل ہوتے ہیں۔ سارا فن ان کی انگلیوں کا ہوتا ہے۔"

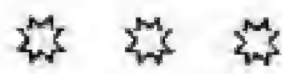
دیا نے ایک لمحے کا توقف کیا تو ماہم اسے گہری سوچ میں دکھائی دی، پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے دیا سے کہنے لگی تھی۔

"یار! مشکل لگ رہا ہے مجھے۔"

"ہاں تھوڑا مشکل ہے پر ناممکن نہیں۔ ابھی چلتے ہیں کیفے ٹیریا میں سارے اودھم باز وہیں ہوں گے۔ ڈسکس کرلیتے ہیں ان لوگوں سے بھی۔" دیا نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ کہنے لگی۔

"وہ سارے نکمے ٹوٹلی تم پر ہی ڈیپینڈ کرتے ہیں۔ سب نے تمہیں "دلیس باس" ہی کہنا ہے۔"

ماہم کی بات پر وہ ہنستے ہوئے کھڑی ہوگئی تو وہ بھی اس کے پیچھے۔ کیفے ٹیریا کی جانب چل دی۔



جب وہ پیدا ہوئی تو اس کی نانی نے اسے سنہری جھولا تحفے میں دیا تھا۔ بالکل "سونے" کا جھولا لگتا تھا اور وہ اسی میں پانچ سال سوئی تھی۔ پانچ سال کے بعد اس کے پاؤں جھولے کی مستطیل دیواروں سے نکلنے لگے تھے۔ پر جھولے پر اتنی عمدہ پالش تھی کہ وہ پانچ سال بعد بھی "سونے" کا جھولا ہی لگتا تھا۔ اس کی ماما نے اس کے لیے ایک چھوٹا بیڈ خرید لیا اور وہ بیڈ پر سونے لگی، پر جھولے سے اس کی انسیت نہ گئی۔ وہ اپنی ہر سائز کی گڑیاؤں کو اس میں لٹا کر سلائے رکھتی۔ اکلوتی اولاد کی ایسی انسیت دیکھ کر بابا جانی نے لان میں ایک جھولا نصب کرا دیا جو کہ بیٹی کو قطعی پسند نہ آیا اور بابا جانی سے سنہری جھولے کی فرمائش کردی۔ انہوں نے آرڈر پر ایک شان دار جھولا تیار کروایا جس کی زنجیر پر نہایت مہنگی گولڈن پالش کی گئی۔ پورا اسٹینڈ بھی گولڈن پالش سے سنہرا دکھتا تھا۔ وہ عام نصب کیے جانے والے جھولوں سے ممتاز دکھتا تھا۔ شام میں بابا جانی آفس سے آتے تو اسے جھولے میں بٹھا کر ہلکے ہلکے جھونٹے دیتے۔ وہ سنہری زنجیروں کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیتی۔ اس کے پیر زمین سے نہیں لگتے تھے۔ وہ جھولا بڑا اور مضبوط تھا۔ اس کی ماما بھی اسے گود میں لے کر بیٹھ جاتی تھیں۔ ماما کے اس عمل سے وہ مسرت کا اظہار کرتی اور ماما اور کہیں مصروف ہوتیں تو گڑیاؤں سمیت وہ جھولے میں چڑھ بیٹھتی۔ علی بخش چاچا اسے جھونٹے دیتے اور کبھی دادی ماں اپنی عبادات سے فارغ ہو کر جھولا جھلاتیں اور جیسے جیسے ہلکے ہلکے جھونٹے تیز جھونٹوں میں بدلتے گئے۔ اس کی سوچ میں بھی بدلاؤ آتا گیا۔ اڑان بھرنا اس کا مشغلہ بنتا گیا۔ وہ بلندی کو پسند کرنے لگی۔



ولیمہ کے دوسرے دن وہ اپنے میکے آگئی تھی۔

دوستوں اور کزنز سے شیئر کرنے کے لیے کچھ بھی "خاص" اس کے پاس نہیں تھا۔ دو دن میں اسے بخوبی اندازہ ہوگیا تھا۔ اس کے سسرال میں اس کی نندان چھ عدد بیٹیوں کا قبضہ تھا۔ اس کا شوہر ان عورتوں کا "مقبوض" وفادار جانور تھا، جسے صرف دم ہلانا آتی ہو، اور کبھی کسی لمحے کسی بشری تقاضے کے سبب وہ اسے دیکھ بھی لیتا تو ان عورتوں کی جماعت میں سے اس "لمحے" کے حسن میں رنگ میں بھنگ ڈالنے کو کوئی

بھی عورت نازل ہو جاتی۔

اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس کی زندگی شادی کے ستر گھنٹوں میں اتنی بے کیف بھی ہو سکتی ہے۔ وہ تو بہت مکمل اور رنگ دار لڑکی تھی۔ اپنی عمر کے چودھویں سن میں اس نے ہاتھ میں برش پکڑ کر رنگوں سے کھیلنا سیکھا تھا۔ اسے نہیں پتا تھا "رنگوں کی موت" بھی ہو سکتی ہے۔ پہلی موت سچی خوشی کے گلابی رنگ کی ہوئی تھی' جو اس کے چہرے پر شادی کی پہلی رات مرا تھا۔



اپنی عمر کے ساتویں برس وہ اپنی ماما اور دادی کے ہمراہ اپنے بابا جانی کی خالہ کے گھر اندرون پنجاب کے گاؤں احمد پور میں گئی تھی اور اس نے زندگی میں پہلی بار دادی کی بہو کو روئی بھری گڑیا بناتے دیکھا تھا۔ اس نے تو ہمیشہ قیمتی گڑیا سے کھیلا تھا تو روئی بھری گڑیا اسے عجوبہ لگی تھی۔ خاص کر کالا ریشم جب سر کی سلائی کرتے ہوئے اس کی رشتے کی مامی نے نہایت مہارت سے لگاتے اسے لمبے بالوں کی شکل دی اور پھر کالے ریشم سے گڑیا کے لمبوترے چہرے کو نقش عطا کیے' پھر اطلس کے گلابی غرارے میں... تو اس گڑیا نے اس کے دل سے اس کی گڑیائیں نکال پھینکی تھیں۔ وہ ہزار ضد کے باوجود اس گڑیا کو لینے میں ناکام رہی تھی۔ جس کا سبب دو لوگ تھے' ایک رشتے کی مامی کی ہم عمر بیٹی روشی جس کے لیے وہ گڑیا تیار کی گئی تھی اور دوسری اس کی دادی ماں! دادی ماں جب بھی اس روئی بھری گڑیا کو دیکھتیں کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ توبہ کرتیں اور بھابھی بہو کو خدا کے غضب سے ڈراتیں۔

"اے بہو! بی بی! اللہ کے غضب سے ڈر۔ جان ڈالنا پڑے گی ان مورتیوں میں۔ خدا کی برابری مت کرو۔ اللہ کو کوئی مورت پسند نہیں۔ بچیوں کو یہ شوق ابھی سے پڑ گئے تو زندگی بھر یہ مورتیں ان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔ تخلیق کا فن بس خدا کے لیے ہے۔ بے جان شکلوں کو گھروں میں رکھنا مومن کا چلن نہیں۔" اور یہ سن کر بیچ میں روشی بول پڑی۔

"دادی! جو ڈول دیا کے پاس ہیں' وہ مورتیں نہیں؟"

"ہاں ہاں بیٹی! وہ بھی مورتیں ہیں۔ میرے منع کرنے پر بھی اماں باوا لا دیتے ہیں تو پکڑ ان کی ہوگی۔ انسان جیسی چیز تو بندہ بنا لیتا ہے' جان بھی ڈال سکتا ہے کیا؟"

دادی کی بات سن کر گھر کی سب بہو بیٹیاں آنکھوں ہی آنکھوں میں ہنستے گھر کے کام کاج میں لگ گئی تھیں۔ اور وہ روئی کی گڈی کی رٹ لگائے کراچی لوٹ آئی تھی اور پھر اس کی ضد دادی کے لیے امتحان بن گئی۔



وہ اسے لینے آیا تھا اور وہ بے دلی سے تیار ہوئی تھی' رنگ ڈیو کے بنا۔ اس نے ماں کے نہ' نہ کرنے پر بھی سفید رنگ کا سادا سوٹ پہنا تھا جو کہ شادی سے پہلے کبھی پہنا کرتی تھی۔ ماں کو اس نے دلیل دی تھی۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ رنگ دار پہنوں یا بے رنگ۔"

"دل نہیں پڑتا فرق' تمہاری شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا' شادی کے بعد ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں۔"

"دیکھنے والے کو ہی فرق نہیں پڑتا تو میں دنیا کی پروا کیوں کروں۔" اس نے دل میں سوچا' پر ماں سے کہہ نہ پائی۔ پھر وہ ماں کی نگاہوں سے ہٹ کر کہیں اور مصروف ہو گئی تاکہ وہ مزید سوال نہ کریں۔

اور بیٹیاں ماؤں کو دکھ دینا ہی کب چاہتی ہیں اور اچھی بیٹیاں تو ماں کو بالکل بھی دکھ نہیں دیتیں۔ اور وہ اچھی بیٹی تھی۔ آج اس نے آنکھوں میں کاجل نہیں ڈالا تھا۔ کالے رنگ کی موت اس کی آنکھوں میں ہوئی تھی چپکے سے اور بغیر کسی کو بتائے...

راستے بھر دونوں کے درمیان رسمی سی بات چیت رہی۔ وہ کوئی سوال کرتا تو وہ ہاں ہوں میں جواب دے دیتی۔ وہ اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی۔ اس نے ایک

دفعہ بھی تو اسے نگاہ بھر کر نہیں دیکھا تھا۔
اور اس ایک "نگاہ" ہی کی تو پیاس تھی اسے۔
کیا تھا جو وہ اس کی پیاس بجھا دیتا۔
وہ اس کی نکاحی بیوی تھی۔ اس کا گریز اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ اسے کوئی جواب نہ مل پاتا اور آج اس کے ساتھ وہ کیا کرنے والا تھا، اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ زندگی ایسے بھی رنگ دکھا سکتی ہے؟

☆ ☆ ☆

آج ان کی فائنل ریہرسل تھی۔ چھت پر لکڑیوں کی چرخیوں پر لپٹی تانت کے تاروں سے کٹھ پتلیاں منسلک تھیں۔ پردے کے پیچھے بیٹھے حسن اور ماہم کے ہاتھوں میں تاروں کے سرے تھے۔ چرخیاں بہت رواں تھیں۔ ہاتھ کے اشارے سے چلتی تھیں۔ ان دونوں کے پاس مرکزی کردار تھے ہیرو اور ہیروئن کے باقی چرخیوں سے اور دوسرے کرداروں کی کٹھ پتلیاں منسلک تھیں جو کہ گروپ کے دوسرے ممبران کے حوالے تھیں۔ بیک گراؤنڈ میوزک بھی حسن کے لیپ ٹاپ میں تھا۔ لیپ ٹاپ کا کنکشن ہال میں جگہ جگہ نصب کیے گئے اسپیکرز سے تھا اور وائس پرفارمنس دینے والے چہرے پر ہیڈ فون تھے۔ ان کا کنکشن بھی ایکو سسٹم سے تھا۔ ہر چیز تیار تھی۔ حسن اور ماہم کے کرداروں کی باڈی پرفارمنس سب سے اہم تھی۔ ریہرسل کے دوران ہی ان کے ڈرامے کی دھوم مچ رہی تھی۔ ہر کوئی سراہ رہا تھا۔

پھر ان لوگوں کو پتا چلا کہ یونیورسٹی کے سالانہ کارنیوال میں بھارتی وفد جو کہ شاعروں اور مصنفین پر مشتمل ہے، شرکت کر رہا ہے اور گورنر کی شرکت بھی ممکن تھی۔ اسے لگا تھا وہ ہواؤں میں ہے۔ اس کا دل چاہا تھا وہ گھر پہنچ جائے اپنے سنہری جھولے میں۔۔۔
جہاں بلندی کے سفر سے روشناس ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ دیر تک اس کا انتظار کرتی رہی۔ اسے اکیلے سونے کی عادت نہیں تھی۔ وہ جیسا بھی سلوک کرتا پر رہتا تو کمرے میں ہی تھا نا۔ اس کے لیے یہی سہارا تھا، کہ وہ "نہ ہوتے ہوئے" بھی ہے اور ہوتے ہوئے بھی "نہ ہونا" کی اذیت کے باوجود وہ اس گھٹن زدہ کمرے میں اس کے انتظار سے تنگ آگئی تو خالی جگ اٹھا کر کچن کی طرف چلی تھی اور اسے احساس ہوا تھا کہ آپا کے کمرے میں شور شرابے والی "رونق" میں سب سے چہکتی آواز اس کے نصف بہتر کی تھی جس نے اسے "نصف" ہی رکھا تھا "مکمل" نہ کیا تھا۔ آپا کے دو عدد دامادوں کی چبھتی ہوئی نگاہوں سے بچنے کے لیے وہ ان کی روزانہ کی آمد پر سلام دعا کے بعد اپنے کمرے میں محدود ہو جایا کرتی تھی۔ اس نے آہستگی سے پانی کا جگ بھرا، جب نند کی بیٹی کی تیز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔
"ماموں تو شادی کے بعد اتنے بدل گئے ہیں کہ کبھی ہمارے ہی بیچ میں سوتے تھے اور اب تو ڈھنگ سے بیٹھتے بھی نہیں۔۔۔"
"ارے میرے بیٹے تم نے یہ کیا بات کی؟ آپا! آج میرا بستر یہی لگا دیں آپ جب تک یہ رونقیں رکنے آئی ہیں۔ میں یہیں سویا کروں گا پہلے کی طرح۔۔۔"
"ارے بھیا! رہنے دے بس۔ تیری بیگم کے تو پہلے ہی مزاج نہیں ملتے ہم سے سارا دن سر بستر میں دیے پڑی رہتی ہے نا جانے کس چیز کا زعم ہے اسے۔ ہماری جیسی دولت بھی نہیں ہے اس کے باپ کے پاس، پھر کا ہے کا غرور۔۔۔"
آپا کی سپاٹ بغیر کسی اتار چڑھاؤ والی آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی اور وہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کے دل میں ایک خواہش نے بڑی سرعت سے سر اٹھایا تھا کہ "وہ" جو کچھ بھی نہیں "سب کچھ" بن کر دو بول اس کی ڈھال کے لیے بول دے۔ اس کی خواہش نے سر اٹھاتے ہی دم توڑ دیا تھا۔ "اس کی" آواز تیز دھارے کی طرح کان میں داخل ہوئی تھی۔

"وہ تو آپ کی ہی پسند کے آگے سر جھکایا تھا میں نے تو بھئی۔ اب جیسی بھی ہے آپ لوگ ہی بھگتیں۔ میں نے تو زرینہ خالہ کی بیٹی کا کہا تھا' پر آپ کو تو وہ سخت ناپسند تھی۔ پڑھی لکھی اکلوتی کا گیت آپ ہی گایا کرتی تھیں نا' سو برداشت کریں' اور رہی بات غرور کی تو سارا نشہ ہرن کر سکتا ہوں میں اس کا۔ شادی مجھ پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتی۔ میں اب بھی ویسا کا ویسا ہی ہوں۔ تمہارا ماموں نہیں ہوں تمہارا دوست ہوں دوست......"

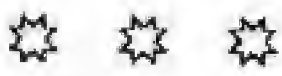
اس نے سارا پانی سنک میں انڈیل دیا اور بھلا چیزوں کو انڈیلنے سے بھی کبھی کسی کے لیے کہیں جگہ بن جاتی ہے۔ اس نے غائب دماغی سے خالی جگ اٹھایا اور چپ چاپ کمرے میں آبیٹھی۔ جب ہی وہ تنا تنا سا کمرے میں آیا تھا۔

"تم سے دو گھڑی میری بچیوں کے پاس آکر نہیں بیٹھا جا سکتا؟ کبھی کبھی تو رکنے آتی ہیں یہ لوگ۔ اس چیز کے زعم میں منہ بنا کر بیٹھی رہتی ہو تم۔"

وہ پھنکارتا اس کے روبرو تھا اور اس کے اندر موت کا سا سکوت تھا اور جب موت کا سکوت طاری ہوتا ہے' تو جسم ایک گنبد بن جاتا ہے' جہاں آوازیں بازگشت کی صورت گنبد کی دیواروں سے ٹکرا کر خود کو لہولہان کر لیتی ہیں اور وہ اس وقت ایسی ہی آواز تھی۔ لہولہان پر خاموش۔۔۔

وہ سسرال نامی جامعہ میں تھی' جہاں کیمیائی لیب کی طرح مختلف تجربات اس کی زندگی کے رنگین کاغذ کو موت کی نیند سلا رہے تھے۔ زندگی سے اتنے سبق تو اس نے اکیس سالہ زندگی میں بھی نہیں سیکھے تھے۔

جتنے چند ماہ کی ازدواجی زندگی نے سکھا دیے تھے۔ اس کے پاس کوئی دلیل نہ تھی کہ وہ خود کو بہادر ثابت کرتی۔ یہ وہ میدان کارزار تھا۔ وہ جہاں وہ کند ہتھیاروں کے ساتھ اتری تھی اور اس کی شکست یقینی تھی۔ وہ بڑبڑاتا کمرے سے نکل گیا تھا اور اسے جتا دیا تھا کہ وہ آج سے کمرے میں نہیں سوئے گا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے کو دیکھتی رہی۔



اس نے گلابی پیروں کے پنجوں پر زور دیا۔
اور خود کو ہواؤں کے سنگ پایا۔

"کل کا دن کتنا خوب صورت ہوگا۔ جب میرا ڈراما ہٹ ہو جائے گا۔" اس نے دھیرے سے پلکوں کی جھالر کو آنکھوں پر گرایا اور آنکھیں میچ لیں۔ پیروں کے پنجوں پر زور دیا اور خود کو مزید بلند کیا۔

"میں یونیورسٹی سے باہر بھی مشہور ہو سکتی ہوں۔۔۔ ہاں ہاں کیوں نہیں۔۔۔ کل کا دن مجھے بلندیوں پر لے جائے گا۔۔۔ ضرور۔۔۔"

اس نے جھونٹے لیے اور بہت جھونٹے لیے۔۔۔

"سب کچھ تو ہے میرے پاس۔۔۔ ہر رنگ۔۔۔ ہر خوشی۔۔۔ اور میں جو وہاں جا پہنچوں۔۔۔ جہاں بلندی اور بلندی۔۔۔ شہرت کی بلندی۔۔۔ تو میں مکمل ہو جاؤں۔۔۔"

جھولے کے فریم سے چوں چوں چرچراہٹ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔



ماما کی کال ڈائریکٹ صفدر کے سیل فون پر آئی تھی' ورنہ وہ عموماً اسی کے ذریعے صفدر کی خیر خیریت لے لیا کرتی تھیں۔ وہ دو دن سے آپا کے کنبے کے بیچ بستر لگا کر سو رہا تھا۔ ماما نے ان دونوں کو رات کے کھانے پر بلایا تھا۔ اس کے پاس انکار کا کوئی جواز نہیں تھا اور جب وہ دونوں تیار ہو گئے تو آپا کی سب سے چھوٹی بیٹی غازہ سے چہرے لیپے ان کے سروں پر سوار تھی۔

"ماموں جان! مجھے عفرہ کی انگیجمنٹ پر جانا ہے۔ آپ چھوڑ کر آجائیں پلیز۔ میں آپ کو پہلے بتانا بھول گئی تھی۔ اگر میں نہیں گئی تو وہ ناراض ہو جائے گی۔"

آپا بہت طاقت ور تھیں' اسے اندازہ تھا۔ پر آپا کی بیٹیاں بہت ہی پاور فل تھیں۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا۔

"تم چلو بیٹا! میں آتا ہوں۔"

وہ فرط مسرت سے ماموں کے گلے آن لگی۔

"تھینک یو سو مچ ماموں! مجھے پتا تھا آپ انکار نہیں کریں گے اور آپ انکار کر بھی کیسے سکتے ہیں 'اکلوتے ماموں ہیں آخر کو ہمارے۔"

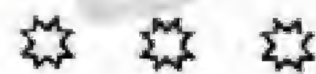
لہراتی بل کھاتی وہ باہر چل دی اور وہ حسرت بھری نگاہوں سے صفدر کو تکنے لگی۔

"آنٹی کو کال کر دو ہم لیٹ ہو جائیں گے۔"

وہ بغیر جواب سنے باہر نکل گیا اور واپسی میں ایم اے جناح روڈ کی ٹریفک میں ایسا پھنسا کہ جب گھر پہنچا تو بارہ بج چکے تھے۔ عفرہ کی انگیجمنٹ کا فنکشن شہر کے آخری کونے کے کسی ہال میں رکھا گیا تھا اور جب اس نے کمرے میں قدم رکھا تو وہ کارپٹ پر بیٹھی بیڈ پر سر رکھے سو چکی تھی۔ جوڑے کی کلی بھنی سفید بیڈ شیٹ پر ایک ترتیب سے رکھی تھیں اور دو سرخ ٹوٹی ہوئی چوڑیاں اس کے پیروں میں پڑی تھیں۔

اس نے خاموشی سے تکیہ اٹھایا اور آپا کے کمرے کی راہ لی۔ اس کے سائلنٹ موڈ پر لگے سیل پر اس کی گیارہ مسڈ کالز تھیں۔

ازدواجی زندگی کی سچے موتیوں کی مالا سے ٹوٹ کر یہ کون سا موتی گرا تھا' اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ اسے سچی خوشی آپا سے جڑے رہنے میں ملتی تھی۔ سو وہ تو خوش تھا نا۔



ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ اگلی قطار میں بھارتی عمائدین بمعہ گورنر سندھ کے تشریف فرما تھے۔ بیک گراؤنڈ میوزک شروع ہوا جو کہ خوش گواریت لیے ہوئے تھے۔ آٹومیٹک پردے دونوں اطراف سمٹ گئے۔ اسٹیج کا منظر صاف دکھائی دیے جانے لگا۔ لیپ ٹاپ سے متصل اسپیکرز کے ذریعے ایک ایک ڈائیلاگ صاف سنائی دے رہا تھا۔ ہال میں موجود ہر شخص اسٹیج پر بکھری کٹھ پتلیوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

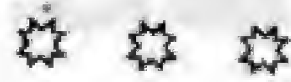
اسٹیج پر شادی کا منظر تھا۔ دولہا دلہن ایک نئے رشتے میں بندھ رہے تھے۔ جب ہی ایک ہلکے سے فائر کی آواز کے بعد اسٹیج پر گلاب کی پتیاں چھت سے کٹھ پتلیوں پر برسی تھیں اور اسپیکرز سے ڈائیلاگ شروع ہو گئے تھے۔ پس پردہ بیٹھے حسن نے ماہم کو تانت کی تاریں ہلانے کا اشارہ دیا۔ ماہم کی انگلیوں کی جنبش سے ہیروئن اپنے سرخ لاچے کو ہلاتی ہیرو کے روبرو آئی تھی۔ باقی کٹھ پتلیوں کو پس پردہ بیٹھے مزید لوگ ایک طرف۔ کر چکے تھے۔ زنیرہ کی آواز ہال میں گونجنے لگی تھی۔

"ساری کشتیاں جلا کر میں تمہاری کشتی میں آن بیٹھی ہوں۔ جھاگ اڑاتے سمندر کے کناروں پر کھڑے میرے خونی رشتے مجھے دیکھ سکتے ہیں۔
آنسو بہا سکتے ہیں۔
پر مجھے واپس بلا نہیں سکتے۔
کہ ان کی ہر خوشی ۔ میرے تم سے جڑے رہنے میں ہے۔
مانا کہ میں نے تم سے محبت کی۔ ان سے ناتے توڑ کر تم سے ناتا جوڑا ہے۔ بولو! مجھے تم چھوڑ تو نہ دو گے نا؟"

زنیرہ کی آواز سسکنے لگی۔ حسن کے ہاتھوں کی حرکت سے ہیرو ہیروئن کے کچھ اور نزدیک آتا ہے۔ بیک گراؤنڈ میوزک کی ٹیون بدلی۔ ارباز کی آواز ہال میں گونجنے لگتی ہے۔

"تمہیں پانے کے لیے میں نے زمانے سے ٹکر لی ہے۔ سمندروں کو ٹاپا ہے۔ پھر کہیں جا کر تمہیں پایا ہے۔ تمہیں پانا تو ایسا ہی تھا جیسے سیپ سے صدف کو پانا اور کوئی صدف کو بھی بے مول کرتا ہے کبھی؟ تم میرے لیے نایاب ہو۔ میرے سیپ کا سچا موتی۔ میری صدف ہو تم۔"

ارباز کی ڈائیلاگ ڈلیوری نہایت شان دار تھی اور اس کی آواز گمبھیر تھی۔ ہال میں ابھی تک سکوت طاری تھا۔



اس کے اندر سناٹوں کا راج تھا۔ رات صفدر نے جو بھی اس کے ساتھ کیا' سکوت طاری ہو جائے تو دل کی دیواریں ہلنے لگتی ہیں اور اس کے دل کے دیواریں ہلنے لگی تھیں۔

وہ صبح آفس جا چکا تھا بغیر کوئی معذرت کیے۔ اسے لگا' وہ اس کے لیے ایک شو پیس ہے' جسے وہ گھر میں سجا کر بھول گیا تھا۔ اس نے ہمت کی اور اٹھ کر "آپا کی جنت" میں جا پہنچی۔ جہاں وہ بیڈ پر مہارانی کی طرح محو استراحت تھیں۔ چھ کی چھ عدد بیٹیاں ملکہ عالیہ کے آس پاس براجمان تھیں۔ اسے کمرے میں آتے دیکھ کر فتح کی چمک ان کی آنکھوں میں کوندی تھی۔ لبوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ رقصاں تھیں۔ چھ عدد "مسٹنڈوں" نما بھانجیوں نے اسے دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں پیغامات کی ترسیل کی تھی۔

وہ بغیر کچھ کہے آپا کے بیڈ کی پائنتی میں بیٹھ گئی تھی۔ آپا کا انداز ہنوز ویسا ہی تھا' وہ ہنکارا بھرتی گویا ہوئی تھیں۔

"آؤ آؤ بی بی! آج کمرے سے نکلنے کا خیال کیسے آگیا تمہیں۔ اپنا اکلوتا گبھرو جوان بھائی تمہارے حوالے کیا تھا میں نے۔ مجھے کیا خبر تھی یوں لات مار کر کمرے سے نکال پھینکو گی اسے۔ کئی راتوں سے میرے پاس سو رہا ہے۔ گم صم رہتا ہے۔ تمہیں تو ذرا جو خیال ہو اس کا۔ بس تمہیں تو ہم نے ایک ہی شوق میں دیکھا۔ ہر وقت بس میکے بھاگنے اور وہاں کی سڑکیں ناپنے کا۔ ارے اتنا ہی ناپ تول کا شوق تھا تو بی بی! "کار" لے آتیں اپنے باوا کے جہیز میں۔"

آپا نے توقف کیا تو اسے لگا' اس کے ہاتھوں میں پسینہ آگیا ہے اور دل اتھاہ گہرائی میں ڈوبے ڈوبے جاتا ہے۔ وہ تو آپا کو کہنے آئی تھی کہ اکیلے سوتے میں ڈر لگتا ہے۔ صفدر کو کہیں کہ وہ آج سے کمرے میں سوئیں' پر یہاں تو الزامات کی نئی کھیپ تیار تھی۔ اس نے کچھ کہنے کو ہونٹ وا کیے ہی تھے کہ چوتھے نمبر کی بھانجی

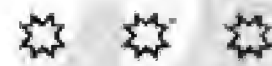
نے ماں کو نئے محاذ کی کمک پہنچائی۔

"کتنے خوب صورت ہیں ہمارے ماموں۔ آپ تو ان کے ساتھ بالکل بھی نہیں جچتیں۔ ہر وقت بھنگنوں والے حلیے میں پھرتی ہیں۔ کل صائمہ نے آپ کو ایسے ہی حلیے میں دیکھ لیا ہوگا' جب ہی تو کہہ رہی تھی کہ تم نے اپنے ماموں کے لیے دیکھا ہی کیا ہے۔" وہ دبے دبے سے لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

"جب تمہارے ماموں کو ہی میرے بننے سنورنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تو فائدہ۔ اور رہی بات ماموں کے خوب صورت ہونے کی تو میرے بابا کے گھر کی دھول آپ نے لے تھی۔ میں خود تو چل کر یہاں نہیں آئی نا اور صفدر کو بتا دیجئے گا۔ اگر آج وہ کمرے میں نہیں سوئے تو میں ماما کو بتا دوں گی۔"

"دھمکی... ی... !ای دھمکی دے رہی ہیں ماں تو۔ میں تو ابھی کال کر کے بتاتی ہوں ماموں کو۔"

یہ پہلے نمبر کی بال بچوں والی بھانجی تھی' جو کھٹ کھٹ کال ملا چکی تھی۔ آپا پیروں کو سمیٹ کر دل تھامے بیٹھی تھیں۔ وہ اس ذہنی ٹارچر سیل نما کمرے سے چپ چاپ اٹھ کر چل دی تھی۔ رات میں ایک طوفان آنے کو تیار کھڑا تھا۔



جب وہ پنجاب سے کراچی لوٹی تھی' روئی بھری گڑیا کے ہجر میں دن رات تڑپی تھی اور بخار چڑھا بیٹھی تھی۔ اس کا بخار سے سرخ تپتا چہرہ دیکھ کر اس کے ماما بابا نے دادی سے درخواست کی تھی کہ اس کے لیے بالکل ویسی ہی گڑیا کا انتظام کردیں۔ پوتی کی شدید محبت دادی کے لیے امتحان بن گئی۔ وہ ساری نصیحتیں بالائے طاق رکھ کر سفید ململ کے کپڑے کو جو کہ ان کا دوپٹا تھا گڑیا کی شکل میں کاٹ کر روئی بھرنے لگیں۔ دادی نے کبھی گڑیا نہیں بنائی تھی' انہیں مورتوں سے خوف آتا تھا۔ پھر بھی روئی بھری گڑیا کو جب اطلس کے گلابی غرارے میں اس کے ہاتھ میں دیا گیا تو اس کا بخار جاتا رہا تھا۔ دادی کے ہاتھوں سے ایک شان دار گڑیا تیار ہوئی تھی اور پھر پوتی کی فرمائش پر تخلیق پر تخلیقات ہوتی گئیں اور اس کا کمرے روئی بھری گڑیاؤں سے بھرتا گیا۔ اسے گڑیاؤں سے عشق ہوگیا تھا۔

وہ اکلوتی تھی۔ ان گڑیاؤں نے رشتوں کی جگہ لے لی۔ اکیلے کمرے میں کوئی گڑیا اس کی بہن بن جاتی' کوئی بھائی۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ اکلوتی پیدا ہوئی تھی۔ دادی ہر گڑیا بنانے سے پہلے اسے باز رکھنے کی تلقین کرتیں۔ "جان ڈالنی پڑے گی" جیسی باتیں کرتیں۔ وہ ضدی نہیں تھی فرماں بردار تھی' پر اپنے اس شوق پر کسی بھی قسم کا سمجھوتا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ دادی ہر تخلیق کے بعد مصلیٰ لے کر بیٹھ جاتیں اور نماز استغفار ادا کرتیں ایسے ہی کئی سال بیچ میں سے سرک گئے۔ وہ سمجھ دار ہوئی تو ساری گڑیا میں بیگ میں بھر کر اسٹور میں رکھ دیں۔

اور پھر ایسا ہوا گڑیاؤں کے رکھتے ہی دادی بھی زندگی سے روٹھ کر افق کے اس پار جا سوئیں۔ دادی کے بہت سارے فلسفے اس کے لاشعور میں بیٹھ گئے اور وہ اپنی زندگی میں مصروف ہوتی گئی۔ پہلے وہ مورتوں سے کھیلتی تھی پھر اس نے برش ہاتھ میں پکڑا تو وہ بہت سی مورتیں خود تخلیق کرنے لگی تھی۔ پھر اسی دوران اس کی زندگی تبدیل ہونے کو تھی۔



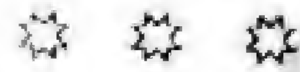
اس نے فون کر کے ماما کو بلوالیا تھا۔ ماما بابا اس سے ملنے آئے تھے۔ گھر کا کوئی بھی شخص ان سے آکر نہیں ملا تھا۔

"تمہاری نند اور ان کی بیٹیاں نہیں ہیں گھر پر کیا؟"

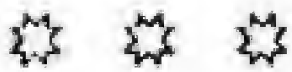
ماما نے ناگواری سے پوچھا تھا۔ بابا نے میگزین اٹھا کر ورق گردانی شروع کردی تھی۔ صفدر آفس سے نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنی ماں کو ابھی تک کچھ بھی گوش گزار نہیں کیا تھا۔

"وہ لوگ مہمانوں سے آکر نہیں ملتیں۔ ان کے ہاں کا رواج یہ ہے کہ مہمان خود جا کر ان لوگوں کے

کمرے میں گھستے پھریں ملنے کے لیے۔"
بابا کو اس کا لہجہ تلخ لگا تھا۔ انہوں نے ذرا کی ذرا نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ ماما نے فکر مندی سے پوچھا۔
"سب ٹھیک تو ہے نا بیٹا؟"
"جی ٹھیک ہے سب۔ صفدر اتنے بزی ہیں آج کل میں اسی لیے آ نہیں پائی۔ یوں آپ کو کال کرکے بلوایا ہے آج۔"
وہ کچھ بتاتے بتاتے رکی تھی۔ اسے اپنے ماں باپ کی تنہائی کا خیال آیا تھا۔ اپنے باپ کی بیماری کی نوعیت یاد آئی۔ وہ کچھ بھی بتا نہ پائی تھی۔ وہ اٹھ کر چائے بنا لائی پر کوئی بھی ان دونوں سے ملنے کے لیے نہیں آیا تھا۔
کار پورچ میں کھڑی بابا کی گاڑی کو آپا اپنی تیز نگاہوں سے ملاحظہ فرما چکی تھیں اور منہ ڈھک کر سوتی بن گئی تھیں۔ اس کے والدین بغیر کسی سے ملاقات کیے صفدر کا انتظار کرتے کرتے چلے گئے تھے۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا ان کی بیٹی خوش نہیں ہے اور والدین کو اس بات کا احساس بہت جلد ہی ہو جاتا ہے۔



رات گئے صفدر گھر لوٹا تھا۔ پہلی حاضری آپا کے حجرے میں لگتی تھی۔ کھانا بھی وہیں تناول فرمالیا گیا۔ ایک کی چار لگا کر اس کا برین واش کیا گیا۔ والدین کی آمد کو غلط رنگ دے کر پیش کیا گیا اور جب صفدر نام کی بوتل لبالب بھر گئی تو ڈانٹ لگا کر اس کے کمرے میں روانہ کر دیا گیا اور وہ گیس بھری کولڈ ڈرنک کی طرح کمرے میں جاتے ہی ابلا تھا۔
"تمہیں شرم نہیں آتی میری ماں جیسی بہن سے بدتمیزی کرتے۔ تمہیں کیا پتا کہ کس طرح ماں بن کر زمانے بھر کی مصیبتیں اٹھا کر مجھے پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ اور تم جو اس بنگلے نما گھر میں بیٹھی ہو نا تو ان کی ہی کرم نوازی ہے جو تم کو ایک چھوٹے گھر سے اٹھا کر بڑے گھر میں لے آئیں اور تمہاری جرات کیسے ہوئی میری بچیوں کو دھمکانے کی۔ منہ توڑ کر ہاتھ میں دے دوں گا تمہارا جو آئندہ نگاہ اٹھا کر دیکھا بھی کسی کو۔ سمجھتی کیا ہو خود کو تم۔ اتنی نعمتیں دیکھ کر بھی خوش نہیں رہتیں تو ہمارا کیا قصور؟ سارا دن کمرے میں گھسی رہتی ہو اور تمہارے باپ کی نوکر نہیں ہیں میری بچیاں جو پکا پکا کر تمہیں کھلائیں۔ صحیح کہتی ہیں آپا۔ تمہارے ہر ٹائم لٹکے منہ کے پیچھے کوئی نہ کوئی لازمی وجہ ہے۔ یہ منہ مار کر تو نہیں آئیں تم۔۔۔؟ جو ہر وقت منہ بنا رہتا ہے اور تمہارے ماں باپ آئے تھے تو مل کے جاتے نا آپا سے۔ یونہی یک طرفہ بات سن کر چلتے بنے؟"
وہ لڑاکا عورتوں کی طرح کمر پر ہاتھ رکھے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ذرا سا سانس لینے کا توقف کیا تو وہ منمنائی تھی۔
"نہیں۔۔۔ میں۔۔۔ نے تو۔۔۔ کچھ بھی۔۔۔ نہیں بتایا ماما۔۔۔ بابا کو۔۔۔"
"ہاں تو بتانے کو تھا ہی کیا تمہارے پاس۔ ساری غلطی تو تمہاری ہی ہے۔ تمہیں ضرورت ہی کیا تھی فساد کرنے کی گھر میں۔"
"آپ میرے پاس کیوں نہیں سوتے صفدر! کیا بیویوں کو اسی لیے لایا جاتا ہے گھروں میں کہ ان کو تنہا کر کے بہنوں کے پاس سویا جائے۔"
آنسوؤں میں گھلی گدلی سی آواز کو صفدر نے دھاڑ سے خاموش کرا دیا تھا۔
"شٹ اپ جسٹ شٹ اپ۔ تم میں کوئی ایسی کشش ہے ہی نہیں کہ مرد تمہارے پاس آئے۔"
ایک اور الزام! وہ ٹوٹ کر رہ گئی۔ "کیا کمی ہے مجھ میں؟" وہ خود سے پوچھنے لگی اور وہ مغلظات بکتا کمرے سے نکل گیا تھا۔ لان میں لگے کہیں دور سنہری جھولا اپنی کانچ کی گڑیا کو یاد کر کے رو رہا۔ وہ آج اندر سے خالی ہو گئی تھی۔
اور خالی گھر کے سناٹے
موت ہوتے ہیں موت۔۔۔



ہال میں ویسا ہی سکوت ابھی تک قائم تھا یا تو گورنر

اور بھارتی وفد کے خوف سے عوام خاموش بیٹھی تھی یا ڈرامے کے مختلف جان دار کرداروں اور یکے بعد دیگرے آنے والے مناظر میں ایسا ربط تھا کہ کوئی بھی آواز نہیں نکال رہا تھا۔ اب ایک نیا منظر چل رہا تھا۔

ہیرو ہیروئن کو چھوڑ کر بیرون ملک چلا جاتا ہے۔ ہیروئن اس کے ہجر میں الیہ شاعری پڑھتی ہے۔ ہیرو کی ماں بہنیں اس پر پھبتیاں کستی ہیں کہ وہ اب کسی انگریز کو لے کر آئے گا اور اسے بھول چکا ہے۔ پھر ایک منظر میں ساری سپورٹنگ کٹھ پتلیاں ہیروئن پر پل پڑتی ہیں، اور سب اسے مل کر مارتی ہیں کیوں کہ اس کا جرم محبت تھا اور وہ اپنی ساس نندوں کے لیے ایک ناپسندیدہ بہو ہوتی ہے اور ایسی صورت حال میں اس کا شوہر گھر والوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے باہر ملک چلا جاتا ہے۔ پیچھے سے گھر والے اسے مار پیٹ کر گھر سے نکال دیتے ہیں اور بیٹے کو فون پر بتا دیتے ہیں کہ وہ گھر سے کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ ہیرو کی آواز ہال میں گونجتی ہے۔

"بھاگ گئی... اسے بھاگنے کیوں دیا؟ جان سے کیوں نہیں مارا۔ میری عزت کو بٹا لگا گئی وہ... ماں تم نے ایسا غضب کیوں ہونے دیا۔ میں نے محبت کی تھی، عزت گروی نہیں رکھی تھی اس کے پاس۔"

ارباز کی آواز میں ایک مخصوص قسم کی دھاڑ تھی۔

دوسری کٹھ پتلیوں کی ملی جلی ہنسی کی طنزیہ آوازیں اسپیکرز سے گونجنے لگتی ہیں، پھر ہیرو کی ماں کی آواز آتی ہے۔

"ہونہہ! آئی بڑی محبت کے گیت گانے والی، محبت کے پیچھے دریاؤں سمندروں کو پاٹ کے آئی تھی۔ ہم سے ٹکر لی تھی... دیکھا! بسنے بھی نہ دیا نا ہم نے۔"

پھر ہنسی کی ہیبت ناک آوازیں گونجنے لگتی ہیں۔

"محبت کا راگ گانے والے کبھی بس ہی نہیں پاتے، محبت بسنے ہی کب دیتی ہے کہیں۔"

پردے برابر ہو جاتے ہیں پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد پھر کھلتے ہیں اور ڈرامے کا آخری سین چلتا ہے۔

ہیروئن پھر میلے کپڑوں میں ہوتی ہے۔ اس کی دراز ریشمی کالی زلفیں اس کے اطراف بکھری ہوئی ہیں۔ ایک سپورٹنگ کٹھ پتلی اس کے پاس آکر رکتی ہے اور اسے معنی خیز لہجے میں بتاتی ہے۔

"جو ہر واپس آگیا ہے۔ وہ سمجھتا ہے تم گھر سے کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہو۔ اگر تم اسے کہیں نظر آگئیں تو جان سے مار ڈالے گا تمہیں۔ وہ محبت جو کبھی تم سے کرتا تھا، وہ سب خواب ہوئی۔ کل اس کی شادی ہے۔ میں نے تمہیں سب سے چھپ کر اپنے گھر میں پناہ دے رکھی تھی، پر تم اب اپنے وطن کو لوٹ جاؤ۔"

سپورٹنگ کٹھ پتلی یہ کہہ کر پردے سے غائب ہو جاتی ہے۔

ہیروئن آہستگی سے اٹھتی ہے۔ اسٹیج پر بنی مصنوعی سڑک پر چلنے لگتی ہے۔ اس کے پس منظر سے زنیرہ کی دکھ بھری آنسو سے مدغم ہوئی آواز گونجنے لگتی ہے۔

میں صدف سیپ کا سچا موتی۔
ان انجان رستوں میں یوں بے مول ہوئی
میرا نصف، جو محبت کو ایمان کہا کرتا تھا
ایمان محبت سے منکر جو ہوا
تو محبت جرم میرے ایمان کا ٹھہری...
محبوب کی گلی کی خاطر
جھاگ اڑاتے سمندر سے پرے
میں نے ہر خون سے بندھے رشتے کو توڑا...
میں نے چپ چاپ ہر دکھ سہے اور میں بے وفا ٹھہری
اور وہ جو وفاؤں کا سردار بنا پھرتا تھا
کیا نکلا...؟
ڈوروں سے بندھا
کٹھ پتلی مرد...

پردے برابر ہو گئے۔ ہال تالیوں سے گونجنے لگا اور تالیوں کے شور نے سب کو باور کرا دیا تھا ڈراما ہٹ ہے۔ پرفارمنس بے حد شان دار تھی۔ پردے پھر کھلتے ہیں۔ پوری ٹیم کٹھ پتلیوں کو ہاتھ میں اٹھائے اسٹیج پر موجود تھی۔ سب کے ل پر ہیڈ فون لگے تھے۔ ان سب

کی صوتی اداکاری تھی۔ دیا کے ہاتھ میں مائیک تھا۔ وہ رائٹر تھی اور ڈائریکٹر بھی۔ ارباز نے سلام کر کے ناظرین کا شکریہ ادا کیا۔ پھر ارباز نے دیا کا تعارف کرایا تھا۔

"یہ ہیں دیا احمد جو کہ اس ڈراما کی رائٹر پروڈیوسر' ڈائریکٹر ہیں۔ اب یہ خود آپ کو اپنے بارے میں بتائیں گی کہ یہ کیا چیز ہیں۔"

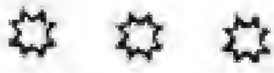
سامعین کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

بھارتی وفد میں ایک غیر ملکی چینل کا نامور پروڈیوسر مکیش کمار بھی شامل تھا۔ وہ ایک ہینڈسم اور تجربے کار آدمی تھا۔ اس کی نگاہ دیا پر جمی تھی اور اسے لگا تھا' پورے ہال میں اندھیرا ہے اور بس ایک دیا ٹمٹما رہا ہے۔ دیا مسکرائی ہوئی گویا ہوئی تھی۔

"السلام علیکم۔ میں آپ کے سامنے۔ دیا احمد۔ ایک آئیڈیا ذہن میں آیا تھا سو ایک مختصر دورانیے کا ڈراما آپ کے سامنے پیش کر دیا۔ میں پوری ٹیم کی بہت شکر گزار ہوں جن کے تعاون کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں تھا۔ ڈرامے کا سارا حسن آوازوں کے اتار چڑھاؤ کا تھا جس میں ارباز اور زہرا کی آوازوں نے چار چاند لگائے۔ اور سب سے زیادہ شکریہ میری دوست کٹھ پتلیوں کا جو بچپن سے میری ساتھی ہیں۔ یہ سب کٹھ پتلیاں میری دادی کے ہاتھ کی تیار کی ہوئی ہیں۔ ان کے ملبوسات کی کارستانیوں میں کچھ ہاتھ میرا بھی ہے۔"

ناظرین کے چہروں پر مسکراہٹ تھی اور مکیش کو لگا تھا اس سے زیادہ دلکش آواز اس نے پہلے کبھی نہیں سنی۔ جو ہال کے اندھیروں میں جھلملا رہی تھی۔ پھر اسٹیج پر آخر کسی نے کیا بولا اس کی نگاہیں اس پر سے ہٹتیں تو وہ کچھ سنتا۔

گورنر نے اعزازی خطاب کیا اور پھر —— غیر ملکی وفود اظہار خیال کے لیے یکے بعد دیگرے اسٹیج پر آئے۔ مکیش کمار نے غیر نصابی سرگرمیوں کو سراہتے سراہتے میڈیا کے شعبے میں مل جل کر کام کرنے کے تجویز کے ساتھ براہ راست دیا کو اپنے چینل کے لیے کام کرنے کی آفر کردی اور دیا دم بخود آنکھیں پھاڑے دیکھنے لگی تھی۔ اسے لگا تھا اس نے ایک تیز جھونٹا لے کر خود کو بلندی پر ہواؤں کے سنگ ہم آہنگ کیا ہو۔



وہ سب موج مستیوں میں مگن تھے' جب ایک نیم سرکاری اہلکار نے دیا کو مکیش کمار کا کارڈ دیتے ہوئے بتایا تھا کہ آپ سے ملاقات چاہتے ہیں اور آپ کو پرنسپل کے آفس میں بلا رہے ہیں۔ وہ ... ٹھنڈے ہوتے ہاتھوں کے ساتھ گئی۔ گھبراہٹ اس کے چہرے سے مترشح تھی۔

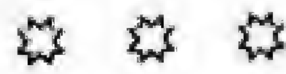
"دیا جی! میں آج کل ایک راجستھانی ڈرامہ پروڈیوس کرنے والا ہوں۔ میں چاہتا ہوں نیو ٹیلنٹ کو سامنے لاؤں۔ میں آپ کو آفر دے رہا ہوں آپ راجستھانی ڈرامے "دیپک راج" کے لیے پلے بیک سنگنگ کریں تو میں آپ کا مشکور رہوں گا۔ مانا کہ ہمارے دیش میں کلاکاروں کی کمی نہیں مگر آپ کی آواز کا سوندھا سا سحر میرے ٹائٹل سانگ کے لیے بہت سوٹ ایبل ہوگا۔ اگرچہ میں نے آپ کو گاتے ہوئے نہیں سنا صرف بولتے دیکھا ہے۔"

وہ ٹکر ٹکر مکیش کمار کی شکل کو تک رہی تھی۔ اس کی تو سات نسلوں میں کوئی گلوکار نہیں گزرا تھا۔ اس کے والدین نمازی پرہیزگار تھے۔ لکھنے کی حد تک تو ٹھیک تھا پر اس نے خود بھی میڈیا میں کام نہیں کیا تھا۔ گو کہ دل میں شوق ضرور تھا مشہور ہونے کا۔ اس کی خاموشی کو دیکھ کر وہ ہنسا' دیا کو اچانک احساس ہوا تھا کہ وہ ایک بے حد ہینڈسم انسان کے روبرو ہے۔

"دیا جی! آپ کو شاید میں نے مشکل میں ڈال دیا ہے۔ ایسا کریں آپ سوچ لیں' میرا کارڈ تو آپ کو مل ہی چکا ہے۔ میرے راجستھان اور ممبئی دونوں آفس کے نمبرز ہیں فیس بک پر بھی آپ مجھے وزٹ کر سکتی ہیں۔ جیسے آپ کو سہولت ہو۔ کونٹیکٹ کر لیجیے گا۔ میں انتظار کروں گا۔ سنگنگ کے علاوہ اور پروجیکٹ بھی میرے پاس ہیں۔ آپ تو اتنی سندر ہیں کسی

ڈرامے میں ہیروئن بھی کاسٹ کر سکتا ہوں میں۔"

اسے بولنے کا خبط تھا۔ دیا کو اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ مسکرا کر جی جی ہی کرتی رہی اور مکیش نے اتنی خوب صورت مسکراہٹ کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بھارتی وفد اور اس کے سینئر پروفیسر اسے رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، وہ مکیش کمار کی نگاہوں میں آئی تھی کوئی معمولی بات تو نہ تھی۔ اور مکیش نے جب اس سے کانٹیکٹ نمبر مانگا تو وہ ذاتی نمبر کے بجائے لینڈ لائن کا نمبر بتا بیٹھی تھی۔



وہ سنہری جھولے میں بیٹھی سوچوں میں گم تھی۔ اس نے خود کو ہواؤں میں پایا۔ اوپر سے نیچے، نیچے سے اوپر۔

"مجھے کیا جواب دینا چاہیے مکیش صاحب کو۔"

وہ اوپر سے نیچے آئی۔ "ماما بابا تو اس بات کو سخت ناپسند کریں گے۔" اس نے انگوٹھوں پر زور دے کر خود کو بلند کیا ایک تیز جھوٹا لے کر "سنگنگ نہیں۔ مجھے لکھنے کی بات کرلینی چاہیے۔" اوپر سے نیچے آتے لاؤنج سے آتی فون بیل پر وہ جھولا روک کر بھاگی تھی۔ بابا فون اٹھائے کھڑے تھے۔

"دیا! تمہارا فون ہے مکیش کمار نامی کسی لڑکے کا۔"

اسے لگا تھا بابا کو ناگوار گزرا ہے۔ وہ کچھ ڈرتے ہوئے فون پر بات کرنے لگی تھی بابا قریب ہی ۔۔۔ بیٹھے اسے ملاحظہ فرما رہے تھے۔ ریسیور سے مکیش کی چہچہاتی آواز نکلی تھی۔

"دیا۔ دیا۔ دیا جی آپ کی تابناکی نے تو رات بھر سونے نہیں دیا۔"

دیا کا دل اچھل۔ بےکل ہونے لگا تھا۔ اکیس سال کوئی زیادہ عمر تو نہیں ہوتی۔ معصوم ہوتی ہیں۔ اس کا لہجہ اتنا کھلا تھا کہ دیا کو سرد موسم میں بھی پسینے آنے لگے تھے۔

وہ ڈرے ڈرے لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

"ایکچولی! میں نے اپنے پیرنٹس سے ڈسکس نہیں کیا تو میں ابھی آپ کو فائنل نہیں بتا سکتی۔ میں آج مشورہ کرلوں پھر آپ کو انفارم کرتی ہوں۔"

بابا کے تنے تنے سے تاثرات میں نرمی آئی تھی۔ اس کی آواز بخوبی ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ اس کی بات پر وہ کچھ اور شوخ ہوا تھا۔

"اف مشرقی لڑکیاں۔ سب کام پیرنٹس سے پوچھ کر کرتی ہیں۔ شادی بھی آپ پیرنٹس کی پسند سے کریں گی کیا؟"

اس نے کام کی بات کے بیچ میں ایک بے ربط بات کی۔ دیا نے ذرا کی ذرا نگاہ بابا پہ ڈال کر کہا تھا۔ "جی میری اولین ترجیح میرے پیرنٹس ہیں۔ وہ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گی۔ میں آپ کو کال بیک کرتی ہوں رات تک۔"

اس نے جلدی جان چھڑائی اور بابا کے روبرو جا بیٹھی۔ اسی اثنا میں ماما بھی بابا کے پہلو میں آن بیٹھی تھیں۔ اس نے بابا کو مخاطب کرتے کہا تھا۔

"بابا! کل میں نے یونیورسٹی میں ایک ڈراما پیش کیا تھا۔ گورنر سندھ اور بھارتی نمائندین کا وفد بھی شامل تھا۔ جن کی کال آئی تھی وہ مکیش کمار صاحب تھے۔ کسی ہندی چینل کے پروڈیوسر ہیں۔ میرا ڈراما پسند آیا تھا انہیں۔ چینل پر کام دینے کے آفر کر رہے ہیں۔"

اس نے پلے بیک سنگنگ والے تذکرے کو سرے سے گول کر دیا تھا۔ وہ بڑی محتاط نگاہوں سے اپنے والدین کے تاثرات جانچ رہی تھی۔ گو کہ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ اس کے منہ سے کوئی بات نکلی ہو اور ماما، بابا نے اسے پورا کرنا اپنا فرض نہ سمجھا ہو۔ اور پھر اس نے کبھی کسی چیز کی ضد کی بھی نہیں تھی۔ پر اب معاملہ دوسرا تھا۔ کسی دوسرے ملک کے چینل کے لیے کسی ہندو لڑکے کے ساتھ مل کر کام۔ وہ بیٹی کے دل کی خواہش جان کر بھی چپ تھے کیونکہ اس شوق کی تکمیل پر بات ساری آ ہی جاتی ہے عزت پر۔ بابا دوٹوک کہتے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"صاف انکار کردو بیٹا! یونیورسٹی تک تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، پر یوں کسی انجان غیر مسلم کی آفر کو

سوچنا بھی ہمیں زیب نہیں دیتا۔ کجا وہاں جا کر ان لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنا۔ بھلا پھسلا کر یہاں سے ہماری بیٹیوں کو لے جا کر کچھر کے نام پر ان کی عزتوں کی نیلامی بندروں کا شیوا ہے بیٹے! انھیں کچھ سوچنا بھی نہیں ہے۔ انکار کرنا ہے دو ٹوک۔ دیٹس اٹ۔"

بابا کے انکار پر وہ چپ چاپ پھر جھولے پر جا بیٹھی تھی۔ اس نے ہلکا تیز کسی بھی قسم کا جھوٹا نہیں لیا تھا۔ خواہشات کی موت پر ایسا ہی سکوت پھیلتا ہے' جیسا اس کے اندر پھیلا تھا۔

☆ ☆ ☆

"صفدر! مجھے ماما کے گھر لے چلیں۔ کتنے دن ہو گئے ہیں مجھے گئے۔"

اس کے لہجے میں نجانے کیا تھا' وہ ایک نگاہ ڈال کر بولا۔

"شام میں لے چلوں گا لیکن آپا سے اجازت لے لینا پہلے۔ ورنہ وہ یہ سمجھیں گی کہ ہم نے ان کو بڑا نہیں مانا۔ دوسری بات یہ کہ ان سے تعلقات صحیح رہیں گے تمہارے تو میرا موڈ بھی ٹھیک رہے گا۔ میرے دل کے تمام رستے آپا اور بچیوں سے ہوتے آئے ہیں۔"

"نہیں جاتی ہوں ان لوگوں کے پاس' وہ لوگ مجھ سے ٹھیک سے بات نہیں کرتے۔ انھیں لگتا ہے میں آپ لوگوں کے بیچ زبردستی گھس آئی ہوں۔" اس کی بات سن کر وہ طنزیہ ہنسنے لگا تھا۔

"کہتی تو ٹھیک ہیں۔"

حلق سے الفاظ کیسے ٹوٹ ٹوٹ کر دل پر گرتے ہیں۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ بات کو طول دینا نہیں چاہتی تھی سو خاموشی سے بیٹھ گئی۔ یہی غنیمت تھا کہ وہ اس دن سے کمرے میں سو رہا تھا۔ کروٹ بدل کر ہی سہی۔ یہی سارا بہت تھا کہ کوئی تو اس کی تنہائی میں شامل ہے۔

وہ بریف کیس اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔ وہ آپا کے پاس جا پہنچی۔ وہ ساری ماں بیٹیاں اس قدر چالاک تھیں' اسے دیکھتے ہی ہنسی ٹھٹھوں میں لگ جاتی تھیں۔ آپا اس کی آمد پر طنزیا ہنکارہ بھرتی تھیں' سو آج بھی بھر کر اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی تھیں۔ اس نے خیریت دریافت کی تو وہ اپنے پرانے جاہلانہ انداز میں تیر کمان لے کر میدان میں کود پڑی تھیں۔

"آج میری خیریت دریافت کرنے کا خیال کیسے آگیا ملکہ عالیہ کو؟" وہ "محاذ" پر آتے ہی گڑبڑا جاتی تھی۔ لڑکیاں جتنی بھی پر اعتماد بنیں "سسرالیوں" کے سامنے سارا اعتماد جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔

"پوچھتی تو ہوں اکثر۔" اس کے ڈرے سے لہجے نے آپا کو اور بھی شیر بنا دیا بلکہ وہ پیدائشی شیر تھیں۔

"کام کی بات کرو بی بی! میرا ٹائم ضائع مت کرو۔"

اور وہ جو میکے جانے کی اجازت طلب کرنے آئی تھی' اسے لگا تھا دنیا میں شاید اس سے زیادہ مشکل کام کوئی اور ہے ہی نہیں' پھر وہ یونہی چپ چاپ اٹھ گئی بغیر کچھ کہے اور رات میں صفدر کے آنے پر اس نے منہ سے جانے کی بات نکالی ہی نہیں۔ نہ اس سنگ دل نے اس سے جھوٹے منہ دریافت کیا کہ اسے جانا بھی ہے نہیں۔

اور یہ دستور تو ہمارے ہی گھروں کا ہے' شادی سے پہلے تک گھر میں آنے والی بہو اور بھابھی چاند کا ٹکڑا لگتی ہے اور جب یہ چاند آنگن میں اتر آتا ہے تو سسرالیوں کے نازیبا رویے چاند کو "گرہن" لگا دیتے ہیں۔

پیروں کی دھول بنا دیتی ہے ایسی حیثیت۔

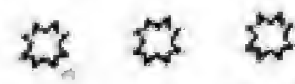
جس عورت کو سب کی پسند کے بعد "بہو" بننے کی سند دی جاتی ہے' اسے گھر میں تو جگہ مل جاتی ہے۔ "دل" میں کیوں جگہ نہیں دی جاتی؟ ہمارے معاشرے کا چلن اتنا برا کیوں ہے؟

کیا ہوا اگر گھر بڑے ہوں تو دل بھی وسیع کر کے آنے والے مہمان کو سچے دل سے خوش آمدید کہا جائے؟

یہ آسانی بھی ہر کسی کے نصیب میں کہاں؟

مشکلات بھری راہوں میں' سنگریزوں سے بھری گلیوں میں ننگے پیروں کا سفر کتنا کٹھن' کتنا صبر آزما ہوتا ،

ہوتا ہے۔ کسی اور کے دکھوں کو کسی اور نے کاندھے پر اٹھایا ہے کبھی۔۔ تو وہ بھی چپ چاپ سارے دکھوں کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے تھی اسی خامشی' اس سکوت سے جو اس کے اندر "بے جرم" کے اترا تھا۔



ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں وہ سوچوں میں مگن تھا جب راہول نے ہلکے سے دروازے کو کھٹکھٹا کر اندر جھانکا۔

"ارے جگر! کن سوچوں میں ہو۔" وہ راہول کو دیکھ کر اٹھنے لگا۔

"یار! وہ لڑکی میری آنکھوں سے نہیں اُترتی۔"

"کون؟"

"وہی یونیورسٹی والی۔"

"اوہ!" اس نے معنی خیزی سے لبوں کو سکوڑا۔ "کیا کہانی ہے جگر! کوئی لو اسٹوری تو کری ایٹ نہیں ہوگئی؟"

"یس۔ آئی ایم فال ان لو یار!"

"یہ بیماری تو سہ ماہی ہے۔" وہ طنزیہ ہنسا تو مکیش نے تکیہ کھینچ مارا اور راہول قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"اپنے دیش میں لڑکیوں کی کمی تھوڑی ہے۔"

"پر یار! بہت اٹریکٹو ہے' بیان سے باہر۔"

"دشمن ملک کی لڑکی سے عشق و محبت بے کار چیزیں ہیں۔ سرحدیں محبت کو پروان چڑھنے نہیں دیتیں اور اہم بات وہ دھرم کی بھی نہیں ہو سکتی ہے۔"

"سو واٹ راہول! پاکستانیوں کی سوچ بدل گئی ہے۔ یہاں کی کتنی ایکٹریس ہیں' جو وہاں جا کر اپنا دھرم بھلا بیٹھی ہیں۔ وہیں کے رنگ میں رنگی ہیں انہیں دیکھ کر کوئی کہہ سکتا ہے' یہ مسلمانوں کی ڈھکی چھپی عورتیں ہیں۔ بس ایک دفعہ وہ کام کرنے کے حامی تو بھر لے پھر دیکھنا میں انہونی کو کیسے ہونی بناتا ہوں۔"

وہ باتوں میں لگے تھے کہ فون بجنے لگا۔ آپریٹر نے اسے جتایا کہ دیا نام کی لڑکی لائن پر ہے اگر وہ اجازت دے تو وہ کال اس کے کمرے سے کنیکٹ کردے اور اس کی تو من چاہی مراد پوری ہونے کو تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کی مدھر بھری آواز ماؤتھ پیس سے اس کی سماعتوں کی نذر ہوئی تھی اور اس نے راہول کو آنکھ مار کر ساری توجہ اس پر مرکوز کی تھی۔

"السلام علیکم مکیش کمار صاحب! میں دیا!"

"واسلام۔ نمسکار دیا جی! کہیے مزاج کیسے ہیں؟"

مکیش کی آواز میں ایک مخصوص جلترنگ تھی اور دیا کا دل دھڑک اٹھا۔

"ایکچولی میرے پیرنٹس نے آپ کی آفر کو قبول کرنے سے انکار کردیا ہے۔ ایم رئیلی ساری۔ میں آپ کے ساتھ کسی بھی قسم کا کام نہیں کرسکتی۔"

"آپ نے پیرنٹس کو کونینس نہیں کیا ہوگا؟"

"ایکچوئلی میں ایک کنزرویٹو فیملی سے بی لونگ کرتی ہوں۔"

"اف ہر جگہ دین دھرم کی باتیں! مذہب کو ایک جگہ اٹھا کر رکھ دیں تو ہم بہت آگے جاسکتے ہیں۔"

اس نے جال بنا۔

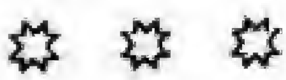
"میں کچھ نہیں کرسکتی اب۔"

اس کے لہجے میں التجا تھی وہ پہلی نگاہ کا شکار ہوا تھا۔ اسے لگ رہا تھا ہر طرف گھپ اندھیرے میں ایک ٹمٹمایا "دیا" ہے۔ جو اسے اپنی جانب مسلسل کھینچ رہا ہے۔

"وہ نہیں مانیں گے۔" اسے بابا کا قطعی لہجہ یاد آیا۔

"پھر بھی میں ایک کوشش تو کرسکتا ہوں۔"

پیچھے ہی بابا آن کھڑے ہوئے۔ وہ گھبرا کر اللہ حافظ کہتی کمرے کی جانب چل دی اور بابا فکروں میں گھرے کتنی دیر تک فون کو تکتے رہے۔



گھر بھر میں اودھم بپا تھا۔ بات ہی ایسی ہوئی تھی انہونی۔

اس گھر میں جس کی ہر عورت کے پاس زیورات کے ڈھیر تھے۔ ان ڈھیروں سے آپا کے قیمتی سونے کے زیورات کی صندوقچی چوری ہوگئی تھی۔ "آپا کی

سلطنت" میں وزیروں اور مشیروں کی عدالت بجی تھی اور جرم کی نامزدگی میں اسی کا قرعہ نکل آیا تھا۔
نندوں کی بیٹیوں نے آگے بڑھ بڑھ کر بیان داغے تھے۔
"ان کے گھر سے تو ان کو اتنا زیور ملا نہیں تھا۔ جب بھی ہمیں "امی" کے زیور پہنے دیکھتی تو بس دیکھتی رہ جاتی تھیں۔ ان ہی کو سب سے زیادہ جلن حسد ہم سے ہے کہ ہم ماموں کے ساتھ کیوں رہتے ہیں۔"
"ان کے بابا کو بھی تو گھاٹا ہوا ہے نا کاروبار میں سوچ رہی ہوں گی ایسے ہی پیچھے والوں کا پورا اڑا دوں۔" بابا کو دانتوں سے چبایا تھا ڈائن سی لڑکی نے۔
"میں نے تو خود کمرے میں چوری چھپے داخل ہوتے دیکھا تھا امی کے۔" یہ سب سے چھوٹی چڑیل تھی۔
وہ گھر ایک بھوت بنگلے کا منظر پیش کر رہا تھا۔
سب کی شکلیں ہیبت ناک تھیں اور آوازیں کریہہ اور چہرے پھنکار زدہ۔ وہ جو دو دن میکہ میں رک کے آتے کٹ پیسوں کو بھی بیگ سمیت اٹھا لائی تھی۔ کمرے کی تنہائی کو بانٹنے کے لیے بچپن سے یہ سکھی ساتھی تھے۔ میکے میں تھی تو بہن بھائی کے کرداروں میں تھے۔ اور سسرال میں آئی تو سسرالی کریکٹروں میں ڈھلے سب دنیا کے بہترین انسان تھے۔ اور سب سے خوب صورت تو اس کا جیون ساتھی تھا۔
لٹھے کے سفید سوٹ میں پگ باندھے صفدر۔
گھر کے تنے تنے ماحول کو اس نے کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ وہ تو اپنی دنیا میں ہی گم تھی۔ اسے اچانک احساس ہوا تھا کہ وہ صفدر سے محبت کرنے لگی ہے۔ باوجود یہ کہ وہ ایک برف کا آدمی تھا عورت کی قربت بھی جس کا کچھ بگاڑ نہ پائی تھی۔
بابا اسے آکر لے گئے تھے دو دن رہنے کے لیے اور صفدر ان کے سامنے خود کو اچھا داماد ثابت کر رہا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں زیور کی صندوقچی اس کے کمرے میں کس طرح چھپائی گئی تھی اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو سکی تھی اور وہ جو واپس آئی تو ہر جگہ گہرا سکون تھا اور وہ سکوت کسی طوفان کا ہی تو پیش خیمہ ثابت ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ سنہری جھولے میں تھی۔ بلندی اور پستی کے درمیان۔ الجھی الجھی۔ سفید لباس میں سنہری جھولے کی پری۔ دروازے کے سامنے دو گاڑیاں آن رکیں۔ ڈور بیل پر علی بخش چاچا نے گیٹ کھول کر دیکھا اور پولیس کی وین کو دیکھ کر گم صم سے ہو گئے۔
مکیش کمار نے ہوٹل کی گاڑی سے اتر کر اپنا کارڈ دیا۔ علی بخش چاچا نے بغیر کچھ پوچھے اسے اندر آنے کا راستہ دے دیا۔ وہ تیز جھونٹا لیتے نگاہ کو مرکزی گیٹ پر جمائے ہوئے تھی اور مکیش کو یوں گھر کے لان میں کھڑے دیکھ کر وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔
اور وہ اس سفید پری کو اتنے خوب صورت جھولے میں بیٹھا دیکھ کر خود اپنے ہوش و حواس کھونے لگا۔ دیا نے خود کو کمپوز کرتے جھولے سے اترنے میں عافیت جانی تھی۔ اسے یوں اچانک بغیر اطلاع کے دیکھ کر وہ خود بے ہوش ہونے کی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی اس کے روبرو آئی۔
"آ۔ آپ۔"
"نمستے!" اس نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ کر ماتھے تک لے جا کر کہا۔ وہ ابھی تک گنگ اسے دیکھ رہی تھی۔
"آپ کے ہاں مہمانوں کو اندر بلانے کا چلن نہیں ہے کیا؟"
اس نے شرارت سے کہا۔ وہ بہت شرمندہ ہوئی۔ اسے ڈرائنگ روم میں لے گئی تھی۔ ماما بابا کسی کام سے گھر سے باہر تھے اور خوف کے مارے اس کے اندر اکھاڑ پچھاڑ ہونے لگی تھی۔
"اکچو ئلی آج رات کی فلائٹ سے ہم انڈیا واپس جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا ایک دفعہ آپ کے پیرنٹس سے مل کر کونینس کرنے کی کوشش کر لوں۔ میرا تو کام ہی نئے چہروں کو فیلڈ میں آگے لانا ہے۔ آپ کو دیکھا تو بس۔ پھر کچھ دکھائی نہ دیا۔" اس کا لہجہ

گمبھیر تھا۔ دیا کے ہاتھ لرزنے لگے تھے۔

"مما پاپا گھر پر نہیں ہیں اور آنے کا ٹائم بھی کنفرم نہیں۔ آپ نے فضول میں زحمت کی۔ وہ نہیں مانیں گے۔ پلیز ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ۔"

وہ التجا کرنے لگی۔ اور اس کا التجائی لہجہ اس کے دل میں اثر کر گیا۔

"گو کہ جاتے سے آپ کو دیکھنا تھا۔ سو دیکھ لیا۔ آپ پریشان مت ہوں میں چلتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا اور وہ ٹھنڈے ہوتے جسم سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ اسے یہ پچھتاوا بھی بعد میں ہوتا تھا کہ کم از کم چائے کا تو پوچھ لیتی۔

مکیش کمار کو گورنمنٹ کی طرف سے پروٹوکول دیا گیا تھا۔ بھارتی وفد کا کوئی بھی رکن کہیں بھی جاتا۔ ایک خصوصی دستہ سیکیورٹی کے لیے موجود ہوتا۔ اور اس کے جانے کے بعد اسے ایک کے بعد ایک خیالات آرہے تھے۔

"مکیش صاحب کو میرا ایڈریس کہاں سے ملا؟" اس نے خود سے سوال کیا۔ یقیناً" اس نے لینڈ لائن نمبر سے اس کا ایڈریس نکلوایا ہوگا۔ مکیش کمار کی اچانک آمد اسے اندر تک ہلا گئی تھی۔

اور ہلایا تو اس کو بابا کی خاموش نگاہوں نے بھی تھا۔ جب علی بخش چاچا نے انہیں مکیش کمار کی آمد کا بتایا تھا اور پولیس کی وین کا سن کر تو وہ چپ کے چپ رہ گئے تھے۔ حالانکہ وہ سیکیورٹی کے لیے ساتھ آئی تھی۔

اسے مکیش کمار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دلچسپی بس کام کرنے اور مشہور ہونے سے تھی۔ رات کی فلائٹ سے مکیش کمار واپس چلا گیا تھا اور وہ رات بھر کروٹیں بدلتی رہی۔ اس کے اندر گہری عمیق خاموشی اتری تھی۔

☆ ☆ ☆

اس نے یونیورسٹی جانا شروع کر دیا روٹین کے مطابق۔ پھر تین دن ہی گزرے تھے اس کی چپ کو توڑنے کے لیے بابا ماما مری گھومنے کا پروگرام بنارہے تھے۔ بابا کے جگری دوست وہیں رہائش پذیر تھے۔ بابا کو اندازہ تھا کہ وہ کچھ اپ سیٹ ہے۔ پر وہ جانتے تھے کہ وہ ایک فرماں بردار بیٹی ہے۔ وہ ہلکی پھلکی گپ شپ میں مشغول تھے کہ فون بیل بجنے لگی۔ دیا فون کے قریب تھی۔ سو وہ کال ریسیو کرنے چل دی تو اس نے سرسری سے نگاہ سی۔ ایل۔ آئی پر ڈالی تھی۔ بہت بڑا سا نمبر سی ایل آئی پر جگ مگ کر رہا تھا۔ اسے کوڈ کی پہچان نہیں تھی اس نے ریسیور اٹھا کر سلام کے بعد ہیلو کہا تھا۔

دوسری جانب وہی شوخ کھنکھتا ہوا لہجہ تھا۔

"میں نے دعا کی تھی کہ کال دیا جی ریسیو کریں۔" دیا کے کانوں میں زن زن کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ چپ کی چپ تھی پھر وہ دوبارہ گویا ہوا تھا۔

"ارے پہچانا نہیں کیا آپ نے؟ میں مکیش کمار۔"

وہ صرف جی کہہ سکی۔ وہ بہت پراعتماد مرد تھا۔ فلمی دنیا کی چکاچوند میں مگن رہنے والا آدمی۔ دیا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے کیسے ہینڈل کرے۔

"ارے کچھ تو بولیے! سمندروں کے پرے سے جسٹ آپ کی آواز سننے کے لیے تو کال کی ہے میں نے۔" اس نے رانگ نمبر کہہ کر ریسیور کو اس طرح رکھا کہ دوبارہ کال آنے کی صورت میں اسے نمبر انگیج ملتا۔ پھر یوں ہوا کہ وقفے وقفے سے مکیش کی کالز آنے لگیں اور وہ فون اٹھانے سے گھبرانے لگی۔ پھر ایک دن بابا کو کسی نمبر پر کال بیک کرنا تھی وہ سی۔ ایل آئی سے نمبر چیک کر رہے تھے۔ ان کی نگاہوں میں انڈیا کے کوڈ والا نمبر بھی آگیا تھا۔ انہوں نے ماما سے استفسار کیا تو انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ دونوں کا ذہن مکیش کمار تک نہیں گیا تھا۔

پھر اس رات بابا ماما اپنے کمرے میں تھے جیسے ہی فون بجنے لگا۔ دیا نے ریسور اٹھالیا۔ بغیر نمبر پر نگاہ ڈالے عجلت میں، کسی کام سے وہ فون کے نزدیک سے گزر رہی تھی۔ دوسری جانب ایکسٹینشن پر بابا بھی ریسیور کان سے لگا چکے تھے۔ دیا کے ہیلو پر مکیش کمار بولا تھا۔

"دیا جی پلیز۔ میری بات تو سن لیں آخری بار!"
"جی کہیے۔"
"آئی ڈونٹ نو۔ میں۔۔۔ میں نہیں جانتا کہ یہ سب کیسے ہوا؟"
اس نے توقف کیا۔ دیا کے دانتوں میں پسینہ آنے کو تھا۔ اسے اندازہ تھا ایکسٹینشن سے ریسیور اٹھالیا گیا ہے۔ لائن میں شور آنے لگا تھا۔
"میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میرا پاگل دل کسی اور دیش کی لڑکی کے لیے مچل جائے گا۔" دیا کی سانس پھولنے لگی تھی۔ سینے میں دل تھا کہ ڈوبے ڈوبے جاتا تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے ریسیور رکھ کر کمرے میں بھاگ گئی تھی۔ اور بھلا بھاگ جانے سے بھی کبھی کچھ ٹھیک ہوا ہے؟
بابا ریسیور کان سے لگائے کھڑے تھے۔ ان کا رواں رواں کان بنا تھا۔ ان کے کمرے میں جلتی مدھم روشنیاں تاریکی میں ڈوبنے لگی تھیں۔ وہ سانس روکے کھڑے تھے اور یہی وہ سکوت تھا۔ جو اس گھر کے تین مکینوں کے رگ و جان میں اُترنے کو تھا۔ مکمش کو اندازہ نہ ہو سکا تھا کہ وہ ریسیور رکھ کر جاچکی ہے۔ اس نے ریسیور کریڈل پر نہیں رکھا تھا۔ مکمش اسی جذب میں بول رہا تھا۔
"دیا جی! مجھے آپ سے پہلی نگاہ میں محبت ہو گئی ہے۔ میں نہیں جانتا ایسا کیوں ہوا۔ پر جو ہوا اچھا ہوا۔ مانا کہ دیش جدا' دھرم الگ' پر محبت بھی کبھی سرحدوں کی محتاج ہوئی ہے بھلا۔ میں آپ کو حاصل کرنا چاہتا ہوں ہر قیمت پر' بس ریکویسٹ تو یہ ہے کہ دل بے قرار کا مقدمہ آپ کی عدالت میں ہے' جو چاہیں فیصلہ کریں۔"
وہ ایک سیکنڈ کو رکا تھا۔ اس کی کہانی بس چند لمحات کی ہی تھی۔
"دیا جی! آپ بولتی کیوں نہیں؟"
ریسیور سے اٹھنے والی آواز دیا کی نہیں تھی۔ اور جس کی تھی اسے اس کا اندازہ نہیں تھا۔
"آپ جو کوئی بھی ہیں' آپ کو آپ کے دھرم کا واسطہ! میری معصوم بچی کو مت ورغلائیں۔ آپ کو یہاں آنے میں کچھ ٹائم لگے گا۔ اور مجھے چند گھنٹے لگیں گے یہاں سب کچھ ختم کرنے میں۔"
اور مکمش جو بے تکان بولتا تھا اور بے حد بولتا تھا۔ اسے آج اندازہ ہوا تھا۔ کبھی کبھی انسان کے پاس بولنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ خود بخود دیکھتے ہی دیکھتے سارے الفاظ مرجاتے ہیں۔ وہ بھی مرے ہوئے لفظوں کے قبرستان میں خالی خالی سا بیٹھا تھا اور اسے مردہ لفظوں کی بستی میں باقی زندگی بتانی تھی۔ اس کا چاند اس کی بستی میں اترا ہی کب تھا۔

☆ ☆ ☆

اور یہ دوسرے دن کی صبح کا ذکر ہے۔
سورج نارنجی شعاعوں سمیت اس کی بستی میں اُترا تھا۔ سب سفر ختم تھے۔
ایک نیا سفر اس کی دہلیز کو پکڑے دروازے کو کھٹکھٹا تا تھا۔
وہ یونیورسٹی نہیں گئی تھی۔ بابا نے اسے ایک لفظ بھی نہ کہا تھا۔ پر وہ بے حد حساس تھی اور حساس لوگوں کو کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی کب ہوتی ہے۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا بابا نے مکمش کی ساری باتیں سن لی ہیں۔
بابا آفس کے لیے نکلے تھے۔ ماما لان میں بیٹھی اون کے گولوں میں الجھی سویٹر میں نیا ڈیزائن ڈال رہی تھیں۔ یہ ان کے فراغت کے کام تھے۔ وہ گاہے بگاہے ایک نگاہ اس پر بھی ڈال لیتی تھیں۔
وہ ملگجے سے گلابی کپڑوں میں بھی گلاب دکھتی تھی۔ سنہرے جھولے کی گلابی گڑیا۔
اس نے آنکھوں کو موند کر خود کو بلند کیا۔ پر اسے مزا نہ آیا۔ وہ خود کو بے دلی سے ہوا کے سنگ کرتی رہی۔ ڈور بیل ہوئی۔ دو خواتین لان میں داخل ہو گئیں۔ اس کی نگاہ چادر اوڑھی عورت سے ٹکراتی بلندی سے پستی کی جانب آرکی۔
اور چادر والی عوت جسے سب "آپا" کے لقب سے

پکارتے ہیں۔ وہ دیا کو دیکھتی ہی رہ گئیں۔ اتنی خوب صورت کوئی لڑکی ان کی برادری میں تھی ہی نہیں۔ وہ جھولے سے اُتر کران کو سلام کرکے اندر چلی گئی تھی۔ مگر آپا نے ان کی دہلیز پکڑلی تھی۔

ماما بابا ایک نگاہ صفدر کو دیکھ آئے۔ صفدر ایک ہینڈسم مرد تھا۔ شان دار گھر گاڑی، تعلیم، اور یہی سب چیزیں تو مدنظر رکھی جاتی ہیں رشتے طے کرتے ہوئے، اندر سے جھانک کر روحوں کو کون دیکھتا ہے۔ اور بابا جو مکیش کمار سے اس حد تک خوف زدہ ہوگئے تھے کہ وہ ان کی بیٹی کو بہلا پھسلا کر انڈیا نہ لے جائے۔ انہوں نے زیادہ تحقیقات کرنے کی جستجو بھی نہ کی اور سب کچھ تو بہترین تھا سو انکار کیونکر ہوتا۔

اسے مکیش سے کوئی انسیت ہوئی نہیں تھی۔ جو صفدر سے منسوب ہونے پر کوئی دکھ ہوتا۔ دکھ تو بس خواہشوں کی موت کا تھا ایک شہرت کا ہی تو شوق تھا۔ کوئی گناہ کی خواہش نہیں کی تھی اس نے۔

مکیش کی آخری کال کے ہفتے بعد اس کی انگلی میں صفدر سے نسبت کی انگوٹھی آگئی اور اسے پابند کردیا گیا کہ بس وہ اس مرد کو سوچے۔

بابا کی فکرات میں کچھ کمی آگئی۔ لینڈ لائن کا کنکشن صرف ایک سیٹ پر کرکے بابا کے کمرے تک محدود ہوگیا۔ بابا کے اس فعل سے اسے دکھ ہوا تھا۔ اپنے خون پر ایسی بے اعتباری۔

مگر ان کے نزدیک وہ ایک چھوٹی سی احتیاط تھی۔ بابا اپنا دین خراب نہیں کرنا چاہتے تھے کسی بھی لاپروائی سے۔ وہ مانتے تھے ان کی بیٹی بہت معصوم اور کم عمر ہے۔ مگر شیطان بیچ میں کود پڑے تو کوئی احتیاط بھی کام نہیں آتی۔ انہیں اپنی بیٹی کو شیطان کے بہکانے سے بچانا تھا۔

اور اس "بچاؤ" کو وہ ممکنات سے نہ بچا سکے تھے۔

☼ ☼ ☼

منگنی کے چھوٹے سے فنکشن کے تیسرے ہی دن آپا اپنی چار عدد بیٹیوں کے ساتھ وہاں موجود تھیں۔

ان کی بیٹیاں نخوت سے اس کی چھوٹی سی جنت کو ترچھی نگاہوں سے ملاحظہ فرما رہی تھیں۔

دیا کو ماما نے کپڑے تبدیل کرکے آنے کو کہا تھا۔ اور جب وہ آئی تو آپا اس کے آگے بچھ بچھ گئی تھیں۔ اسے اپنے پہلو میں بیٹھنے کی جگہ دی تھی۔ وہ سلام کرکے خاموشی سے ان "شہد سے میٹھی" عورتوں کے درمیان بیٹھ گئی تھی۔ اسی اثنا میں بابا بھی کمرے میں آگئے تھے۔ کچھ دیر رسمی بات چیت کے بعد آپا اپنے مدعے پر آگئی تھیں۔

"بھائی صاحب میں آج تاریخ لینے آئی ہوں شادی کی۔"

دیا نے انگلیوں میں انگلیاں پھنسالی تھیں۔ دل کہیں بہت اندر ڈوب گیا تھا۔ بابا اور ماما خود سناٹے میں آگئے تھے۔

"پر بہن! آپ سے بات تو یہ طے ہوئی تھی دیا کے فائنل سمسٹر کے بعد ہی شادی ہوگی اور آج تو منگنی کو ہی تیسرا چوتھا دن ہوا ہے، اتنی جلدی شادی تو ناممکن ہے۔" وہ پہلو بدل کر نرم لہجے میں بولے تھے۔ بیچ میں آپا کی سب سے بڑی بیٹی بول پڑی۔

"انکل! ایسا ہونا چاہیے بس! شادی تو دو دن میں بھی ہو سکتی ہے۔ میری شادی ایک ہفتے کے اندر ہوئی تھی۔ میرے سسرال والوں نے بس ایک ہفتے کا نوٹس دیا تھا۔"

"بیٹے! آپ کی بات درست ہے۔ پر مسئلہ تو پڑھائی کا ہے۔"

"ارے چھوڑیں انکل! ماموں نے کون سی ان سے نوکری کروانی ہے۔"

"بیٹے! بات نوکری کی تو نہیں ہوتی۔ ہم یہ سوچ کر تو اپنی بیٹی کو تعلیم نہیں دلا رہے۔" ماما کا لہجہ بھی سمجھاتا ہوا تھا۔ آپا کی بیٹی منہ بنا کر بیٹھ گئی۔

"بھائی صاحب! بات یہ ہے کہ میرے والدین صفدر کو پانچ سال کی عمر میں چھوڑ کر ایکسیڈنٹ میں فوت ہوگئے تھے۔ میری شادی جب ہی ہوئی تھی، بہت بڑا کاروبار تھا۔ زمینیں تھیں۔ میں نے ہی سب کچھ

دیکھا۔ ماں بن کر یتیم بھائی کو پالا۔ اب وہ بڑا ہو گیا ہے تو سب ہی کچھ اس کا ہے۔ میں تو بس نگران تھی۔ میرا حصہ تو شادی کے وقت ہی مجھے دے دیا گیا تھا۔ میں نے بھائی کو پڑھایا لکھایا کسی قابل بنایا۔ اب شادی کر کے اپنی ذمہ داری سے نبٹنا چاہتی ہوں جلد از جلد۔ زندگی موت کا کیا بھروسا۔ بچیاں چھوٹی تھیں تو شوہر داغ مفارقت دے گئے۔ بیٹا اللہ نے دیا نہیں۔ دل میں اس قدر ارمان ہیں کہ جلد از جلد بھائی کے سر پر سہرا سجاؤں۔ بچیوں کو بھی ماموں کی شادی کے چاؤ چونچلے ہیں۔ اور آج جو ہم تاریخ لینے آئے ہیں وہ صفدر کی خواہش پر آئے ہیں۔ وہ شادی کر کے کوئی نئے بزنس کا سیٹ اپ لگائے گا۔ رہا مسئلہ پڑھائی کا صفدر چاہے گا تو بعد میں پڑھ لے گی دیا۔ بلکہ میں اسے کہوں گی اس کے تمام شوق پورے کرے۔ آپ بے فکر رہیں۔ یہ سمجھیں بچی ایک گھر سے دوسرے گھر میں جا رہی ہے۔ اور اب آپ تاریخ دے دیں۔"

"ہم آپ کو مشورہ کر کے جواب دیں گے۔ ہماری اکلوتی بیٹی ہے' اب یوں ہی تو اٹھا کر رخصت نہیں کر سکتے نا!"

ماما نے کہا تو وہ خوشامدانہ لہجے میں کہنے لگی تھیں۔

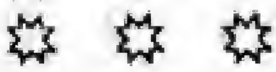
"ارے آپ لوگ جہیز کے تکلفات میں قطعی مت پڑیے گا۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمارے گھر میں۔ بس اس چاند کو ہمارے آنگن میں اتار دیں' آپ کا احسان ہو گا۔"

ماما ان سے معذرت کرتی اٹھیں۔ بازار سے کئی طرح کے کھانے منگوا کر انہیں رات کا کھانا کھلا کر بھیجا۔

اور اسی رات بابا نے ماما کو مشورہ دیا۔

"شادی تو ہمیں سال بعد بھی کرنی تھی نا۔ اسی ماہ ہی سہی اور تم تو جانتی ہی ہو مجھے کتنی فکر رہنے لگی ہے دیا کی۔ جب سے اس ہندو نے اس کا پیچھا لیا ہے۔ وہ تو انسان کا بچہ تھا جو میرے سمجھانے پر دوبارہ کال نہیں کی اس نے۔ مگر میری تمام فکریں تب ہی دور ہوں گی جب میں بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔"

اور ماما ان کی بات بن کر ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگی تھیں۔ ان کے پاس اس کے علاوہ تھا ہی کیا۔ وہ فرماں بردار بیوی تھیں اور اس سارے کھیل تماشے میں دیا خاموش تماشائی تھی۔ اسے کٹھ پتلیاں بہت پسند تھیں۔ اور وہ اپنے ماں باپ کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی تھی۔



اور پھر وہی تاریخ آگئی۔ پچھلے مہینے کی اسی تاریخ کو اس نے ایک اسٹیج پر سیج سجائی تھی۔ ڈوریوں سے بندھی کٹھ پتلیاں مختلف ہاتھوں میں تھما کر ایک ڈراما پیش کیا تھا "کٹھ پتلی"

ٹھیک اسی تاریخ کو اس کی شادی طے ہوئی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ یوں ہاتھوں سے وقت بھی پھسل سکتا ہے۔ جیسے ساحل پر کھڑے شخص کے پیروں تلے سیکنڈز میں ریت پھسل جاتی ہے یونہی بس چند لمحوں میں سب کچھ بدل جاتا ہے۔ اور اس کی زندگی میں کم و بیش سب کچھ بدل گیا تھا۔ دیا سے دیا صفدر تک کہ سفر میں چند لمحے ہی تو لگے تھے۔



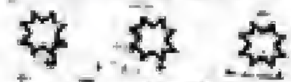
صفدر نفسیاتی طور پر ——— ایک ایسا شخص تھا۔ جس کی ساری ڈوریں اس کی بڑی بہن کے ہاتھوں میں تھیں۔ اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو آپا کے ساتھ پایا۔ آپا کے تلے اوپر کی بیٹیاں اس سے چند سال ہی چھوٹی تھیں۔ صفدر ان ماں بیٹیوں کے لیے بے حد اہم مرد تھا۔ جس کی دو وجوہات تھیں۔ اول اس گھر میں کوئی اور دوسرا مرد نہیں تھا۔ آپا کے شوہر بہت جلد ہی دنیا چھوڑ گئے تھے۔ دوم آپا کے پاس اپنا کچھ بھی باقی نہ تھا۔ وہ اپنا سب سرمایہ خرچ کر کے کنگال ہو چکی تھیں۔ سب زمین و جائیداد صفدر کی تھیں۔ یوں صفدر سے گہری وابستگی کی دوسری اہم وجہ صفدر کی دولت تھی۔ اور بیوہ بچے ہونے کی صورت میں انہیں دیوار سے جا لگنے کا ڈر تھا۔ اولاد کے بعد کوئی بھائی بہن اہم نہیں رہتا' یہ دنیا کا دستور بہت پرانا ہے۔ سو یہی وہ نقطہ تھا'

جہاں سے انہوں نے صفدر کی نفسیات پر گرفت مضبوط رکھی تھی۔ یہ بات تو انہیں معلوم تھی کہ اگر وہ صفدر کی من پسند دلہن لے آئیں گی تو بھائی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

صفدر کی تھوڑی سی دلچسپی زرینہ خالہ کی بیٹی میں تھی۔ آپا کو اندازہ تھا۔ ذرا سی انسیت ان کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے' سو چند ہفتوں میں انہوں نے ایسی لڑکی کو ڈھونڈلی جو کہ بیوی تو بھائی کی ہو پر زرخرید غلام ان کی ہو۔ آپا بالکل نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی بھاوج اس گھر میں قدم جمائے۔ ویسے تو بھائی کی فرماں برداری پر بڑا ناز تھا۔ اور انہیں اپنی صلاحیتوں پر بھی بڑا فخر تھا۔ انہوں نے اس کی تربیت کی ہی اس انداز سے تھی کہ وہ کبھی ان کے سامنے سر نہ اٹھا سکے۔ بس وہ صفدر کی برین واشنگ میں لگی رہتیں۔

دیا انہیں بہت زیادہ چالاک نہیں لگی تھی جیسے کہ عموماً "لڑکیاں ہوتی ہیں۔

انہیں زرینہ خالہ کی بیٹی پسند نہیں تھی اور ان کے خیال میں وہ صفدر کی بیوی بننے کے قابل نہیں تھی۔ کیونکہ وہ بہت بولڈ تھی۔ دیا سے جلد از جلد صفدر کی شادی کرا کر آپا نے زرینہ خالہ کی بیٹی کا قصہ تو مکا دیا۔ دوسری طرف صفدر نے پہلی رات ہی اسے بری طرح نظر انداز کیا تھا۔ وہ پیا چاہی سہاگن نہیں بن پائی تھی۔ اس نے ساری رات آپا کے احسان کا راگ الاپا تھا۔



ولیمہ کے دوسرے دن کھانے پر سب جمع ہوئے تھے۔ دیا اپنے والدین کی طرف ملنے گئی ہوئی تھی۔ صفدر نے سالن کا ڈونگہ آپا کو بڑھاتے کہا تھا۔

"آپا! آپ کی پسند کی داد دینی چاہیے ویسے' لڑکی خوب صورت ڈھونڈی ہے آپ نے۔"

آپا جو پلیٹ میں سالن نکال رہی تھیں۔ اپنی منجھلی بیٹی کو بلاوجہ سخت سست سنانے لگیں۔ انہیں اچھے بھلے سالن میں کیڑے نظر آنے لگے تھے۔ صفدر کی بات انہیں تیر کی طرح لگی تھی۔ سب خاموش ہو کر کھانے لگے۔ آپا زہر مار والے انداز میں دو لقمے کھا کر صفدر کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"تم ہی مرے جا رہے تھے زرینہ خالہ کی بیٹی کے لیے۔ دیکھ لیا نا میرا انتخاب۔ پر ایک بات میرے بھائی! کان کھول کر سن لو۔ پیر کی جوتی ہوتی ہے عورت۔ سر پر بٹھایا نہیں جاتا اسے۔ بیوی کے ارد گرد لٹو کی طرح جو مرد شروع میں گھوم جائے تو عورت ساری عمر لٹو کی طرح ہی گھماتی ہے پھر۔ ہم زمینوں کے مالکوں کو زیب نہیں دیتا کہ عورت کی تعریف کر کے اس کے دماغ کو آسمانوں پر چڑھائیں۔ ہر چیز جگہ پر ہی اچھی لگتی ہے۔ اور عورت کی جگہ مرد کے پیر ہوتے ہیں اس کا دل نہیں۔ اللہ بخشے ابا جی کو' اماں کو وہ گالیاں دیتے داخل ہوتے تھے کہ لوگ انگلیاں کانوں میں ڈال لیتے تھے۔ اماں ان کے آگے پیچھے لٹو کی طرح گھوما کرتی تھیں۔ اور اپنے بہنوئی کی مثال لو تمہارے ہوش میں ہی تو انتقال ہوا ہے نا۔ اپنے مرد ہونے کا وہ غرور' وہ تنتنا تھا کہ میری تو بولتی بند رہتی تھی۔ اتنا روپیہ پیسہ جہیز میں لے کر آئی پر مجال جو مجازی خدا کے سامنے اف بھی کی ہو۔ شکل میں بھی ان سے کہیں خوب صورت' پر کبھی جوان کانوں نے دو بول تو تعریف کے سنے ہوں۔ اور تم خاندانی روایتوں کو بھول کر صرف دو دن میں یوں سب کے سامنے دھڑلے سے اس کے حسن کے گیت گا رہے ہو؟"

اور صفدر اپنا سا منہ لے کر کھانے میں مصروف ہوگیا۔ آپا کے لیکچر کے جواب میں بس ایک کھسیانی سی ہنسی ہنسا تھا۔ اور کافی دیر تک اپنے "فعل" پر نادم ہوتا رہا تھا۔ آپا کا وفادار۔

اور پھر آئندہ دنوں میں اس نے کبھی یہ غلطی دہرائی نہیں۔ وہ آپا کو خوش رکھنا چاہتا تھا اور آپا کی خوشی اسی میں تھی۔ وقت بے وقت بیوی کو بے نکان سنائے۔ بیوی کو پیر کی جوتی بنا کر رکھے۔ دیا کے لیے شہد بھری باتیں بس جب تک ہی تھیں جب وہ میکے میں تھی۔

شادی کے دوسرے دن جب اس نے پڑھائی جاری رکھنے کی بات کی تو صفدر نے دوٹوک انکار کر کے کہا تھا، کہ سارا دھیان گھر میں لگاؤ۔ یہ وعدہ بھی جھوٹا ثابت ہوا کہ اس کو شادی کے بعد مزید پڑھنے کی اجازت دی جائے گی۔

دیا کو آپا کا وہ غلط رویہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ شادی سے پہلے کیا تھیں اور شادی کے بعد وہ وہی روایتی نند نکلیں، جو بھاوجوں کو دنیا کی حقیر مخلوق سمجھ کر بھائی کی شراکت دار سمجھتی ہیں۔ انہیں تو چاہیے تھا بھائی کو کنوارہ ہی رکھتیں۔ بھائی تو ان کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھتا تھا تو اسے بیوی یا "فیملی" کی حاجت کیا ہوتی۔

بعض دفعہ تو دیا کو لگتا تھا کہ وہ اس میں تھوڑی سے دلچسپی ظاہر کر لیتا ہے۔ پر دوسرے ہی دن وہ مٹی کی مورت سا ساکن ہو جاتا۔ ہر احساس سے عاری۔ پھر چند مہینوں میں وہ دیا سے بے زار سا رہنے لگا۔ صفدر کو لگتا کہ گھر میں ہونے والی چپقلش کی تمام وجوہات کی وجہ دیا ہے۔ ورنہ دیا کی آمد سے پہلے کم از کم گھر میں بہت سکون تھا۔

آپا کو اس سے بیر یوں بھی کچھ زیادہ تھا کہ ان کی توقع کے مطابق جہیز نہیں لائی تھی۔ لانے یا نہ لانے سے کیا فرق پڑتا ہے سب کچھ تھا تو اسی کا نا! پر موٹی عقل کے لوگوں کا کیا کیا جائے۔

اصل میں بات یہ تھی کہ وہ صفدر کی شادی کے لیے صرف یوں راضی ہوئی تھیں کہ خاندان بھر کے لوگ انہیں یہی طعنے دیتے تھے کہ صفدر کی عمر شادی کی ہو چکی ہے اور وہ اس کی شادی نہیں کرنا چاہتیں کہ "کماؤ" لڑکا اور کروڑوں کی جائیداد ہاتھوں سے نہ نکل جائے۔ سو ان طعنوں سے بچنے کے لیے صفدر کی شادی ناگزیر تھی، پر اسکیم یہی تھی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

دیا صفدر کی من چاہی نہیں تھی۔ اور آپا چاہتی تھیں کہ وہ دل سے اتر جائے صفدر کے۔ اپنے منصوبے پر ابتدا سے ہی کام کرنا شروع کر دیا تھا انہوں نے اور یوں رفتہ رفتہ صفدر نے اسے مکمل طور پر مسترد کر دیا۔

وہ زرینہ خالہ کی چلبلی بیٹی کو بھول نہیں پایا تھا۔ وہ لڑکی سب سے چھپ چھپا کر صفدر سے رابطے میں رہنے لگی تھی۔

آپا اس کو انجام تک پہنچاتے پہنچاتے کچھ ہی دنوں میں خود ہی انجام کو پہنچنے والی تھیں۔ انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ ان کے کچے کانوں کے بھائی کی برین واشنگ کوئی اور بھی کرنے لگے گا۔



اسے جس دن یہ احساس ہوا کہ وہ صفدر کو چاہنے لگی ہے تو اسے لگا وہ کسی دوزخ میں نہیں رہ رہی اس کی تشنگی ایسے ہی ختم ہو گئی جیسے ریگستان میں کوئی شفاف پانی کا چشمہ دیکھ لے اور پیاس بجھا لے۔

وہ صفدر کا وارڈ روب کھول کر کھڑی ہو جاتی۔ اس کے کپڑوں کو چہرے سے قریب کر کے اس کی خوشبو کو اپنے اندر اتارتی۔ اسے یہ کرنے میں مزا آتا۔ پھر وہ اس کے ہر لباس کو سونگھتی اور مسکراتی۔

"اف میرے اللہ! یہ ہے وہ محبت۔ جس کے بارے میں میں لکھا کرتی تھی۔" وہ خود سے سوال کرتی اور خود ہی مسکرا دیتی۔ پھر وہ وارڈ روب بند کر کے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر سجے سارے قیمتی پرفیومز اٹھا اٹھا کر اپنے کپڑوں پر اسپرے کرنے لگتی۔

"یہ ہوتی ہے نا محبت؟" وہ آئینے میں دکھنے والے اپنے عکس سے سوال کرنے لگی۔

اور آئینے کی دیا مسکرائی۔ "ہاں یہی ہے۔"

"میں اپنے آپ کو صفدر کی پسند میں ڈھال لوں گی۔" وہ بیڈ پر جا بیٹھی۔ اسے لگا جیسے سارے رنگ، جو وقفے وقفے سے مر گئے تھے ایک ہی دم زندہ ہو کر اس کے اطراف میں زندہ ہو کر بکھر گئے۔

اور یہ سب محبت کی معراج تھی۔

محبت ہوتی ہی اتنی خوب صورت شے ہے۔ کسی سے ہو تو جائے بس۔ پھر کیا ہے؟ ہر طرف زندگی اور جیے جانے کا مزا، چاہے حالات کیسے بھی ہوں۔

وہ مسکرائی اور اس کی آنکھ کے نیچے بھنور بنا۔
سائیڈ ٹیبل پر ایک فائل رکھی ہوئی تھی۔ صفدر کے اہم کاغذ تھے۔ وہ فائل اٹھا کر دیکھنے لگی۔ آفیشل ڈاکومنٹس کے سب سے اوپر ایک خالی صفحہ رکھا تھا لیٹر پیڈ سے نکلا ایک خالی صفحہ اس نے مسکراتے ہونٹوں سے پین نکالا اور اس پر لکھنا شروع کردیا۔

مڑتی ہوئی گلیاں چھوڑی ہیں
کھلتی ہوئی کلیاں چھوڑی ہیں
جھولے کی وہ سکھیاں چھوڑی ہیں

ہر طاق میں گڑیاں چھوڑی ہیں
جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے
مت پوچھ کہ کیا کیا چھوڑا ہے

دیا جب دو دن کے لیے اپنے والدین کے ہاں رہنے گئی تو آپا کے داماد نے انکشاف کہ صفدر ماموں نے پوش علاقے میں ایک فلیٹ خریدا ہے۔ وہ آپا کے داماد کے دوست کے کسی جاننے والا کا فلیٹ تھا۔ آپا کے تو آگ ہی لگ گئی۔ صفدر نے چھپا کر کس کے لیے خریدا۔ ساری ماں بیٹیاں خیالوں کے گھوڑے دوڑانے لگیں۔ یہی وجہ سمجھ میں آئی کہ صفدر بیوی کو لے کر علیحدہ ہونا چاہتا ہے۔ آپا ڈائریکٹ صفدر سے نہیں پوچھ سکتی تھیں سو بس اس "پھانس" کو گھر سے نکالنے کا سوچ لیا۔
اور تب ہی زیور کے ڈبے والا واقعہ وقوع پذیر ہوا۔
طے شدہ کھیل۔



اور دو دن میں جو اس کی زندگی بدلی تو واقعی اس کی زندگی بدل گئی۔
اور وہ جو دن بھر سفید لٹھے کے سوٹ میں ملبوس "صفدر" کو سامنے بٹھائے محبت کی ساری داستانیں سناتی رہتی ہے۔
"رات میں صفدر آئیں گے تو میں کاسہ دل لیے ان کے روبرو جاؤں گی اور محبت کے چند سکے جو کاسہ دل میں اچھال دیں گے تو وہ میں کسی درگاہ کے مجاور کی طرح بس ان کی باندی بن جاؤں گی میں کہوں گی صفدر آپ مجھے پیروں کی جوتی سمجھتے ہیں نا۔ تو بس اسی جوتی کی دھول ہی بننا ہے مجھے۔ اپنے پیروں سے لپٹا رہنے دیں۔ آپ مجھے نہیں چاہتے بھلے نہ چاہیں، بس میرے پاس آکر بیٹھ جایا کریں۔"
"اف میرے اللہ میں نے کبھی سوچا تھا کہ میں کسی کو دل کی شدتوں سے اس طرح اچانک چاہنے لگوں گی؟"
اور محبت دروازہ کو کھٹکھٹا کر تو کبھی بھی نہیں آتی۔ یہ تو بد روحوں کی طرح بس گھستی چلی جاتی ہے یونہی کسی دن۔ کسی پہر۔ سو اس کے ساتھ بھی یہی ماجرا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہر ماجرا ہی جدا ہوا تھا۔



"اپنی لاڈلی بیوی کی حرکت دیکھ لی تم نے؟" آپا نے کڑے تیوروں سے گھورتے دبے دبے لہجے میں اس سے پوچھا۔
"کیسی حرکت؟" وہ استعجابیہ انداز میں پوچھنے لگا۔
"زیور کا ڈبا غائب ہے میرا۔ چھوٹی بتا رہی تھی۔ اس نے تمہاری بیگم کو دبے پاؤں میرے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ کان کھول کر سن لو! پولیس میں رپورٹ کروادوں گی اگر تم نے ایکشن نہ لیا تو۔"
"میں پوچھ لیتا ہوں جاکر۔۔۔" اس کے اندر ابال اٹھا دیا تھا آپا نے۔
"ارے پوچھنے پر کون سا بتادے گی وہ جاکر تلاشی لو کمرے میں۔" ساری لڑکیاں آنکھوں ہی آنکھوں میں طنزیہ مسکراہٹ بھر کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگی تھیں۔
وہ دن بھر کا بزنس کی الجھنوں میں پھنسا گھر آیا تو یہاں سکون ناپید تھا۔ اس نے وہی سنا جو آپا نے بتایا اور وہی دیکھا جو بھانجیوں نے دکھایا۔
وہ تن فن کرتا کمرے میں جا پہنچا۔ صفدر کو دیکھ کر مسکرائی۔ وہ بغیر جوابی مسکراہٹ دیے، کمرے کی

چیزوں کو الٹ پلٹ کرنے لگا۔ صفدر کو دیکھ کر جتنے دیے اس کی آنکھوں میں جھلملائے تھے' ایک دم بجھ گئے۔ وہ اس کے تیوروں سے گھبرانے لگی۔ اس نے وارڈ روب سے سارے کپڑے کھینچ کر بیڈ پر پھینک دیے۔ شوز کیبنٹ کھول کر اس کی ساری سینڈل ڈھیر کر ڈالیں۔ اور تب ہی ایک کونے میں سے ایک ڈبا ہاتھ میں لیے اس کے سامنے آن رکا۔

"یہ کیا ہے؟"

"پتا نہیں۔"

اس نے پوری قوت سے اس کے منہ پر ایک تھپڑ جڑ دیا۔ وہ بیڈ پر جا گری۔

محبت کے سارے فلسفے انسانی شکل میں بیڈ کے اطراف آن کھڑے ہوئے۔

"صفدر آئیں گے تو میں کاسہ دل لیے ان کے روبرو جاؤں گی وہ چند سکے۔"

اس کو لگا تھا صفدر نے مٹھی بھر سکے اس کے اوندھے منہ پر اچھالے ہوں۔

وہ سکے نہیں تھے بلکہ زیورات کا ڈبا تھا کھنکتے زیور اس کے اطراف پڑے تھے۔ وہ جرم سے بے خبر ہونقوں کی طرح اٹھ کر اسے حیرانی سے تکنے لگی۔ بکھرے ہوئے زیور اور فلسفہ محبت دونوں تالیاں مار مار کر اس پر ہنسنے لگے تھے۔

"کیا کیا ہے میں نے؟" اس نے لاچاری سے پوچھا۔

"تیرا باپ اٹھا کر لایا ہے ان زیورات کو آپا کے کمرے سے۔"

وہ اس حد تک بدتمیز تھا۔ اسے آج انکشاف ہوا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی اسے' کبھی زیورات کو تک رہی تھی۔

"آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"بکواس بند کر چیخ عورت! کبھی دیکھے بھی ہیں اتنے زیورات۔۔۔ تیری اوقات تھی' تجھے چھوٹے سے ڈربے نما گھر سے اس محل میں اٹھا لائے ہم۔"

اسے لگا جیسے اب سب کچھ ختم ہونے کو ہے تو اسے بھی چپ نہیں رہنا چاہیے۔

"یہ ساری آگ اس عورت کی لگائی ہوئی ہے جو "آپا" نام کا نقاب لگائے بیٹھی ہے آپ کی بدتہذیب بھانجیوں کی۔"

اس کے منہ سے محض یہی سن کر اس کے سارے حواس جواب دے گئے۔ وہ پاگلوں کی طرح آگے بڑھا' اور اسے لاتوں گھونسوں سے پیٹنے لگا۔

"تیری یہ مجال۔ تیرے جیسی گری ہوئی چور عورت میری ماں بہنوں کو گالیاں بکے۔" اس نے اسے قمیص سے پکڑ کر کھینچا تھا اور ایک آواز کے ساتھ قمیص گریبان سے الگ ہو کر شانے پر جھولنے لگی تھی۔

وہ آواز سے رونے لگی تھی۔

"صفدر! میں نے کیا سوچا تھا۔ آپ نے کیا کر دیا۔"

"تو نے سوچا ہوگا کہ اس چوری میں' میں بھی تیرا ساتھ دوں گا۔"

"آپ کا گھر کبھی بھی نہیں بسے گا' جب تک یہ عورتیں آپ کی زندگی سے نہیں نکلیں گی۔"

"وہ کیوں نکلیں گی تو نکلے گی۔۔۔ ابھی اور اسی وقت۔ جا نکل جا میرے گھر سے۔" وہ سیدھا ہوا تو وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"نفرت ہے مجھے تجھ سے۔ تو زبردستی میرے سر پر مسلط کی گئی۔ جا میں تجھے آزاد کرتا ہوں۔"

وہ تیر کی طرح اٹھی اور اس کے لبوں پر ہاتھ رکھنے لگی۔ اس نے پھر دھتکار دیا۔ دھکا دے دیا اسے۔

"نہیں صفدر! پلیز نہیں۔" وہ پیروں میں جا بیٹھی' مگر اس پر مطلق اثر نہ ہوا۔

"روز روز کی چخ چخ سے تنگ آ گیا ہوں میں۔ جا تجھے طلاق دیتا ہوں۔۔۔ طلاق دیتا ہوں۔۔۔ طلاق دیتا ہوں۔"

وہ اسے لاتوں سے روندتا کمرے سے نکل گیا۔

"میں کسی درگاہ کے مجاور کی طرح بس ان کی باندی بن جاؤں گی۔ میں کہوں گی صفدر! آپ مجھے پیروں کی جوتی سمجھتے ہیں نا۔ مجھے اپنے پیروں کی دھول ہی رہنے

دیں۔"

کوئی آواز سے ہنستا تھا۔

اس نے کئی دفعہ لکھا تھا زمین کی گردش رک جاتی ہے۔

اور آج اس نے زمین کی گردش کو رکتے دیکھا تھا۔

طوفان کے بعد آنے والا سکوت ہر جگہ پھیلا تھا۔

"میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا مالک! کیا میرا گناہ اتنا بڑا تھا؟" وہ گھٹنوں میں سر دیے روتی رہی۔ کوئی اس کی داد رسی کو نہیں آیا۔

اور زخموں کو کسی مرہم کی ضرورت رہی کب تھی۔ یہ تو وہ پھوڑے تھے جن سے تمام عمر دکھوں، پچھتاوؤں اور سوالوں کے مواد کو بہنا تھا۔ ایسے پھوڑوں کو کوئی مرہم آرام پہنچا سکتا ہے بھلا؟

☼ ☼ ☼

کئی گھنٹے بیت گئے اور رات بھی بہت گہری ہو گئی تو اسے خیال آیا کہ ان درودیوار سے اب اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ مادی چیزیں بھی نامحرم دکھنے لگیں۔ وہ ہمت کرکے اٹھی، چادر سے اپنے جسم کو ڈھانپ کر اس قدر پھیلاوے میں سیل فون ڈھونڈنے لگی۔ اس مار دھاڑ میں سیل فون پتا نہیں کہاں گم ہو گیا اور اس کی اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ باہر جا کر لینڈ لائن سے اپنے گھر پر کال کرے۔ ساری رات وہ گھڑی کی ٹک ٹک سنتی رہی۔ وقفے وقفے سے سسکیوں سے کمرا گونجنے لگتا تھا۔ ساری رات اس نے یوں ہی گزار دی صبح وہ چادر کو اچھی طرح جسم پر لپیٹ کر ایک الوداعی نگاہ کمرے پر ڈالتی نکل گئی۔ جاتے وقت بس کٹھ پتلیوں سے بھرا بیگ اٹھایا تھا اس نے۔

اس کا دماغ اتنا پک چکا تھا کہ حال سے بے حال ہو گئی۔ ماضی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔

کہیں دور سے دادی ماں کی آواز کانوں میں گونج کی طرح داخل ہوئی۔

"بچیوں کو یہ شوق ابھی سے پڑ گئے تو زندگی بھر یہ مورتیں ان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔"

"تخلیق کا فن بس اللہ کے لیے ہے۔ جان ڈالنی پڑے گی ان مورتوں میں۔"

وہ دونوں ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کر کے دھیرے سے بولی۔ "دادی ماں۔" آوازوں کے تلاطم میں خود اسی کی آوازیں گونجنے لگیں۔

"آج صفدر آئیں گے تو میں انہیں بتاؤں گی میں انہیں کتنا۔"

آوازیں رک گئیں اور اسے پھر ڈھیر سارا رونا آیا۔

کاندھے پر ٹکے کٹھ پتلیوں کے بیگ کا وزن اچانک بڑھ گیا۔ وہ چلتے چلتے گول گھومتی سڑک کے کنارے لگے نیم کے درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ ہر طرف اوس پڑی تھی۔ وہ ہی اوس اس کے اندر گرنے لگی۔ اس دھند لکے میں کہیں دور نظر آتی کھڑکی میں اسے ایک ٹمٹماتا دیا جلتا دکھائی دے رہا تھا آوازیں پھر سے اس کے اردگرد تلاطم پیدا کرنے لگیں۔

کہیں دور جھاگ اڑاتے سمندروں سے پرے کوئی اسے پکارتا ہے۔

"دیا۔ دیا۔ دیا جی آپ کی نیناں کی نے تو رات بھر سونے نہیں دیا۔"

"جاتے سے آپ کو دیکھنا تھا۔ سو دیکھ لیا۔"

"میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میرا پاگل دل کسی اور دیش کی لڑکی کے لیے مچل مچل جائے گا۔"

وہ سسکنے لگی تھی۔ ان آوازوں نے تو شاید عمر بھر اس کا پیچھا چھوڑنا ہی نہیں تھا۔ وہ ابھی تک کھڑکی پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھی۔ ٹمٹماتا دیا بجھ گیا تھا۔ اس کے پیروں کے نیچے نیم کے سبز مائل زرد مردہ پتوں کا ڈھیر تھا۔

ہوا کے ہلکے سے تھپیڑے سے درخت کے پتے ایک تسلسل سے اس پر گر رہے تھے۔ وہ تو آوازوں کی بستی میں تھی۔ بے حس، بے حرکت۔ اسے لگا تھا وہ مرچکی ہے پر وہ زندہ تھی۔ اس نے زندگی بھر کٹھ پتلیوں سے بہت پیار کیا تھا۔

اور اس کی زندگی کو کٹھ پتلیوں کی مار پڑی تھی۔

وہ بچپن میں اللہ سے دعا کرتی تھی کہ اس کی کٹھ پتلیاں ہمیشہ اس کے ساتھ رہیں۔

اس کی دعائیں مستجاب ٹھہری تھیں۔

اس کو ہاتھ سے تراشی ہوئی مورتیں پسند تھیں۔ گڑیاؤں سے عشق تھا اور حقیقی کٹھ پتلی نے اس کی زندگی میں ولن کا کردار ادا کیا تھا۔ وہ جو محبت کے ذائقے سے آشنائی کر بیٹھی تو ہجر کے کڑوے دریا میں پھینک دیا گیا تھا۔

اسے احساس ہوا کہ اس کے کاندھوں پر بہت وزن ہے۔ اس نے بیگ کی زپ کھول کر چند کٹھ پتلیاں سبز مائل زرد نیم کے مردہ پتوں پر پھینک دیں۔

پھر بھی وزن کم نہیں ہوا۔ وہ اٹھ کر چند قدم چلی۔ بیگ میں ہاتھ گھسا کر کچھ اور کٹھ پتلیوں کو سڑک پر پھینک دیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ سارا بیگ خالی کر چکی تھی۔ تارکول کی چمکتی کالی سڑک پر جابجا کٹھ پتلیوں کی قطار تھی۔

اس کے بیگ میں صرف آخری کٹھ پتلی بچی تھی۔

جب وہ پیدل کا سفر طے کر کے اپنے گھر کے مرکزی دروازے پر تھی۔ اس نے بے دردی سے آخری کٹھ پتلی کو کھینچ کر باہر نکالا۔

سفید لٹھے کے سوٹ میں سر پر کھتئی پگ باندھے "صفدر" اس کے ہاتھوں میں موجود تھا۔ وہ اسے آنکھوں سے لگا کر رونے لگی۔ آوازوں کے تلاطم میں یونیورسٹی میں پیش کی جانے والے ڈرامے کے آخر میں گی۔ زنیرا کی آواز میں پڑھی جانے والی نظم اس کے کانوں کے پردے پھاڑنے لگی۔

میں صدف سیپ کا سچا موتی۔\
ان انجان رستوں میں یوں بے مول ہوئی۔\
میر النصف۔ بہتر جو محبت کو ایمان کہا کرتا تھا\
ایمان محبت سے منکر جو ہوا\
تو محبت جرم میرے ایمان کا ٹھہری\
محبوب کی گلی کی خاطر\
جھاگ اڑاتے سمندروں سے پرے\
میں نے ہر خون سے بندھے رشتے کو توڑا\
میں نے چپ چاپ ہر دکھ سہے اور میں بے وفا

ٹھہری۔
اور وہ جو وفاؤں کا سردار بنا پھرتا تھا؟
کیا نکلا۔۔۔؟
ڈوروں سے بندھا کٹھ پتلی مرد۔
اس نے صفدر کو دور ہوا میں اچھال کر گھر میں قدم رکھ دیے۔
وہ بچپن میں دادی سے ضد کر کرکے اپنی ارد گرد کٹھ پتلیوں کا ڈھیر لگا لیتی تھی۔ آج اسے قابل نفرت لگیں تو اپنی زندگی سے نکال پھینکا تھا انہیں۔

☼ ☼ ☼

ایک طوفان تھا جو آکر گزر گیا تھا۔
جس رات صفدر نے اسے طلاق دی' اسی رات لان میں نصب جھولے کی کڑیاں نکل گئی تھیں اور سنہری جھولا کانچ کی کڑیا کے ٹوٹنے پر خود بھی ٹوٹ کر ایک بازو پر لٹکا رہ گیا تھا۔
وہ ہر رات شیشے کے سامنے بیٹھ کر اپنے عکس کو گھورا کرتی اور اپنے عکس سے سوال کرتی۔ "اس نے مجھے کیوں چھوڑا؟"
آئینہ خاموش رہتا اور اس کا عکس اداسی سے اسے تکتا۔ وہ اپنی آنکھوں سے پوچھتی۔
"اس نے ایک بار کہا تھا' تمہاری آنکھیں بہت خوب صورت ہیں اور خوب صورت آنکھوں کو بھی کوئی چھوڑ سکتا ہے۔ اس نے تمہیں کیوں چھوڑا؟"
آنکھیں خاموش رہیں۔ اس نے یہی سوال ہونٹوں سے کیا۔ ہونٹ بھی خاموش رہے' لپ اسٹک اٹھا کر ہونٹوں پر لگائی اور کاجل کی سلائی آنکھوں میں پھیری۔ اس کی آواز بھرا گئی۔
"آئینے! مجھے غور سے دیکھو! کیا میں اس قابل تھی کہ مجھے چھوڑا جاتا؟"
آئینہ ہیبت ناک شکل اختیار کرکے اس پر ہنسنے لگا۔ اس نے لپ اسٹک سے پورا چہرہ رنگ لیا۔
"ہاں ہاں میں اسی قابل تھی کہ وہ مجھے چھوڑ دیتا۔ میں کٹھ پتلیوں سے محبت کرتی تھی نا۔۔۔ اس نے ٹھیک کیا میرے ساتھ۔۔۔ کٹھ پتلیاں تو ایسا ہی کرتی ہیں۔۔۔ آئینے! تم مجھ پر ہنستے ہو نا۔ سب مجھ پر ہنسیں گے۔ میرے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔"
وہ ڈریسنگ ٹیبل پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☼ ☼ ☼

اوائل دسمبر کی زرد سی بھیگی بھیگی شام تھی۔ وہ چھت پر بیٹھی طائروں کے غولوں کو تکتی تھی۔ سب کچھ تو اپنی جگہ پر تھا۔ چاند' سورج' پرندے' نظارے۔ نہیں تھا تو اس کا دل تھا' جو صفدر نے بڑی بے دردی سے توڑا تھا۔ وہ مرے مرے قدموں سے چھت کی دیواروں تک آئی تھی۔ گلی کے کونے پر بچے آگ جلائے گول دائروں کی شکل میں بیٹھے ہاتھ سینکتے تھے۔ سرمئی رنگ کا گہرا گاڑھا دھواں فضا میں اڑتا' پھر تحلیل ہو جاتا تھا۔ وہ دھویں پر نگاہ جمائے کھڑی رہی۔ طائروں کے غول سوچوں' شکووں کی صورت میں چھت کی منڈیروں پر آکر بیٹھ گئے۔
"صفدر! آپ نے تو مجھے دھواں بنا دیا۔ میں بھی اس گہرے سرمئی دھویں کی مانند فضا میں تحلیل ہونے کو ہوں۔"
پھر سوچ کا ایک پرندہ منڈیر پر سے اڑان بھر گیا اور دوسرا سوچ کر پرندہ منڈیر پر آن بیٹھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر نگاہ جمائی اور اس کے لب شکوہ کناں ہوئے۔
"بہت ہنر تھا ان انگلیوں میں۔ بہت کچھ لکھا ان انگلیوں نے۔ بہت ہنر کے نمونے تخلیق کیے اور آپ نے میری انگلیوں کو مار ڈالا۔"
اسے صفدر کا اپنے ہاتھوں کا موڑنا یاد آیا اور یاد تو بہت کچھ آیا۔ سارے ظلم' سارے ستم۔۔۔ اس نے طائروں کو اپنا دکھ سنایا۔
"اے پرندو! تم نے کبھی دونوں ہاتھوں سے بسکٹ کو توڑا ہے۔"
صفدر نے مجھے بسکٹ کی طرح دو حصوں میں تقسیم

کر دیا۔

سوچوں کے چرند پرند نوحہ کنائی کرتے اپنے آشیانوں کی طرف چل دیے۔ اس نے ڈوبتے سورج کو دوست بنا لیا۔

"اے سورج تم نے کبھی خالی عورت کو دیکھا ہے؟ نہیں نا۔ تو مجھے دیکھو۔ اس نے ہر خوشی کو میرے اندر مار ڈالا۔ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ میں تو اس سے محبت کرنے لگی تھی محبت کو ایسے بھی ٹھکرایا جاتا ہے؟؟"

اس کے اندر کی عورت ہچکیاں لے رہی تھی۔ پر اس کی آنکھیں بنجر تھیں۔ ویران تھیں۔ جہاں ماتمی ہوائیں شام غریباں کی طرح نوحے پڑھتی تھیں۔

زرد اداس سورج اسے دیکھتا مغرب میں خودکشی کر بیٹھا۔



ٹھیک چھ ماہ بعد جب اس کے زخم کسی حد تک بھر گئے تھے اور وہ صفدر کو بھلانے کی کوشش میں کسی حد تک کامیاب ہو گئی تو اس کا دل چاہا کہ وہ پھر سے اپنے سنہری جھولے میں بیٹھے اور اسی دن اس کی فرمائش پر بابا نے جھولے کی مرمت کرا دی۔

اس نے لان سے سارے زرد پھولوں کو توڑ کر لمبے لمبے دھاگوں میں ان پھولوں کو موٹی سوئی کے ذریعے پرو لیا پھر ان لڑیوں کو دونوں اطراف سنہری زنجیروں پر لپیٹ دیا۔ "سنہری جھولا" اور بھی حسین دکھنے لگا۔ وہ جھولے میں بیٹھ کر ہلکے ہلکے جھونٹے لیتی تو ماما' بابا نے اسے اطمینان بھری نظروں سے دیکھا تھا۔

جب ہی بیل ہوئی تو بابا نے دروازہ کھولا۔ ارباز کھڑا تھا اپنے والدین کے ساتھ۔ بابا ارباز سے کئی بار ملے تھے' پر اس کے والدین سے آج پہلی بار مل رہے تھے۔ وہ ان لوگوں کو ڈرائنگ روم میں لے گئے۔

ارباز بابا سے معذرت کرتا اس کے جھولے کے سامنے آن رکا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھنے لگی۔

کل ہی تو زنیرہ نے ارباز کے بارے میں اسے فون پر بتایا تھا اور آج وہ یہاں آبھی گیا۔ اسے ارباز سے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ ارباز جھولے کی زنجیر تھام کر کھڑا ہو گیا۔

"مجھے نہیں معلوم دیا! کب اور کیسے مجھے تم سے محبت ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا فائنل سمسٹر کے بعد ممی پاپا کو تمہاری طرف بھیجوں گا۔ پر چند ہی روز میں تمہاری سرپرائزنگ شادی ہو گئی اور میں چپ کا چپ کھڑا رہا۔ میں نے کبھی تمہارے لیے برا نہیں چاہا تھا۔ پھر بھی تمہارے ساتھ اتنا برا ہو گیا۔ پر شاید قدرت کو بھی تمہارا اصل جوڑ میرے ساتھ منظور تھا' جب ہی میں آج تمہارے سامنے کھڑا ہوں تمہارے جواب کا منتظر۔ تمہارے تو بہت سے خواب تھے نا دیا! وعدہ رہا ہر خواب پورا کروں گا میں۔ رئیلی آئی لو یو سو مچ۔ مانا کہ میں لیٹ ہو گیا پر اتنا بھی نہیں۔ مجھ سے شادی کرو گی؟"

وہ ایک ٹک اس بے حد شان دار انسان کو تکے گئی۔ وہ جانتی تھی ارباز کو بے حد بولنے کی عادت ہے۔ اس کے گروپ کا وہ شخص اس کے لیے "محبت" کے جذبات رکھتا تھا اور اسے کبھی اندازہ ہی نہیں ہوا تھا۔ کتنی لاپروا تھی وہ اسے آج احساس ہو رہا تھا۔ ایک لمحے کو چپ ہوا تو وہ پھر شروع ہو گیا تھا۔

"دیا! تم کتنی بے خبر تھیں۔ تمہیں کبھی احساس بھی نہ ہوا میں جو تمہیں ہر بات پر "ٹیلس باس" کہا کرتا تھا جو تمہارے ہر آئیڈیے کو آگے تک لے کر جایا کرتا تھا۔ تم سے کس قدر "چاہ" رکھتا ہوں اور اب عشق کی کئی منازل طے کرتا تمہارے در پر سوالی بن کر کھڑا ہوں۔ مجھے دھتکار دو یا میرا ہاتھ تھام لو۔ تمہاری مرضی ہے۔"

اس کے ہونٹوں پر بے حد جان دار مسکراہٹ تھی۔ اس کے لہجے میں سچائی تھی اور اس کی باتیں کھری تھیں۔ وہ کسی کی لکھی ہوئی لائن نہیں بول رہا تھا۔ اس کی ڈوریں کسی اور کے ہاتھوں میں نہیں تھیں۔ وہ اندر باہر سے ایک جیسا خوب صورت مرد تھا۔

دیا نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا تھا۔

خواہشوں کے سارے جگنو نئی سانس لیتے اس کے ارد گرد اڑنے لگے تھے۔ لان میں اڑتی ساری تتلیاں جھولے کی زنجیروں پر لپٹے پھولوں پر آن بیٹھی تھیں۔ اس کی زندگی کا ہر ماجرا ہی انوکھا تھا۔

اس کے سامنے کھڑے خوب صورت اور کھرے مرد نے اس کی پشت پر آکر اسے ہلکا سا جھولا دیا تھا اور اپنے سچے لبوں کو پھر پھول برسانے کی اجازت عطا فرمائی تھی۔

"پتا ہے دیا۔۔۔ جب کبھی تم بے ساختہ ہنستی تھیں، تمہارے بائیں آنکھ کے نیچے بھنور بنتا تھا۔ اور جس دن پہلی بار میں نے اس بھنور کو دیکھا تھا میں اسی دن اس بھنور میں آگیا تھا۔"

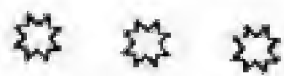
اس کی بات سن کر وہ دل سے مسکرائی تھی اور بائیں آنکھ کے نیچے پڑنے والا بھنور اور بھی گہرا ہوا تھا۔

"مجھے زنیو نے تمہارے ادھورے خوابوں کا بتایا تھا۔ اب سارے خوابوں کو منزل ملنے کا وقت آگیا ہے دیا!"

خواہشوں کے جگنو اس کی گود میں آن بیٹھے۔ اسے نئی منزلوں کے نئے رستوں سے روشناس کرانے کے لیے اور اس کے کان میں کسی نے چپکے سے کہا تھا۔

"اللہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا۔ وہ بس آزماتا ہے۔ اور صبر کرنے والوں کو ایسے ہی پھل ملتا ہے۔"

سنہری جھولے کی کانچ کی گڑیا نے پلٹ کر پیچھے کھڑے ارباز کو دیکھا اور مسکرا دی اور پھر جیسے زندگی ہی مسکرا دی۔



زرینہ خالہ اپنی لاڈلی بیٹی کے ساتھ ٹیرس پر کھڑی باہر کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ نیچے لان میں آٹھ سالہ پوتا لٹو سے کھیل رہا تھا۔ اس نے لٹو پر ڈوری لپیٹ کر ایک جھٹکے سے چکنے فرش پر چھوڑ دیا۔ پھر بڑی سرعت سے اسی ڈوری کی مدد سے چلتے ہوئے لٹو کو ایک ہتھیلی پر رکھ لیا۔ لٹو اسی رفتار سے اس کی ہتھیلی پر گول گول گھومنے لگا۔ غیر شعوری طور پر دونوں کی نظریں اس منظر میں اٹک گئیں۔

زرینہ خالہ کی بیٹی کے لبوں پر ایک کمینی سی مسکراہٹ ابھری، وہ ماں کو مخاطب کر کے بولی۔

"صفدر کی آپا سمجھتی ہیں کہ ان سے بڑا کوئی طرم خان نہیں۔ قسم کھا کر کہتی ہوں اس بدھو کو زندگی بھر اپنے آگے پیچھے لٹو کی طرح نہ گھمایا تو میرا نام بدل دینا آپ! آپا کی چالاکیاں دھری رہ جائیں گی۔ پہلے مجھے ریجیکٹ کیا پھر اس بے چاری کو گھر سے نکلوا دیا۔ لیکن کب تک؟ انہیں اپنے کیے کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ بہت چالاک سمجھتی ہیں خود کو 'اب میری باری ہے۔"

زرینہ خالہ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ ابھری تھی۔



آپا کی سلطنت میں خامشی بکل مارے بیٹھی تھی۔ انہوں نے ایک پھانس نکال پھینکی تھی اور ان کا لاڈلا اکلوتا فرماں بردار بھائی پوری خاردار جھاڑی گھر میں اٹھا لایا تھا۔ ان ماں بیٹیوں میں سے کسی نے بھی اس کی دوسری شادی میں شرکت نہیں کی تھی۔ البتہ خاندان کے ان لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا' جنہیں آپا نے ہمیشہ اپنے ہدف پر رکھا تھا۔

ان کی ناپسندیدہ عورت' دیا کی طلاق کے دسویں دن بڑے کروفر سے چلتی آپا کی سلطنت کے سامنے سے گزرتی صفدر کے کمرے میں پہنچی تھی۔ جہاں کی ہر چیز صفدر کی کمائی سے سجائی گئی تھی۔ وہ جہیز میں کچھ نہیں لائی تھی۔ وہ پیا بھائی سہاگن تھی۔ اس کا شوہر اس کی مٹھی میں تھا۔ اسے زمانے کا ڈر تھا نہ سسرالیوں کا خوف۔

اس کے پہلے قدم نے آپا کے تخت کو ہلایا تھا۔ آپا زلزلوں کے جھٹکوں کی زد میں تھیں صفدر کے کمرے کی ہر چیز اس کی پسند کے مطابق اسی کے ہاتھوں خریدی ہوئی تھی۔ دیا کو طلاق دیتے ہی اس نے علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ وہ زرینہ خالہ کی بیٹی سے شادی کر

رہا ہے۔ آپا کے اٹھائے گئے طوفان نے بھی اس کے ارادے متزلزل نہیں کیے۔ وہ لڑکی اس کی خواہش تھی اور خواہش کی تکمیل کے لیے اس کے پاس سب کچھ تھا۔ روپیہ پیسہ گھر بار' کاروبار تعلیم۔ اس نے اپنی خواہش کے چاند کو صرف دس روز میں آنگن میں اتار لیا تھا۔

آپا کے ہنگامے دم توڑ گئے۔ کبھی کبھی کوئی چنگاری اڑتی تو صفدر اسے اپنے سرد رویے سے دبا دیتا۔ اس نے آخری دن بہت کوشش کی کہ وہ لوگ شادی میں شرکت کریں' پر آپا کا انکار پتھر پر لکیر ثابت ہوا۔

دوسری طرف اس کی ہونے والی بیوی اس کو اس حد تک دیوانہ بنائے ہوئے تھی کہ وہ اس کی ہر بات پر لبیک کہتا اسی کی جانب کھنچتا۔

اور آج شب عروس میں اس کے روبرو بیٹھا قصیدہ گو بنا تھا۔ وہ سفید پھیکی شلجم سی عورت جو اس کے دل کا قرار تھی۔ اس کی زندگی بن گئی' عزیز ترین گئی۔

اس نے پھونک سے ایک دیا بجھایا تھا۔ اسے تاریکی کا خوف نہیں تھا نہ اس تاریکی میں ڈوب جانے کی سمجھ بوجھ۔

وہ تب بھی کٹھ پتلی تھا' جب آپا کے ہاتھوں میں تھا۔ اور اب بھی کٹھ پتلی تھا۔ شوخیاں دکھاتی اس کی دولت پر نگاہ جمائے ہوئے عورت کے ہاتھوں... کٹھ پتلی کٹھ پتلی ہی رہتی ہے ہاتھ بدلنے سے تقدیر بھی بدل سکتی ہے بھلا... اب یہ تو ان ہاتھوں پر ہے کہ وہ کتنی محبت سے اسے رکھتے ہیں اور کتنی مہارت سے اسے دنیا کے سامنے قابل ستائش بناتے ہیں۔

دیا آخر کے دنوں میں اسے دل کی شدتوں سے چاہنے لگی تھی۔ سامنے بیٹھی ہوئی اس عورت کو صفدر سے زیادہ اس کی دولت میں دلچسپی تھی۔

پر وہ دلوں کا حال تھوڑی جانتا تھا۔ وہ کچے کانوں کا مرد۔ صرف نام کا مرد تھا۔ اس کی ڈوریں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھوں میں پہنچی تھیں۔ اسے بس اداکاری کرنی تھی۔ آواز اس بار بھی کسی اور کی تھی۔

اس نے بڑے اعتماد سے صفدر کے ہاتھوں کو تھام کر "آپا نامہ" شروع کیا تھا۔ آج سب الٹ تھا۔

"آپا ناراض ہیں صفدر! مجھے نہیں لگتا' وہ مجھے کبھی یہاں بسنے دیں گی۔"

وہ لٹو کی طرح گول گول گھومنے لگا تھا۔

"میں نے ایک پوش علاقے میں فلیٹ خرید رکھا ہے تمہارے نام پر' اگر یہ تمہیں تنگ کریں گی تو ہم وہاں شفٹ ہو جائیں گے۔"

وہ ایک ادا سے مسکرا کر اس کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا کر بولی تھی۔

"تم نے شادی کرلی تھی اور میں کتنا تڑپی تھی۔ میرے صبر کو منزل مل گئی۔ مجھے تم مل گئے۔"

اس کے اظہار وابستگی سے وہ شاد ہو گیا۔

اس نے مزید آپا کے قصے چھیڑے تو صفدر نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی تھی۔

"چھوڑو نا جان! ہم ان کے پیچھے اپنی رات برباد کیوں کریں۔"

صفدر کی اس بات پر سامنے بیٹھی اس عورت نے وہ داؤ پیچ کھیلے کہ صفدر چاروں شانے چت ہو گیا۔

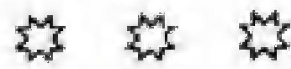
اور اس کا چت ہونا آپا نامی تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے مترادف ثابت ہوا تھا۔



آپا نے نئی دلہن کے ساتھ وہی پرانی روش روا رکھی تھی۔ پر یہ دلہن پیا بھائی تھی' سو ان کے سارے منصوبے وقفے وقفے سے فلاپ ہوتے گئے۔ شادی کے دوسرے دن سے جو دیوار ان کے درمیان کھڑی ہوئی' وہ بلند سے بلند ہوتی چلی گئی اور جس دن شادی کے دوسرے مہینے جھاڑ پر پھول کھلنے کی خبر ملی ان کی راتوں کی نیندیں اڑ گئیں۔ وہ بے وقوف تھیں۔ بھائی سمندر میں اترا تھا اور گیلا بھی نہ ہوتا... فطرت سے بھی کبھی کوئی جیتا ہے بھی۔

آپا اب بھی صفدر کے کان بھرتیں' پر اس پر مطلق اثر نہ ہوتا۔ اس کی بیوی وہ کالا جادو تھی جو اس کے سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔ پھر وہی چپقلش اور ہر وقت کی چخ

پیچ سے تنگ آکر صفدر نے اپنے پوش علاقے میں خریدے گئے فلیٹ میں شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔
صفدر کی بیوی زیورات سے لدی پھندی طنزیہ مسکراہٹ لبوں پہ سجائے یہاں سے وہاں پھدکتی پھرتی اور ان ماں بیٹوں کے سینوں پر سانپ لوٹتے۔
پھر وہ دن بھی آگیا جب صفدر اپنی بیوی کو لے کر فلیٹ میں شفٹ ہو گیا تھا اور آپا فقط در و دیوار کے بیچ بغیر کسی مرد کے سہارے کے تنہا رہ گئیں۔ آہستہ آہستہ وہ اپنی ازدواجی زندگی میں مصروف ہوتا گیا۔ مہینوں پلٹ کر خبر نہ لیتا آپا زیور بیچ بیچ کر اپنا گزارہ کرنے لگیں۔ اور یوں تو ـــ خزانے بھی خالی ہو جاتے ہیں اور ان کا انجام بھی افلاس اور زبوں حالی ہی تھا۔ کاروبار اور بنک بیلنس کا کنٹرول صفدر کے ہاتھ میں ہی تھا۔



اور پھر چند مہینوں میں صفدر نامی کٹھ پتلی نے فلیٹ سے بنگلے میں شفٹنگ کر لی۔ اس کی بیوی کا کھلا ہاتھ اور بے دریغ روپے پیسے کے خرچ نے کاروبار پر برا اثر ڈالا اور چند سالوں میں اس کے کاروبار کی ساکھ بیٹھ گئی' وہ مختلف کمپنیوں کا مقروض ہوتا چلا گیا۔ کٹھ پتلی غلط ہاتھوں میں تھی۔ صحیح ہاتھ کمزور ثابت ہوئے۔ اسے تھام نہ سکے۔ سنبھال نہ سکے۔
صفدر کی ساس' سالوں اور بیوی نے بری طرح اسے اپنے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا اور وہ اب صفر پر آنے کو تھا۔
اور یہ سب اللہ کا انصاف تھا۔ بندہ زمین پر کتنے ہی فساد پھیلائے۔ سزا اور جزا کی چین ایک دوسرے سے یونہی جڑی ہوتی ہے۔



یہ ان کٹھ پتلیوں کی کہانی ہے، جن کی سوچ اور عمل ہمیشہ دوسروں کے ہاتھ میں رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی قوت فیصلہ کمزور ہوتی ہے۔ وہ اپنے سوچنے' سمجھنے' پرکھنے کی صلاحیتوں کو استعمال ہی نہیں کرتے۔ ہمیشہ دوسروں کے اشاروں پر چلتے رہتے ہیں۔

یہ صفدر کی کہانی تھی۔
یہ آپا کی کہانی تھی۔
یہ سزا و جزا کی کہانی تھی۔
یہ ایک ٹوٹی ہوئی اندر سے خالی عورت کی کہانی تھی' پر اس عورت کے سوچ کے آئینوں پر کوئی دھند نہیں تھی۔ کوئی میل نہیں تھا۔
یہ دیا کی کہانی تھی' جو بجھ جانے کے بعد بھی دیا ہی رہی۔
یہ کھری سوچ رکھنے والے مرد ارباز کی کہانی تھی' جس کے مضبوط بازوؤں میں اتنی قوت تھی کہ جو جھاگ اڑاتے سمندروں سے پرے بھی لوگوں کی مدد کو جا سکتا تھا۔ جو رستوں میں بکھرے ذرے ذرے کو یکجا کر کے عمارت بنا سکتا تھا۔ جو دیے کی صورت دوسروں کے رستوں سے تاریکی کو ختم کر سکتا تھا۔



نگار احمد

ان چھوئے سارے لمحے اور نگینہ

نگینہ نے Pride and Prejudice کو بلا مبالغہ چھٹی بار ختم کر کے اپنے پلنگ پر تکیے کی ایک جانب رکھ دیا اور الزبتھ (Elizabeth) کی جرات اور ڈیرسی (Darcy) جیسے مکمل انسان کے لیے، جو شکل و صورت میں یکتا اور معاشی لحاظ سے مستحکم ہے اس کی محبت پر دل ہی دل میں عش عش کرتے دور خلاؤں میں دیکھنے لگی۔ جیسے وہ خود سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہو، بلکہ جیسے وہ خود ہی الزبتھ ہو۔

اسی کہانی کے حصار میں گھری وہ اس تین کمروں پہ مشتمل گھر کے چھوٹے سے صحن میں آگئی اور ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی، مگر اس کی نظریں اب تا حد نظر آنے والے آسمان کی وسعتوں میں گم تھیں۔ جس پر لاتعداد ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ ہر بار یہ ناول اسے ایسے ہی مسحور کر دیتا تھا اور اس کا تخیل اسے ذہین آنکھوں والی پر کشش سی الزبتھ کے دیس لے جاتا۔

اس وقت ساڑھے دس بجے تھے۔ اب تک اس کے والدین اور اس سے چھوٹی سعدیہ، ناہید اور انعام سو چکے تھے۔ لیکن وہ یہ کہانی پڑھ کے گویا اپنی نیند کو ناراض کر چکی تھی۔ ورنہ عموماً کتاب بینی کے دوران ہی اسے میٹھی میٹھی سی نیند آجاتی، بالخصوص جین آسٹن کے اس ناول Pride and prejulice کے بعد تو اسے نیند آنے کا پتا ہی نہ چلتا، لیکن آج الزبتھ کے دیس جانا اس کے لیے ممکن نہیں ہو رہا تھا کیونکہ آج!

آج کا دن زیادہ مختلف سا دن نہیں تھا۔ وہی معمول، جو پچھلے چار سالوں سے گھریلو امور کی انجام دہی میں ہوتا تھا۔ روزانہ کی طرح وہ نو بجے اٹھی تو سعدیہ کالج اور ناہید اور انعام اسکول جا چکے تھے۔ ابو بھی سات بجے اپنے دفتر کے لیے نکل چکے تھے۔ جہاں سے وہ شام میں پارٹ ٹائم جاب پر جاتے اور رات نو بجے واپس آتے۔ ان کی گھر میں دلچسپی بس ضرورت کی حد تک ہی تھی۔ ان کی اولادیں کیا پڑھ رہی ہیں۔ ان کے کیا مشاغل ہیں۔ بیوی مرنے جینے۔ کیسے لین دین کرتی ہے۔ ان کو کوئی غرض نہ تھی۔ ان کے نزدیک مکان کی قسط ادا کر کے مہینے کے خرچ کی ایک مخصوص رقم بیوی کے ہاتھ پر رکھنا ہی ان کی ذمہ داری تھی اور کسی حد تک یہ ٹھیک بھی تھا۔ بھلا رات کو واپس آکر بندہ مزید کیا کر سکتا ہے۔ سو گزارہ بہت اچھا نہیں تو برا بھی نہیں ہو رہا تھا۔

امی ناشتے کے بعد سارا پھیلاوا سمیٹ رہی تھیں، اور ساتھ ساتھ اس کے دیر تک سونے پر ڈانٹ ڈپٹ بھی جاری تھی۔

وہ روز کی اس "صبح بخیر ٹرانسمیشن" پہ مسکراتی منہ ہاتھ دھو کر کچن میں آگئی۔ جلدی جلدی ناشتا کر کے باقی کام پھرتی سے نپٹانے لگی تو امی سلائی مشین پر بیٹھ گئیں۔ سعدیہ اور نگینہ بھی وقت ملنے پر ان کا ہاتھ بٹا دیتی تھیں۔

نازیہ کی، جو اس سے صرف ایک سال ہی بڑی تھی۔ شادی کے بعد اب وہ ہی گھر میں سب سے بڑی تھی۔ سو اپنی ذمہ داری خوش اسلوبی سے نبھا رہی تھی۔ نازیہ کو پڑھائی میں بالکل بھی دلچسپی نہ تھی۔ وہ بمشکل ہی انٹر کر پائی تھی کہ اس کی پھوپھی نے اسے اپنا ذاتی جنرل اسٹور چلانے والے بیٹے اکرم کے لیے پسند کر لیا۔ اور بیاہ کر لے گئیں۔ رشیدہ اور فیروز نے بساط کے مطابق نازیہ کو اچھا خاصا ہی جہیز دے دیا۔ کچھ بچتیں کام آئیں۔ کچھ کمیٹیاں اور کچھ ٹرنک میں نازیہ کے لیے جمع شدہ چیزیں۔ یوں فقط اٹھارہ سال میں نازیہ بیاہ دی گئی اور وہ اکرم کے ساتھ معقول زندگی گزارنے لگی۔ مگر۔

نگینہ کتابوں کی شیدائی تھی۔ اس لیے اس نے بی



اے کیا اور پھر زور زبردستی' رو پیٹ اور بھوک ہڑتال کر کے ایم اے انگلش بھی کر لیا' مگر پرائیویٹ۔ کیونکہ فیروز کو لڑکیوں کا یونی ورسٹی جانا قطعاً" پسند نہیں تھا۔ بلکہ وہ تو ان کا باہر نکلنا بھی ناپسند کرتے تھے۔ ان کے خیال میں میٹرک یا انٹر بہت ہے لڑکیوں کے لیے' لیکن کچھ رشیدہ نے نگینہ کا ساتھ دیا اور کچھ قسمت نے۔ لیکن پھر فیروز نے اسے جاب کی اجازت ہرگز نہ دی اور اب پچھلے چار سالوں سے وہ گھر پر تھی۔

ادھر رشیدہ کے دل کا سکون غارت تھا۔ نگینہ کی شادی کا مسئلہ ان سے سلجھ کر نہیں دے رہا تھا۔ اس لیے آئے دن کسی نہ کسی وچولن کو فون کھڑکا کر نگینہ کے رشتے کی بابت دریافت کرتی رہتیں۔

درمیانے قد اور قدرے فربہی مائل جسم کے ساتھ وہ کوئی حور پری تو ہرگز نہ تھی' مگر معقول شکل و صورت اور سلیقے کی چادر اوڑھے' دیکھنے والوں کا دل ضرور موہ لیتی تھی۔ وچولن اب تک انہیں پنسار اور چھوٹے پیمانے پر مختلف کاروبار کرنے والے کم پڑھے لکھے نوجوانوں کے کئی رشتے دکھا چکی تھی۔ اگر ایک دو جگہ رشیدہ اور فیروز کو تسلی نہ ہوئی تو کتنے ہی رشتے نگینہ نے اپنے "ڈیرسی" کے انتظار میں منع کر دیے۔

سیدھے سادھے ماں' باپ اس نازک معاملے میں زور زبردستی کے قائل نہ تھے اور پڑھی لکھی بیٹی کا فلسفہ ان کے سر پر سے گزر جاتا' لیکن وہ ریت کی مانند مٹھی سے پھسلتے وقت کی برق رفتاری سے بھی خائف تھے۔

یوں یہ معاملہ اب تک التوا کا شکار تھا' مگر اب رشیدہ کو لگتا کہ نگینہ کی طرف داری کر کے اس کو ایم اے کروانا ان کی غلطی تھی۔

قصہ مختصر۔ آج بھی وچولن ایک رشتہ لائی تھی۔ جو نگینہ کے والدین کے لیے تو بہترین تھا۔ متین نے انٹر کر رکھا تھا۔ سرکاری ملازم۔ گھر ذاتی تھا اور آگے پڑھنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا تھا۔ ماں فوت ہو چکی تھی اور شادی شدہ تینوں بہنیں یہ فرض جلد انجام دینا چاہتی تھیں۔ اسے رشیدہ اور فیروز کا واضح مثبت رجحان اور کسی حد تک اپنے آپ پر ان کا دباؤ محسوس ہوا۔

ایسا آج سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ سو بس یہ ہی بات نگینہ کی نیند اڑا دینے کے لیے کافی تھی۔ اسی لیے وہ اب تک جاگ رہی تھی۔

"اب کم از کم لڑکا پڑھا لکھا تو ہو۔" اس نے دل گرفتی سے سوچا۔

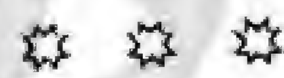
اس کی سوچوں میں تو ڈیرسی کا الزبتھ کے لیے محبت لٹاتا انداز کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ اتنا امیر کبیر' بہت ہی خوب صورت ہیرو جو پرکشش اور ذہین' لیکن غریب الزبتھ کی گہری چمکتی آنکھوں پر مرمٹا تھا۔ نگینہ کے لیے اس کہانی کا وہ مرحلہ بہت ہی پرلطف ہوتا جب الزبتھ اپنے بے وقوف کزن کولن کا رشتہ ٹھکراتی ہے۔ وہ ایک چرچ میں Clergyman ہے اور اپنی تمام تر حماقتوں کے باوجود اوسط طبقے کی الزبتھ جیسی لڑکیوں کو ایک اچھا نہیں تو بہرحال بہتر مستقبل دے سکتا ہے۔ چونکہ الزبتھ ذہنی مطابقت اور محبت کو ہر دوسری خوبی پر ترجیح دیتی ہے۔ اس لیے کولن جیسے احمق کو انکار کرنے

میں سیکنڈ کا وقفہ بھی نہیں لیتی۔ یوں وہ نگینہ کی آئیڈیل بن جاتی ہے۔ الزبتھ مضبوط دل کی حامل ہے اور اپنے لیے ایک بہترین شریک سفر کو کچھ کٹھنائیوں کے بعد چن لیتی ہے۔ جو نہ صرف اسے کولن کے مقابلے میں ایک شان دار مستقبل دے سکتا ہے' بلکہ اس سے محبت اور اس کی عزت بھی کرتا ہے۔

لیکن اسی کی دوست شارلٹ جو کہ بہت عام سی ایک لڑکی ہے' کولن کا ساتھ قبول کرلیتی ہے اور جو الزبتھ کے لیے باعث حیرانی ہے کہ شارلٹ کیونکر اس بغیر دماغ کے انسان کے ساتھ گزارا کرسکے گی۔ جو سب کچھ اپنی سرپرست لیڈی کیتھرین کے کہنے پر کرتا ہے۔ حتی کہ شادی بھی۔ مگر شارلٹ کے جواب کا لب لباب یہ ہے کہ وہ اٹھائیس سال کی ہے۔ اس سے چھوٹے بھی بہن' بھائی ہیں۔ ان کی معاشی حالت بھی حوصلہ افزا نہیں۔ اس لیے ان حالات میں وہ یہ اعلا ترین رشتہ نہیں ٹھکرا سکتی' جو اس کے اچھے مستقبل کی ضمانت ہے۔

"واہ بھئی شارلٹ بی بی! کیا نقطہ نظر ہے آپ کا۔ اس گدھے کے ساتھ اچھی زندگی کا خواب۔"

وہ شارلٹ پہ یوں ہنستی جیسے وہ الزبتھ ہے اور اس کا ڈیرسی اپنا دل لیے اس کے قدموں میں بچھا ہے۔ ان ہی سوچوں میں غلطاں کب اسے نیند آئی' معلوم نہیں۔



صبح اس کی آنکھ اپنے آٹھ سالہ بھانجے اور سات سالہ بھانجی کے چہکنے کی آوازوں سے کھلی۔ بہن کے آنے پر حیرت اور خوشی کے جذبات لیے وہ باہر آگئی' جہاں نازیہ' امی کے ساتھ دھوپ میں مالٹے اڑا رہی تھی' اور ساتھ ساتھ کوئی راز و نیاز بھی جاری تھے' جو نگینہ کی آمد کی وجہ سے رک گئے۔

"تم اتنی صبح صبح۔" بہن سے گلے ملتے ہوئے نگینہ مسکرائی۔

"جناب آپ کی صبح صبح ہے گیارہ بجے تو میں دن کا کھانا بھی پکا چکی ہوتی ہوں۔" نازیہ نے دھمو کا جڑا۔

اس کی آواز میں آسودگی کی کھنک تھی۔ اس کا ہر انداز اس کی طمانیت کا اعلان کررہا تھا۔ یوں نوک جھونک میں' بچوں کو کارٹون میں مصروف کرکے' دونوں نے کھانا تیار کیا اور کھانے کے بعد گپیں لڑانے بیٹھ گئیں۔

رشیدہ نازیہ کو مخصوص اشارہ کرکے بچوں کو ان کے کپڑے دکھانے کے بہانے دونوں کو اکیلا چھوڑ گئیں۔ تاکہ وہ نگینہ سے اطمینان سے بات کرسکے۔

"بنو جی! اب تم بھی کچھ سیا پر دیا کرو' کیونکہ اب آپ کی رخصت ہونے کی باری ہے۔" نازیہ نے اسے چھیڑا۔

"ایسے ہی۔ ابھی تو کوئی ایسا سلسلہ نہیں۔" نگینہ نے زور سے سر نفی میں ہلا کر تردید کرڈالی یا جانے خود کو تسلی دی۔

"اب انجان مت بنو۔ کل رحمت کس کا سندیسہ لائی ہے۔" بڑی بہن نے آنکھیں مٹکائیں تو چھوٹی نے بھی جواباً" اسے آنکھیں دکھائیں اور مکھی بھگانے کے انداز میں ہاتھ ہلا کر بولی۔

"جیسے تم مجھے جانتی نہیں ہو نازیہ!" مگر پھر لہجہ دھیما ہوگیا خود بخود جیسے خواب میں بول رہی ہو۔

"میں نے تمہیں ڈیرسی اور الزبتھ کی کہانی سنائی تھی نا۔ میں اپنے ڈیرسی کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروں گی۔ میں شارلٹ تھوڑا ہی ہوں کہ بس ایک چار دیواری اور مرد کے نام کی چھت پر ریجھ جاؤں۔"

جواباً" نازیہ قدرے سنجیدگی سے گویا ہوئی۔ "دیکھو نگی! میں اس کہانی' اس سے تمہاری وابستگی سے اچھی طرح واقف ہوں۔ مگر میری پیاری بہن! ان کتابوں سے باہر نکل کر حقیقی دنیا کو دیکھو گی تو جان سکو گی کہ ہر الزبتھ کو ڈیرسی نہیں ملتا اور وہ مجبوراً" شارلٹ بن جاتی ہے۔ ہم جیسے سفید پوش گھرانوں میں متین جیسا رشتہ کسی نیکی کا پھل سمجھا جاتا ہے اور تم پتا نہیں کن پریوں کے دیس کی کہانیاں سنا رہی ہو۔"

نازیہ نے حقیقت پسندی سے تجزیہ کیا۔ اس کا مقصد بہن کا دل توڑنا نہیں' بلکہ اسے احمقوں کی جنت

سے نکالنا تھا۔ سو نگینہ کے جھٹکنے کا عمل اسے کڑوے گھونٹ کی طرح پینا تھا۔

"مگر میرے بھی کچھ خواب ہیں۔" نگی بڑبڑائی۔ "میں انگریزی ادب میں ماسٹرز ہوں اور ایک انٹرپاس سے شادی کرلوں؟ پھر ساری زندگی اس کے ماتھے کے بل دیکھ دیکھ کر گزاروں' اپنا آپ کہیں کھو کر زندگی کی دوڑ میں شامل ہو جاؤں۔ تم سے مجھے یہ توقع نہ تھی نازی!"

اس کی آواز بھرا گئی۔ گو کہ نازیہ اس سے سال بھر ہی بڑی تھی' مگر اس کے مزاج میں ٹھہراؤ تھا' سو رسانیت سے بولی۔

"جانتی ہوں۔ اسی لیے اب تک تمہارے انکار پر انکار کرنے کی روش پہ تمہیں کچھ نہیں کہا۔ یہ ہی سوچ کر کہ شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن اگر یوں ہی وقت گزرتا گیا تو پھر ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ رشتے بھی ایک وقت تک آتے ہیں۔ جیسے جیسے لڑکی کی عمر گزرتی ہے۔ لوگوں کے مطالبے بڑھتے جاتے ہیں اور لڑکی کے لیے ہر آنے والا نیا رشتہ اس کے لیے کم اذیت کا باعث نہیں ہوتا۔ میں تمہیں اس وقت سے بچانا چاہتی ہوں نگی!"

"ایسی بھی کون سی عمر گزر گئی ہے میری۔ ابھی تو وقت ہے نازی! اللہ کا واسطہ! مجھے مت دہلاؤ۔"

مگر نازیہ کی باتوں میں وزن محسوس ہوا۔ نگینہ کو چپ اور لوہا گرم دیکھ کر اس نے پھر سلسلہ کلام جوڑا۔

"ماشاء اللہ ستائیس کی ہو چکی ہو تم۔ میں ایک سال بڑی ہوں تم سے اور دس سالہ ازدواجی زندگی گزار چکی ہوں اور دو بچے پال رہی ہوں۔ امی اور ابو بہت پریشان ہیں تمہارے لیے۔ تمہارے بعد دو اور بھی ہیں' جن کو بیاہنا ہے۔ لہٰذا شارلٹ کی طرح سب کے بارے میں سوچو' نا کہ الزبتھ کی طرح بس اپنے ہی نقطہ نظر کو زندگی کا محور بنالو۔ اب اگر وقت نکل گیا تو خدانخواستہ یہ نہ ہو کہ تم شارلٹ کی پوزیشن میں بھی نہ رہو۔"

بہن کی باتیں نگینہ کو وہ راہ دکھا رہی تھی' جس کے بارے میں اس نے سوچا ہی نہ تھا کبھی۔ بس اپنی دنیا میں گم زندگی گزار رہی تھی وہ' سو روہانسی ہو گئی۔

"تو کیا فائدہ میری تعلیم کا جب میں نے ایک انٹر پاس کے ساتھ ہی نباہ کرنا ہے۔"

سوں سوں کرتی نگینہ پہ نازیہ کو بہت پیار آیا۔ اس کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور بالوں کی لٹ کو بہت نرمی سے اس کے کان کے پیچھے اڑسا' پھر اس کا سر سہلانے لگی' جو یقیناً "بج رہا تھا' نازیہ کے حساب سے۔

"تو میری بے وقوف بہن! ابھی تم کون سا پی ایچ ڈی لوگوں میں زندگی بسر کر رہی ہو۔ ابا نے پرانے وقتوں کا میٹرک کیا ہے اور امی بے چاری بمشکل اردو اور کلام پاک پڑھ سکتی ہیں۔ باقی تینوں تو تم سے چھوٹے ہیں اور ابھی پڑھ رہے ہیں۔ یہاں پر بھی تم گھرداری کر رہی ہونا' وہاں بھی کرنا۔"

"مگر میری تعلیم۔" اب کے سوں سوں کرتی نگینہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تو نازیہ چپ ہو گئی اور اس کے سنبھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ جب نگینہ کا دل کچھ ہلکا ہوا تو نازیہ نے دوبارہ کہا۔

"تعلیم کی قدر تو مجھ سے پوچھو' جس نے انٹر بھی مر مر کے کیا۔ لیکن اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ کم از کم بی اے ہی کرلیتی تو آج میں بھی اپنے بچوں کو بہتر طور پر گائیڈ کر سکتی تھی۔ تمہاری تعلیم تمہارے بچوں کے کام آئے گی۔ ان کے ساتھ تم خوب انگریزی میں گٹ پٹ کیا کرنا' کیونکہ ایک پڑھی لکھی ماں ہی نسل سنوارتی ہے۔ وہی تو درس گاہ ہوتی ہے' بچوں کی۔"

نگینہ ـــ سر اٹھا کر اپنی انٹرپاس بہن کو دیکھنے لگی' جو تھی تو کم تعلیم یافتہ' لیکن ذہنی طور پر بہت پختہ اور باشعور تھی۔ وہ نگینہ کے سامنے وہ پرتیں کھول رہی تھی' جو وہ ایم اے پاس ہو کر بھی نہ دیکھ سکی۔

"اب اگر میرا ایکسرے کرلیا ہے اپنی مینڈک جیسی آنکھوں سے تو امی کو تمہاری ہاں پہنچا دوں؟"

نگینہ کی بڑی بڑی آنکھوں پر اسے شرارت سے چھیڑتے ہوئے وہ مخاطب ہوئی تو نگینہ کا سر خود بخود ہی اثبات میں ہل گیا اور نگینہ خوشی خوشی ماں کو خوش خبری دینے چل دی۔

نمرہ احمد

نمل

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلا عہدے پر فائز ہے۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف اس کا بھانجا ہے جو اس سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔

سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں' ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ حنین اور اسامہ' سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر' سعدی کی پھپھو ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی۔ فائرنگ کے نتیجہ میں بیوی مرجاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گردہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ سعدی کو یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے' جس کی بنا پر زمر اپنے بھتیجے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔

جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔

ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے۔ ہاشم اور اس کی بیوی شہرین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کی ایک بیٹی سونیا ہے۔ جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔

فارس غازی' ہاشم کی پھپھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں' جس میں اس کا بھی حصہ ہے' رہائش پذیر تھا۔ سعدی کی کوششوں سے فارس رہا ہو جاتا ہے۔

والد کے کہنے پر زمر سعدی کی سالگرہ پر اس کے لیے پھول اور ہاشم کی بیٹی سونیا کی سالگرہ کارڈ لے کر جاتی ہے۔ سعدی' ہاشم کی بیوی سے ہاشم کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ مانگتا ہے۔ شہرین اپنے دیور نوشیراں سے' جو اپنی بھابھی میں دلچسپی رکھتا



مکمل ناول



ہے بہانے سے پاس ورڈ حاصل کر کے سعدی کو سونیا سالگرہ میں دے دیتی ہے۔

پاس ورڈ ملنے کے بعد سعدی ہاشم کے کمرے میں جا کر اس کے لیپ ٹاپ پہ فلیش ڈرائیو لگا کر ڈیٹا کاپی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

چیف سیکیورٹی آفیسر خاور ہاشم کو اس کے کمرے کی فوٹیج دکھاتا ہے' جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے' ہاشم خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے' لیکن سعدی اس سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمرے میں لیپ ٹاپ سے ڈیٹا کاپی کرنے آیا تھا اور شہرین نے نوشیرواں کو استعمال کر کے پاس ورڈ سعدی کو دیا تھا۔ دوسری جانب بڑے ابا زمر کو یہ بتا دیتے ہیں کہ زمر کو کسی یورپین خاتون نے نہیں بلکہ سعدی نے گردہ دیا تھا۔ یہ سن کر زمر کو بے حد دکھ ہوتا ہے۔

نوشیرواں ایک بار پھر ڈرگز لینے لگتا ہے اس بات پر جواہرات فکر مند ہے۔

بعد میں سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمج ہو جاتی ہیں۔

سعدی' حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے' حنین حیران ہو کر اپنی گیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر پر "آئس ایور آفٹر" لکھا ہوتا ہے۔ وہ علیشا ہے ورجینیا سے۔ حنین کی علیشا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

اب کہانی ماضی میں آگے بڑھ رہی ہے۔ فارس' زمر سے لاء کی کچھ کلاسز لیتا ہے۔ ندرت اس سے شادی کا پوچھتی ہیں۔ وہ لاپروائی سے زمر کا نام لے لیتا ہے۔ ندرت خوش ہو کر ابا سے بات کرتی ہیں۔ ان کی ساس فارس کو اجڈ اور بدتمیز سمجھتی ہیں اور اس کے مقابلے میں نند سے زمر کی بات طے کر دیتی ہیں۔ وارث غازی' ہاشم کے خلاف منی لانڈرنگ کیس پر کام کر رہا ہے۔ اس کے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ اس کا باس فاطمی ہاشم کو خبردار کر دیتا ہے۔ ہاشم' خاور کی ڈیوٹی لگاتا ہے کہ وہ وارث کے پاس موجود تمام شواہد ضائع کرے۔ وارث کے ہاسٹل کے کمرے میں خاور اپنا کام کر رہا ہے۔ جب وارث ریڈ سگنلز ملنے پر اپنے کمرے میں جاتا ہے۔ پھر کوئی راستہ نہ ہونے کی صورت میں بہت مجبور ہو کر ہاشم' خاور کو وارث کو مار دینے کی اجازت دے دیتا ہے۔ دوسری صورت میں وارث' فارس کو وہ سارے شواہد میل کر دیتا۔ وارث کے قتل کا الزام ہاشم' فارس پہ ڈلواتا ہے۔

زرتاشہ کو قتل اور زمر کو زخمی کرنا بھی فارس کو وارث کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی ہاشم اور خاور کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ وہ دونوں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ زرتاشہ مر جاتی ہے۔ زمر زخمی حالت میں فارس کے خلاف بیان دیتی ہے۔ فارس جیل چلا جاتا ہے۔ سعدی زمر کو سمجھاتا ہے کہ فارس ایسا نہیں کر سکتا۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ زمر کہتی ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی اور اپنے بیان پر قائم رہتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ زمر کی ناراضی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وارث کے قتل کے وقت بھی اس کی شادی لیٹ ہو جاتی ہے اور وہ اپنی شادی روک کر فارس کے لیے مقدمہ لڑتی ہے۔ اب وہی شخص اپنے اس قتل کو چھپانے کے لیے اسے مارنا چاہتا ہے۔ وہ بظاہر اتفاقاً "بچ جاتی ہے" مگر اس کے دونوں گردے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور اس حادثے کی صورت اس کی شادی ٹوٹ جاتی ہے۔

حنین کی نیٹ فرینڈ علیشا دراصل اورنگ زیب کی بیٹی ہے جسے وہ اور ہاشم تسلیم نہیں کرتے۔ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے حنین سے دوستی کرتی ہے اور پڑھائی کے لیے کاردار سے پیسے لینے کے لیے پاکستان آتی ہے۔ مگر ہاشم اس سے بہت برے طریقے سے پیش آتا ہے اور کوئی مدد نہیں کرتا۔ زرتاشہ اور زمر کے قتل کے وقت فارس اور حنین وارث کیس کی ایلی بائی کے سلسلے میں علیشا کے پاس ہی ہوتے ہیں مگر علیشا ہاشم کی وجہ سے کھل کر ان کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

آٹھویں قسط

میں غارت گر

تم ملو گے، بہت سے زبردست لوگوں سے۔۔۔
بہانگ 'ناقابل برداشت لوگ'
جو زور و شور سے تمہاری زندگی میں
اپنا حق جماتے ہوئے داخل ہو جاتے ہیں۔
یہ ہے نشانی ایک غارت گر کی۔۔۔
غارت گر شکار کرتے ہیں نرمی، سکون، امن'
خوش خلقی، اور ہر اس مثبت چیز کا'
جو ان کو سونگھنے پہ کمزوری لگے۔
ہر خوش باش' پرسکون شے کو وہ
غلطی سے کمزور سمجھ لیتے ہیں۔
تمہارا کام ان کو بدلنا نہیں۔
تمہارا کام ان کو دکھانا ہے کہ
تمہاری نرمی اور امن پسندی کمزوری نہیں ہے۔
میں ہمیشہ نازک اور کمزور لگتا ہوں'
مگر بات یہ ہے کہ
میں نازک اور کمزور ہوں نہیں۔
میں نرم ہوں، مگر میں تمہیں دکھا سکتا ہوں کہ
نرمی میں بھی ایک زہر چھپا ہوتا ہے۔
میں ریشم کی مانند ہوں۔
لوگ ریشم کو کمزور سمجھتے ہیں'
مگر ایک ریشمی رومال بچا لیتا ہے انسان کو
بندوق کی گولی لگنے سے۔
بہت سے لوگ تمہیں کمزور سمجھ کر
تم سے دوستی کے خواہاں ہوں گے
غارت گروں کو درکار ہوتے ہیں ایسے دوست
جن پہ وہ حاوی ہو سکیں'
تاکہ ان کو اپنا آپ مضبوط اور اہم لگے۔
سچ تو یہ ہے کہ غارت گر میں نہ مضبوطی ہے نہ
ہمت۔
یہ تم ہو جو مضبوط ہو، اور ہمت والے ہو۔
میں نے بہت سے دوست کھوئے'
بوجہ اس کے کہ جب انہوں نے مجھے چیر پھاڑنا
چاہا۔
تو وہ ایسا نہیں کر سکے۔
اب وہ مجھے الزام دیتے ہیں دھوکا دہی کا۔
میں دھوکا نہیں دے رہا۔
میں تو بنا ہوں ریشم کا۔
وہی غلطی سے شرافت اور نرمی کو کمزوری گردان
لیتے ہیں۔
دنیا بھری پڑی ہے غارت گروں سے
سو میں چاہتا ہوں کہ تم بھی میری طرح
بن جاؤ ریشم!"

(جوائے بیل)

اور وہ سعدی جو ڈیڑھ برس سے ریشم بن چکا تھا' اس نے اپنے اچھے وقتوں کے غارت گر دوست کے بڑھے ہاتھ پہ چبھتی ہوئی نظر ڈالی اور فیصلہ کر لیا کہ اسے فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

"اور میں نے آپ سے کیا چرایا ہے بھلا؟"

"وہی جو تمہارے خیال میں پہلے میں نے تم سے چرایا تھا۔"

سعدی کا جبڑا بھینچ گیا' آنکھوں میں سختی در آئی۔

"آپ میرے خیالات کو نہیں جانتے۔ ہم اس بارے میں بعد میں بات کریں گے۔"

کہتے ہوئے وہ مڑنے لگا' پھر ٹھہر گیا۔ دور کار میں بیٹھا فارس اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ سعدی نے واپس دیکھا۔ ہاشم نے مسکراتے ہوئے ہاتھ بدستور بڑھا رکھا تھا۔

"جلد ملتے ہیں۔ آپ کے آفس میں۔" اس نے ہاتھ ملا لیا اور فوراً" سے واپس کھینچ کر پلٹ گیا۔ کار میں بیٹھتے ہی فارس نے سوال کیا۔

"کیا کہہ رہا تھا ہاشم؟"

اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے اس نے سر جھکائے ذرا سے شانے اچکائے۔

"کچھ خاص نہیں۔ آفس کا ایک کام تھا۔ وہی پوچھ رہے تھے۔" کار اسٹارٹ کر کے سر سیدھا کیا۔ فارس تو "ہوں" کہہ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا مگر سائیڈ مرر

میں ہاشم دور مسکراتے ہوئے جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا نظر آ رہا تھا۔ اس نے کار کی رفتار تیز کی تو ہاشم پیچھے رہ گیا۔

(وہی جو تمہارے خیال میں 'میں نے تم سے چرایا تھا۔ اف! اور یہ بات اسے کس نے بتائی ہو گی؟) ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے اسٹیئرنگ پہ موبائل رکھا اور شہرین کا نمبر نکالا۔ کچھ غصے بھرا ٹائپ کرنے لگا' پھر ارادہ ترک کر دیا۔ یہ ٹیکسٹ پہ کرنے والی بات نہیں تھی۔

برے موڈ کے ساتھ اس نے رفتار تیز کر دی۔

کار اب دور جا چکی تھی۔ ہاشم آہستہ سے پلٹ آیا۔

لاؤنج میں مرکزی صوفے پہ جواہرات ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھی' موبائل پہ کچھ دیکھ رہی تھی۔ اتوار کے باعث اسے آفس نہیں جانا تھا' مگر وہ پھر بھی ہمیشہ کی طرح تر و تازہ اور تیار تھی۔ وہ قریب صوفے پہ ڈھیر ہو گیا۔ پیر لمبے کر کے میز پہ رکھ لیے اور انگلی سے ٹھوڑی مسلتا' پرسوچ نظروں سے سامنے دیکھنے لگا۔

جواہرات نے موبائل سے نگاہ اٹھائی۔

"پریشان لگ رہے ہو۔"

"نہیں تو۔" وہ چونکا۔

"کچھ تو ہوا ہے۔" وہ پھر سے موبائل پہ انگلی سے صفحہ اوپر کرنے لگی۔

"نہیں بس۔۔۔ ابھی سعدی سے ملاقات ہوئی۔ وہ فارس سے ملنے آیا تھا۔"

"اور تمہیں یہ بات ڈسٹرب کر رہی ہے کہ سعدی سب جانتا ہے؟"

"کیا نہیں کرنی چاہیے؟" اس کا موڈ بگڑا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ سب ہمارا وہم ہو۔ فارس کے لیے کوشش کرنے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ وہ سب جانتا ہو۔"

مگر ہاشم نے سوچتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"اونہوں۔ وہ جانتا ہے کہ یہ میں نے کیا ہے' مگر چونکہ اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے' اس لیے وہ برملا اظہار نہیں کر پا رہا۔ وہ فارس تک کو کچھ نہیں بتا رہا' اس کو دکھانے کے لیے اس نے مجھ سے ہاتھ بھی ملا لیا۔"

جواہرات نے موبائل پرے ڈال دیا اور چہرہ اٹھا کر بے چینی سے ہاشم کو دیکھا۔

"تو اب کیا ہو گا؟"

"سعدی کو میں سنبھال لوں گا' وہ ابھی بھی وہی معصوم بچہ ہے' مگر سوال یہ ہے کہ جب اس کے ہاتھ ثبوت نہیں لگا تو اسے کیسے علم ہوا؟" الجھ کر کہتے ہوئے اس نے ماں کو دیکھا۔ "میں پچھلے ایک ہفتے سے' جب سے وہ میری پارٹی پہ میرے کمپیوٹر سے ڈیٹا چرا کر گیا ہے' یہی سوچ رہا ہوں۔ میں نے بنا جھول کے پلان کیا تھا سب' ہر شے ٹھیک تھی' چار سال پہلے تک اسے نہیں پتا تھا کچھ۔ پھر دو سال وہ انگلینڈ میں رہا' واپس آیا تب بھی اسے کچھ نہیں پتا تھا۔ کتنا عرصہ ہو گیا ڈیڈ کی ڈیتھ کو؟"

"ایک سال پانچ ماہ۔" جواہرات بے اختیار بولی' کرب سا ہر جگہ پھیل گیا۔

"ہوں۔ کل رات جب میں سعدی کی بہن سے بات کر رہا تھا فنکشن پہ' تو مجھے احساس ہوا کہ ڈیڈ کی ڈیتھ کے بعد سے وہ لوگ ہمارے گھر نہیں آئے۔ سونیا کی پچھلی برتھ ڈے پہ بھی نہیں آئے تھے۔ اگر میں اس دفعہ زمر سے نہ کہتا تو وہ اب بھی نہ آتے۔" جواہرات نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"تمہارے باپ کی ڈیتھ سے چند دن پہلے سعدی نے فارس کا وکیل بدل دیا تھا اور اس نے تمہارے باز پرس کرنے پہ تم سے کافی بدتمیزی بھی کی تھی' یاد ہے؟ ہو سکتا ہے وہ اس رویے پہ شرمندگی کی وجہ سے نہ آیا ہو۔"

"یا پھر۔۔۔" ہاشم ایک دم سیدھا ہوا' وہ بری طرح چونکا تھا۔ "یا پھر اس نے وکیل تب بدلا' جب اسے ساری حقیقت کا علم ہو گیا تھا۔ کیا وہ۔۔۔ وہ ڈیڑھ سال سے جانتا ہے یہ سب؟" اسے بے یقینی سی محسوس ہوئی۔

"اگر وہ اتنے عرصے سے جانتا ہے تو اب تک چپ

کیوں تھا؟"

"وہ چاہتا تھا پہلے فارس باہر آجائے اور پھر وہ میرے پیچھے آئے۔ مگر۔۔۔ اسے کیسے پتا چلا ممی؟" یہاں آکر ہاشم کا سارا دماغ الجھ جاتا۔ وہ چاہ کر بھی اس سوال کا جواب نہیں ڈھونڈ پا رہا تھا۔ کب غلطی ہوئی؟ کدھر غلطی ہوئی اور وہ ریشم بن گیا؟

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" اس نے گہری سانس لے کر شانے اچکائے اور پھر سے موبائل اٹھالیا۔ "کیا میں نے تمہیں نئی خبر دی کہ زمر فارس کے خلاف کچھ کرنے جارہی ہے۔"

سوچ میں الجھا ہاشم چونکا۔ "نئی پٹیشن (مقدمے کی درخواست)؟"

"اونہوں۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔ "اس کا دماغ درست ہے؟"

"وہ اس سے انتقام کے لیے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

"اور یہ سب اس نے آپ کو کیوں بتایا؟"

"کیونکہ میں ہی اس کی مدد کر سکتی ہوں۔" جواہرات نے محظوظ انداز میں شانے اچکائے۔ ہاشم کے تاثرات بگڑے۔

"انتقام کے بہت سے طریقے ہوتے ہیں' اسے شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"شاید اس کے منصوبے کے مطابق ان کے درمیان میرج کانٹریکٹ ہونا ضروری ہو۔ خیر میرے لیے یہ بات تشفی کا باعث ہے۔ اب ہمیں فارس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں' اس کے لیے زمر کافی ہے۔"

مگر ہاشم بے چینی سے آگے کو ہوا۔

"اول تو فارس اس سے شادی نہیں کرے گا اور اگر کرلی تو بھی کیا گارنٹی ہے کہ وہ اس سے انتقام لے گی؟ اگر اسے سب حقیقت معلوم ہو گئی' اور وہ جان گئی کہ فارس بے گناہ ہے تو؟"

"وہ کبھی نہیں جان پائے گی۔ وہ اس سے نفرت کرتی ہے۔"

"اور اگر نفرت مر گئی تو؟۔۔۔ اگر انہیں ایک دوسرے سے محبت ہو گئی' اور وہ مل کر ہمارے خلاف کھڑے ہو گئے تو؟"

جواہرات نے سرد سانس خارج کر کے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"تم بھی جانتے ہو اور میں بھی جانتی ہوں کہ شادیاں محبت سے خالی ہوا کرتی ہیں۔"

ہاشم کی آنکھوں میں چھائی بے چینی' کرب میں بدل گئی۔ تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ اس نے آہستہ سے سرہلایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ جواہرات نے اسی جبری مسکراہٹ کے ساتھ اسے سیڑھیوں کی طرف جاتے دیکھا اور پھر ہلکا سا سر جھٹکا۔ آنکھ کا کونا' انگلی کی نوک سے پونچھا۔ موبائل پرے ڈال دیا اور گردن موڑ کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔

وہاں اتوار کی صبح اب باسی ہو کر دوپہر میں بدل رہی تھی۔ سبزہ اور ملازموں کی چہل پہل' سب یہاں سے دکھائی دیتا تھا' مگر وہ یہ سب نہیں دیکھ رہی تھی۔ اسے کچھ اور یاد آرہا تھا۔

ہاشم نے کہا' سعدی ڈیڑھ سال قبل' سونیا کی سالگرہ سے پہلے' صرف آخری دفعہ ان کے گھر آیا تھا۔ ہاشم نہیں جانتا تھا کہ سعدی نے وہاں آنا کیوں چھوڑا تھا۔ مگر وہ جانتی تھی اور یہ بھی کہ وہ ہاشم کو کبھی نہیں بتائے گی۔

جواہرات نے سر جھٹکا۔

☆ ☆ ☆

وقت کے کتنے دھاروں سے گزرنا ہے ابھی
زندگی ہے تو کئی رنگ سے مرنا ہے ابھی

سعدی کے جانے کے بعد سے اتوار کے ناشتے کے برتن یونہی میز پہ رکھے تھے۔ صداقت نجانے کن کاموں میں مصروف تھا۔ زمر نے ٹی وی دیکھتے ہوئے اسے آواز دی اور پھر چائے کا کپ اٹھالیا۔ دفعتاً محسوس ہوا' بڑے ابا مسلسل اسے دیکھ رہے ہیں مگر وہ ٹی وی کی طرف دیکھتی رہی۔

"کیسی رہی شادی؟"
نگاہیں اسکرین پہ جمائے، زمر نے ہلکے سے شانے اچکائے۔
"یہ تو چند برس بعد پتا چلے گا کہ کیسی رہی شادی!"
"تم ٹھیک ہو؟" وہ اس کی خوابیدہ آنکھوں کو تفکر سے دیکھ رہے تھے۔
"ہمیشہ سے بہتر۔" آخری گھونٹ کپ اونچا کر کے اندر انڈیلا اور پھر کپ ان کو دکھا کر ہلکا سا مسکرائی۔
"ایک بات پوچھوں ابا؟"
"تم کب سے تمہید باندھنے لگیں؟"
"جب سے یہ معلوم ہوا کہ مجھے بہت کچھ معلوم نہیں تھا۔" مسکراتی آنکھوں میں کرچیاں سی چبھیں مگر وہ ضبط کر کے ان کی طرف پوری گھوم گئی۔
"ابا! کبھی فارس نے میرا رشتہ مانگا تھا؟"
بڑے ابا کے لیے سوال غیر متوقع تھا۔ وہ چونک گئے، کچھ کہنے کی کوشش کی مگر زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ پراسیکیوٹر بھوری آنکھیں سکیڑ کر غور سے ان کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔
"آپ نے انکار کیوں کیا؟"
"بس یہی لگا کہ تمہارا اس کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔"
"کس کو لگا؟ آپ کو یا امی کو؟"
"ہم دونوں کو۔" احتیاط سے الفاظ کا چناؤ کیا۔
"مجھے کیوں نہیں بتایا؟" وہ ان کی آنکھوں میں دیکھتی سوال پہ سوال کر رہی تھی۔
"جب رشتہ نہیں کرنا تھا تو بتانے کا فائدہ؟"
"کیا یہ سچ ہے کہ آپ نے فارس کو گھر بلا کر انکار کیا تھا اور بے عزتی بھی کی تھی؟"
"ہرگز نہیں فرحانہ نے ندرت کو فون پہ انکار کیا تھا، گھر بلانے والی بات کس نے کہی؟" ان کو شدید حیرت اور صدمے کا جھٹکا لگا۔ زمر کے لبوں پہ زخمی مسکراہٹ آئی۔
"ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ آپ دونوں نے انکار کیا تھا؟"
بڑے ابا لمحے بھر کو چپ رہ گئے۔ وہ اب ٹھوڑی ہتھیلی پہ رکھے، دلچسپی سے ان کو دیکھ رہی تھی۔ کتنی دفعہ کی گئی خواہش انہوں نے دل میں دہرائی۔ کاش اس لڑکی کو وکیل نہ بنایا ہوتا۔
"اب دیر ہو گئی ہے، انکار مت کیجئے گا۔ آپ کی مرضی کے برخلاف انکار کیا امی نے، آپ صرف ان کے لیے میرے دل میں کوئی برا خیال نہ لانے کو کہہ رہے تھے۔ کیوں کہ آپ مجھ سے ڈسکس کیے بنا کبھی انکار نہ کرتے۔"
"تمہاری امی نے..."
"اچھا فیصلہ کیا میرے لیے، مجھے پتا ہے۔ مجھے کوئی شکایت نہیں۔ میں تو بس یہ جاننا چاہ رہی تھی کہ کیا انہوں نے میرا نام لے کر انکار کیا؟" وہ ریموٹ اٹھا کر اب ٹی وی کی طرف رخ کر کے بیٹھ گئی۔ بڑے ابا ہنوز تفکر سے اسے دیکھ رہے تھے۔
"تمہیں کس نے بتایا؟"
"حنین نے۔ اس کے خیال میں انکار میں نے کیا تھا۔"
"تم نے تصحیح نہیں کی؟"
"جب خیالات ذہن میں اتنے راسخ ہو چکے ہیں تو محض الفاظ سے ان کی نفی کر دینے کا کیا فائدہ؟" وہ چینل بدلتے ہوئے گھنگھریالی لٹ انگلی پہ لپیٹ رہی تھی۔ "میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ فارس شاید اتنا بھی برا نہیں جتنا میں سمجھتی تھی۔"
بڑے ابا نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کیا کوئی بات ہوئی ہے؟"
"کوئی خاص نہیں۔ میں فارس کی کیس فائلز پڑھ رہی تھی، یہ دیکھنے کے لیے کہ جج نے کیوں اس کو بری کیا؟ مگر جج حق بجانب تھا، کوئی بھی چیز اس کو مجرم ثابت نہیں کرتی۔" سرسری سے انداز میں کہتی وہ رک کر کوئی ہیڈ لائن پڑھنے لگی۔
"اور تم پھر بھی اس کو مجرم گردانتی ہو؟"
"ہو سکتا ہے میں غلط ہوں۔ یہ سب ایک سیٹ اپ ہو۔ شاید۔" اس نے ہلکے سے شانے اچکائے۔
بڑے ابا حیرت سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

"تمہارے خیالات اتنی جلدی نہیں بدل سکتے۔ کوئی اور بات ہے، ہے نا؟"

"میں نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کرلیا ہے ابا۔ وہ مجرم ہے یا نہیں، مجھے فرق نہیں پڑتا اب۔ میں مزید اپنے دکھوں اور محرومیوں کا قصور وار اسے نہیں ٹھہراؤں گی۔ میں سعدی سے دوبارہ ملنے لگی ہوں، خاندان کی تقریبات میں جانے لگی ہوں، آپ یہی چاہتے تھے اور اگلا قدم۔۔۔" اس نے گردن پھیر کر ان کو سنجیدگی سے دیکھا۔ "آپ کہیں گے کہ میں شادی کرلوں۔"

"میں چار سال سے یہ کہہ رہا ہوں۔"

وہ چند لمحے ان کو تکتی رہی، پھر سر اثبات میں ہلا دیا۔ نرمی سے، امن سے۔

"اوکے۔ میں کرلوں گی۔ جب آپ کہیں، جس سے آپ کہیں، لیکن اس دفعہ مجھ سے پوچھے بغیر آپ کسی کو انکار یا اقرار نہیں کریں گے۔" اور یہ کہہ کر وہ پرسکون سی اٹھ آئی۔ بڑے ابا شل سے بیٹھے رہ گئے۔ کتنی دیر تو ان کا ضعیف دماغ الجھتا رہا، پھر حیرت کی دھند چھٹی۔ امید کی کرن چھلکی۔

زمر نے بہت لمبے عرصے بعد سہی، ان کی بات مان لی تھی۔ سعدی لوگوں سے "صلح" اس کے لیے خوش آئند ثابت ہوئی تھی۔

وہ خوش گوار سی حیرت میں گھرے ہوئے تھے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا اپنی خوشی کس سے شیئر کریں۔ پھر جلدی سے فون اٹھایا۔ انہیں ندرت کو بتانا تھا۔

لفظوں کو اس نے جھوٹ سکھایا کچھ اس طرح
ساری علامتوں سے معنی بھی لے گیا

اتوار کی دوپہر قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی۔ سنہری دھوپ نے ندرت کے ریسٹورنٹ کے شیشے کی دیواروں کو چمکا رکھا تھا۔ ندرت کچن میں، آستین چڑھائے، مصروف سی کھڑی، لڑکوں کو ہدایات دے رہی تھیں۔ ساتھ ہی چولہوں پہ پکتے پکوانوں کو دیکھ لیتیں۔ ان کاموں کے دوران انہوں نے دو فون اٹینڈ کیے تھے۔ ایک سعدی کا کہ وہ فارس کے ساتھ گھر پہنچ چکا ہے، جس پہ ندرت نے کھانا بھجوادیا، خود وہ کسٹمرز کی وجہ سے جانے سے قاصر تھیں۔ اور دوسرا بڑے ابا کا۔ وہی پرانی بات۔ زمر کی شادی۔ البتہ اب کے ایک شے کا اضافہ ہوا تھا۔ زمر مان گئی تھی اور اب وہ چاہتے تھے کہ ندرت اس سلسلے میں ان کی مدد کریں۔ ندرت تب سے یہی سوچ رہی تھیں۔ رشتہ داروں میں کون سی جگہ بات چلائی جاسکتی ہے۔

تب ہی کاؤنٹر والا جنید اندر آیا۔

"آنٹی!" (وہ سب ندرت کو آنٹی کہتے تھے) "کوئی مسز کاردار آئی ہیں، آپ کا پوچھ رہی ہیں۔"

"مسز کاردار۔ لوہو۔" وہ جلدی جلدی ہاتھ دھوکر، کیپ اتارتیں، دوپٹا درست کرتیں باہر آئیں تو شیشے کی دیوار کے ساتھ ایک کرسی پہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے سیدھے بھورے بالوں والی جواہرات بیٹھی تھی۔ وہ تیزی سے اس طرف آئیں۔

"سوری، میں بس کچن میں لگی تھی، آپ کو انتظار کرنا پڑا۔" وہ اس سے مل کر خواہ مخواہ شرمندہ ہو رہی تھیں۔ جواہرات اسی تمکنت سے بیٹھی مسکراتی رہی۔ نیوی بلیو لمبی قمیص اور سفید پینٹ پہنے، وہ بغیر میک اپ کے بھی کافی تروتازہ اور جوان لگتی تھی۔

"کیا آپ گھر گئی تھیں؟ مجھے بتایا ہوتا، میں ادھر ہی آجاتی۔" ندرت سامنے بیٹھتے ہوئے مزید فکر مند ہوئیں۔ مسز کاردار کی اب وہ کیا خاطر کریں، پہلی دفعہ جو آئی تھی۔

"مجھے کچھ بات کرنی تھی، اس کے لیے یہی جگہ درست تھی۔" کہہ کر وہ پہلے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ سعدی کی جاب، ریسٹورنٹ کا نفع نقصان، مالی مسائل تب ہی جنید جوسز لے آیا۔ جواہرات نے اسٹرالیوں سے چھو کر گھونٹ بھرا، پھر سیدھی ہو کر مسکراتے ہوئے ندرت کو دیکھا۔

"فارس ہم سب کی کوششوں سے باہر آچکا ہے، آپ یقیناً" "بہت خوش ہوں گی۔"

بات میں صداقت تھی یا نہیں، انداز ایسا تھا کہ ندرت نے احسان کے بوجھ تلے سر تسلیم خم کیا۔

"آپ کے ساتھ کا شکریہ!"

"اب آپ کو اسے نارمل زندگی کی طرف لانا ہوگا۔ دوبارہ شادی' نئی فیملی وغیرہ۔"

"ابھی تو۔۔۔" ہچکچائیں۔ "ابھی دو ہفتے تو ہوئے ہیں اسے رہا ہوئے۔"

"ہاں مگر زرتاشہ کی ڈیتھ کو تو چار سال ہو چکے ہیں۔ فارس مضبوط اعصاب کا مالک ہے' اب تک اس صدمے سے نکل چکا ہوگا۔"

"یہ تو ہے۔"

"آپ کو شاید اب سعدی کی شادی کی فکر ہوگی' اوہ! اور ایسا کرتے ہوئے آپ اپنے بھائی کو بھول گئیں۔" مسکرا کر اسٹرا گلاس میں ہلاتے ہوئے وہ نرمی سے ٹوک گئی۔ تو ندرت کو ڈھیروں شرمندگی نے آن گھیرا۔

"نہیں نہیں' فارس کی شادی میرے ذہن میں تھی' میں بس چاہتی تھی کہ وہ ذرا سیٹل ہو جائے اور پھر۔۔۔ وہ مان بھی جائے۔"

"وہ تو مان جائے گا' کون اپنی زندگی کی نئی شروعات نہیں کرنا چاہتا؟ اوہ آئی سی۔ آپ کو یقیناً" خاندان والوں کی پریشانی ہوگی۔" سر اثبات میں ہلاتے اس نے ایک اور گھونٹ بھرا۔ ندرت کی آنکھیں اچنبھے سے سکڑیں۔

"خاندان والے۔۔۔؟"

"وہ تو فارس کو قاتل سمجھتے ہیں نا۔ وائف کلر' چچ چچ مگر لوگوں کا کیا ہے' وہ تو زمر کی وجہ سے ایسا سمجھتے ہیں۔ زمر کی اہمیت ہے خاندان میں' اس نے کہا کہ ایسا ہے تو ایسا ہے۔ مگر آپ فکر نہ کریں' کسی زمر جیسی لڑکی سے ہی فارس کی شادی کروادیں' سارا مسئلہ حل۔" نزاکت سے شانے اچکا کر وہ اسٹرا گلاس میں گول گول گھما رہی تھی۔ مسکراتی آنکھیں ندرت کے الجھے الجھے چہرے پہ جمی تھیں۔

"زمر جیسی لڑکی؟"

"سامنے کی بات ہے ندرت! لوگوں نے زمر کی بات' زمر کی کریڈیبلٹی کی وجہ سے مانی۔ آپ کوئی اتنی ہی آن بان اور حیثیت والی لڑکی ڈھونڈیں' لوگوں کو فارس کی بے گناہی کا یقین آجائے گا۔ وہ کہیں گے کہ اگر فارس برا تھا تو یہ رشتہ اس کو کیوں ملتا؟ ایسا نہ کیا تو کل رات فنکشن کی طرح آپ کئی سال لوگوں کو صرف جواب ہی دیتی رہیں گی۔"

ندرت کے چہرے پہ اداسی بکھری۔ کل بھی کتنے لوگوں نے سوال کیا تھا۔ فارس کیا کبھی دوبارہ خاندان میں سر اٹھا کر جی سکے گا؟ ٹھوڑی جھکا کر وہ دل گرفتی سے بولیں۔

"پتا نہیں لوگوں کو کب یقین آئے گا کہ فارس بے گناہ تھا۔"

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں' اس کی شادی اور اس کی عزت' دونوں کا سوچیں۔" نرمی سے انگوٹھیوں والا ہاتھ ندرت کے سوکھے' کملائے ہوئے ہاتھ پہ رکھا۔ ندرت نے آنکھیں اٹھا کر تشکر سے اس کو دیکھا۔

"میں بالکل ایسا ہی کروں گی۔ موقع دیکھ کر فارس سے بات کرتی ہوں۔"

"اب آپ کو ہی کچھ کر کے اس کو خاندان والوں کی نظر میں دوبارہ سرخرو کرنا ہے' کیوں کہ اب زمر تو ایک ایک سے نہیں کہے گی نا کہ اس کو فارس کی بے گناہی کا یقین آگیا ہے۔" سرسری سا کہتے ہوئے وہ موبائل نکال کر مسڈ کالز چیک کرنے لگی۔ ندرت نے بے حد چونک کر اسے دیکھا۔

"زمر نے۔۔۔ ایسا کب کہا؟"

"ایسا کیا مطلب؟" جواہرات نے الٹا حیرت سے ان کو دیکھا۔ "جج نے اس کو بری کر دیا' زمر قانون سے واقف ہے' وہ بھی کنوینس ہوگئی ہے کہ فارس بے گناہ ہے۔ میرے پوچھنے پہ اس نے خود اعتراف کیا تھا۔ اب فارس پہ شک کرنے کی وجہ کیا رہ جاتی ہے۔"

ندرت نے آدھی بات سمجھتے ہوئے باقی آدھی پہ الجھتے سر ہلا دیا۔ ان کا خیال تھا زمر ابھی تک اپنے بیان پہ قائم ہے مگر شاید وہ بدل رہی تھی۔ جواہرات نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی اور مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"ارے' آپ بیٹھیں نا' جنید اسنیکس لا ہی رہا

تھا۔" وہ جلدی سے مڑ کر جنید کو پکارنے لگیں، مگر جواہرات نے انہیں روک دیا۔

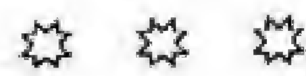
"میں ڈائٹ پہ ہوں اور ریسٹورنٹس کے کھانے میں ویسے بھی نہیں کھاتی۔ تکلف نہ کریں۔"

ندرت کا جوش ماند پڑ گیا۔ خاموشی سے سر ہلا دیا۔

"اس بات کو میرے اور آپ کے درمیان رہنا چاہیے۔ اگر فارس کو علم ہوا تو وہ میری ضد میں مانتے مانتے بھی انکار نہ کر دے۔"

"جی، بالکل!" ندرت سمجھ گئی تھیں اور اب وہ اسے کار تک چھوڑنے باہر جا رہی تھیں۔ ذہن میں بہت سے سوالیہ نشان ابھر ابھر کر آ رہے تھے۔

زمر جیسی لڑکی... زمر جیسی لڑکی؟



پتے کی بات بھی منہ سے نکل ہی جاتی ہے
کبھی کبھی کوئی جھوٹی خبر سناتے ہوئے

دوپہر اب سہ پہر میں بدل رہی تھی۔ چھوٹے باغیچے والے گھر میں کھانا سیر ہو کر کھا چکنے کے بعد غنودہ فضا چھائی تھی۔ حنین لاؤنج میں ڈائجسٹ لے کر صوفے پہ پیر اوپر کر کے بیٹھ گئی تھی اور سیم گول میز سے برتن اٹھاتے ہوئے خفگی سے کہہ رہا تھا۔

"کبھی کوئی کام بھی کر لیا کرو کٹو۔" مگر وہاں سن کون رہا تھا؟ فارس ہاتھ دھو کر ادھر آیا تو حنہ ہنوز رسالہ پڑھنے میں مگن تھی۔

"دروازہ لاک کر لو، میں جا رہا ہوں۔ امی کو بتا دینا، پھر آؤں گا۔"

حنہ نے رسالہ رکھتے ہوئے اسے دیکھا۔ پورے آستین کی شرٹ اور جینز میں ملبوس فارس آنکھوں میں کافی اکتاہٹ لیے، بات کرنے کے ساتھ کال بھی ملا رہا تھا۔

"بھائی کہاں ہے ماموں؟"

"اپنے کمرے میں۔" وہ راہداری میں آگے بڑھتے ہوئے موبائل کان سے لگا رہا تھا جس وقت وہ باہر نکلا اور حنین دروازہ بند کرنے گئی فارس کے الفاظ سماعت سے ٹکرائے۔

"یار اسٹیفنی! کدھر ہو؟ اچھا سنو، ایک بندے کو چیک کر کے..." دروازہ بند ہوا تو آواز کا راستہ رک گیا۔ وہ لاک کر کے واپس آئی اور بھائی کے کمرے کے پاس رکی۔ ذرا ہچکچا کر بند دروازے کو دیکھا پھر دستک دی۔

وہ جو کمپیوٹر چیئر پہ بیٹھا موبائل پہ نمبر ملا رہا تھا، چونک کر سر اٹھایا اور پھر موبائل رکھتے ہوئے مسکرایا۔

"آؤ حنہ! میں تمہارے پاس ہی آنے لگا تھا۔"

"مجھے آپ کو کچھ بتانا تھا بھائی!" انگلیاں مروڑتی حنین نے خشک ہوتے گلے کے ساتھ الفاظ جمع کرنے چاہے۔ کیسا لگے گا کہنا، میں چیٹنگ کرتے ہوئے پکڑی گئی تھی اور پھر میں نے ہاشم بھائی کو بلا لیا۔ دونوں فقروں میں سے کس فقرے پہ اس کا اعتبار ٹوٹے گا؟

ظاہر ہے پہلے پہ۔ ہاشم کو کسی اور چیز کے لیے بلایا ہوتا تو خیر تھی مگر چیٹنگ... وہ کیسے بتائے؟

"ہاں بولو۔" وہ متوجہ ہو کر سن رہا تھا۔ حنین نے لب کھولے، پھر ایک دم خیال آیا۔

"آپ میرے پاس کیوں آنے لگے تھے؟"

"وہ... مجھے ایک کام تھا۔" کہتے ہوئے اس نے لیپ ٹاپ کے ساتھ رکھی فلیش ڈرائیو اٹھائی، لبوں پہ زبان پھیری اور ہمت مجتمع کرتے ہوئے چہرہ اٹھایا، پھیکا سا مسکرایا۔

"یہ کچھ ڈاکومنٹس میں Decrypt کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر..." احتیاط سے تول تول کر الفاظ ادا کیے۔ "یہ میری قابلیت سے اوپر کی چیز تھی۔ میں اس کو ٹھیک سے آپریٹ نہیں کر پایا اور فائل کرپٹ ہو گئی ہے۔ کیا تم کسی طرح اسے ری کور کرنے میں میری مدد کر سکتی ہو؟"

حنین بنا پلک جھپکے چند ثانیے فلیش کو دیکھتی رہی، پھر نظریں اٹھائیں۔ آنکھوں میں صدمہ اور خفگی در آئی تھی۔

"حنہ، پلیز، صرف تھوڑی سی ہیلپ کر دو۔"

حنین کی گردن نفی میں ہلی، وہ دو قدم پیچھے ہٹی۔ شکوہ

کناں آنکھیں بدستور سعدی پہ جمی تھیں۔
"کسی کے ڈاکومنٹس کو آپ کھولنے کی کوشش کررہے ہیں اس کا تعلق آپ کے آفس سے ہے یا نہیں مجھے نہیں پتا مگر یہ غلط ہے۔ غیر قانونی ہے۔ اور میں ایسے کام نہیں کرتی۔" سعدی نے گہری سانس خارج کرکے آنکھیں بند کیں۔ پھر کھولیں تو وہ چوکھٹ تک پیچھے ہٹ چکی تھی۔
"ہمارا مسیحا صرف ایک شخص ہوتا ہے اور وہ ہم خود ہوتے ہیں۔ تم کبھی بھی اس فیز سے نہیں نکلو گی۔ اگر تم اپنی خود مدد نہیں کرو گی۔"
"میں کسی فیز میں نہیں ہوں' میں ٹھیک ہوں' پہلے جیسی۔"
سعدی نے نفی میں سرہلایا۔ فلیش رکھی۔ اٹھ کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ وہ ابھی تک ابرو بھینچے اسے دیکھ رہی تھی۔
"تم بدل گئی ہو۔ ایک وقت تھا تم ہمارے خاندان کا سب سے پُراعتماد اور بولڈ بچہ تھیں۔ اب تو تم نے خود کو بالکل عام لڑکیوں جیسا بنالیا ہے۔"
حنین کے چہرے پہ تاریک سایہ لہرایا' مگر وہ گردن اکڑا کر بولی۔
"میں نہیں بدلی۔ اور میں اس سب میں آپ کی مدد نہیں کروں گی۔ یہ غیر قانونی ہے۔"
"ہاں' سارے قانون دان میرے ہی خاندان میں پیدا ہونے تھے۔" وہ سوچ کر رہ گیا' کیوں کہ حنہ اب مڑ کر جارہی تھی۔ اس کے کان سرخ تھے اور آنکھوں میں شدید بے بسی بھرا غصہ تھا۔ بھائی جانتا تھا وہ اب کمپیوٹر استعمال نہیں کرتی' اس نے ڈیڑھ سال پہلے لاؤنج کی کمپیوٹر چیئر بھائی کے کمرے میں شفٹ کردی تھی۔ کمپیوٹر اچھے نہیں ہوتے' اور اس کے لیے تو بالکل بھی نہیں' سو وہ کس طرح ایسی بات کہہ سکتا تھا؟
"پتا ہے آج مجھے زمر نے کیا کہا؟" وہ جاتے جاتے رکی۔
"یہ کہ انہیں ماموں کی بے گناہی کا یقین آگیا ہے۔ وہ اپنے تمام الزامات واپس لیتی ہیں۔" وہ کہتے ہوئے خود بھی الجھا تھا۔ کچھ کھٹک رہا تھا۔ حنین جھٹکے سے واپس پلٹی۔
"یہ پھپھو نے کہا؟"
سعدی نے اثبات میں سرہلا دیا۔ حنین کے لب بھنچ گئے۔ آنکھوں میں ناگواری در آئی۔
"تو آپ نے آگے سے کیا کہا؟"
"میں کیا کہتا؟"
"کم از کم اتنا تو پوچھ سکتے تھے کہ وہ جھوٹ کیوں بول رہی ہیں؟"
"جھوٹ؟" سعدی کا دھچکا لگا۔
"وہ جھوٹ بول رہی ہیں' وہ اتنی جلدی اور اتنے آرام سے اپنا ذہن نہیں بدلتیں' میں ان کو جانتی ہوں۔"
"زمر جھوٹ نہیں بولتیں۔"
"اوکے مگر وہ وکیل ہیں' انہوں نے الفاظ کا محتاط چناؤ کیا ہوگا یقینا" وہ اداکاری کررہی ہیں۔"
"تم اتنی جلدی ان کے بارے میں اتنی منفی کیوں ہوجاتی ہو حنہ کیا پتا ان کو واقعی۔" اسے دکھ ہوا تھا۔
"میں ان کو جانتی ہوں۔ وہ بغیر کسی وجہ کے اتنی بڑی بات نہیں کہہ سکتیں۔ پتا نہیں وہ کیا سوچ رہی ہیں۔"
وہ ناگواری اور غصے سے کہتی باہر نکل گئی۔ سعدی نے افسوس سے سر جھٹکا۔ وہ دونوں اس کو جتنی پیاری تھیں' اتنی ہی وہ ایک دوسرے سے دور تھیں۔ وہ بے دلی سے واپس کرسی پہ ڈھے سا گیا۔ دو انگلیوں میں فلیش اٹھا کر دیکھی۔ آج آٹھواں دن تھا ناکامی کا۔ اب وہ کیا کرے؟ کیسے ثبوت لے کر فارس اور زمر کے پاس جائے؟ اس کے پاس انتقام اور انصاف کا ایک منصوبہ تھا' مگر اس کو فارس اور زمر کی مدد چاہیے تھی۔ اکیلی چیونٹی کچھ نہیں کرسکتی تھی۔
باہر حنین بڑبڑاتی ہوئی واپس صوفے پہ دھپ سے آبیٹھی۔
"ایسے بیٹھتی ہو' لگتا ہے زلزلہ آرہا ہے۔" قریب بیٹھے سیم نے رسالے سے سر نکال کر ناگواری سے

تبصرہ کیا، مگر اس نے بغیر (ہونہہ) سر جھٹکا۔ پھر ذہن کی رو بھٹک گئی۔ غصہ اداسی میں بدل گیا۔

"سیم! ایک بات بتاؤ۔" اس نے کھوئے کھوئے لہجے سے پکارا۔

"کیا میں واقعی بدل گئی ہوں؟"

"کب سے؟" وہ حیران ہوا۔ (ڈیڑھ سال پہلے سے۔) اس نے سوچا، مگر سیم کو کیا بتائے؟

"جب سے میں نے بی اے میں ایڈمیشن لیا ہے۔"

"آ۔" وہ سوچنے لگا۔ "نہیں تو۔ اب بھی تم اتنا ہی کھاتی ہو، ویسے ہی مذاق کرتی ہو، میرے ساتھ اسی طرح لڑتی ہو اور جب میرے دوست مجھے کچھ کہیں تو ان سے لڑنے بھی اسی طرح پہنچ جاتی ہو۔ تم تو ویسی ہی ہو۔"

"اچھا۔" وہ ہلکا سا ہنس دی۔ سیم پہ تھوڑا سا پیار آیا، مگر ظاہر کیے بنا اس نے کشن اٹھا کر گود میں رکھا اور ادھر ادھر ہاتھ مارا۔ رسالہ غائب۔ وہ حیرت اور پریشانی سے اٹھ کر ڈھونڈنے لگی۔ پھر چونک کر سیم کو دیکھا۔

"تم ڈائجسٹ پڑھ رہے ہو؟ کس نے اجازت دی تمہیں، ہاں؟" لپک کر صوفے تلے سے جوتا اٹھایا۔

"آنے دو آج امی کو، میں نے تمہارا حشر نہ کروایا تو دیکھنا۔" اس سے پہلے کہ وہ غصے سے اس پہ جھپٹتی، سیم چھلانگ مار کر چوکھٹ تک گیا اور پھر آگے غائب۔ حنین طیش سے لال سرخ ہوتی، جوتا لیے اس کے پیچھے بھاگی۔

"یہ موٹا آلو آج بچے گا نہیں۔"

☼ ☼ ☼

لگا ہو دل تو خیالات کب بدلتے ہیں
یہ انقلاب تو اک بے دلی میں پلتے ہیں

شام ایک ٹھنڈی سی چھایا کے ساتھ قصر کاردار پہ اتر رہی تھی۔ لاؤنج کی دیوار گیر فرانسیسی کھڑکیوں سے باہر کا سبزہ زار جھلک رہا تھا۔ کونے میں دو کرسیاں ساتھ ساتھ رکھی تھیں۔ دونوں کے بازوؤں کے درمیان گلدستے والی چھوٹی میز تھی۔ ایک کرسی پہ جواہرات تھی۔ بال جوڑے میں، کہنی کرسی کے ہتھے پہ اور چہرے پہ مسکراہٹ لیے وہ اپنی مہمان کو دیکھ رہی تھی۔

وہ مہمانوں کو سامنے بٹھانے کے بجائے برابر کرسی پہ بٹھایا کرتی، اسے گردن بائیں طرف موڑ کر مہمان کو دیکھنا زیادہ پسند تھا۔ گئے برسوں میں اس کرسی پہ سعدی اکثر آ کر بیٹھتا تھا۔ اب کبھی کبھی ادھر زمر ہوتی۔ آج بھی وہی تھی۔

کپ کے کناروں پہ انگلی پھیرتی، وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے، سنجیدگی سے بیٹھی تھی۔ بنا مسکراہٹ کے بھوری آنکھیں اور کیچر میں ہاف بندھے گھنگریالے بال جو سمیٹ کر ایک طرف کر دیے تھے۔ دوپٹا گردن میں لپیٹ کر دونوں پلو سامنے کر رکھے تھے۔

"کیا تم پچھتا رہی ہو؟" جواہرات اس کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔

"ہرگز نہیں بلکہ میں ذہنی طور پہ تیار ہوں۔"

"یہ اذیت ناک ہوگا۔ جس سے نفرت کی جائے اس سے شادی!" جواہرات نے جھرجھری لے کر انگلی سے گال تک آئے بال ہٹائے۔ زمر نے کپ اٹھا کر گھونٹ بھرا۔

"میں بہت اذیت سے گزری ہوں۔ اور سب سے زیادہ تکلیف دہ بے اعتباری تھی۔" کپ نیچے کر کے وہ کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔ یہاں سے سبزہ زار دکھائی دیتا۔ انیکسی عقبی طرف تھی۔ ادھر سے دکھائی نہ دیتی۔

"اس وقت کسی نے بھی میرا اعتبار نہیں کیا، مگر اب کریں گے۔"

"تم اپنے رشتے داروں کے دباؤ کی وجہ سے اس کا کیس لینے سے انکار نہ کرتیں تو آج وہ جیل میں ہوتا۔"

"بات رشتے داروں کی نہیں ہے۔ میں ایک پبلک پراسیکیوشن میں ذاتی عناد کو نہیں لا سکتی تھی۔ یہ ذاتی جنگ نہیں تھی۔" وہ کھڑکی سے نظریں ہٹا کر جواہرات کو دیکھتے ہوئے تلخی سے بولی۔ "وہ ایک وائف کلر تھا،

سیریل کلر۔ اس نے مجھے استعمال کیا' پہلی دفعہ تب جب مجھ پہ گولی چلائی' دوسری دفعہ ڈیڑھ سال پہلے جب اس نے میرے کندھے پہ پیر رکھ کر رہائی حاصل کرنا چاہی۔ یہ قانونی جنگ تھی۔ صرف ایک تسلی تھی مجھے کہ فارس کا میں نے کچھ نہیں بگاڑا تھا' میں بے گناہ تھی' مگر نہیں۔" آخر تلخ گھونٹ اندر اتار کر اس نے کپ پرچ میں رکھا۔

"وہ مجھ سے انتقام لے رہا تھا۔ یہ آغاز سے ہی ذاتی جنگ تھی۔ شروع اس نے کی' ختم میں کروں گی۔" اس نے آگے ہو کر پیالی واپس ٹرالی میں رکھ دی۔

"مگر تم کرو گی کیا؟ شادی کر کے تمہیں کیا فائدہ ہو گا؟"

"نہیں مسز کاردار!" زمر نے گہری سانس خارج کی اور نفی میں سر ہلایا۔ "میں اور آپ محرم راز نہیں ہیں۔ میں نے مدد مانگی تھی' لائحہ عمل بتانے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔" جواہرات نے مسکرا کر سر جھٹکا۔

"تم یہ کہہ رہی ہو کہ تمہیں مجھ پہ اعتبار نہیں ہے؟"

"مدد کی حد تک؟ جی ہے۔ مگر اپنے پلانز میں خود تک ہی محدود رکھتی ہوں۔" وہ سرد سا مسکرائی۔ جواہرات نے اثبات میں گردن کو جنبش دی۔

"تمہاری مرضی۔ بہر حال' میں اپنا وعدہ پورا کروں گی۔ تم نے اس سے شادی کرنی ہے' میں کروا دوں گی۔ اور کل میں تمہارے والد سے ملنے آؤں گی۔"

"شیور!" اس نے کندھے اچکا دیے۔

"کیا تم جاننا چاہتی ہو کہ میں یہ کیسے کروں گی؟"

"نہیں۔ میں قدرتی طریقے سے حیران ہونا پسند کروں گی۔" وہ رکی۔ "آپ کو اس سے کیا ملے گا؟"

"کس سے؟"

"ہم دونوں جانتے ہیں کہ آپ میری مدد اپنے فائدے کے لیے کر رہی ہیں' اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ کبھی میرا ساتھ نہ دیتیں۔"

جواہرات ہلکا سا ہنس دی۔ "فارس کے قانونی شیئرز ہیں ہماری جائیداد میں۔ جب تک وہ دوسری چیزوں میں الجھا ہے' میرا کاروبار محفوظ رہے گا۔ مگر تم یہ جانتی ہو کہ میں تمہیں استعمال کر رہی ہوں' تو میرا ساتھ کیوں دے رہی ہو؟"

"تاکہ آپ کو واپس استعمال کر سکوں!" وہ مسکرا کر اٹھی' پرس کی اسٹریپ کندھے پہ لٹکائی۔ "آخری بات جو مجھے کہنی تھی۔ میں تیار ہوں۔"

"میں بھی!" ایئر رنگ پہ انگلی پھیرتے ہوئے جواہرات مسکرائی۔

اس کے جانے کے بعد اسی کرسی پہ بیٹھے' جواہرات نے موبائل پہ نمبر ڈائل کیا۔ یوسف خان صاحب۔

"السلام علیکم۔" وہ کافی دیر بعد فون اٹھا پائے۔

"وعلیکم السلام یوسف صاحب! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔"

"اللہ کا شکر ہے۔" وہ چند رسمی فقروں کے بعد کہنے لگے۔

"آپ نے دو ڈھائی ماہ قبل مجھے کال کر کے کہا تھا کہ میں زمر کو سمجھاؤں تاکہ وہ شادی کر لے۔"

"جی۔ میں یہ ہر اس شخص سے کہتا ہوں جو زمر کے قریب ہو۔" وہ سنجیدہ اور قدرے خشک تھے۔ جواہرات کا ٹاپس کو مسلتا ہاتھ رکا' ذرا دیر کو اس نے سوچا۔

"اگر آپ میرے گارڈ کی اس نیکلس کے لیے تلاشی والی بات پہ ہم سے خفا ہیں تو میں معذرت کرتی ہوں۔ وہ سب ایک غلط فہمی تھی۔"

"نہیں' کوئی بات نہیں۔"

"او کے۔ تو میں یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ کل رات فنکشن میں میری زمر سے بات ہوئی تھی۔ میں نے اسے بہت سمجھایا ہے۔ امید ہے وہ جلد مان جائے گی۔"

بڑے ابا چونکے۔ "تو آپ نے بات کی تھی زمر سے؟"

"جی۔ میں نے آپ سے وعدہ کر رکھا تھا۔ بس موقع کل رات ملا۔"

"اچھا۔" ان کے لہجے کی سرد مہری زائل ہونے

لگی۔ "زمر نے مجھ سے صبح بات کی تھی' وہ شادی کے لیے رضامند ہے۔"

"گڈ۔ مگر مجھے حیرت نہیں ہے۔ میں ناکام نہیں ہوا کرتی۔"

"آپ کا۔ شکریہ مسز کاردار۔"

"مائی پلیزر۔" مسکراتے ہوئے' بدستور ایر رنگ پہ انگلی پھیرتے' وہ کھڑکی کے پار دیکھ رہی تھی۔ "کوئی رشتہ ڈھونڈا آپ نے؟"

"نہیں' ابھی تو ندرت سے بات کی ہے۔ وہ شاید کوئی بتائے۔"

"اوکے' میں نے بھی چند ایک لوگوں سے کہہ رکھا تھا۔ دو رشتے ہیں' جو دلچسپی رکھتے ہیں۔ آپ تفصیلات جاننا چاہیں گے؟"

"جی' بتایئے۔" بڑے ابا بمشکل اپنی آواز کی ضعیف خوشی چھپا رہے تھے۔

"ایک سیشن کورٹ کے جج صاحب کا رشتہ ہے۔ بیوی سے علیحدگی ہو چکی ہے اور تینوں بچے بورڈنگ میں پڑھتے ہیں۔" ذرا دیر کو وقفہ دیا۔ بڑے ابا کی لائن خاموش تھی۔ "دوسرا رشتہ میری کمپنی کے ایک عہدے دار کا ہے۔ پہلی شادی کم عمری میں ہوئی تھی' بیوی اور اس سے ہوئے دونوں بیٹے گاؤں میں رہتے ہیں۔ وہ صاحب خود اسی شہر میں ہیں' اکیلا اچھا گھر ہے' عمر ذرا زیادہ ہے' پچاس سے اوپر۔ آپ سن رہے ہیں۔"

"جی ہاں۔" ان کی آواز بدقت نکلی تھی اور اس میں بھی تکلیف تھی۔

"یوسف صاحب! حقیقت پسندی سے کام لیجیے۔ آپ کی بیٹی تیس بتیس سال کی ہے' اس کے گردے ضائع ہو چکے ہیں' بیمار ہے' ایسے میں کسی نوجوان خوب صورت لڑکے کا رشتہ ملنا تو معجزہ ہوگا اور معجزے کم ہی ہوا کرتے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں' مگر۔" وہ۔ رک گئے' کیا کہیں اب؟

"ہاں۔ ایک شخص اور بھی ہے' ہاشم کی عمر کا ہے' ہینڈسم بھی ہے' پہلی بیوی مر چکی ہے' مگر۔"

"مگر کیا؟" بڑے ابا تیزی سے بولے۔ امید کی کرن چمکی تھی۔

"مگر آپ کی کیا گارنٹی' آپ اس سے شاید رشتہ نہ ہی کریں۔" اس نے ذرا سا وقفہ دیا۔ بڑے ابا بے چینی سے منتظر تھے۔

"میں فارس کی بات کر رہی ہوں۔"

اور بڑے ابا کو اتوار کے اس گرم دن میں لگنے والا یہ دوسرا جھٹکا تھا۔

"فا۔ رس؟" وہ اٹکے۔ آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ندرت آج کل فارس کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی ہے۔ تو آپ اس سے زمر کی بات کیوں نہیں کر لیتے؟ اس سے اچھا آپشن آپ کو نہیں ملنے والا۔"

"مگر۔ فارس کے لیے زمر۔"

"کیا زمر؟ اسے عدالت نے بری کیا ہے' اور اب زمر اس کو موردالزام ٹھہرانا چھوڑ چکی ہے۔ پرانی باتوں کو بھول جایئے۔" اس نے خفگی سے ٹوکا۔

"مسز کاردار! آپ سمجھ نہیں رہیں۔ فارس کا۔ وہ ابھی ابھی رہا ہو کر آیا ہے' وہ خود مسئلوں میں گھرا ہے' ایسے میں۔"

"آپ نے پہلے بھی اس کے رشتے سے انکار کر دیا تھا' تب کیا وجہ تھی؟"

وہ چپ سے ہو گئے۔

"آپ شاید اس کو ہمیشہ سے اپنی بیٹی سے کم تر سمجھتے رہے ہیں۔"

"ایسی بات نہیں ہے' مجھے وہ بہت پسند ہے' مگر وہ خود نہیں مانے گا' زمر بھی نہیں مانے گی۔"

"آپ مان جائیں تو وہ بھی مان جائیں گے۔"

"زمر کبھی بھی نہیں مانے گی' وہ تو اس کا ہمارے گھر آنا تک برداشت نہیں کر سکتی۔"

"وہ تو شادی کے لیے بھی نہیں مانتی تھی۔ میں نے منا لیا تھا۔ بہرحال میں فارس کے ساتھ دو چار روز میں آپ کی طرف چکر لگاؤں گی۔ آپ تینوں رشتوں کے

بارے میں سوچ لیں۔ تین بچوں کا باپ جج' پچپن سالہ کمپنی عہدیدار یا فارس اور اگر تینوں نہیں قبول تو اس دفعہ اپنی بیٹی کے مجرم آپ ہوں گے' ٹیک کیئر۔"

مسکراتے ہوئے فون رکھ دیا اور بہت طمانیت سے کھڑکی کے باہر سبزہ زار کو دیکھنے لگی' جہاں فینوٹا اپنی نگرانی میں ملازموں سے گملے رکھوا رہی تھی۔

جواہرات کو موسم زیادہ خوش گوار لگنے لگا تھا۔

سب ٹھیک جا رہا تھا۔



خدایا تیرے دم سے اپنا گھر اب تک سلامت ہے
وگرنہ دوست اور دشمن ہمارے ایک جیسے ہیں

رات کھانے کے بعد وہ چھوٹے باغیچے والے گھر سے باہر نکل آیا۔ سڑک کنارے چلتے' کانوں میں ہینڈز فری لگا کر وہ موبائل کو ہاتھوں میں پکڑے کوئی نمبر ملا رہا تھا۔

"سعدی۔۔۔ تمہاری ہاشم سے بات ہوئی؟" شہرین نے کال اٹھاتے ساتھ پوچھا۔ ایئرفون میں گونجتی اس کی آواز میں شدید اضطراب تھا۔

"کیوں نہ پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کی ہاشم بھائی سے کیا بات ہوئی؟" وہ تلخی اور درشتی سے کہتا قدم قدم چلتا جا رہا تھا۔

"میری بات؟ کیا مطلب؟"

"آپ نے ان کو بتا دیا کہ میں نے ان سے وہ چرایا ہے' جو انہوں نے ہم سے چرایا تھا۔"

"میں نے ایسے نہیں۔" وہ اٹکی۔ "وہ مجھ پہ چلا رہا تھا' مجھے دھمکی دے رہا تھا' مجھے معلوم نہیں کہ میں کیا کہتی گئی۔۔۔ بلکہ میں نے تو یہ کہا بھی نہیں کہ تم نے۔"

"مگر آپ نے میری بات تو دہرا دی نا ان کے سامنے۔" طیش سے اس کی آواز بلند تھی۔

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"اس سے یہ ہوتا ہے کہ میں نے پہلی دفعہ آپ پہ اعتبار کر کے غلطی کی۔ بلکہ نہیں' اعتبار تو اس دفعہ بھی نہیں کیا تھا' بس کام کہہ کر غلطی کی اور اس سے یہ بھی ہوتا ہے کہ شہرین بیگم! آج سے آپ اکیلی ہیں۔ مجھے رتی برابر بھی پروا نہیں ہے کہ سونیا آپ کے ساتھ جائے یا نہیں۔ اس لیے آپ اپنی تمام جنگیں اکیلے لڑیں گی۔"

"تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہو؟ تم نے مجھے اس کام میں پھنسایا اور۔۔۔"

"میں آپ کے اس سے بڑے کام کر چکا ہوں اور یہ کام میں نے آپ کو اس لیے دیا کہ آپ بھی ہاشم بھائی سے انتقام لینا چاہتی تھیں' کم از کم کہتی تو یہ ہی رہی ہیں آپ۔ لیکن آج سے ہم ایک ٹیم نہیں ہیں' اللہ حافظ۔" زور سے سرخ بٹن دبا کر کال کاٹی۔

آنکھوں میں شدید خفگی اور غصہ لیے وہ واپس گھر کی طرف مڑ گیا۔

شہرین کی تین' چار کالز آئیں' اس نے سب کاٹ دیں۔ پھر تنگ آ کر فون سائیلنٹ پہ لگا دیا۔

واپس اندر آیا تو امی خاموش سی لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ ٹی وی چل رہا تھا۔ حنین پاؤں اوپر کر کے بیٹھی' ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے شوق سے ڈراما دیکھ رہی تھی۔ اب وہ صرف وہی ڈرامے دیکھتی تھی جو ٹی وی پہ لگ جاتے۔

امی البتہ کسی گہری سوچ میں تھیں۔

وہ ایئرفونز اتارتے ہوئے ندرت کے ساتھ دھپ سے صوفے پہ گرا۔ وہ پھر بھی نہیں چونکیں۔ سعدی نے پلکیں سکیڑ کر غور سے ان کو دیکھا۔

"ندرت بہن! پریشان لگ رہی ہیں آپ؟" معصومیت سے پوچھا۔ انہوں نے خفگی سے اس کو دیکھا۔

"کچھ نہیں۔"

"کچھ تو ہوا ہے۔ بتائیں' میں حل کرتا ہوں ابھی آپ کا مسئلہ۔" وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھا۔

"میں سوچ رہی ہوں' فارس کی شادی کر دینی چاہیے۔"

حنین اور سعدی' دونوں نے چونک کر ان کو دیکھا۔ وہ سوچ سوچ کر بول رہی تھیں۔ حنین کے ماتھے پہ بل پڑے۔

"ماموں کی شادی؟ مگر امی! وہ ابھی تو باہر آئے ہیں' ان کو سانس تو لینے دیں۔"

"حنین ٹھیک کہہ رہی ہے امی! وہ پہلے ہی دوسرے چکروں میں ہیں' ان کو ابھی تنگ نہ کریں۔"

"چپ کرو تم دونوں۔ پتا نہیں ہے کسی بات کا اور ماں کو مشورے دے رہے ہو۔" وہ خفگی سے کہہ کر اٹھ گئیں اور میز پہ رکھے برتن اٹھا کر کچن میں لے گئیں۔ جب واپس آئیں تو وہ دونوں بھول بھال کر ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

"بڑے ابا کا فون آیا تھا۔ کہہ رہے تھے۔ زمر شادی کے لیے مان گئی ہے۔ فنکشن میں جانے اور رشتے داروں سے ملنے کا اس پہ مثبت اثر ہوا ہے۔" وہ کشن ٹھیک کر کے رکھتی' سرسری انداز میں بتا رہی تھیں۔ حنین اور سعدی نے ایک دم ایک دوسرے کو دیکھا۔

"اچھی بات ہے نا۔" ندرت نے فالتو کشن اٹھا کر بیڈ روم کی رف جاتے پوچھا۔

"جی۔" حنین بے زاری سے کہہ کر واپس ٹی وی دیکھنے لگی۔

"جی۔" سعدی البتہ دھیما سا بولا۔ چاہنے کے باوجود وہ خوش نہیں ہو سکا۔ کہیں کچھ غلط تھا۔

میں دوستوں کے اک اک امتحان سے گزرا ہوں
بکھر گیا ہوں کئی راستے بناتا ہوا

قصر کاردار پہ اگلی صبح پہلے سے بھی گرم طلوع ہوئی تھی۔ ہاشم برآمدے کی سیڑھیاں اترتا' نیچے کھڑی کار کی طرف جا رہا تھا۔ شوفر کے سلام کا سپاٹ چہرے اور سر کے خم سے جواب دیتا وہ اندر بیٹھا تو شوفر نے دروازہ بند کر دیا۔ جواہرات نے ستون کے ساتھ کھڑے ہو کر یہ دیکھا' یہاں تک کہ اس کی کار روش پہ چلتی گیٹ پار کر گئی۔

"میم! کار تیار ہے۔" فینو نا نے سامنے کھڑی کار کے بارے میں یاد دہانی کراتے ہوئے اسے پکارا' جو گردن میں موتیوں کی لڑی پہ انگلی پھیر رہی تھی۔ بال جوڑے میں باندھے اور لمبی قمیص پہ سفید فلنڈ منی کوٹ پہنے' وہ سوچ میں گم کھڑی تھی۔ پھر یکایک زینے اترنے لگی۔ فینو نا پیچھے آئی تو جواہرات رکی' گھور کر اسے دیکھا' فینو نا کے قدم منجمد ہو گئے' فوراً" سر جھکا کر پیچھے ہو گئی۔

جواہرات زینے اتری۔ سبزہ زار عبور کیا۔ گھوم کر گھر کے عقب میں آئی۔ سبز پہاڑی یہاں نشیب میں ڈھل جاتی۔ وہ قدم قدم اترتی نیچے انیکسی تک آئی' دروازہ کھٹکھٹایا۔

چند ہی لمحوں میں وہ کھلا تو فارس نظر آیا۔ وہ ٹراؤزر اور پوری آستین کی ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ کافی پہلے کا اٹھا ہوا لگتا تھا۔ اسے دیکھ کر آنکھیں سکیڑیں' اچنبھے سے' پھر پیچھے ہوا۔ "آیئے۔"

"صبح بخیر۔" وہ مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ باریک ہیل سے چلتی' راہ داری عبور کر کے لونگ روم میں آ گئی' جس کے ساتھ اوپن کچن تھا۔ گھوم کر اطراف کا جائزہ لیا۔

"گھر کو کافی رینوویشن کی ضرورت ہے اور صفائی کی بھی۔ تم اجازت دو تو میں فینو نا کو بھیج دیا کروں؟" کچن کاؤنٹر کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے اس نے فارس کو مخاطب کیا۔

"ضرورت نہیں۔" وہ آگے آیا' چائے تلے آنچ بند کی اور اوپر کیبنٹ سے شیشے کا گلاس نکالا۔ زرتاشہ کے جہیز کے برتن جن میں سے اکثر ڈبا پیک تھے۔ گلاس نل سے دھویا اور الٹا کر اسٹینڈ پہ رکھا۔ پھر فریج تک آیا۔ جواہرات سینے پہ بازو لپیٹے' ایک ہاتھ بدستور گردن کے موتیوں پہ پھیرتی مسکرا کر اسے دیکھتی رہی۔

"ایک کام تھا تم سے۔ دوپہر کو مجھے زمر کے گھر لے جاؤ گے؟"

فریج سے جوس کا ڈبا نکالتا فارس لمحے بھر کو رکا' پھر دروازہ بند کرتا کاؤنٹر تک آیا۔ چہرہ ویسے ہی سپاٹ رہا۔

"کیوں؟ ڈرائیور کہاں گیا آپ کا؟"

"تمہیں میرا ڈرائیور بننے پہ اعتراض ہے کیا؟"

"نہیں مجھے کام سے جانا ہے دوپہر میں۔" وہ شیشے کے گلاس میں جوس کا ڈبا انڈیل رہا تھا۔ نارنجی رس سے گلاس بھر گیا۔

"کدھر جانا ہے؟"

"ایک دوست سے ملنے۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ جاتے ہوئے مجھے ڈراپ کردینا اور واپسی پہ پک کرلینا۔" فارس نے گلاس اسے پیش کیا تو اس نے پکڑتے ہوئے شانے اچکا کر گویا بات ختم کردی۔

"بہت اچھا۔" وہ مڑ کر چولہے تک آیا اور مگ میں اپنی چائے انڈیلنے لگا۔

"میں نے یوسف صاحب کو بتایا تھا کہ تم میرے ساتھ آؤ گے۔ وہ چاہتے ہیں تم اور میں کھانا ان کے ساتھ کھائیں۔ کافی خوش ہوئے تمہارا سن کر۔"

فارس نے چونک کر اسے دیکھا اور کیتلی واپس چولہے پہ رکھی۔ "آپ یوسف صاحب سے ملنے جارہی ہیں؟"

"ہوں۔" جوس کا گھونٹ بھر کر مسکرائی۔ "زمر کے رشتے کے لیے انہوں نے مجھے کہہ رکھا تھا۔ وہ پروپوزل ہیں وہی بتانے ہیں ان کو۔"

وہ مقابل کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر کھڑا تھا، نظریں چائے پہ جھکائے ایک گھونٹ بھرا۔ بولا کچھ نہیں۔ انداز البتہ ست تھا۔ جواہرات اس کی آنکھوں پہ نگاہیں جمائے ہوئے تھی۔

"ایک جج کا ہے، عمر پچاس سال سے اوپر، پہلی بیوی کو طلاق دے چکا ہے، تین بچے بھی ہیں۔ دوسرا میری کمپنی میں ملازم ہے۔ عمر اس کی بھی اتنی ہی ہے، مگر پہلی بیوی اور بچے گاؤں میں رہتے ہیں۔" کہہ کر اس نے اپنے حلق میں شیریں گھونٹ انڈیلا اور فارس نے کڑوا گھونٹ۔ دونوں نے اپنے اپنے جام نیچے کیے تو انیکسی میں خاموشی چھا گئی۔

"تمہیں تو معلوم ہے، زمر کے والد بیمار رہتے ہیں، اپنی بیٹی کی بہت فکر ہے ان کو۔ وہ ہے بھی گردے کی مریض۔ جانے کب تک یہ عطیہ شدہ گردہ چل پائے۔"

فارس نے کچھ نہیں کہا۔ ایک گھونٹ مزید بھرا۔ جواہرات نے قدرے بے چینی سے اس کی آنکھیں دیکھیں۔

"تمہیں شاید میری بات میں دلچسپی نہیں۔ اوہ! یہ مت کہنا کہ تم ابھی تک زمر سے پرانا بغض پالے ہوئے ہو۔ اب تو وہ تمہارے خلاف بیان واپس لے چکی ہے، اب تو بھول جاؤ۔"

فارس نے چونک کر اسے دیکھا۔ جواہرات نے مصنوعی حیرت خود پہ طاری کی۔

"اوہ۔ تمہیں نہیں معلوم تھا؟ جج نے تمہیں بری کردیا تو اس نے بھی تمہارے بارے میں کہی ہر بات واپس لے لی۔ اس کے والد، ندرت، سعدی، سب کے آگے ہی اس نے یہ بات کہی وہ اب تم پہ کوئی الزام نہیں لگائے گی۔"

"اسی لیے اس نے پچھلے ہفتے مجھے اپنے گھر سے نکالا تھا؟" وہ سنجیدہ تلخی سے بولا تو جواہرات لمحے بھر کو چپ ہوگئی۔ پھر لاپروائی سے شانے اچکائے۔

"یہ انسانی فطرت ہے۔ یقین کے قریب ہو کر بھی شک آخری جھٹکا ضرور لگاتا ہے، پوری قوت سے، مگر اس کے بعد امن ہوجاتا ہے۔"

"واٹ ایور!"

چند لمحے مزید خاموشی سے گزر گئے۔ پھر وہ ذرا سا کھنکھاری۔

"تمہارا آگے کا کیا ارادہ ہے؟"

"نہیں۔ میں یہ گھر نہیں چھوڑ رہا۔ اگر آپ یہ پوچھنے آئی ہیں تو۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو ہنی! میں تمہیں یہاں دیکھ کر سب سے زیادہ خوش ہوں۔ تمہیں یہیں رہنا چاہیے، بلکہ جاب اسٹارٹ کرو کوئی، شادی کرو، زندگی کو سیٹل کرو۔ وہ ایک طوفان تھا، آیا اور گزر گیا۔ اس سب کو بھول جاؤ۔"

"مسز کاردار! طوفان کے گزر جانے سے جڑ سے اکھڑے درخت واپس نہیں لگ جایا کرتے۔"
"تو نئے بیج بوؤ۔ نئے رشتے بناؤ۔ شادی کرلو فارس! ورنہ کبھی آگے نہیں بڑھ سکو گے۔"
"میرے پاس اور بہت کام ہیں۔" وہ تلخی سے کہتا آخری گھونٹ اندر انڈیلتا مڑ گیا۔
جواہرات نے ذرا جوس بچا کر گلاس کاؤنٹر پہ رکھا' اس کا شانہ تھپکا اور "دوپہر کو ملتے ہیں" کہہ کر آگے نکل گئی۔ فارس آنکھوں میں ناپسندیدگی لیے اسے جاتے دیکھتا رہا۔

ہر سمت سپیرے ہیں جمائے ہوئے ڈیرے
اس شہر میں سانپوں کے خریدار بہت ہیں

دوپہر طلوع ہوئی تو اتنی سنہری کہ ہر چمکتی شے سونا دکھنے لگی۔ یوسف صاحب کا گھر بھی دھوپ میں جھلس رہا تھا۔ جب زمر فائلز اور پرس پکڑے اندر داخل ہوئی۔ راہ داری سے گزرتے ہوئے وہ ڈرائنگ روم کے جالی دار پردے کے پاس رکی۔ جالی کے پار صوفے پہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' جواہرات تمکنت سے بیٹھی نظر آرہی تھی۔ انگلی پہ مسلسل لاکٹ کی چین لپیٹتی' وہ مسکرا کر ابا کو سن رہی تھی جو مقابل وہیل چیئر پہ بیٹھے مدھم آواز میں کچھ کہہ رہے تھے۔ زمر نے سامنے سے آتے صداقت کو چیزیں تھمائیں اور کھنکھارتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ جواہرات نے مسکرا کر گردن اٹھاتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ سنجیدگی سے سلام کرکے سنگل صوفے پہ ٹک گئی۔ عمروں کے فرق کے باوجود دونوں عورتوں میں کچھ بہت مشترک سا تھا۔ شاید تنی ہوئی گردن' شاید گہری آنکھیں۔
"تمہارے والد نے مجھے اچھی خبر سنائی ہے' تم شادی کے لیے رضامند ہو۔"
زمر نے خاموش نگاہ بڑے ابا پہ ڈالی۔ وہ مطمئن اور خوش نظر آرہے تھے۔
"اگر کوئی مجھ سے شادی پہ رضامند ہوا تو شیور!"
"اور تم یہ فیصلہ اپنے والد پہ چھوڑ چکی ہو؟"
"بالکل!" اس نے شانے اچکائے۔
"واقعی زمر!" جواہرات نے تیکھی' مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "وہ جس سے چاہیں تمہاری شادی کروا دیں' یہ بات دل سے کہی یا اوپر اوپر سے؟"
"جب کہہ دی ہے تو پورا کروں گی۔" وہ بے تاثر تھی۔
"اور اگر تمہارے والد فارس کو منتخب کرلیں تمہارے لیے؟ کیا کرلو گی اس سے شادی؟"
بڑے ابا نے ایک دم پریشان ہو کر جواہرات کو دیکھا۔ گویا اسے روکنا چاہا' مگر وہ لاکٹ کی چین انگلی پہ لپیٹتی زمر کو مسکرا کر دیکھے جارہی تھی۔ بڑے ابا نے مجرمانہ انداز میں گردن موڑی۔ زمر لب بھینچے جواہرات کو دیکھ رہی تھی۔ خلاف معمول اس نے اس بات پہ کھڑے کھڑے' جواہرات کو گھر سے نہیں نکالا تھا۔
"تمہاری خاموشی سے میں کیا سمجھوں؟ یہ ہی کہ تم نے رضامندی کا اظہار محض اوپر سے کیا تھا؟ درحقیقت تم اپنے والد کو یہ حق نہیں دے رہیں۔ کیا یہ تمہارے والد کے ساتھ وعدہ خلافی نہیں ہے؟"
"ایسا نہیں ہے۔" وہ تیزی سے بولی' پھر چپ ہوگئی۔
"میرا اور تمہارے ابا کا خیال ہے کہ فارس تمہارے لیے بہترین انتخاب ہے۔ پلیز وہ پرانی باتیں مت دہرانا۔ تم خود بھی جانتی ہو کہ وہ سچ نہیں تھا۔ اب بتاؤ' اپنی زبان پہ قائم ہو؟"
بڑے ابا بے چارگی سے اسے تک رہے تھے۔ مگر خلاف توقع زمر سپاٹ نظروں سے جواہرات کو دیکھتی رہی۔
"قائم ہوں۔ جانتی ہوں' ابا میرے لیے غلط فیصلہ نہیں کریں گے۔" ضبط سے الفاظ ادا کیے۔
"تم سوچ لو' یہ تو بس ہمیں یوں ہی خیال آیا تو۔" وہ شرمندہ سے وضاحت کررہے تھے۔
"سوچ چکی سب۔ جو مرضی آئے کریں۔"
"اور ہاں! فارس ابھی مجھے پک کرنے آئے گا۔ اگر تمہارا دوبارہ اس کو گھر سے نکالنے کا ارادہ ہے تو ابھی بتا دو' تاکہ میں اسے منع کردوں۔"

زمر نے بہت ضبط سے خود کو بھڑکنے سے روکا اور آہستہ سے بولی۔

"میں نے اس دن غلط کیا تھا' مجھے ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آئی ایم سوری ابا!" وہ ایک دم اٹھی اور باہر نکل گئی۔ راہ داری میں آکر گہرے سانس لے کر خود کو نارمل کرنا چاہا' مگر پرانی باتیں' یادیں سب ابل ابل کر جیسے باہر آرہا تھا۔ وہ دل پہ ہاتھ رکھے' آنکھیں بند کیے' راہ داری کی دیوار کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔

اندر جواہرات سولت سے کہہ رہی تھی۔

"اسے منانا مشکل نہیں تھا۔"

"اسے منانا نہیں کہتے۔ احتجاج کہتے ہیں۔" وہ نفی میں سر ہلاتے افسوس کررہے تھے۔ جواہرات نے بمشکل ناگواری چہرے سے چھپائی۔

"زمر کو کوئی مجبور نہیں کرسکتا۔ وہ اپنا اچھا برا سوچ کر ہی جواب دے رہی تھی۔ اسے فارس سے شادی پہ کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" (پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے بول بول کر وہ تھک گئی' مگر یہ ابھی وہیں اٹکے تھے۔)

تب ہی اس کا موبائل بجا۔ جواہرات نے نہیں اٹھایا' اسی طرح بیٹھی رہی۔

"فارس باہر لینے آیا ہے مجھے۔ آپ یوں کیوں نہیں کرتے کہ باہر دروازے تک چلے جائیں اور اسے اندر لے آئیں۔ میرے کہنے پہ تو وہ کبھی نہیں آئے گا۔"

بڑے ابا نے اثبات میں سر ہلایا اور وہیل چیئر کے پہیے چلاتے مڑ گئے۔ ساتھ میں صداقت کو آواز بھی دی۔ جب وہ واپس آئے تو فارس ان کے ساتھ تھا۔ زمر اس دوران اندر جاچکی تھی۔ وہ آرام دہ نہیں تھا' مگر مجبور تھا۔ خاموشی سے اس سنگل صوفے پہ بیٹھ گیا۔ جہاں سے ابھی زمر اٹھ کر گئی تھی۔

"طبیعت کیسی ہے آپ کی؟" وہ مدھم آواز میں پوچھ رہا تھا۔ دائیں ٹانگ بائیں گھٹنے پہ رکھے' کہنی صوفے کے ہتھ پہ۔ بس جلدی سے وہ یہاں سے نکل جائے۔

"اچھا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم آئے۔ تمہارا بہت شکریہ فارس!"

وہ دونوں چند رسمی کلمات کا تبادلہ کررہے تھے۔ جواہرات نے بور سی ہو کر آنکھیں گھمائیں۔ چند ثانیے مزید سرکے۔ صداقت چائے سرو کرکے جاچکا تو جواہرات ذرا سا کھنکاری۔ دونوں نے اسے دیکھا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ ایک اچھا موقع ہے' تم سے بات کرنے کا فارس!"

بڑے ابا بری طرح چونکے۔ فارس بھی دھیان سے سننے لگا۔

"یوسف صاحب کا تم کتنا احترام کرتے ہو' ان کے تم پہ کتنے احسانات ہیں' کتنے برے وقتوں انہوں نے تمہاری مدد کی ہم سب اس سے واقف ہیں۔"

زمر پھر سے راہ داری میں آکھڑی ہوئی۔ دھڑکتے دل سے وہ دیوار سے لگی بن رہی تھی۔

"جی!" فارس نے اچنبھے سے جواہرات کو دیکھتے سر ہلایا۔

"ایسے میں یوسف صاحب کا حق ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی طرح سمجھ کر تم سے ایک سوال کرسکیں۔"

بڑے ابا نے بے چینی سے جواہرات کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ باز رہنے' خاموش رہنے کا اشارہ' یہ سب بہت جلدی ہورہا تھا' مگر وہ ان کو دیکھے بنا' مسکراتے ہوئے فارس سے کہے جارہی تھی۔

"میں سن رہا ہوں' آپ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔"

"میں تو..." وہ جلدی سے کوئی بات بنانا چاہتے تھے۔ مگر...

"وہ چاہتے ہیں کہ زمر کا جو رشتہ تم نے چند برس قبل مانگا تھا' اس کا جواب وہ آج دیں' کیونکہ اس وقت کا جواب ان سے پوچھے بنا دیا گیا تھا' اگر ان سے پوچھا جاتا تو ان کا جواب مختلف ہوتا۔"

فارس بالکل رک کر انہیں دیکھنے لگا' جیسے اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو۔

"یوسف صاحب یہ چاہتے ہیں کہ تمہاری اور زمر کی شادی ہوجائے۔"

اس کا سانس واقعتاً" تھم گیا۔ بے اختیار ابا کو

دیکھا۔ انہوں نے چارگی سے چہرہ جھکالیا۔
"کوئی جلدی نہیں ہے' تم سوچ سمجھ کر جواب دینا۔" جواہرات نے تیزی سے کہا' مبادا وہ انکار ہی نہ کردے 'بڑے ابا نے سر اٹھایا۔
"اور کوئی زبردستی بھی نہیں ہے بیٹا! بس ایک خیال تھا' کہہ دیا۔ تم نہ کہہ دو تب بھی ہمارے تعلقات ویسے ہی رہیں گے۔"
فارس نے بمشکل سر اثبات میں ہلایا۔ وہ کچھ بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔
"یوسف صاحب بہت پریشان رہتے ہیں زمر کے لیے' ان کو اپنی زندگی کا بھی کوئی بھروسا نہیں' وہ اپنے سامنے اپنی بیٹی کو کسی ایسے شخص کو سونپ کر جانا چاہتے ہیں' جس پہ وہ اعتبار کرتے ہوں اور تم وہ واحد شخص ہو فارس!" جواہرات نرمی سے سمجھا رہی تھی۔
"میں... مجھے کچھ وقت دیں۔" بدقت وہ کہہ پایا' پھر ایک سلگتی نظر جواہرات پہ ڈالی۔
"میں باہر انتظار کررہا ہوں آپ کا۔" اور اٹھ کھڑا ہوا' جیسے مزید وہاں بیٹھنا دوبھر ہو۔ بڑے ابا نے یاسیت سے اسے جاتے دیکھا۔ وہ ان سے نگاہ ملائے بغیر دھیما سا سلام کہہ کر باہر نکل آیا۔
راہ داری میں وہ ٹھٹکا۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ زمر کھڑی تھی۔ ساکت' زرد سفید چہرہ لیے' ضبط کی انتہا پہ۔ بس ایک لمحے کو رک کر اس نے زمر کو دیکھا' مگر وہ منہ پھیر گئی' وہ بھی نہیں رکا۔ تیز تیز قدموں سے چلتا دہلیز پار کر گیا۔
جواہرات چند ثانیے مزید ابا کو تسلی دیتی رہی اور جب نکلی تو زمر ہنوز کھڑی تھی۔ اس کا سفید چہرہ اب اہانت سے گلابی پڑتا جارہا تھا۔
"یہ کیا تھا؟" وہ دبی دبی سی غرائی تھی۔ آواز بہت دھیمی رکھی۔ ابا نہیں سن سکتے تھے۔
"تمہارا پچاس فیصد کام ہوگیا۔"
"مگر اسے میرا رشتہ لے کر آنا چاہیے تھا' نہ کہ میرا باپ اس کی منت کرتا۔" وہ ضبط کے مارے پھٹ بھی نہیں سکتی تھی۔ "یہ پلان کا حصہ نہیں تھا۔"
"تم نے پلان سنا ہی کب تھا؟" وہ شانے اچکا کر موبائل پہ بٹن دبانے لگی۔ زمر آنکھوں میں تپش لیے اسے گھور رہی تھی۔ جواہرات نے تھکی ہوئی سانس اندر کھینچی۔
"تم کیوں فکر کرتی ہو؟ شادی کرنی ہے نا' ہوجائے گی۔ چاہے جیسے بھی ہو۔ دیکھو! میں زیادہ قرآن نہیں پڑھتی' مگر ایک آیت میں بہت خوشی سے ہر جگہ کوڈ کرتی ہوں۔" ذرا سا مسکرائی۔ "اور وہ یہ کہ 'عورتوں کی چالیں بہت عظیم ہوتی ہیں۔" اس کے گال کو ہولے سے چھو کر وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ زمر ان ہی سلگتی نظروں سے اسے جاتے دیکھتی رہی۔
فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ کر جیسے ہی جواہرات نے دروازہ بند کیا' فارس نے تیزی سے کار پیچھے کی' گیٹ سے نکالی اور سڑک پہ ڈال دی۔ اس کا جبڑا بھنچا ہوا تھا۔ وقفے وقفے سے ایک قہربار نظر جواہرات پہ ڈال دیتا۔
"یہ سب کیا تھا مسز کاردار؟"
"ایک معذور اور بے بس آدمی تم سے درخواست کررہا تھا اپنی بیٹی کے لیے۔"
"میں بچہ نہیں ہوں۔ آپ ان کے منہ میں الفاظ ڈال رہی تھیں۔" اکتاہٹ سے اس نے سر جھٹکا۔ "صبح آپ میرے پاس آئیں اور آپ کو میری شادی کی فکر ہونے لگی اور اتفاق سے آج ہی یوسف صاحب نے یہ بات کہہ دی۔"
"سامنے کی بات ہے' تم سے بہتر داماد ان کو نہیں ملے گا۔"
"یہ خیال بھی آپ نے ہی ڈالا ہوگا ان کے ذہن میں۔ میں تو جیسے آپ کو جانتا ہی نہیں ہوں۔" غصے سے بولتا وہ ایکسلیٹر پہ دباؤ بڑھا رہا تھا۔ کار کی رفتار تیز ہوتی گئی۔
"مجھے تمہاری فکر ہے فارس!"
"پہلے تو ساری زندگی آپ کو میری فکر نہیں ہوئی۔"
"یہ ہی تو پوائنٹ ہے فارس! میں نے یا اورنگ زیب نے ساری زندگی تمہاری فکر نہیں کی' مگر جس

شخص نے کی، تم پہ اتنے احسان کیے۔ جو تمہیں اچھی نوکری دلوانے میں مدد نہ کرتا تو آج تم سڑکوں پہ آوارہ پھر رہے ہوتے' اب وہ شخص معذور ہے۔ اس کی بیٹی بیمار ہے اور وہ تم سے صرف ایک چیز مانگ رہا ہے کہ اس کی بیٹی سے شادی کرلو' تو تم اسے بھی انکار کردو گے۔ کیا یہ ہوتا ہے احسان کا بدلہ؟" تلخی سے اسے دیکھ کر وہ کہہ رہی تھی۔

فارس اسی طرح تیز ڈرائیو کیے گیا۔ البتہ خاموشی کا لمبا وقفہ دونوں کے بیچ حائل ہو گیا۔

"ان کی بیٹی کبھی نہیں مانے گی۔" بہت دیر بعد وہ بولا۔

"مان جائے گی۔"

"کبھی نہیں۔"

"وہ مان چکی ہے یار۔" جواہرات نے بے زاری سے سر جھٹکا اور کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ اسے دیر ہو رہی تھی۔

اور فارس غازی نے ایک دم چونک کر اسے دیکھا' پھر سامنے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے کا غصہ' ایک نئی سوچ میں ڈھلتا گیا۔ لب کاٹتے' آنکھیں سکیڑے وہ چند منٹ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔

"آپ ان سے کہیے' میں سوچ کر بتاؤں گا۔" اب کے وہ بولا تو آواز مدھم تھی۔ جواہرات نے گہری مطمئن سی سانس خارج کی۔ کام "تقریباً" ہو گیا تھا۔

فارس نے اسے گھر اتارا اور خود کار سے نکل کر انیکسی کی طرف ہو لیا۔ قصر کی عقبی سمت میں فیونا ٹرے میں کچھ چیزیں لادے ہاشم کی بالکونی کے بیرونی زینے سے نیچے اتر رہی تھی۔ فارس کار سے اترا۔ اور وہیں کھڑا رہا۔ جب وہ قریب سے گزرنے لگی تو اسے روکا۔

"اے۔۔۔ بات سنو!" انگلی سے اشارہ کیا۔ وہ مؤدب مگر پراعتماد سی چلتی قریب آئی۔

"یس سر؟"

"تمہاری اتنی ہمت کب سے ہوئی کہ تم میری اجازت کے بغیر میرے گھر میں داخل ہو؟"

فیونا کا منہ مارے شاک کے کھل گیا۔

"میں تو کبھی بھی نہیں۔۔۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"کیا جب پراسیکیوٹر زمر آئی تھی تو تم اسے میرے گھر نہیں لائی تھیں' ہاں؟" غصیلی آنکھوں سے وہ اسے گھور رہا تھا۔

"کل شام؟ نہیں تو' پراسیکیوٹر تو آدھے گھنٹے کے لیے آئی تھیں' سارا وقت وہ مسز کاردار کے پاس بیٹھی رہیں اور پھر واپس چلی گئیں۔ وہ تو اس طرف آئیں بھی نہیں۔" وہ حیران پریشان سی صفائی دے رہی تھی۔

"سچ کہہ رہی ہو؟"

فیونا نے جلدی سے سر اثبات میں ہلایا۔

"ہوں ٹھیک ہے۔ مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔" وہ مڑنے لگا' پھر رکا۔ "یہاں پہ میری اینجیو ہوا کرتی تھی کدھر گئی؟"

"وہ۔۔۔ اس نے مسز کاردار کا نیکلس چرایا تھا' سو اسے نکال دیا۔"

"اور تم نے اس کی جگہ لے لی۔ ہوں؟"

"جی' میں اب یہاں کی ہیڈ اسٹاف ہوں۔" گردن ذرا اکڑا کر بولی۔

"ٹھیک ہے۔ آئندہ میرے گھر کے قریب مت پھٹکنا۔" انگلی اٹھا کر تنبیہہ کرتا وہ آگے بڑھ گیا۔ چہرے کے تاثرات میں پھر سے غصہ جھلکنے لگا۔" جو اگلوانا تھا فیونا سے' وہ اگلوا لیا تھا۔

"تو میڈم پراسیکیوٹر ادھر آئی تھیں اور سارا وقت جواہرات سے باتیں کرتی رہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ فارس اور زمر کی شادی کا خیال کس نے کس کے ذہن میں ڈالا؟ جواہرات نے؟ یا زمر نے؟ یہ کھچڑی کس نے پکائی' ہوں؟" اس نے سبزہ زار پہ چلتے ہوئے تنفر سے جھٹکا۔ "کیا یہ دونوں عورتیں مجھے بے وقوف سمجھتی ہیں؟"

اپنے دروازے پہ رک کر اس نے موبائل نکالا اور کال ملا کر کان سے لگایا۔

"جی فرمائیے۔" سعدی کی مصروف آواز گونجی۔

"کدھر ہو تم؟"

"عموماً" اس وقت شریف لوگ اپنے آفس میں ہوتے ہیں، مگر اوہ سوری، آپ کی چونکہ اپنی کوئی جاب ہے نہیں اور چار سال سے آپ بیکار ہیں تو آپ کو کیا معلوم۔"

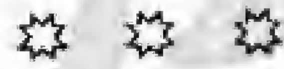
"بک بک مت کرو۔ فوراً" اپنے دادا کے گھر جاؤ۔"

"جی بالکل، میں تو بیٹھا ہی فارغ ہوں، اور آفس بھی میرے مرحوم ابا جان کا ہے نا، جو میں جب چاہے منہ اٹھا کر نکل جاؤں۔" وہ جلا بھنا بیٹھا تھا۔ آگے پیچھے کاغذوں، فائلوں کا ڈھیر۔ کمپیوٹر پہ کھلے ڈھیروں کام۔ اوپر سے تازہ تازہ پڑی باس سے ڈانٹ۔

"تم جا رہے ہو یا نہیں؟"

"ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے نکلا تو دوبارہ یہ لوگ داخل نہیں ہونے دیں گے، اور جو میری باس ہیں نا، وہ پہلے ہی۔"

"تمہارے دادا نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہاری زمر پھپھو سے شادی کرلوں۔ کیوں ہوگئی زبان بند؟ اب اسی کو لے کر ان کی طرف جاؤ اور جو بھی مناسب لگے کرو۔" اور دوسری طرف سعدی کی زبان واقعی بند ہوگئی تھی۔ فارس نے فون رکھا اور اندر چلا گیا۔



قدرے فاصلے پہ واقع کاردار قصر کے لاؤنج میں تھکی تھکی سی جواہرات اپنی مخصوص اونچی کرسی پہ بیٹھی تھی۔ ٹھوڑی تلے ہتھیلی جمائے، وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ سہ پہر میں آس پاس سناٹا سا تھا۔ ہاشم، نوشیرواں، سونیا، کوئی بھی گھر پہ نہ تھا۔ وہ بہت عرصے بعد اس وقت گھر پہ تھی اور یہ سناٹا کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ بجائے آفس واپس جانے کے، وہ ادھر ہی بیٹھی رہی۔ آج کی کارروائی نے اسے تھکا دیا تھا۔

پچھلے ایک ہفتے میں اس نے بارہا ماضی کے کئی ادوار کو ذہن میں دہرایا تھا۔

سات سال پہلے۔۔۔ جب وہ سب پہلی دفعہ ملے تھے۔

پانچ سال پہلے۔۔۔ جب وہ خوشی سے ایک دوسرے پہ عنایات کیا کرتے تھے۔

چار سال پہلے۔۔۔ جب ان کے خاندانوں میں خونی لکیر آکھنچی تھی۔

مگر ماضی کے ابواب کا آخری حصہ ابھی رہتا تھا اور جواہرات کاردار کے لیے یہی سب سے تکلیف دہ تھا۔

ڈیڑھ سال پہلے کیا ہوا تھا، سعدی اب ان کے گھر کیوں نہیں آتا تھا، اور وہ تمام مسئلے جو ہاشم نہیں سنبھال سکا تھا۔

وہ نہ چاہنے کے باوجود بھی یاد کرنے لگی۔۔۔

اس کی نم آنکھیں کھڑکی پہ جمی تھیں اور اس کے شیشے پہ پرانی کہانیاں ابھر ابھر کر ڈوبنے لگیں۔



کوئی ہے رنگ، کوئی روشنی، کوئی خوشبو
جدا جدا ہے تاثر ہر اک لمحے کا

موجودہ دن سے ڈیڑھ سال قبل۔

قصر کاردار میں وہ شام بہت سے رنگوں، قمقموں اور چہل پہل کے ساتھ اتر رہی تھی۔ میری انجیو ٹرے اٹھائے، مسکراتی ہوئے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اس کے عقب میں نیچے کافی آوازیں آرہی تھیں، جیسے مہمان آئے ہوں۔ وہ اوپر آئی اور ہاشم کے کمرے کے سامنے رکی۔ دروازہ ادھ کھلا تھا۔ ڈریسنگ مرر کے سامنے کھڑے سعدی اور ہاشم کی پشت جھلک رہی تھی۔ سعدی کچھ کہہ رہا تھا، اور ہاشم مسکرا کر سنتا، کف لنکس پہن رہا تھا۔

میری نے دروازہ بجایا۔ وہ دونوں مڑے۔ اس نے ذرا سا سر اندر کیا۔

"سر! آپ کو کاردار صاحب نیچے بلا رہے ہیں۔"

"میں بس تیار ہوں۔" اس نے دوسرا کف لنک اٹھا کر لگاتے ہوئے خود کو آئینے میں دیکھا۔ وہ مسکرا کر سر ہلاتی واپس مڑ گئی۔

سعدی نے واپس اسے دیکھا، وہ آفس سے ابھی آیا تھا اور چونکہ سعدی کی پوری فیملی ڈنر پہ مدعو تھی، اس

لیے وہ آتے ساتھ ہی جلدی جلدی ڈنر کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ نیچے سب کھانا شروع کرنے کے لیے اس کے منتظر تھے۔ سعدی بلانے آیا اور پھر وہیں کھڑا ہو گیا' یہاں تک کہ میری کو بھیجا گیا۔

"مجھے ڈنر کا پتا ہوتا تو میں جلدی آجاتا۔ شہری بتانا بھول گئی تھی۔" اس نے پرفیوم اٹھا کر کیپ اتارتے آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے کہا۔ "سو تمہاری بہن نے بورڈ ٹاپ کیا ہے' ہوں؟" اس نے ڈنر کی وجہ پھر سے پوچھی۔

"جی' مگر وہ تو پرانی بات ہو گئی' اب تو انٹری ٹیسٹ کا رزلٹ بھی آگیا ہے' اور جب انکل کو اس کے انجینئرنگ میں ایڈمیشن کا علم ہوا تو انہوں نے ہمیں ڈنر پہ مدعو کر لیا۔" پرفیوم کا اسپرے کرتے ہاشم نے مسکرا کر سعدی کو دیکھا۔ وہ سیاہ کوٹ اور سفید شرٹ میں ملبوس تھا' بال پہلے سے چھوٹے تھے اور چہرے کی متانت و سنجیدگی بڑھ چکی تھی۔ انداز ابھی بھی معصوم تھا۔

بولتے بولتے سعدی رکا' سانس اندر کو کھینچا' پھر ستائشی انداز میں ہاشم کو دیکھا۔

"کتنا اچھا پرفیوم ہے۔"

"سو تو ہے۔" ہاشم نے مسکرا کر آئینے میں خود کو دیکھتے' گردن پہ ایک اور اسپرے کیا' پھر کیپ اٹھایا' شیشی پہ چڑھایا۔ شیشی کو ڈبی میں ڈالا' اور سعدی کی طرف بڑھایا۔

"اب یہ تمہارا ہے۔"

وہ ایک دم بدک کے پیچھے ہوا۔ ہاتھ اٹھا کر جلدی سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ "نہیں نہیں ہاشم بھائی! میں اس لیے تو نہیں کہہ رہا تھا۔"

"رکھ لو یار!"

"نہیں' پلیز' میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ اتنا شرمندہ تھا کہ حد نہیں۔ "اگر آپ اس طرح کریں گے تو میں دوبارہ کبھی آپ کی کسی چیز کی تعریف بھی نہیں کر سکوں گا۔"

ہاشم نے اس کی پوری بات تسلی سے سنی' پھر سر ہلایا' اور پرفیوم کی ڈبی اس کے کوٹ کی جیب میں ڈال دی۔

"مجھ سے بحث میں تم کبھی نہیں جیت سکتے' سو کوشش کیوں کرتے ہو؟ چلو نیچے' سب انتظار کر رہے ہوں گے۔" اس کا کندھا تھپتھپا کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ بے حد خفت سے کھڑے سعدی نے خود کو دس دفعہ کوسا' مگر اب وہ تحفہ واپس نہیں کر سکتا تھا' اور پھر کمرے پہ ایک سرسری نظر ڈالتا واپس پلٹا۔ ان چند منٹوں میں بھی اس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہاں شہرین کی کوئی چیز نہیں رکھی تھی۔ وہ غالباً" مختلف کمروں میں رہ رہے تھے۔ شہرین بتانا نہیں بھولی تھی' وہ ایک دوسرے سے بات تک نہیں کرتے تھے اور یہ سب کو پتا تھا۔

وہ دونوں اکٹھے سیڑھیاں اتر رہے تھے' جب ہاشم نے سرسری سا سوال کیا۔ "فارس کیسا ہے۔ ملاقات ہوئی؟"

"جی' بس ایک دو بار ہی ملنے جیل جا سکا ہوں آپ کو تو پتا ہے' انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد ان تین چار ماہ میں میں جاب وغیرہ میں بہت مصروف تھا۔"

"ہوں۔ اس کا کیس کیسا جا رہا ہے؟"

"وکیل سے ملا تھا' وہ تو امید دلا رہا ہے کہ چند ماہ میں ان کو بری کروا لے گا' ہے نا؟" قدرے امید سے ہاشم کو دیکھا۔ وہ زبردستی مسکرا دیا۔

"بالکل۔" اور دونوں آگے بڑھتے آئے۔

ڈرائنگ روم میں روشنیوں کی برسات تھی گویا۔ فانوس' میز کی موم بتیاں' سب جل رہا تھا۔ سربراہی کرسی پہ اورنگ زیب کاردار براجمان تھے۔ دائیں ہاتھ پہ جواہرات تھی' اور بائیں ہاتھ کی پہلی کرسی خالی تھی۔ ہاشم نے وہی کرسی سنبھالتے ہوئے' اورنگ زیب کی سیدھ میں دوسری سربراہی کرسی پہ بیٹھی حنین کو دیکھا' جس کو وہ زمر کے حادثے کے بعد یعنی ڈھائی سال بعد اب دیکھ رہا تھا۔ اس کی عینک نا تھی۔ بال کٹے اور ربڑ کی ہیر بینڈ لگے کھلے بال ویسے ہی تھے' البتہ قد کافی لمبا ہو گیا تھا اور اعتماد پہلے سے بڑھ گیا تھا۔

"مبارک ہو حنین!" مسکرا کر کہتے ہوئے وہ فوراً نمکین پھیلانے لگا' اسے معلوم تھا حنین کڑوے منہ سے "تھینکس" کہہ کر رخ پھیر لے گی اور ایسا ہی ہوا۔ وہ علیشا والا بغض ابھی تک دل میں رکھے ہوئے تھی۔

"آپ اپنے چھوٹے بیٹے کو نہیں لائیں؟" سعدی بھی بیٹھ گیا تو جواہرات گردن موڑ کر ساتھ بیٹھی ندرت سے پوچھنے لگی۔

"اس کے دوست کی سالگرہ تھی' اس کو وہاں ڈراپ کر کے ہم آئے ہیں۔" ندرت پھیکا سا مسکرا دیں۔ ان کے مقابل بیٹھی شہرین سب سے بے نیاز موبائل پہ بٹن دبا رہی تھی۔ ساتھ موجود نوشیرواں بے زار لگ رہا تھا' گویا زبردستی بٹھایا گیا ہو۔

"تم باہر پڑھنے کیوں نہیں جاتیں' ہوں؟" اورنگ زیب نے اپنی سیدھ میں بیٹھی حنین کو مخاطب کیا۔ ملازم اب آخری لوازمات میز پہ رکھ رہے تھے۔

"ماسٹرز کے لیے باہر جاؤں گی۔" وہ اشتہا انگیز چیزوں کو نہ دیکھنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔

"اوکے! کھانا شروع کرتے ہیں۔ حنین تم شروع کرو۔" اورنگ زیب نے اسے اشارہ کیا۔ وہ لمحے بھر کو رکی۔ امریکی ڈرامے یاد کرنے کی کوشش کی۔ یہ گورا ٹائپ لوگ کھانے کے شروع میں کیا کرتے ہیں؟ ٹوسٹ؟ گریس؟

"حنین کو بہت اچھا قرآن آتا ہے۔ ترجمے کے ساتھ۔" سعدی نے کھنکار کر اسے دیکھا' وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"حنہ! تم تھوڑا سا قرآن سنا دو اور پھر کھانا شروع کرو۔"

حنین نے پہلے سعدی کو دیکھا' پھر اورنگ زیب سمیت منتظر نظروں سے اسے تکتے لوگوں کو۔

"آہم۔ اوکے۔ ایک آیت پڑھ دیتی ہوں۔" اس نے دوپٹا سر پہ جمایا' ایک خفا نظر بھائی پہ ڈالی اور بظاہر مسکرا کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے سورۃ المرسلت میں' کلوا واشربوا ھنیئا بما کنتم تعملون۔" (کھاؤ اور پیو خوب مزے سے بوجہ اس کے جو اعمال تم نے کیے ہیں۔) صدق اللہ العظیم۔" چہرے پہ دونوں ہاتھ پھیرے۔ اورنگ زیب کو ترجمہ معلوم نہ تھا' بس سرہلا کر "بہوں گڈ" کہا اور کھانے کا آغاز کرنے لگے۔

حنین نے مسکراتی آنکھیں گھما کر بھائی کو دیکھا' جو ضبط سے اف کر کے رہ گیا۔ (آیات بھی اپنے مطلب کی یاد تھیں کٹو بیگم کو!) مگر اس کے اف سے بے نیاز وہ ڈشز میں سے چن چن کر چیزیں اپنی پلیٹ میں بھر رہی تھی۔

کھانے کے درمیان میں ہی شیرو کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اورنگ زیب نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ "میں سیر ہو چکا ہوں" کہہ کر لاؤنج کی طرف چلا گیا۔ سعدی نے رک کر اسے دیکھا۔ اس نے جاتے جاتے بھی ایک اکتائی ہوئی نظر سعدی پہ ڈالی تھی۔ سعدی کی نظریں جھکیں۔ شیرو کی پلیٹ میں ذرا سا سلاد تھا وہ بھی اس نے آدھا کھایا تھا۔ ان دونوں کی آخری دفعہ بات کب ہوئی تھی۔ اسے یاد بھی نہ تھا۔

"اور آج کل تم کیا دیکھ رہی ہو؟"

اورنگ زیب کے سوال پہ سعدی نے بے اختیار جیب میں ہاتھ ڈالا' شاید روئی کا کوئی گولا مل جائے جسے وہ کان میں ٹھونس سکے۔ کیونکہ ابھی کوریا نامہ شروع ہونا تھا۔ حنین نے تسلی سے منہ میں موجود نوالہ ختم کیا اور پھر وہ شروع ہوئی۔

"میرے نزدیک دنیا کا بہترین ڈراما ساؤتھ کوریا میں بنتا ہے' کورین فلمیں بھی زبردست ہیں مگر کورین ڈرامے اور ان کے اداکار' ان کی کہانیاں' کیا بات ہے۔ پچھلے ایک سال میں' میں نے ایک سو گیارہ کورین ڈرامے اور فلمیں دیکھی ہیں' پچاس فلمیں اور اکسٹھ ڈرامے۔ Lee Min Ho میرا فیورٹ ہے' اور اس کا ڈرامہ سٹی ہنٹر۔۔۔" میری اینجیو لا کر میز کے وسط میں croquembouche رکھ رہی تھی۔ گول گول بالز کا مینار۔ حنہ کا دل چاہا' جلدی سے چند گیندیں توڑ لے مگر۔۔۔ اخلاقیات! اونہہ۔

"ایک سو گیارہ فلمیں اور ڈرامے دیکھنے کے باوجود تم نے بورڈ کیسے ٹاپ کیا؟" ایک ٹکڑا توڑتے ہاشم نے یونہی پوچھا تو حنین نے چونک کر اسے دیکھا' پھر چہرے پہ ناپسندیدگی پھیل گئی۔

"میں بہت کچھ ایک ساتھ کرنے میں ماہر ہوں ہاشم بھائی!"

ہاشم کندھے اچکا کر کھاتا رہا۔ شہرین بس پلیٹ کو دیکھتی کھا رہی تھی۔ جواہرات مضطرب مگر مسکراتی نظروں سے بار بار لاؤنج کی سمت دیکھتی جہاں شیرو غائب ہوا تھا۔ سوائے سعدی کے' وہ کسی کی بات کا اچھے دل سے جواب نہیں دے رہی تھی۔ شیرو اور اورنگ زیب کا کسی نہ کسی بات پہ روز جھگڑا ہونا معمول بن گیا تھا۔ صبح بھی نئی گاڑی لینے کی فرمائش پہ اسے جھاڑ پڑی تھی۔ اور پھر سعدی کو برداشت کرنا۔ اس کا جینا محال ہو چکا تھا۔

کھانے کے بعد سب لاؤنج میں آبیٹھے تو وہ وہاں سے بھی اٹھ گیا۔ ٹی وی چلتا رہا' آوازیں' باتیں۔ اورنگ زیب صاحب کی کوئی کال آگئی' وہ اٹھ کر باہر گئے تو سعدی کے ساتھ صوفے پہ بیٹھی ندرت نے آہستہ سے سرگوشی کی۔

"کیا تم نے ہاشم سے فارس کے کیس کی بات کی؟"

"ان کا وکیل کر تو رہا ہے نا امی! اب اور کیا کرے۔"

"کیا کر رہا ہے وکیل؟ ڈھائی سال سے چند ماہ کی رٹ لگا رکھی ہے' ایسے تو اگلے پانچ سال گزر جائیں گے اور فارس باہر نہیں آئے گا۔" وہ اس کو شکوہ کناں نم آنکھوں سے دیکھ کر بولیں تو سعدی نے خفگی سے ان کو دیکھا۔

"تو میں کیا کروں امی! ہاشم بھائی وکیل کو پیسے دے رہے ہیں' اب تاریخ نہیں ملتی اگلی پیشی کی تو ہم کیا کریں۔"

"تم سعدی اپنے ماموں کو بھولتے جا رہے ہو۔ تم سب اپنی زندگی میں مگن ہو کر اس کو اس کے حال پہ چھوڑ چکے ہو۔"

"امی!" اس کا دل دکھ گیا۔ "ایسا نہیں ہے۔ میں نے جاب شروع کی ہے' چھ بجے تو گھر آتا ہوں' اتنے کام ہیں میں پھر کر بھی کیا سکتا ہوں؟"

ندرت نے جواب نہیں دیا۔ آنکھ کا کنارہ پونچھتی' خاموش ہو کر بیٹھ گئیں۔ سعدی نے بھی رخ پھیر لیا۔ (اب وہ اور کیا کرے؟ وہ وکیل تو نہیں ہے نا' پر امی کو سمجھ ہی نہیں آتی۔) اس نے چڑ کر سوچا۔ (امی کو تو ہر وقت ایک ہی سوچ پریشان کیے رکھتی ہے کہ...) اسی وقت ندرت بڑبڑائیں۔

"پتا نہیں وہ اس وقت کس حال میں ہو گا؟ کھانا بھی کھایا ہو گا یا نہیں؟ نہ جانے کتنے ظلم کر رہے ہوں گے پولیس والے اس پر۔"

(بالکل! یہی سوچ!) وہ تنگ کر رخ پھیر گیا۔ شہرین اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا تو وہ کسی اور جانب دیکھنے لگی۔ ندرت ہنوز وہی سوچ رہی تھیں فارس... اس مظلوم کا اس وقت کیا حال ہو گا؟



قصر عمر گواہی دے گا کیسے کیسے کرب سے
کیسی کیسی رت گزری ہے ہم پر اتنے سالوں میں

جیل کے برآمدے میں مدھم بتیاں جل رہی تھیں' پہرے دار اسی حوالاتی کو ٹھڑی کے باہر جمع تھے' اور وہ اندر کھڑا' سفید کرتے کی آستین موڑے' سلاخیں پکڑے' غصے سے اونچا اونچا کہہ رہا تھا۔

"اے سنگل پسلی! بات دماغ میں فٹ کر لو' آئندہ اس طرف سے..." (کنارے والے کمروں کی طرف اشارہ کیا) "اشرف چیمہ کا کوئی بندہ ادھر آیا نا تو اپنے قدموں پہ واپس نہیں جائے گا۔" جواب میں اس سیل سے موچھوں والے اشرف چیمہ نے چلا کر کچھ کہا تو وہ اور بھی بھڑک گیا۔

"اس کو چپ کرا لو محمد دین! ورنہ آج یہ میرے ہاتھوں نہیں بچے گا۔"

"اچھا بس کر دے تو ہی چپ ہو جا۔"

"میرے گروپ کے بندے اس کے باپ کے ملازم نہیں ہیں جو اس کے حصے کی مشقت کریں تم اس کو

آخری دفعہ سمجھا دو' ورنہ۔۔۔" شور اب بلند ہوتا جا رہا تھا' پھر بمشکل سپاہیوں نے آ کر معاملہ رفع دفع کرایا۔
فارس ہونہہ کر تا سر جھٹکتا واپس زمین پہ آ بیٹھا۔ اس تاریک کمرے میں۔
دوسرے کونے میں کوئی اور بھی بیٹھا تھا۔
"فارس بھائی! یہ سپاہی آپ لوگوں سے ڈرتے کیوں ہیں؟"
"ہم چھوٹ کر چلے جائیں گے' یہ یہیں ڈیوٹی دیتے رہیں گے' اصل قیدی تو یہی ہیں۔" وہ بے زاری سے بولا' پھر تیکھی نظروں سے اس لڑکے کو دیکھا جس کا چہرہ تاریکی میں تھا۔
"اپنے حصے کا کام وقت پہ ختم کیا کرو' تمہارے باپ کی جیل نہیں ہے یہ۔"
"یو نو' میرے ایک قیدی کی حیثیت سے بھی بہت رائٹس ہیں جن کی وائلیشن کے جرم میں میں گورنمنٹ آف پاکستان کو Sue کر سکتا ہوں اور جب سے میں ادھر آیا ہوں' میرا ایک بھی رائٹ پورا نہیں کیا گیا۔" وہ بہت سنجیدگی سے کہتے ہوئے آگے کو ہوا تو چہرا روشنی میں آیا۔ وہ خوش شکل نوجوان تھا۔ بال نو عمر لڑکوں کی طرح ماتھے پہ کٹے تھے اور آنکھوں میں لاپروائی تھی۔
"جاگ جاؤ۔ بیٹا! یہ پاکستان ہے!"
"پتا ہے۔ مگر جتنا وقت آپ جیل میں جھگڑوں اور گروہ بندی پہ لگاتے ہیں نا' اگر اتنا اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانے پہ لگا دیتے تو۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔
"اپنے کام سے کام رکھو۔ زیادہ اسٹیپنی نہ ہو۔" وہ چڑ کر رخ پھیر گیا۔
"ویسے آپ نے یہ دونوں قتل کیے تھے؟" کچھ دیر بعد وہ دلچسپی سے پوچھنے لگا۔ فارس نے مڑ کر ترشی سے اسے گھورا۔
"پچھلے چھ گھنٹے سے کتنی دفعہ پوچھ چکے ہو' میں بار بار بتانے کا پابند نہیں ہوں۔ تم بتاؤ' کس جرم میں آئے ہو؟" کڑے انداز میں نئے سیل میٹ کی تفتیش شروع کی' جو آج کے جھگڑے کے باعث ابھی تک ہو نہیں سکی تھی۔
"میں۔۔۔" اس نے بے پروائی سے سامنے کے بال ہٹائے۔ "کریڈٹ کارڈ فراڈ کے جرم میں۔ حوالاتی قیدی ہوں۔ کیس عدالت میں چل رہا ہے۔"
"تو تم نے جرم کیا تھا؟"
"کیا تو تھا۔" وہ چڑانے والے انداز میں مسکرایا۔
"لگ بھی رہا ہے۔ پراسیکیوٹ کون کر رہا ہے؟" یہ سوال وہ اکثر پوچھا کرتا تھا۔
"وہ جو پورے کورٹ میں سب سے سڑی ہوئی پراسیکیوٹر ہے۔ زمر یوسف۔" اس نے منہ بنایا۔
فارس خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔
"تمہارا وکیل اس کے مقابلے میں کیس جیت جائے گا؟"
"ہاں۔ ایسا ویسا۔ ہاشم کاردار ہے میرا وکیل۔" اس نے کالر جھاڑے۔ فارس چونکا۔
"اس کو دینے کا پیسہ کہاں سے آیا؟ شکل سے تو تم یتیم خانے سے بھاگے لگتے ہو۔"
"وہ میں' اصل میں اورنگ زیب کاردار کا کمپین منیجر رہا ہوں' اس لیے انہوں نے زبردستی ہاشم کو میرا وکیل مقرر کر دیا ہے۔" احمر شفیع ہنس کر بولا۔ فارس نے چونک کر اسے دیکھا۔
"تو تم اورنگ زیب کاردار کے لیے کام کرتے تھے؟"
"جی۔ آپ کے ماموں کے لیے۔ اور نہیں' میں اتفاق سے آپ کے سیل میں نہیں آیا۔ ہاشم نے مجھے ادھر بھجوایا ہے' تاکہ میں آپ کا خیال رکھ سکوں۔" فارس نے جواباً" تیز نظروں سے اسے گھورا۔
"خیال رکھ سکو یا نظر؟"
"ظاہر ہے نظر۔" وہ لاپروائی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ باہر اندھیرے میں مدھم جلتی بتیوں میں پہرے دار ٹہلتے نظر آ رہے تھے۔
"کیا کرتے تھے ماموں کے لیے؟" وہ اس لڑکے کو مسلسل چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"الیکشن اسٹریٹجی' کمپین مینجمنٹ' پبلک امیج کنسلٹنگ وغیرہ۔"
"یعنی ان کو ایڈوائز کرتے تھے۔ کبھی جیل میں سڑتے بھانجے کو نکلوانے کا مشورہ نہیں دیا؟"
"وہ۔" احمر نے کھسیانے انداز میں ٹھوڑی کھجائی۔ "وہ تو مدد کرنا چاہ رہے تھے آپ کی مگر۔"
"مگر؟" وہ چونکا۔
"دیکھیں ان کے الیکشن کے لیے یہ اچھا نہیں تھا' سو میں نے مشورہ دیا کہ۔ وہ خود کو لاتعلق کرلیں آپ سے۔ بھئی وہ میرے کلائنٹ تھے' مجھے ان ہی کا فائدہ دیکھنا تھا نا۔" وہ جلدی جلدی وضاحت دے رہا تھا اور فارس ایک دم سے اٹھ کر بیٹھا' بس نہیں چلتا تھا کہ اس کی گردن مروڑ دے۔
"تو یہ نیک مشورے دینے والے تم تھے؟" ضبط بھری کڑی نظروں سے اسے گھورا۔ "یوں کرو' اپنا سامان سمیٹ لو' اور صبح کسی اور سیل میں اپنی شکل گم کرلینا۔ یہاں نہیں رہو گے تم۔" درشتی سے کہتے ہوئے وہ اٹھ کر دور چلا گیا۔
احمر نے معصومیت سے گردن سینے پہ گرادی۔
"سچ بولنے کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔"

☼ ☼ ☼

سب سخن' اس لب سخن کے اسیر
سارے موسم گلاب ہیں جیسے

اورنگ زیب کال سن کر آگئے تھے۔ لاؤنج میں سوائے خاموش بیٹھی ندرت کے سب باتیں کررہے تھے۔ حنین اور سعدی' ہاشم کی سیاست کے موضوع پہ کی گئی کسی بات پہ بحث کررہے تھے۔ اورنگ زیب آکر بیٹھے تو حنین پوچھنے لگی۔
"کیا آپ نے وہ تمام ڈرامے دیکھے جن کے لنکس میں نے آپ کو میل کیے تھے؟"
"اتنا وقت نہیں ہوتا میرے پاس۔ ہاں' دس پندرہ سال بعد کبھی فرصت ملی تو دیکھوں گا۔"
"ویسے اگر آپ نے "کے" ڈرامے (کورین ڈرامے) نہیں دیکھے۔ کے پوپ نہیں سنا تو کچھ دیکھا سنا نہیں ہے۔"
"کیا تمہیں سارے کورین ایک جیسے نہیں لگتے؟ ایک ہی چائنیز شکل والے؟" اور ان کے اس سوال پہ حنین حسب معمول جذباتی ہوگئی۔
"ہم ساری قوموں کا یہی مسئلہ ہے۔ ہمیں دوسری قوم والے ایک جیسے لگتے ہیں۔ سیاہ فام بھی ایک سے اور چائنیز بھی ایک سے۔ ورنہ وہ بھی اتنے ہی مختلف ہوتے ہیں جتنے ہم۔ اور خوب صورت بھی بہت ہوتے ہیں۔"
حنہ بولے جارہی تھی۔ ہاشم آہستہ سے اٹھ کر کچن کی طرف آگیا۔ کچن گھر کے آخری کونے میں تھا۔ وہاں سینٹر ٹیبل پہ نوشیرواں کھانا کھا رہا تھا۔ میری اینجیو قریب کھڑی تھی۔ ہاشم نے چوکھٹ میں کھڑے تھکی ہوئی سانس بھری۔ شیرو نے چونک کر اسے دیکھا پھر شرمندگی سے پلیٹ پرے کی۔
"کھاؤ' شاباش' میں منع تو نہیں کرنے آیا۔" مگر وہ ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے بڑبڑایا۔
"نہیں کرسکتا اس کو برداشت۔ اور آپ لوگ اس کو فیملی سمیت مدعو کرلیتے ہیں۔"
ہاشم نے میری کو اشارہ کیا۔ وہ باہر نکل گئی۔ پھر وہ قدم قدم چلتا اس کے قریب آکھڑا ہوا۔
"تمہیں ابھی تک یہی غصہ ہے کہ اتنے سال پہلے اس نے تمہاری شکایت ممی کو کیوں لگائی؟"
"کیا نہیں ہونا چاہیے؟" وہ بگڑا۔
"کیا تم نے پھر ڈرگز لیں؟"
"نہیں تو۔"
"اور ڈرگز نہ لینے سے تمہاری تعلیم پہ اچھا اثر پڑا' آج تم ایک کامیاب انسان بن چکے ہو۔ اس نے تمہارے لیے ایک اچھا کام کیا' اور تم ناراض ہو؟"
نوشیرواں کے تنے اعصاب ذرا ڈھیلے پڑے۔ "وہ تو ٹھیک ہے مگر۔"
"مگر یہ کہ شیرو! کیا یہ وہی سعدی نہیں ہے جس نے تمہاری جان بچائی تھی' تمہیں بروقت اسپتال لے

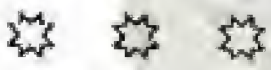
جا کر؟"
نوشیرواں چپ ہو گیا۔
"اب اس ناراضی کو بھول جاؤ۔"
"کیسے بھول جاؤں؟ پانچ سال اس ٹینشن میں گزارے کہ میری ہر موومنٹ کو وہ مانیٹر کر رہا ہے۔ جو ممی نے میری بے عزتی کی۔ اس کے بعد کتنا عرصہ وہ مجھ سے مجرموں کی طرح سوال جواب کرتی رہیں اور۔"
"تمہارا اس سے کسی لڑکی پہ جھگڑا تو نہیں ہے؟" ہاشم نے مسکراہٹ دبا کے پوچھا۔ اس کا موڈ مزید بگڑ گیا۔
"اتنا لوزر لگتا ہوں میں آپ کو؟" (اور یہ شکر تھا کہ گئے برسوں میں ایک لڑکی کے منگیتر سے پڑنے والی مار کی بھنک ہاشم کو نہیں پڑی تھی۔ جب وہ مار پڑی تھی تو سعدی سامنے بیٹھا کیفے میں کافی پی رہا تھا۔ اف!)
"چلو پھر موڈ ٹھیک کر لو۔ لاؤنج میں اس کی وہ تیز طرار بہن پھر سے بولنا شروع ہو چکی ہے۔ اس کو برداشت کرنے کے لیے مجھے تمہاری مدد چاہیے۔"
نوشیرواں سر جھٹک کر ہنسا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔
دونوں باہر نکلے تو راہداری میں میری کھڑی ایک فلپینو لڑکی کو کچھ سمجھا رہی تھی۔ وہ نروس، مگر ذہین سی لگتی لڑکی تیز تیز سر ہلائے جا رہی تھی۔ ہاشم نے سوالیہ نظروں سے میری کو دیکھا۔
"سر! یہ فینو نا ہے۔ فی۔ او۔ نا۔" توڑ توڑ کر اس کا نام ادا کیا۔ "یہ نئی ملازمہ ہے۔ مسز جواہرات نے رکھی ہے۔ آج سے جوائن کیا ہے اس نے۔"
"ہوں۔" وہ ایک اچٹتی نظر اس پر ڈالتا آگے نکل گیا۔ شیرو نے تو اسے دیکھا بھی نہیں۔
اندر جب حنین، اورنگ زیب سے بات کر رہی تھی تو شہرین مسلسل سعدی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر جواہرات سامنے بیٹھی تھی اور اس کے سامنے شہرین خود کو سعدی سے لاتعلق ظاہر کرتی تھی، سو خاموش رہی۔
ہاشم اور نوشیرواں واپس آئے تو حنین کا ڈرامہ نامہ ابھی تک جاری تھا۔
"بیٹا! آپ کو پتا ہے، شیرو کل تائیوان جا رہا ہے۔ ابھی آپ کسی تائیوانی ڈرامے کی بات کر رہی تھیں نا۔" ہاشم نے مسکراتے ہوئے اسے ٹوکا اور سامنے صوفے پہ بیٹھا۔ حنین کی چلتی زبان رکی، سر گھما کر شیرو کو دیکھا۔
"تائیوان میں کیا رکھا ہے؟ جانا ہے تو ساؤتھ کوریا جائیں۔"
"آفس کے کام سے جا رہا ہوں۔" شکایتی نظر باپ پہ ڈالی۔ "کوریا کئی دفعہ جا چکا ہوں پہلے۔"
"تو دوبارہ چلے جائیں۔ میرے لیے Kimchi لے آئیے گا۔" وہ پرجوش سی ہو کر کہنے لگی۔ سعدی نے تنبیہی نظروں سے اسے گھورا مگر وہ متوجہ نہیں تھی۔ اکھڑے اکھڑے سے بیٹھے شیرو نے کندھے اچکائے۔
"ہاں وہاں بھی ایک دو دن کے لیے چلا جاؤں شاید۔ لے آؤں گا۔"
"واؤ۔ یو آر لکی۔" آگے پیچھے نوشیرواں جیسے لوزر کو لفٹ نہ کرانے والی حنین بے اختیار ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔
ندرت ہنوز خاموش بیٹھی تھیں۔ ان کو اس ڈنر میں کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔



کچھ بھی کہو، سب اپنی اناؤں پر اڑے ہیں
سب لوگ یہاں صورت اصنام کھڑے ہیں

اس سرد سی رات جب فارس اپنے نئے ساتھی قیدی کو سخت سست سنا کر پرے لیٹ چکا تھا اور ندرت قصر کاردار میں عدم دلچسپی سے بیٹھی تھیں۔ ان سب سے دور، یوسف صاحب کے گھر میں صداقت بھاپ اڑاتی کافی زمر کے سامنے رکھ رہا تھا۔
دفعتاً" سربراہی جگہ پہ بیٹھے بڑے ابا ذرا کھنکھارے۔ وہ باسی اخبار دیکھتے ہوئے چونکی، نظر اٹھا کر ان کو دیکھا۔

"کس بات کی تمہید باندھنا چاہ رہے ہیں؟"
"وہ فارس کے کیس کی سماعت اس مہینے ہے نا؟"
اس ذکر پہ اس کے ابرو تن گئے۔ واپس اخبار دیکھنے لگی۔
"آپ یہ ظاہر کرنا چاہ رہے ہیں کہ لاؤنج کی میز پہ رکھا سمن آپ نے نہیں دیکھا جس میں مجھے پیش ہونے کے لیے کہا گیا ہے؟"
"زمر!" وہ بے بسی سے آگے کو ہوئے۔ "کیا تم اس کے خلاف گواہی دو گی؟"
"جو سچ ہے' وہی کہوں گی۔" وہ اخبار پڑھتی رہی۔
"ڈھائی سال ہو گئے اس بات کو' تم ایک دفعہ بھی اس سے نہیں ملیں۔ اس کی بات تو سن لو۔"
"میں جج ہوں' نہ پراسیکیوٹر' نہ ڈیفینڈر۔ میں صرف ایک گواہ ہوں۔ اپنی بات وہ عدالت میں کہے۔ مجھ سے کیوں امید رکھتا ہے؟"
"سعدی سے تو مل لیا کرو۔" انہوں نے ایک اور کوشش کی۔
"وہ میری موجودگی میں گھر آتا تو مل لیتی۔ نہیں آتا تو میں کیا کروں؟"
"وہ تو تمہارا سعدی ہے' ہمارا سعدی۔ اس کا کیا قصور ہے؟"
"جب مجھے اس کی ضرورت تھی' وہ میرے ساتھ نہیں کھڑا تھا۔ اسپتال میں رشتہ داروں کی لعن طعن کے وہ تکلیف دہ دن' وہ راتیں جب میں درد کی شدت سے بیدار ہو جاتی تھی' میں نے کیسے گزارے' مجھے یاد ہے۔ اب مجھے اس کی ضرورت نہیں رہی۔ میں اکیلی ٹھیک ہوں۔" صفحہ پلٹ کر اندرونی طرف سامنے کی۔ چہرے پہ سنجیدگی اور سپاٹ پن تھا۔ وہ افسوس سے اسے دیکھنے گئے۔
"کیا تمہیں اپنی گواہی پہ خود یقین ہے؟"
"نہ ہوتا تو کبھی گواہی نہ دیتی۔ اور رہی گواہی تو وہ میں پچھلی پیشی پہ دے چکی ہوں۔ اس دفعہ مجھے صرف کراس ایگزامن کرنے کے لیے بلایا جا رہا ہے۔"
ساتھ ہی مگ اٹھا کر گھونٹ بھرا۔
"ندرت کو ٹرپل ویسل (دل کی نالیوں کی) بیماری ہو گئی ہے۔ اس کا دل ٹھیک کام نہیں کرتا۔ اگر فارس کو سزا ہو گئی تو وہ صدمے سے مر جائے گی۔"
"یہ فارس کو مجھ پہ گولی چلانے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔" دوسرا گھونٹ بھر کر مگ واپس رکھا۔ نگاہیں اخبار پہ نیچے کی سمت دوڑائی گئیں۔ ناک کی لونگ دمک رہی تھی۔
"سعدی کے گھر ہی چلی جایا کرو۔"
"ضروری کام ہوا تو چلی جاؤں گی۔ ناراض تھوڑی ہوں میں اس سے۔" ساتھ ہی اس کا فون بجا۔ وہ بات کرنے میں مصروف ہو گئی اور بڑے ابا اپنی ادھوری چائے کو دیکھے گئے۔
آج تو چائے کے ساتھ' بات بھی ادھوری رہ گئی تھی۔



ہم نہ کہتے تھے گھر جاؤ گے
کس جگہ پہنچے ہو آخر دیکھو

(یہ حنین کو دیے جانے والے ڈنر سے چار روز بعد کا ذکر ہے۔)

رات کا اندھیرا ہر سو پھیلا تھا۔ سردی مزید بڑھ گئی تھی۔ چھوٹے باغیچے والے گھر میں سعدی کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ وہ کمبل تانے گہری نیند سو رہا تھا۔ یکایک وہ ذرا سا ہلا۔ پھر کمبل ہٹایا تو بکھرے بال اور چہرہ واضح ہوا۔ وہ اچنبھے سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ دماغ اتنا سویا ہوا تھا کہ فوری طور پر سمجھ میں نہ آیا کہ یہ آواز کدھر سے آ رہی تھی' زوں زوں۔
اس نے تکیہ ہٹایا۔ نیچے دبا موبائل بج رہا تھا۔ آہ۔ وہ نیند سے کراہا۔ موبائل اٹھایا۔ رات کے ڈیڑھ بجے اور انجان نمبر۔ اکتا کر اس نے فون کان سے لگایا۔
"ہیلو؟" آواز بھاری اور نیند میں ڈوبی نکلی۔
"سعدی! ابھی اسی وقت میرے گھر آ سکتے ہو؟"
اس کی نیند میں ڈوبی آنکھیں ذرا سی کھلیں۔ "کو۔۔۔ کون ہے؟"

"سعدی! اٹھو اور میری بات سنو۔" ذرا زور سے کہا گیا تو وہ چونک کر اٹھا۔

"ہاشم بھائی! خیریت؟" حیرت سے آنکھیں ملیں۔ ٹیبل لیمپ جلایا۔ گھڑی روشن ہوئی۔ ڈیڑھ بجے۔

"ابھی اسی وقت میرے گھر آؤ اپنی بہن کو لے کر۔ ٹریفک نہیں ہوگا' بیس منٹ لگیں گے۔ تم دونوں آؤ اور سنو! اکیسواں منٹ نہیں ہونا چاہیے۔" اس کا لہجہ' انداز۔۔۔ سعدی فکر مند ہو گیا۔

"مگر ہوا کیا ہے؟"

"تم ابھی تک بستر سے نہیں نکلے کیا؟ جلدی کرو یار! میں انتظار کر رہا ہوں۔" اور فون بند ہو گیا۔ وہ حیران و پریشان سا بیٹھا رہ گیا' پھر تیزی سے بستر سے نکلا۔ دو' تین منٹ بعد وہ منہ پہ چھینٹے مار' کپڑے بدل کر جیکٹ پہنے' کار کی چابی اٹھائے باہر آیا تو لاؤنج سے آوازیں آرہی تھیں۔ معلوم تھا وہ جاگی ہوئی ہوگی۔

کمپیوٹر کے سامنے کرسی پہ پیر اوپر کرکے بیٹھی' ہیڈ فون چڑھائے' ہنستے ہوئے اسکرین کو دیکھتی' ساتھ پیالے سے پاپ کارن اٹھا کر منہ میں رکھتی' حنین روز رات گئے تک یوں ہی پائی جاتی تھی۔ آہٹ پہ وہ چونکی' پھر بھائی کو آتے دیکھ کر پرجوش سی بتانے لگی۔

"پتا ہے' سوپر جونیئر (کوریا کا ایک بینڈ) ایک شو میں آئے ہوئے ہیں اور ان کے لوگ اپنے مسئلے بتا رہے ہیں' جیسے ایک لڑکے کا دوست سانپ اور بچھو کھانے لگ گیا ہے تو وہ۔۔۔" سعدی نے آگے آکر کمپیوٹر کی تار کھینچی۔

"سوئیٹر پہنو اور باہر آؤ' میں کار میں انتظار کر رہا ہوں۔"

"ہا۔۔۔" وہ ہکا بکا رہ گئی۔ پھر غصے سے ہیڈ فون اتارے۔ "اتنی مشکل سے ویڈیو ڈاؤن لوڈ کی تھی اور۔۔۔"

"حنین! جلدی کرو' کوئی وجہ ہے تو کہہ رہا ہوں نا۔" سختی سے کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ کار اسٹارٹ کی تو وہ بھی آ ہی گئی۔ گرین لمبا اوور کوٹ پہنے۔ (جو تھا تو ایل شاپ کا' مگر امی کی تاکید تھی کہ ہر ایک کو کہنا ہے' سارہ لندن سے لائی ہے۔) اندر سوئیٹر۔ گردن کے گرد دوپٹا اور بال ہیر بینڈ لگا کر کھلے چھوڑے' چہرے پہ ڈھیروں ناراضی لیے۔ چپ چاپ فرنٹ سیٹ پہ آبیٹھی۔ سعدی خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ پھر حنین نے اپنے اور امی کے مشترکہ موبائل پہ گانا آن کر لیا۔

ساتھ میں سر دھننے لگی۔

"بند کرو اس سوپر جونیئر کے ماماشیتا کو۔"

"یہ ماماشیتا نہیں ہے' سٹی ہنٹر کا گانا ہے۔ اس میں Lee Min Ho آتا ہے۔ پتا ہے' اس کے باپ کو گورنمنٹ نے مار دیا ہوتا ہے' تو وہ کئی سال بعد انتقام لینے کوریا کے صدر کا سیکورٹی آفیسر تعینات ہو جاتا ہے۔۔۔ اور۔۔۔"

پھر رکی۔۔۔ "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"ہاشم بھائی نے بلایا ہے' کوئی مسئلہ ہے۔"

وہ حیران رہ گئی۔ "تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ کیا ہاشم بھائی خود ہر مسئلہ سنبھال نہیں لیا کرتے؟" اس کی نقل اتار کر سر جھٹکا۔

"میرا خیال ہے دنیا میں ابھی کچھ ایسے بھی مسئلے ہیں جنہیں وہ نہیں سنبھال سکتے۔" سعدی نے گہری سانس بھر کر شانے اچکائے۔

جب وہ کاردار قصر کے اندرونی دروازے میں داخل ہوئے تو ہاشم سامنے ہی کھڑا تھا۔ سیاہ ٹراؤزر پہ گرے ٹی شرٹ پہنے وہ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ انہوں نے شاید پہلی دفعہ اسے ٹی شرٹ میں دیکھا تھا۔

"اوپر میرے کمرے میں جاؤ' میں آرہا ہوں۔" اس نے سعدی کو اشارہ کیا۔ اس کا حلیہ' ساتھ ہی مصروف مگر پریشان انداز۔۔۔ اور پھر پلٹ کر لاؤنج میں پریشانی سے ٹہلتی' کچھ بولتی جواہرات۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا تم اتنی دیر کیوں کر رہے ہو ہاشم! ان کو پیسے دو اور میرے بیٹے کو واپس لاؤ۔" دبا دبا غرائی وہ رکی۔ دونوں بہن بھائی کو دیکھ کر جھٹکا لگا۔

"ان کو بلانے کی کیا ضرورت تھی؟"

سعدی' حنین کا ہاتھ تھامے فوراً" اوپر لے آیا۔ ہاشم کے کمرے کا دروازہ کھولنے سے قبل انہوں نے

پیچھے ہاشم کو کہتے سنا۔
"ممی! آپ آرام سے بیٹھ جائیں' میں کر رہا ہوں نا۔" اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھے وہ سمجھا رہا تھا۔
دروازہ بند ہوا تو آوازوں کا رستہ رک گیا۔
اندر کمرے کی ساری بتیاں خود بخود جل اٹھیں۔ وہ دونوں خاموش اور غیر آرام دہ سے کاؤچ پہ جا بیٹھے۔ میز پہ ہاشم کا لیپ ٹاپ رکھا تھا۔ وہ آن تھا' مگر اسکرین اسٹینڈ بائی پہ تھی۔ سیاہ تاریک۔
"یہ کیا ہو رہا ہے بھائی؟"
"کوئی مسئلہ ہے ان کے گھر میں۔۔۔" اور تب ہی وہ عجلت سے دروازہ کھولتا اندر آیا۔ سامنے میز کے کنارے آ بیٹھا۔ حنین کے بالکل سامنے۔ سعدی کو دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔
"حنین' بچے! اب جو میں پوچھوں مجھے سچ سچ بتانا۔"
حنین نے ناسمجھی سے اسے دیکھا اور پھر سعدی کو۔
"جی؟"
"کیا تمہارا علیشا سے کوئی کانٹیکٹ ہے؟"
"نہیں۔"
"تم سچ کہہ رہی ہو؟" ہاشم نے اس کو غور سے دیکھتے پوچھا تو حنین کے ابرو تن گئے۔
"میں آپ سے ڈرتی نہیں ہوں' جو جھوٹ بولوں گی۔ نہ اس سے رابطہ رکھنے کے لیے مجھے آپ کی اجازت چاہیے۔"
"حنین۔" سعدی نے اسے تادیبی انداز میں پکارا۔ مگر وہاں کہاں اثر ہوتا تھا۔
"او کے۔۔۔ مگر کیا تم جانتی ہو' وہ ابھی کہاں ہے؟ یا معلوم کر کے بتا سکتی ہو؟"
"مگر ہوا کیا ہے؟"
ہاشم نے گہری سانس لی' ترچھے ہو کر لیپ ٹاپ کی کیز کو چھوا۔ اسکرین روشن ہوئی۔
"شیرو تائیوان سے کوریا گیا تھا۔ واپس نہیں آیا۔ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے مجھے فیس بک پہ کسی انجان آئی ڈی کی جانب سے ویڈیو ملی ہے' تاوان کے لیے۔" حنین اور سعدی نے چونک کر اسے دیکھا۔ نوشیرواں اغوا ہو گیا تھا اور ہاشم نے انہیں بلایا تھا؟
وہ اب ویڈیو کھول رہا تھا۔ اسکرین پہ ایک کمرا تھا۔ لکڑی کا فرش' پیچھے سلائیڈنگ ڈور' کاؤچ' الماری' چھت' پیچھے نظر آتا ایک سوئچ بورڈ' وسط میں رکھی کرسی جس پہ نوشیرواں بیٹھا تھا' ہاتھ پیچھے بندھے تھے۔ بکھرے بال' روئی روئی آنکھیں۔ گردن جھکی ہوئی۔ کیمرا آن ہوا۔ تو اس نے چہرہ اٹھایا۔ وہ شدید تکلیف میں لگ رہا تھا۔
"ڈیڈ۔۔۔ بھائی۔۔۔ یہ لوگ آپ کو ایک اکاؤنٹ نمبر اور ایک رقم ای میل کر رہے ہیں اور۔۔۔" وہ رک رک کر کیمرے کی سمت دیکھنے لگا' جہاں سے اسے ہدایات مل رہی تھیں۔ یقیناً" اغوا کار وہیں کھڑے اسے متنبہ کر رہے تھے۔ چہرے پہ خوف لیے شیرو تھوک نگلتا پھر سے کہنے لگا۔ "آپ چار گھنٹے کے اندر اندر یہ رقم بھجوا دیں' ورنہ یہ مجھے مار دیں گے۔ میں کوریا میں ہوں۔ اگر آپ میں سے کوئی گھر سے بھی نکلا یا یہاں آنے کی کوشش کی یا کسی کو کال کرنے کی تو یہ مجھے مار دیں گے۔" آنسو خوف زدہ' ہراساں شیرو کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ سدا کا ڈرپوک شیرو بلی کا بچہ لگ رہا تھا۔
"بھائی پلیز۔۔۔ مجھے یہاں سے نکال لو اور کسی کو فون مت کرنا۔ یہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔ مجھے مار دیں گے۔ ان کے پاس آپ کے تمام نمبرز ہیں' یہ ہر چیز مانیٹر کر رہے ہیں۔" اور اسکرین سیاہ ہو گئی۔
سعدی نے بے یقینی کے عالم میں سر اٹھایا۔ ہاشم تھکا تھکا اور پریشان نظر آ رہا تھا۔
"کیا آپ نے پولیس کو کال کی؟ آپ کے تو کتنے ہی کانٹیکٹس ہوں گے ایجنسیز میں۔"
"کی تھی۔۔۔ میرے لوگ کورین پولیس سے بات کر رہے تھے' جب یہ دوسری ویڈیو موصول ہوئی۔ تمہیں کال کرنے کے دس منٹ بعد۔" چند بٹن دبائے اور پیغام کھولا۔
وہی کمرا اور ویسے ہی نڈھال' بندھا ہوا شیرو۔ البتہ اب اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔

"بھائی! انہوں نے منع کیا تھا کسی کو کال کرنے سے، آپ لوگ کیوں ایسا کر رہے ہیں؟ مجھ سے کوئی محبت نہیں ہے آپ کو؟ ایک مانسٹر کو بھی اپنے بچے سے محبت ہوتی ہے۔ پلیز ان کو رقم دیں اور مجھے یہاں سے نکالیں۔ ورنہ یہ پہلے میرے کان کاٹیں گے، پھر انگلیاں۔"

ویڈیو ختم ہوئی اور ہاشم کے چہرے کی تکلیف بڑھ گئی۔ شیرو کا خون نکلتے دیکھنا بہت اذیت ناک تھا۔ حنین خاموش تھی اور سعدی ہکابکا۔

"کیا وہ لوگ آپ کے فونز بگ کر رہے ہیں؟"

"میں نہیں جانتا۔ مگر۔ اب ہم کسی سے رابطہ نہیں کر رہے۔ میں نے سب کو منع کر دیا ہے۔"

"مگر۔" سعدی بے چینی سے آگے ہوا۔ "یہ خالی خولی دھمکی بھی تو ہو سکتی ہے۔ آپ خفیہ طور پہ کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش۔"

"وہ میرا بھائی ہے، میں اس کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔"

"اور۔ اس سارے معاملے میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟" حنین پہلی دفعہ بولی۔ دیکھ وہ ابھی تک اسکرین کو رہی تھی۔ (اس لوزر کے کان کی جگہ بال کاٹ دیں تو کتنا اچھا ہو۔ اونہوں نہیں۔ یہ تو آئینہ دیکھتے ہی مر جائے گا۔)

"مجھے شک ہے کہ اس میں علیشا ملوث ہو سکتی ہے۔"

"کبھی نہیں۔" حنہ نے ناگواری سے اسے ٹوکا۔ "وہ کمزور اور بزدل سی ہے۔ آپ کے بھائی کو اغوا' ناممکن؟"

"وہ کسی کے ساتھ مل کر یہ کر سکتی ہے۔ میں نے اس کی فیس بک پروفائل چیک کی تھی۔ دیکھو' اس نے کور فوٹو سینول (کوریا کا ایک شہر) کی لگا رکھی ہے۔" اس نے اسکرین پہ علیشا کی پروفائل کھول کر دکھائی۔

"یہ اس نے کوئی چھ ماہ پہلے لگائی تھی اور وہ اس لیے کہ ہم کے ڈرامے اور کے پوپ کے شوقین ہیں۔ ہمیں کے کلچر پسند ہے' میری بھی پروفائل پہ یہ ہی سب ہے' اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں کوریا میں ہوں اس وقت۔"

"مگر اس واہمے کی مجھے تصدیق کرنی ہے۔ اگر خاور ہوتا تو وہ یہ سب کر لیتا' مگر وہ دو روز قبل ہی اپنے کسی کام سے ملک سے باہر گیا ہے۔ میں اس کے بغیر بالکل مفلوج ہوں۔" میز کے کنارے پہ بیٹھا قدرے بے بسی سے کہتے ہاشم پہ سعدی کو ترس سا آیا۔

"ہاشم بھائی! ہم آپ کی ہر ممکن مدد کریں گے۔ آپ بتائیں کیا کرنا ہے۔"

اس بات پہ حنہ نے گھور کر سعدی کو دیکھا اور پھر ہاشم کو۔ وہ ابھی تک ناگواری محسوس کر رہی تھی۔

"اوکے' حنین سنو! تم ہیکنگ جانتی ہو' تم نے ڈیڈ کو کئی دفعہ بتایا تھا۔ سو تم علیشا کی لوکیشن ٹریس کرو۔ ساتھ میں تم اس ویڈیو بھیجنے والے کی لوکیشن بھی ٹریس کرو۔ پھر اس فارن بینک اکاؤنٹ کو ٹریس کرو کہ یہ کس کے نام ہے اور اس شخص کی تمام تفصیلات مجھے دو۔ ساتھ ہی شیرو کے موبائل کو ٹریس کرنے کی کوشش کرو کہ آخری دفعہ وہ کب اور کہاں استعمال ہوا تھا۔ فی الحال وہ بند ہے۔ کتنی دیر میں تم یہ سب کر سکتی ہو؟" وہ سنجیدہ تھا اور حنین نے اتنی ہی سنجیدگی سے سر ہلایا۔

"دس سے بارہ منٹ میں۔"

"واقعی؟" ہاشم تو ہاشم۔ سعدی کو بھی جھٹکا لگا۔

"شیور۔ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ مگر آپ نے سیٹ نہیں لگایا ابھی تک۔" معصومیت سے ادھر ادھر دیکھا۔

"کیا؟" ہاشم سمجھا نہیں۔

"ہم ہالی ووڈ کے کسی سیٹ پہ ہیں نا اور میں تو ہوں ہی Nolan Ross جو کھٹ کھٹ کر کے سب کچھ فٹافٹ ہیک کر لوں گی اور دس منٹ میں مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

"حنین!" سعدی نے اس کے جوتے پہ جوتا رکھ کر دبایا۔

"سوری ہاشم بھائی! مگر نولن اور ہک جیسے

صرف ہالی ووڈ میں ہوتے ہیں۔ میں انٹرنیٹ سے کسی بینک کا مین فریم ہیک نہیں کر سکتی۔ نہ ہی ہم فیس بک میسج سے کسی کا آئی پی ایڈریس یا لوکیشن معلوم کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں فیس بک کمپنی سے رابطہ کرنا ہوگا اور اس میں دو ماہ لگیں گے۔"

ہاشم لب بھینچے سلگتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ (بدتمیز لڑکی۔)

"تو تم کیا کر سکتی ہو؟"

"ایسے مت دیکھیں مجھے۔ خاور بھی یہ نہیں کر سکتا۔ کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کو ایک کیک چاہیے اور میں دیوار پہ لگے بیکری کے اشتہار کو پھاڑ کر اندر سے کیک نکال لوں مگر اشتہار کے کاغذ کے پیچھے دیوار ہوتی ہے' بیکری نہیں۔ کیک نکالنے کے لیے ہمیں بیکری کا تالا توڑنا پڑے گا اور گھر بیٹھے یہ سب نہیں ہو سکتا۔"

"یعنی کہ تم کچھ بھی نہیں کر سکتیں۔"

"خیر اب یہ بھی نہیں کہا میں نے۔ میں یہ کر سکتی ہوں کہ علیشا کو ای میل کرتی ہوں' اس کے جواب سے اس کی لوکیشن ڈھونڈتی ہوں۔ ساتھ اس ویڈیو بھیجنے والے کا اکاؤنٹ ہیک کرتی ہوں' شاید اس کے اپنے ان بوکس سے کوئی سراغ مل جائے۔ کوئی فون نمبر' کوئی دوسرا ای میل ایڈریس۔"

ہاشم خوش نہیں تھا' مگر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اوکے! تم کام شروع کرو۔"

"ابھی نہیں کر سکتی میں کچھ۔" وہ اس کی بات پہ جاتے جاتے پلٹا۔ سعدی نے بھی حیرت سے اسے دیکھا۔ حنین نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔

"اصل میں خالی معدے کے ساتھ میرا دماغ کام نہیں کرتا۔ بلکہ مجھے تو لگ رہا ہے کہ میرا شوگر لیول بھی لو ہو رہا ہے۔"

ہاشم نے گویا جھپٹ کر انٹرکام اٹھایا اور ضبط کرتے ہوئے چبا چبا کر بولا۔ "مصیری! اوپر آؤ اور میڈم جو کہیں ان کو پانچ منٹ میں بنا کر لا دو' ہری اپ۔" اور دھاڑ سے دروازہ بند کرتا باہر نکل گیا۔

"تم کچھ زیادہ ہی بدتمیز ہوتی جا رہی ہو۔" سعدی نے واقعی غصے سے اس کا بازو جھنجھوڑا۔ "ابھی پاپ کارن نہیں کھا کر آ رہی ہو کیا؟"

"ایک تو اچھا بھلا سوپر جونیئر دیکھ رہی تھی' اوپر سے سردی۔۔۔ خوامخواہ مجھے اٹھایا' وہ بھی اس انوکھے لاڈلے کے لیے' اب بھگتیں۔" وہ ڈھٹائی سے شانے اچکاتی لیپ ٹاپ قریب کرنے لگی۔

چند منٹ بعد لیپ ٹاپ گود میں تھا۔ ایک ہاتھ میں جوس کا گلاس' سامنے چین پڑا' کٹلٹس' ساس' فرنچ فرائز' منہ مسلسل چلاتے ہوئے وہ کیز دبا رہی تھی۔ سعدی چپ چاپ اسے دیکھتا رہا تو اس نے فرنچ فرائز کی پلیٹ بڑھائی۔

"کھائیں گے؟"

"ان کا بھائی اغوا ہو گیا ہے' سارا گھر پریشان ہے' اغوا کار پچاس کروڑ مانگ رہے ہیں اور تم کھا رہی ہو؟"

حنین نے جوس کا گھونٹ بھرا اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ "پچاس کروڑ میں کتنے زیرو ہوتے ہیں؟"

"اف۔۔۔" وہ کراہ کر اٹھا اور باہر نکل آیا۔ سیڑھیوں کے اوپر ریلنگ سے جھانکا۔ اورنگ زیب پریشانی سے ماتھا مسلتے بیٹھے تھے۔

ہاشم ادھر ادھر چکر کاٹ رہا تھا اور جواہرات ہذیانی انداز میں چلا رہی تھی۔ "تم لوگ پیسے کیوں نہیں دے رہے؟ وہ شیرو کو مار دیں گے ہاشم!" آنسو اس کی آنکھوں سے ابلنے کو تیار تھے۔

"ہم پیسے دے دیں گے' بات پیسوں کی نہیں ہے ممی! اگر شیرو نے ان کی شکلیں دیکھ رکھی ہوں گی۔ کیا گارنٹی ہے کہ وہ پیسے لے کر اس کو چھوڑ دیں گے۔ ایسے لوگ تاوان لے کر مغوی کو مار دیا کرتے ہیں۔"

"تو تم کس چیز کا انتظار کر رہے ہو؟" اورنگ زیب بھی غصے سے بولے تھے۔

"ان کی لوکیشن یا ان کے بارے میں کوئی معلومات۔ کوئی لیوریج ہونا چاہیے ہمارے پاس جس کے اوپر ہم ان سے شیرو کو زندہ سلامت واپس لیں۔"

جواہرات نفی میں سر ہلاتی نڈھال سی بیٹھ گئی۔ ہاشم موبائل پہ نمبر ملانے لگا۔ سعدی افسوس سے واپس پلٹ آیا۔ اندر وہ صوفے پہ بیٹھی' ہاشم کے ہیڈ فون چڑھائے چپس کھاتے ہوئے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا کوئی نئی ویڈیو آئی ہے؟" وہ تیزی سے لپکا۔

"اونہوں۔۔۔ میں اس کے اکاؤنٹ کو ہیک کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ چند گھنٹے لگیں گے۔ تب تک میں اس ڈرامے کی آخری دو قسطیں دیکھ لوں۔" بڑے غور سے اسکرین کو دیکھتی کہہ رہی تھی۔ وہ جو جوش سے لپکا تھا جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"پتا ہے بھائی! اتنا مزے کا ڈراما ہے۔ Days 49 اس میں جو ہیروئن ہے نا۔"

"یا اللہ۔۔۔ کب شمالی کوریا ایٹم بم بنائے گا اور کب اسے جنوبی کوریا پہ گرائے گا۔ کب جان چھوٹے گی اس "کے" کلچر سے۔"

وہ کراہ کر پیچھے کو ہو گیا۔ حنین کے ڈرامے سر چکرا دیتے تھے۔ وہ منہ بنا کر (ہونہہ) پھر سے دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

ویران سرائے کا دیا ہے
جو کون و مکاں میں جل رہا ہے

اس رات بھی حوالاتی کوٹھڑی کی سلاخوں کا صرف کنارہ روشن تھا۔ باقی سب تاریکی میں ڈوبا تھا۔ ایک کونے میں فارس اور دوسرے میں احمر۔ دور دور چت لیٹے چھت کو دیکھ رہے تھے۔ فارس روشنی والے کونے میں تھا۔ ٹیوب لائٹ کی مدھم سی کرن اس کی تاریک دنیا کو روشن کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس کی کوشش کے باوجود احمر اس سیل سے نہیں گیا تھا۔ اب اس نے کوشش بھی ترک کر دی تھی۔

"فارس بھائی!" اس نے ہلکے سے پکارا۔ چت لیٹے' چھت کو تکتے فارس کی پیشانی پہ بل پڑے۔

"کیا تمہیں کسی نے خاموش رہنا نہیں سکھایا؟"

"میں نے سیکھا ہی نہیں۔ ویسے کوئی سکھانے والا تھا بھی نہیں۔" قدرے توقف کیا۔ "آپ نماز پڑھتے ہیں؟"

"ہوں۔"

"وہ تو میں نے دیکھا ہی تھا۔ نماز میں بھی ساتھ والی کوٹھڑی سے کیا آوازیں آرہی ہیں' سب خبر ہوتی ہے آپ کو۔"

"سب کو ہوتی ہے' اب سو جاؤ۔" وہ بےزار ہوا۔

"سنیں نا۔۔۔ کیا ہمیشہ سے پڑھتے تھے؟"

"نہیں' جیل میں آنے کے بعد شروع کی۔"

"تو اب کیوں پڑھتے ہیں نماز' اپنے سگے بھائی کے قتل کے الزام۔۔۔"

"وہ میرا سوتیلا بھائی تھا' اپنے فیکٹس درست رکھو۔"

احمر نے بہت حیرت سے اسے دیکھا۔ "مطلب وہ آپ کو پسند نہیں تھا؟"

"صرف تمہاری غلطی درست کر رہا ہوں' زیادہ اسٹیپنی نہ بنو۔" (زیادہ چپکو نہیں۔)

"تو کیوں پڑھتے ہیں آپ نماز؟"

"مجھے خود نہیں پتا۔" وہ بہت دیر بعد بولا۔ "کچھ دن پڑھتا ہوں جوش سے' پھر ڈھیلا پڑ جاتا ہوں اور کئی دن یوں گزر جاتے ہیں جیسے اندھیری سرنگ میں ہوں۔ پھر کچھ دن پڑھتا ہوں۔ تب اپنا آپ بہت نیک لگتا ہے۔ ہلکا اور پیارا سا۔ مگر پھر ڈھیلا ہو جاتا ہوں اور یہ پڑھنے' نہ پڑھنے کا چکر کبھی ختم ہی نہیں ہوتا۔ چاہوں تو ہر وقت پڑھوں' میرے اندر بہت اسٹیمنا ہے۔ مگر میری نماز مجھ پہ کوئی فرق نہیں ڈالتی۔ شاید میرا دل سخت ہو گیا ہے۔"

"اس نے بھی یہ ہی کہا تھا۔" چت لیٹے احمر نے ہولے سے کہا تو فارس چونکا۔

"کس نے؟"

"جزیل نے۔ پچھلے سال آیا تھا میں اور نگ زیب صاحب کے کہنے پہ آپ کی پیشی دیکھنے۔ تب جب انہوں نے جزیل کو گواہی کے لیے بلایا تو اس نے بھی یہ ہی کہا۔"

"کون چڑیل؟"

"اوہو۔ پراسیکیوٹر زمر۔ گھنگریالے بالوں والی چڑیل۔" فارس کے ابرو تن گئے۔ ناپسندیدگی سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"بکو مت۔" مگر اس نے نہیں سنا۔ وہ چھت کو دیکھتا کہہ رہا تھا۔

"جب استغاثہ نے اس سے اس کی حالت کا پوچھا تو اس نے کہا میرے پاس کھونے کو کچھ نہیں بچا' میری نماز بھی نہیں۔ کیونکہ اب میں نماز کے آخر میں دعا نہیں مانگتی۔ میرے حادثے نے میرا دل' میری زندگی' میری نماز' ہر شے کو مردہ کر دیا۔"

فارس چپ رہا۔ چہرہ واپس پھیر لیا۔ نگاہیں چھت پہ جا ٹکیں۔

"میں بھی پانچ وقت کی نماز پڑھنا چاہتا ہوں۔ اچھی اور لمبی نماز' زندہ نماز' مگر مجھ سے یہ نہیں ہوتا' کیا کروں؟"

"پراسیکیوٹر سے پوچھو۔" اس بات پہ احمر ہنسا۔ باہر پھیلی سرد رات ہر گزرتے پل سیاہ پڑتی گئی۔

"اچھا سنیں۔ آپ کا کیس کیسا جا رہا ہے؟" احمر نے اس رخ کروٹ بدلی۔ وہ اس سے کافی فاصلے پہ کمر کے بل لیٹا چھت کو دیکھ رہا تھا۔ سفید کرتا اندھیرے میں بھی دمک رہا تھا۔

"ڈھائی سال میں تین پیشیاں ہوئی ہیں' کیسا جا رہا ہوگا؟"

"اوہ۔ میری تو چند دن میں چار ہو چکی ہیں۔"

"کیونکہ تم اورنگ زیب کاردار کے آدمی ہو۔" اس کے اندر تک کڑواہٹ پھیل گئی۔

"نہ کریں یار۔ کیوں ان سے اتنے خفا ہیں؟ وہ برے نہیں ہیں' بس اپنا فائدہ اوپر رکھا انہوں نے۔"

"اور وہ بھی تمہارے کہنے پہ۔" تلخی سے نگاہ پھیر کر دور لیٹے احمر کو دیکھا۔ "ویسے اب تک کیا' کیا رپورٹنگ کر چکے ہو میرے بارے میں؟"

"ہاشم سے ملاقات ہی نہیں ہوئی دوبارہ' نہ کسی اور نے کچھ پوچھا۔ اگر پوچھے گا تو بتا دوں گا۔"

"کیا؟"

"اتنا ہی جتنا آپ کے بارے میں سارے جیل کو معلوم ہے۔ جھگڑے' پھڈے وغیرہ۔" وہ لاپروائی سے ہنسا۔

"اور اگر میں کہوں کہ مجھے اس کیس میں بھی تمہارے سابقہ باس نے پھنسایا ہے تو ان کو بتا دو گے؟"

احمر ایک دم کہنی کے بل اٹھ کر بیٹھا' حیرت اور اچنبھے سے اس کا چہرہ دیکھا۔ "کاردار صاحب نے؟ وہ کیوں پھنسائیں گے آپ کو؟"

"وہ نہیں۔ ہاشم۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ اس نے ہی یہ دونوں قتل کروائے ہیں' بس اتنا کہہ رہا ہوں کہ اگر وہ چاہتا تو آج میں باہر ہوتا۔"

احمر کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں فارس بھائی! جن دنوں آپ گرفتار ہوئے تھے' میں دن رات کاردار صاحب کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ واقعی آپ کے لیے پریشان تھے' مگر کچھ میری حکمت عملی اور کچھ ان کی اپنی سوچ تھی کہ انہوں نے آپ کے اوپر سے ہاتھ کھینچ لیا۔"

"الیکشن جیتنے کے بعد تو وہ میری مدد کر سکتے تھے نا۔"

"میرا خیال ہے ان کی نظر میں آپ قصوروار تھے۔ ہاں مگر ہاشم نے تو آپ کے لیے بہت بھاگ دوڑ کی۔ میں ان دنوں وہیں تھا۔ ہاشم نے بارہا آپ کو بے قصور کہا اور ان دنوں وہ آفس' جیل' کچہری کے چکر لگا لگا کر تکان کا شکار لگتا تھا' مگر اس نے آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ٹھیک ہے' آپ اس کو پسند نہیں کرتے' مگر اس کے بارے میں اتنا غلط مت سوچیں۔"

فارس کافی دیر خاموشی سے چھت کو دیکھتا رہا۔

"شاید تم درست کہہ رہے ہو۔ شروع میں اس پہ شک تھا' مگر پھر اتنے سال اس بارے میں سوچا۔ ہمارے جائیداد کے جھگڑے اتنے بڑے نہیں تھے کہ وہ مجھے اندر کرواتے' جبکہ میں ان سے کچھ مانگ بھی نہیں رہا تھا۔ دوسرا ان کی میرے بھائی سے' بیوی سے کوئی دشمنی بھی نہیں تھی۔ کوئی بھی چیز ان کی طرف اشارہ نہیں کرتی' مگر۔"

وہ لحظے بھر کو ٹھہرا۔ احمر دھیان سے اسے سن رہا تھا۔

"مگر آخری فتویٰ دل سے لیا جاتا ہے اور میرا دل ہاشم کے لیے کبھی اچھا نہیں سوچ سکتا۔"

"آپ کو ان کے بارے میں نہیں، یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔"

"تو کیا کروں؟ جیل توڑ دوں؟" وہ کوفت زدہ ہوا۔

"اچھا ایک بات تو بتائیں۔" وہ پھر بولا۔ مگر فارس کو اب احساس ہوا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بول گیا ہے۔ فوراً" کروٹ بدل لی۔

"چپ کر کے سو جاؤ، زیادہ اسٹیپنی نہ ہو۔"

اس کے انداز پہ احمر نے منہ بنایا۔ (ہونہہ) اور برے دل کے ساتھ واپس لیٹ گیا۔

"یو نو۔ میرے بھی کچھ پرزن رائٹس ہیں اور ان میں سب سے پہلی چیز صاف ستھری فضا کا ہونا، ہائی جین والی ڈائٹ کا ہونا اور۔۔۔"

تھوڑی دیر بعد "اسٹیپنی" پھر شروع ہو چکا تھا۔



مگر یہ قتل کی سازش کہاں سے آنکلی
وہ لوگ تو تھے میرے خاندان کے ہی

ہاشم کے کمرے میں سینٹرل ہیٹنگ سے کافی گرمائش تھی۔ حنین چپس کھاتے کمپیوٹر پہ کام کر رہی تھی۔ صوفے پہ پیچھے کو ٹیک لگائے سعدی کو نیند آنے لگی مگر حنین کی آواز نے جگا دیا۔ وہ چونک کر سیدھا ہوا۔

"آئیں ان کی فوٹوز دیکھتے ہیں۔" وہ دلچسپی سے کہتی ہاشم کے لیپ ٹاپ پہ فولڈرز کھولے جا رہی تھی۔ سعدی نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا۔ "بری بات ہے حنہ! کسی کی ذاتی چیزیں نہیں دیکھتے۔"

"او کے۔۔۔ آپ آنکھیں بند کر لیں۔" اس نے پرانی تصویریں کھولیں۔ ہاشم کی اسٹین فورڈ کے دنوں کی۔ تب بھی وہ ایسا ہی تھا، مگر ذرا ینگ۔ شہرین بھی ان میں تھی۔ کلاس فیلو تھی شاید یا جونیئر۔

"یہ آج کہاں ہے؟"

"اپنی امی کے گھر، ہاشم بھائی نے بتایا ہے۔" سعدی نے لبوں پہ مٹھی رکھ کر جمائی روکی۔ حنین تیز تیز تصویریں آگے کرتی جا رہی تھی۔ پھر وہ اس سے بھی بور ہو گئی اور واپس ڈراما لگا لیا۔ دفعتاً" ہاشم کمرے میں داخل ہوا تو حنین نے جھٹ اسکرین پہ اصل کام والی ونڈو سامنے کر لی۔

"علیشا کا ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا۔ اغوا کار کا اکاؤنٹ ہیک کرنے میں ابھی کچھ اور گھنٹے لگیں گے۔"

اس نے اطلاع دی۔ ہاشم نے بس سر ہلایا اور الماری کی طرف آیا۔ سعدی یوں ہی گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ الماری سعدی کی پشت پہ تھی۔ ہاشم نے دروازہ کھولا تو خانے سامنے آئے۔ تیسرے خانے میں ایک ڈیجیٹل لاک والا سیف نصب تھا۔ ہاشم نے چند نمبر دبا کر سیف کا دروازہ کھولا۔ اندر کاغذات، چیک بکس، نوٹ، بہت کچھ نظر آیا۔ وہ چیزیں الٹ پلٹ کر کے کچھ ڈھونڈنے لگا۔ سعدی نیند میں ڈوبی آنکھوں سے اسے ہمدردی سے دیکھنے لگا۔

اس نے چیک بک نکالی اور کچھ پیپرز۔ اندر سیف میں ہر چیز بکھر چکی تھی اور سعدی واپس گردن موڑنے ہی لگا تھا کہ نگاہ میں کچھ اٹکا۔ جیسے سیاہ رات میں کوئی انگارہ نظر آئے۔ مگر وہ بلاشبہ ایک دہکتا ہوا انگارہ تھا۔

سیف کی دیوار کے ساتھ ایک لفافے سے کچھ جھلک رہا تھا۔ ایک تصویر کی سفید پشت۔ جس پہ سرخ اور نیلے ننھے ننھے انگوٹھوں کے نشان تھے۔ جیسے پینٹ میں ڈبو کر لگائے گئے ہوں۔ بس ایک جھلک دکھائی دی اور ہاشم نے سیف بند کر دیا۔ پاس ورڈ دبا کر لاک کیا اور باہر نکل گیا۔

اور سعدی یوسف کی ساری دنیا وہیں ٹھہر گئی۔ نیند کھل چکی تھی۔ وہ سالوں بعد اب جاگا تھا۔

"حنہ۔۔۔" اس کو اپنی آواز کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔ "تمہیں یاد ہے، جب میں دادی کی ڈیتھ پہ آیا تھا پاکستان۔ وارث ماموں کی ڈیتھ سے چھ ماہ پہلے شاید۔

تب میں ان کی بیٹیوں کی ایک تصویر لایا تھا جس کی بیک پہ پینٹ میں ڈبو کر ان دونوں کے انگوٹھوں کے نشان ثبت کیے تھے؟"

"جی۔ وہ آپ نے وارث ماموں کو دے دی تھی اور انہوں نے اسے اپنے لیپ ٹاپ کی الٹی طرف کارڈ ہولڈر میں ڈال دیا تھا' تاکہ ان کے پاس رہے ہر وقت۔" حنین مصروف سی کیز دباتی کیے جا رہی تھی۔ اس کو لگا' وہ سانس نہیں لے پائے گا۔

"وہ۔ وہ تصویر اب کہاں ہو گی؟"

"کیا ہو گیا ہے بھائی؟" وہ کھٹ کھٹ ٹائپ کرتی بولی۔ "ماموں کے قاتل ان کا لیپ ٹاپ لے گئے تھے۔ اب تک تو انہوں نے وہ سب تباہ بھی کر دیا ہو گا' سنبھال کر تھوڑی رکھی ہو گی۔"

سعدی کی مری مری نگاہیں بند الماری پہ مرکوز ہوئیں۔ چہرہ سفید پڑ رہا تھا۔

"ہاشم اور میرے لیے کوشش کرے؟ ناممکن!"
کہیں ماضی سے فارس کی جھنجلائی ہوئی آواز گونجی۔

"مجھے ہاشم پہ شک ہے۔ اسی کا ہاتھ ہو گا اس میں۔"

"ہاشم چاہتا تو میں باہر ہوتا۔ میں باہر اس لیے نہیں ہوں' کیونکہ اس نے چاہا ہی نہیں۔"

"ماموں کہہ رہے تھے انہیں ہاشم بھائی پہ شک ہے۔ ماموں کو ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔"

"میں فارس کی وجہ سے اپنی بیوی اور بچی کو وقت نہیں دے پا رہا۔"

"ہاشم کو میرے افیئر کے بارے میں پتا چل گیا' دیکھو کیا' کیا اس نے میرے ساتھ۔"

اس کو لگا' اس کے ہاتھ کپکپا رہے ہیں۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ وہ بالکل سن سا بیٹھا تھا۔ پلکیں بھی نہیں جھپک پا رہا تھا۔

"وہ تصویر۔ تمہیں واقعی یاد ہے حنہ! کہ ماموں کے لیپ ٹاپ کے کارڈ ہولڈر میں ہی تھی؟"

"جی۔ مگر آپ کو کیوں خیال آیا اچانک؟" وہ ایک دم چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ سنبھل کر پھیکا سا مسکرایا۔

"یوں ہی۔ تمہارا کام کہاں تک پہنچا؟"

"ہو رہا ہے۔ ویسے آپ کو یہ بات عجیب نہیں لگی کہ نوشیرواں بھائی کا اغوا ان ہی دنوں میں کیا گیا' جب خاور یہاں نہیں تھا۔ اورنگ زیب انکل نے بتایا تھا مجھے کہ خاور ان کے آفس اور گھر کا کمپیوٹر جینئس ہے۔ ویسے یہ کاردارز کا کاروبار کیا ہے؟"

"یہ ایک کارٹیل کو ہیڈ کرتے ہیں۔"

"کارٹیل کیا ہوتا ہے؟"

"فضول سوال مت پوچھو۔ تمہیں پتا ہونا چاہیے' کیا ہوتا ہے۔" وہ ایک دم چڑ کر بولا۔ دماغ اتنا الجھا ہوا تھا کہ حنین کی باتیں بے زار کر رہی تھیں۔ اس نے جواب میں زور سے ہونہہ کہہ کر رخ پھیرا۔

"میری توبہ جو اب آپ سے کچھ پوچھوں یا بتاؤں۔ ہونہہ!"

ہاشم کے قدموں کی آواز آئی تو وہ ذرا سنبھل کر بیٹھا۔ ہاشم اندر آیا۔ وہی پریشان' تاؤ زدہ چہرہ لیے۔ سعدی کے پیچھے آکر الماری کھولی۔ سعدی نے اب کے گردن نہیں موڑی۔ سامنے ڈریسنگ مرر لگا تھا۔ وہ آئینے میں ہاشم کو دیکھتا رہا۔ اس نے سیف کا کوڈ دبایا۔ چار ہندسے۔ سعدی نے دماغ میں فیڈ کیے۔ سیف کھلا تو اس نے کاغذات واپس رکھے اور اسے بند کیا۔ پھر سے کوڈ دبایا۔ سعدی نے اب کے پکا یاد کر لیا۔ وہ اس کی تاریخ پیدائش تھی۔

وہ چلا گیا اور سعدی کتنی ہی دیر حنین کے ساتھ خاموش بیٹھا رہا۔ اس کا کام جاری تھا۔ وہ بھائی کے چہرے کو دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ وہ بس چپ چاپ بیٹھا رہا۔ کتنی ہی پرانی باتیں یاد آئیں۔

امی کہتی تھیں' ہاشم کا وکیل کیوں ان کو ہر دفعہ ٹال دیتا ہے' کیوں وہ کچھ ٹھوس اقدام نہیں کر رہا اور وہ ہر بات عدالتی نظام پہ رکھ دیتا۔ تب آنکھوں پہ اعتماد کی پٹی بندھی تھی۔ اب اس میں سوراخ ہو رہے تھے۔

کیا پتا ہاشم نے وہ لیپ ٹاپ وارث کے قاتلوں سے حاصل کر لیا ہو اور وہ تصویر رکھ لی ہو' مگر انہوں نے

ہمیں کیوں نہیں بتایا۔ کیا پتا اس میں کچھ ایسا ہو جو فارس کے لیے نقصان دہ ہو۔ مگر انہوں نے ہمیں کیوں نہیں بتایا۔ ہر توجیہہ کے آخر میں وہ الجھ جاتا۔ ہاشم نے کچھ سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہو شاید' کچھ تو سوچا ہو گا۔ کیا پتا یہ کوئی اور تصویر ہو' ان کی اپنی بیٹی کی' مگر نہیں' اس کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ یہ وہی فوٹو تھی۔

"میں ابھی آئی۔" حنین ایک دم اٹھی اور باہر چلی گئی۔ اس نے کچھ نہیں پوچھا۔ بس یوں ہی چپ سا بیٹھا رہا۔ پھر ایک دم چونک کر سر اٹھایا۔

وہ کمرے میں اکیلا تھا۔ گردن ادھر ادھر موڑی۔ پھر آہستہ سے اٹھا اور الماری کی طرف آیا۔

اس کی تربیت' اس کا ایمان' سب کہہ رہے تھے کہ کسی کا لاکر کھولنا گناہ ہے' مگر اس کا دل کہہ رہا تھا کہ آخری فتویٰ مجھ سے لو' میں کہتا ہوں' ایسا کر ڈالو تو کر ڈالو۔ اور دل سے بحث کا وقت ہی نہیں تھا۔ اس نے جلدی جلدی کوڈ ڈالا۔ لاکر کھولا۔ تصویر والا لفافہ سامنے تھا۔ سعدی نے کپکپاتے ہاتھوں سے فوٹو نکالی اور الٹائی۔

امل اور نور..... اس کے دل کو دھکا لگا۔ یہ وہی فوٹو تھی۔ ہاشم کو بچے پسند تھے۔ وہ بچیوں کی تصویر تباہ نہ کر سکا تھا۔

وہ جو اب تک بے یقینی کے عالم میں تھا' ایک دم سے اس کی آنکھوں میں سرخی اترنے لگی۔ لب بھنچ گئے۔ مڑ کر دروازے کو دیکھا' جس کے پار' نیچے لاؤنج میں ہاشم بیٹھا تھا۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا ابھی جا کر اس کو گریبان سے پکڑے اور پوچھے کہ اس نے کیوں کیا ان کے ساتھ ایسا؟ اس کا اس سب میں ہاتھ تھا۔ فارس ٹھیک کہتا تھا' کیونکہ فارس اس کو جانتا تھا اور سعدی اس کو بالکل نہیں جانتا تھا۔

مگر وہ فارس نہیں تھا۔ اس کو غصے سے بے قابو ہو کر ہاشم کا گریبان نہیں پکڑنا تھا۔ اس کو کچھ اور کرنا تھا۔

اس نے وہ لفافہ نکالا۔ اس میں مزید بھی کچھ تصویریں تھیں۔ وہ ان کو دیکھتا گیا اور دل ہر ایک پہ ڈوبتا گیا۔

وہ اس ریسٹورنٹ میں فائرنگ کے فوراً" بعد کی تھیں۔ خون میں لت پت زمر۔ ابھی لوگ بھی اکٹھے ہونا شروع نہیں ہوئے تھے..... اور..... وہ اوپر سے لی گئی تھیں۔ اوپر ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی سے۔

سعدی کی آنکھوں سے نیند اب بالکل غائب ہو چکی تھی۔ وہ ساکت' سانس روکے ایک کے بعد ایک تصویر دیکھ رہا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ پیشہ ور قاتل اپنے شکار' اپنی مہارت کی تصاویر اپنے پاس سنبھال کر رکھتے ہیں اور فخر سے اپنا بے عیب کام دیکھا کرتے ہیں۔ مگر اسے یقین آج آیا تھا۔

لفافے کی آخری چیز ایک فلیش ڈرائیو تھی۔ سعدی نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس پہ کوئی ٹیگ نہیں لگا تھا۔

باہر نکل کر حنین نے ریلنگ کے اوپر سے جھانکا۔ ہاشم نیچے صوفے پہ بیٹھا انگلیوں سے پیشانی مسل رہا تھا۔ سر اٹھایا تو حنہ نے اشارہ کیا۔ جواہرات مسلسل کچھ بول رہی تھی۔ اور نگ زیب فون پہ بات کر رہے تھے۔ ہاشم اس کے اشارہ کرنے پہ اٹھ کر اوپر آیا۔ جس وقت سعدی لاکر کا پاس ورڈ دبا رہا تھا وہ دونوں بند دروازے کے آگے کھڑے تھے۔

"نوشیرواں بھائی کا کمرا کون سا ہے؟ مجھے چیک کرنا ہے کہ ان کا کمپیوٹر ہیک تو نہیں کیا گیا؟"

"لیپ ٹاپ تو وہ ساتھ لے کر گیا تھا' مگر وہ زیادہ ڈیسک ٹاپ استعمال کرتا ہے۔" ہاشم ساتھ والے کمرے میں داخل ہوا تو وہ پیچھے آئی۔ اس نے بتی جلائی اور کمپیوٹر ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔ عین اس وقت سعدی دیوار کے پار لاکر میں سے تصویریں نکال کر دیکھ رہا تھا۔

"دیکھ لو جو دیکھنا ہے۔" تکان سے اشارہ کیا۔ وہ فوراً" آگے جا کر کرسی پہ بیٹھی' اسے آن کیا۔

"آخری دفعہ آپ کی کب بات ہوئی تھی ان سے؟ اغوا سے پہلے؟"

"اغوا سے شاید چھ' سات گھنٹے پہلے بات ہوئی تھی۔ وہ سینٹول میں تھا اور شاپنگ کر رہا تھا' خوش

تھا۔" وہ اداسی سے مسکرایا۔
"ہوں۔ اچھا اس کمپیوٹر کا پاس ورڈ کیا ہے؟"
"پتا نہیں۔" ہاشم نے شانے اچکائے۔ تھکا تھکا سا وہ صوفے پہ گر سا گیا۔ دروازہ پورا کھلا تھا۔ نیچے سے جواہرات کے بولنے کی آواز ہنوز آرہی تھی۔
"اوکے جو بھی ہے' اڑا دیتی ہوں۔" ایڈمنسٹریٹر پہ پاس ورڈ نہیں تھا۔ سو اس نے آسانی سے کمپیوٹر کھول لیا۔ اب وہ خاموشی سے کیز دباتی کام کرنے لگی۔
"کیا آپ لوگ پیسے دے رہے ہیں؟ میرا مطلب ہے ابھی آپ اپنے لاکر سے کچھ نکال رہے تھے۔"
"ڈیڈ دے رہے ہیں پیسے' شیرو سے بڑھ کر نہیں ہیں۔" وہ بند آنکھوں کو مسل رہا تھا۔
"آپ کسی اور سے رابطہ کرنے کی کوشش تو کریں۔ کیا معلوم' وہ آپ کے کمپیوٹرز اور فون ٹیپ نہ کررہے ہوں۔ یہ صرف ایک خالی خولی دھمکی ہو۔ آپ کے تو اتنے کانٹیکٹس ہوں گے۔"
"اونہوں۔ میں اپنے بھائی کی زندگی پہ رسک نہیں لوں گا۔"
"آپ لکی ہیں۔ آپ کو اپنے بھائی کو بچانے کا موقع مل گیا۔ کاش ہمیں بھی ملتا' ماموں کو بچانے کا' تو ہم بھی ہر رقم دے دیتے۔" وہ ٹائپ کرتی کہہ رہی تھی۔ دوسری طرف خاموشی رہی تو حنین نے گردن موڑ کر دیکھا۔
وہ صوفے پہ بیٹھا' اسے دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں اتنی بے بسی اور کرب تھا کہ حنہ کے دل کو کچھ ہوا۔
"سوری' میرا مطلب آپ کو دکھی کرنا نہیں تھا۔" مگر ہاشم نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا۔
"آئی ایم سوری بچے۔ میری ہر اس چیز کے لیے جس نے تمہیں دکھ دیا ہو۔" وہ ایک دم بہت ڈسٹرب نظر آنے لگا تھا۔ "علیشا کا معاملہ میں نے غلط طریقے سے ہینڈل کیا۔ پھر ابھی بھی میں تم پہ غصہ کر گیا۔ مجھے تمہارے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آئی ایم سوری بیٹا۔" آنکھیں بند کیں' انگلیوں سے پیشانی مسلتا رہا۔ حنین ہاتھ روک کر اسے دیکھے گئی۔
"میں نے جو بھی کہا' پریشانی میں کہا۔ میں اپ سیٹ ہوں۔ میرا بھائی مجھے بہت عزیز ہے۔"
اب وہ پھر سے بند آنکھوں کو مسل رہا تھا۔ حنین دم سادھے اسے تک رہی تھی۔ پھر ہاشم نے آنکھیں کھولیں۔ بہت امید' بے بسی اور آس سے اسے دیکھا۔
"اگر خاور ہوتا تو میں کبھی ایک چھوٹی بچی سے درخواست نہ کررہا ہوتا' مگر میں اس وقت بالکل مفلوج ہوں۔ حنین۔" مدھم' تھکی آواز میں وہ کہتا گیا اور وہ سانس روکے سنے گئی۔ "تم کچھ بھی کرو' بس میرے بھائی کو اذیت دینے والوں کا پتا کردو مجھے۔ کردو گی نا؟"
اس نے ہاشم کو پہلی دفعہ اتنا کمزور دیکھا تھا۔ اس نے شاید ہاشم کو دیکھا بھی پہلی بار تھا۔ اس طرح۔ اس نظر سے۔ اور یہ وہ لمحہ تھا جب ہاشم کے لیے حنین ذوالفقار یوسف خان کا دل پلٹ گیا تھا۔
اور یہ وہ لمحہ تھا جب متصل کمرے میں کھڑے لاکر میں سے تصویریں نکال کر دیکھتے سعدی ذوالفقار یوسف خان کا ذہن ہاشم کے لیے پلٹ گیا تھا۔
ان دونوں کے احساسات سے بے خبر ہاشم اپنی کمزوری' اپنے بھائی کو کسی دوسرے کے ہاتھ پاکر' خود کو بہت بے بس محسوس کرتے ہوئے شیرو کے کمرے کے کاؤچ پہ نڈھال بیٹھا تھا۔
حنین نے آہستگی سے رخ پھیر لیا۔ اس کے اپنے ہاتھ ذرا سے کپکپائے تھے۔ پھر اس نے کچھ پیپرز پرنٹ کیے' کمپیوٹر آف کیا' اور صوفے کی طرف گھومی۔
"آپ پریشان مت ہوں۔ وہ علیشا نہیں ہے' علیشا ایسا کبھی نہیں کرسکتی۔ وہ ایک کمزور لڑکی ہے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ آپ مجھ سے ایکسکیوز کریں' آپ بڑے ہیں' آپ نے وہ ہی کیا جو آپ کو ٹھیک لگا۔ مگر ایک دفعہ آپ کو علیشا کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ اس کو پیسے دینے سے آپ کی دولت کم نہ ہوجاتی' جیسے اغوا کاروں کو دینے سے کم نہیں ہوگی۔"

مدھم سا کہہ کر وہ باہر نکل آئی۔ ہاشم نے معلوم نہیں سنا بھی تھا یا نہیں۔

وہ واپس کمرے میں داخل ہوئی تو سعدی نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ ہاشم کا لاکر کھولے کھڑا تھا۔ حنین کو پہلے تو جھٹکا لگا' پھر گڑبڑا کر جلدی سے دروازہ بند کرتی قریب آئی۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"یہ فلیش چاہیے تھی مجھے۔" جلدی سے وہ لفافہ جس میں وہ تصاویر ڈال چکا تھا' واپس رکھا' لاکر بند کیا اور اس کی طرف گھوما۔

"مجھے اس کو کاپی کرنا ہے۔ مت پوچھو یہ کیا ہے' بس میرے آفس کی چیز ہے۔ مجھے پتا ہے یہ غلط ہے مگر تمہارے پاس کوئی ڈیوائس ہے جس پہ میں یہ کاپی کر سکوں؟"

حنین نے سر جھٹکا' اس ایک پرفسوں لمحے کا اثر زائل کیا' اور گہری سانس لے کر مشکوک نظروں سے بھائی کو دیکھتی آگے آئی۔ ہاشم کی اسٹڈی ٹیبل کی دراز کھولی' ادھر ادھر ہاتھ مارا اور واپس مڑی تو ہاتھ میں یو ایس بی تھی۔

"کیا یاد کریں گے' کسی سخی سے پالا پڑا تھا۔ کاپی کر لیں' کچھ دن بعد آکر چپ چاپ رکھ دیتا۔"

عام حالات میں اس چوری پہ ڈانٹ دینے والے سعدی نے چپ چاپ اسے لیپ ٹاپ میں لگا لیا۔

"اس میں ان کارٹیل کے کچھ ڈاکومنٹس ہیں۔ میرے پروجیکٹ کے لیے فائدہ مند ہیں۔"

"کارٹیل کیا ہوتا ہے؟" وہ چپس اٹھا کر کھانے لگی تھی' رکی۔ پھر سر جھٹکا۔ "خیر' نہیں بتانا بالکل بھی اب آپ مجھے کچھ نہ بتایا کریں' میں بھی نہیں بتاؤں گی کچھ۔"

"سر نہ کھاؤ میرا۔ باہر جا کر مسز کاردار کے پاس بیٹھو۔" وہ اس فلیش کو کاپی کر رہا تھا' جیسے ہی کام ختم ہوا' اس نے اصلی فلیش نکالی' اور اٹھ کر اسے واپس لاکر میں رکھ دیا۔ جب پلٹا تو وہ ہنوز بیٹھی تھی۔ چپس اٹھا کر منہ میں رکھتی ہوئی۔

"تم جاؤ بھی' اچھا نہیں لگتا' جب سے آئے ہیں' ان کو ایک لفظ تسلی کا نہیں بولا۔"

"اوکے!" وہ مشکوک نظروں سے اسے دیکھتی اٹھی اور باہر آ گئی۔

ہاشم اب سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ حنین نے دروازہ بند کر دیا' اور اس کے ساتھ نیچے اتر آئی۔ جواہرات اور اورنگ زیب مخالف صوفوں پہ فکر مند سے بیٹھے تھے۔ پوری رات کی ذہنی اذیت نے تھکا دیا تھا۔

"ڈونٹ وری انکل! ایک دفعہ نوشیرواں بھائی بخیریت گھر پہنچ جائیں' تو میں رقم کو ٹریس کر لوں گی۔"

جواہرات نے تیز نظروں سے اسے گھورا۔ "اور کیا اس میں اس لڑکی کا ہاتھ ہے؟"

"نہیں' اس کے ہاتھ اتنے لمبے نہیں ہیں۔" اس نے شانے اچکا دیے۔ پھر قریب سے گزرتی میری انجیو کو روکا۔ "سنو' تمہارے فش فنگرز تیار نہیں ہوئے ابھی تک؟"

"بس میں لا ہی رہی تھی۔"

"ویسے آج کل میں ایک کورین ڈرامہ دیکھ رہی تھی 49 Days۔ اس کا ایک فلپائنی ورژن بھی عنقریب بننے لگا ہے' کیا تمہارے ملک میں بھی کے کلچر مشہور ہے؟"

"بہت زیادہ۔" میری نے اس کو دیکھا' پھر سلگتی نظروں سے خود کو گھورتی جواہرات کو' اور جلدی سے وہاں سے کھسک لی۔

اندر بیٹھا سعدی اب ہاشم کے لیپ ٹاپ کو کھنگال رہا تھا۔ کچھ تو ملے گا۔ سرسری سا ایک ایک فائل کھولتا' وہ مایوس ہونے لگا تھا جب۔ بالآخر چند ڈاکومنٹس ملے جن کے نام نہیں تھے' صرف نمبرز تھے اور وہ لاکڈ تھے۔ انہی میں کچھ تھا۔ اس نے ان کو کاپی کرنے کی کوشش کی مگر یہ ناممکن تھا۔ اب کیا کرے؟ اور تب ہی اغوا کاروں کا اگلا پیغام آیا۔ پیغام پڑھ کر سعدی تیزی سے باہر ریلنگ پہ آیا۔ نیچے سب بیٹھے تھے۔ حنین بھی ٹانگ پہ ٹانگ رکھے' پاؤں ہلاتی موبائل پہ بٹن دبا رہی تھی۔

"ان لوگوں کا نیا پیغام آیا ہے۔ پیسے مل گئے ہیں' نوشیرواں چار سے پانچ گھنٹے تک پہنچ جائے گا مگر اس کے پہنچنے تک وہ نہیں چاہتے کہ ہم کسی کو خبر کریں۔"

وہ لیپ ٹاپ لیے نیچے اُترتے ہوئے بتا رہا تھا۔ فلیش جیب میں تھی' اور چہرے پہ گہری سنجیدگی تھی۔ ذہن ابھی الجھا تھا۔

سب خاموش رہے۔ سعدی' حنہ کے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔ وہ لیپ ٹاپ گھٹنوں پہ رکھے' پھر سے کام کرنے لگی۔ چونکہ اسکرین حنین کی اپنی طرف تھی تو کانوں میں ایئرفونز لگا دیے اور ڈرامے کی قسط چلادی۔

"اور شیرو کے آنے تک وہ لوگ بہت دور جاچکے ہوں گے۔" اورنگ زیب بے بسی بھرے غصے سے بڑبڑائے۔ جواب میں جواہرات اور ہاشم ایک ساتھ بولنے لگے۔ سعدی نے ہاشم کو دیکھا تو دل نرم پڑنے لگا۔ وہ اتنا پریشان اتنا ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا اور وہ اس کے بارے میں غلط کیا سوچ رہا تھا؟ کیسے اس کے لاکر سے کچھ چرا کر لے آیا؟ کیسے کرلیا اس نے یہ سب؟ تب ہی اسکرین پہ نظر پڑی۔

"تم ابھی تو کوئی اور ڈراما دیکھ رہی تھیں۔" سعدی نے ہلکے سے سرگوشی کی۔ حنین ایک لمحے کو گڑبڑائی۔

"وہ۔ یہ بھی میرا فیورٹ ہے' یونہی دوبارہ دیکھ رہی ہوں۔" وہ خاموش رہا۔ الجھی ہوئی نگاہیں اسکرین پہ رہیں جہاں حنین مناظر آگے آگے کر کے دیکھ رہی تھی۔

"آ۔ ہاشم بھائی۔" کوئی گھنٹے بعد سعدی نے اسے پکارا۔ وہ جو درمیان میں اٹھ کر باہر چلا گیا تھا' شیرو کے آنے کی تیاری وغیرہ' ایئرپورٹ' فلائٹس ٹائمنگ چیک کرنے' اب آکر بیٹھا تھا' ذرا چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں بولو۔"

"فارس ماموں کا وکیل کہہ رہا تھا کہ ہمیں اگر وارث ماموں کی فائلز مل جائیں تو کسی نہ کسی طرح ہم ان کے اصل قاتلوں تک پہنچ سکتے ہیں؟"

ہاشم ابھی تک شدید پریشانی کا شکار تھا' اس نے ذرا سے شانے اچکائے۔

"مشکل ہے' اب کہاں ملیں گی اس کی فائلز۔ اتنا عرصہ گزر گیا۔ تم کوشش کرلو مگر مشکل لگتا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا؟"

"جی' بالکل' سمجھ رہا ہوں اب۔" ذرا سا اثبات میں سرہلایا' ہاتھ سے نامحسوس انداز میں جینز کی جیب کو چھوا جہاں فلیش موجود تھی۔ ہاشم اب موبائل دیکھنے لگا۔ اور سعدی گاہے بگاہے ایک سنجیدہ نظر اس کے چہرے پہ ڈال لیتا۔

باربار وہ دل میں ہاشم کی طرف صفائی پیش کرتا تھا۔ وہ ساری صفائیاں دم توڑنے لگیں۔ رات کی تاریکی میں اس کے اعتماد کا خون بھی آہستہ رسنے لگا اور رس رس کر بالآخر اس نے اعتماد کے لاشے کو ادھ موا کردیا۔



اس کے اپنے گھر کا صفایا دن کو کیسے ہوپایا وہ جو شب بھر شہر کی خود نگرانی کرتا رہتا ہے

صبح سورج نکلنے اور ہر سو روشنی پھیلنے تک وہ لوگ وہیں لاؤنج میں بیٹھے رہے۔ ناشتے کی ٹرالیز اب میری اور فیونا لے کر جارہی تھیں' جب بیرونی دروازے پہ ہلچل مچی۔ ہاشم شیرو کو ایئرپورٹ سے لے کر آگیا تھا۔ جواہرات اور اورنگ زیب تیزی سے اس کی طرف لپکے۔ سعدی ہنوز خاموش سوچ میں ڈوبا بیٹھا تھا' اور حنین' وہ جوس کے گھونٹ گھونٹ پیتی' تیکھی نظروں سے دونوں ماں باپ کو اپنے بیٹے کو گلے لگاتے دیکھتی رہی۔ وہ واقعی تکان کا مارا لگ رہا تھا' ماتھے کے زخم پہ بینڈیج لگی تھی۔ آنکھیں روئی روئی تھیں۔ زبردستی مسکراتا' ماں سے گلے لگ کر الگ ہوا تو ان دونوں بہن بھائی کو بیٹھے دیکھ کر چونکا' پھر فوراً" ہاشم کی طرف دیکھا۔

"حنین کمپیوٹرز میں اچھی ہے' ہم ان لوگوں کو ٹریس کرنے کے لیے اس کی خدمات لے رہے تھے۔" اس نے وضاحت دی۔

"تو کیا آپ نے پیسے واپس حاصل کرلیے۔" وہ

حیرت سے پوچھتا صوفے پر بیٹھا۔ اورنگ زیب ایک طرف اور جواہرات دوسری طرف' باربار نم آنکھوں کو پونچھتی۔ اورنگ زیب گو کہ اپنے تاثرات کو سخت رکھ کر ہی بیٹھے تھے مگر اندر سے وہ نرم پڑ چکے تھے۔

''نہیں! ہاشم مسکراتے ہوئے (بالآخر) واپس آتے اعتماد کے ساتھ سامنے والے صوفے پر بیٹھا۔

''ہم تمہارے آنے سے پہلے ان کا تعاقب کر کے تمہاری جان خطرے میں نہیں ڈال سکتے تھے۔ مگر حنین کہہ رہی ہے کہ وہ ان لوگوں کو ٹریس کر سکتی ہے۔''

''تو کیا ان دونوں کو کال کرنے پہ انہوں نے مجھے یہ زخم دیا؟'' بگڑ کر کہتے اس نے پیشانی کے زخم کی جانب اشارہ کیا۔ اسے سعدی کا یہاں ہونا سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ جواہرات نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبایا۔

''ہاشم نے تو بس یونہی ان کو بلالیا۔'' ساتھ ہی جتاتی نظر حنین پہ ڈالی اور پھر شیرو کے ماتھے کے بال ہٹا کر بینڈیج ٹھیک کرنے لگی۔ وہ ایک دم بہت خفا نظر آنے لگا تھا۔

''آپ لوگوں نے مجھے بچانے میں اتنی دیر کیوں لگائی؟ جانتے ہیں' میرا کیا حال تھا ادھر؟ کتنا خوف میں نے محسوس کیا؟ کیا پیسے مجھ سے زیادہ اہم تھے؟''

''ایسا نہیں ہے شیرو!'' اورنگ زیب نے بھی ہولے سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ مگر اس نے کندھا جھٹک دیا۔ حنین نے جوس کا گلاس رکھا اور کھنکھاری۔

''آپ نے ان کی شکلیں تو دیکھی ہوں گی نوشیرواں بھائی؟''

''ہاں!''

''چلیں یہ اچھا ہوا کیونکہ ویسے ان لوگوں کو ٹریس کرنا مشکل ہے۔ اصل میں' میری کوریا کے ایک پولیس چیف سے بات ہوئی ہے۔'' سعدی نے چونک کر حنہ کو دیکھا جو پورے اعتماد سے نوشیرواں کو دیکھتی کہہ رہی تھی۔ ''ان دو لوگوں پہ شک ہے۔ یہ دونوں نامور مجرم ہیں اور دونوں کل رات امریکا منتقل ہو گئے ہیں' افسوس کہ اب نہ ہم ان سے رقم واپس لے سکتے ہیں' نہ ہی ان کو پکڑ سکتے ہیں۔ آپ بس ان دونوں کی تصویریں دیکھ کر کنفرم کر دیں کہ آپ کو پکڑنے والے گروہ کا سرغنہ کون تھا۔ حیران مت ہوں ہاشم بھائی! مجھ سے زیادہ کورین لوگوں کو کون جانتا ہے؟''

اس نے دو پرنٹ آوٹ سامنے کیے۔ دو کورین مردوں کے کلوز اپ سب کے سامنے ہوئے۔

ہاشم بے چینی سے آگے ہوا۔ ''مجھے بتائے بغیر تم کیسے کسی سے بات کر سکتی ہو؟ اگر وہ شیرو کو نقصان پہنچاتے تو؟''

سعدی نے ایک چبھتی ہوئی نظر ہاشم پہ ڈالی مگر بولا کچھ نہیں۔ کیا صرف شیرو کی جان اہم تھی؟ اور امل اور نور کے لیے کوئی اہم نہیں تھا؟

''بتاتی ہوں' پہلے شیرو بھائی کنفرم تو کر دیں کہ ان میں سے کون تھا وہ۔'' نوشیرواں نے باری باری دونوں کے چہرے دیکھے' پھر دائیں والے پہ ٹھہرا' آنکھیں سکیڑیں۔

''یہی تھا۔ بالکل یہی تھا۔''

''شیور!'' حنین نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''سو فیصد۔ مگر اب یہ کہاں ہو گا؟''

حنین نے گہری سانس لی' جیسے کندھوں سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔ اور پھر مسکرائی۔ شرارت سے' معصومیت سے۔

''یہ آج کل امریکا میں ہے فلم کی شوٹنگ کے لیے۔ اوہ سوری' شیرو بھائی! مگر یہ لی من ہو ہے۔ ——— کوریا کا دوسرا بڑا ایکٹر۔ یہ پہلی تصویر اس کی پلاسٹک سرجری سے پہلے کی ہے' دوسری سرجری کے بعد کی۔''

کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ کسی کو اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ نوشیرواں کا رنگ سفید پڑنے لگا۔

''نوشیرواں بھائی! آپ خود بتائیں گے یا میں بتاؤں کہ اپنے آپ کو آپ نے خود ہی اغوا کیا تھا۔ اور وہ

تاوان کی رقم' وہ بھی آپ کے ہی اکاؤنٹ میں ہے۔"
جواہرات کا شیرو کا کندھا مسلتا ہاتھ رک گیا۔ اورنگ زیب بے اختیار آگے کو ہوئے اور ہاشم بالکل ساکت بیٹھا رہ گیا۔

"کیا۔ بک۔ واس ہے؟" شیرو ہکلایا۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

"سارے ذہین لوگوں کا ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ انہیں لگتا ہے' کوئی ان کو بے وقوف نہیں بنا سکتا۔ اسی لیے میں نے اپنے شک کی تصدیق کا انتظار کیا۔ جو کہ اب ہو گیا۔" تصویریں لہرائیں۔

"اب یہ مت کہیے گا کہ سارے کورین ایک سے لگتے ہیں تو آپ نے غلط بندے کی تصویر کی تصدیق کر دی۔ کورین بھی اتنے ہی مختلف ہوتے ہیں جتنے کہ ہم۔"

"تم۔ کیا کہہ رہی ہو' تمہیں خود بھی علم ہے؟" جواہرات دانت پیستی غرائی۔ سعدی بالکل چپ بیٹھا تھا۔

"مجھے ہی تو علم ہے مسز کاردار! شیرو بھائی کبھی بھی اچھے کرمنل نہیں بن سکتے کیونکہ انہوں نے چند غلطیاں کر دیں۔ جو پہلی ویڈیو بھیجی' تاوان کی رقم کے لیے' اور دوسری جس میں ماتھے پہ زخم تھا' دونوں میں ان کا رونا' مجھے سوری! مگر اداکاری لگتا تھا' اور یونو! میں اتنے ملکوں اور کلچرز کے ڈرامے دیکھ چکی ہوں کہ اداکاری کو مجھ سے بہتر جج نہیں کر سکتے آپ لوگ۔ سو میں نے ویڈیوز کی تاریخ چیک کی۔ وہ دونوں تین دن پرانی تھیں' زخم والی بھی۔ شیرو بھائی کو اندازہ تھا کہ ہاشم بھائی اپنے جاننے والوں کو فون ضرور کریں گے اس لیے انہوں نے دو ویڈیوز تیار کر لیں۔ اغوا سے چند گھنٹے پہلے اگر ان کی ہاشم بھائی سے بات ہوئی تھی تو یہ ویڈیوز تو اس سے بھی پہلے کی تھیں۔ سو ظاہر ہوا کہ جعلی تھیں۔ مگر آپ کو یہ ویڈیوز کوریا میں تیار کرنی چاہیے تھیں' کیونکہ۔" ایک اور پرنٹ شدہ صفحہ لہرایا۔ جس میں شیرو کی ویڈیو کا اسٹل امیج تھا۔ "یہ جو آپ کے پیچھے دیوار پہ سوئچ نظر آ رہا ہے' یہ عام پاکستانی سوئچ جیسا ہے'

جبکہ کوریا میں سوئچ کھوکھلے ہوتے ہیں' انڈے کے آدھے چھلکے کی طرح' پلگ ان کے اندر ڈالا جاتا ہے۔ یہ کورین سوئچ نہیں ہے۔ اور۔" ویڈیو کا ایک اور اسٹل امیج مسکراتے ہوئے سامنے لائی۔

"چھت پہ کوئی فائر الارم نہیں ہے' جبکہ کورین گھروں میں چھت پہ فائر الارم ضرور ہوتا ہے۔ آپ نے لکڑی کا فرش' سلائیڈنگ ڈور' ہر چیز پرفیکٹ رکھی مگر۔ ایک سو گیارہ کورین ڈرامے اور فلمیں دیکھنا کوئی مذاق نہیں ہے۔ سو میں نے آپ کے کمپیوٹر کی ہسٹری چیک کی۔" ایک اور کاغذ ان کے سامنے میز پہ رکھا۔ اب وہ کھڑے کھڑے' باقی کاغذ ہاتھ میں پکڑے بول رہی تھی اور سب اس کو سن رہے تھے۔ ہکا بکا۔

"پچھلے ہفتے میں یہ وہ تمام ویب سائٹس ہیں جو آپ نے کھولیں۔" فیک اغوا کرنے کے طریقے' وغیرہ وغیرہ۔ اور آپ نے وہ فیک کڈنیپ والے بہت سے امریکی ڈرامے اور فلمیں بھی دیکھیں' کیونکہ آج کل یہ امیر ماں باپ کے بگڑے بچے کا خود کو اغوا کر لینا ہر دوسرے امریکی ڈرامے میں ہو رہا ہوتا ہے' یہ رہے ان تمام ڈراموں اور فلموں کی لسٹ جو آپ نے ڈاؤن لوڈ کر رکھے تھے۔ اوہ ہاں! اور وہ اپنا کان کاٹ کر بھیجنے والا آئیڈیا۔ وہ "اسکینڈل" سے تھا نا' اس میں ڈوتیل کی بیٹی نے تو واقعی اپنا کان بھیج دیا تھا' مگر مجھے معلوم تھا' اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ مگر آپ نے صرف وہ قسط "دیکھی" تھی' مجھے تو وہ "ایک۔ مونسٹر بھی اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے۔" والا ڈائیلاگ بھی یاد تھا۔

نوشیرواں دھواں دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ بیٹھا تھا' جیسے کوئی زہریلا جانور ڈس گیا ہو اسے۔ اورنگ زیب کے لب بھنچ چکے تھے' کنپٹی کی نسیں ابھر آئیں' سرخ ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ہاشم ابھی تک سن تھا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے۔ جھوٹ بولنا بند کرو۔ میرے ہی گھر میں تم میرے بیٹے کے بارے میں کیا بولے جا رہی ہو۔" جواہرات غصے سے کانپتی آواز میں بولنے لگی۔ "اگر ایسا کچھ تھا تو تم اسی وقت بتاتیں۔"

"اگر میں یہ سب آپ لوگوں کو بتا دیتی تو آپ فوراً شیرو بھائی کو فون کر کے کنفرم کرنا شروع کر دیتے اور یہ واپس ہی نہ آتے اور ممکن تھا کہ میں ہی غلط ہوتی تو مجھے تصدیق تو کرنی تھی نا۔ کیوں بھائی؟" محظوظ ہونے والے انداز میں آنکھیں گھما کر سعدی کو دیکھا۔ وہ ہر شے سے بے نیاز، چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اسے کچھ بھی مزید حیران نہیں کر سکتا تھا۔

باقی سب بھی خاموش تھے۔ ہاشم بالکل شل، اور رنگ زیب ضبط کیے، اور جواہرات بے چین، کبھی اِدھر دیکھتی کبھی اُدھر۔ نوشیرواں کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ مگر وہ شاک سے نکل آیا تھا۔ بدقت کھڑے ہوتے اس نے چلانے کی سعی کی۔

"نہیں... میں تمہارا منہ نوچ لوں گا، تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ پہ اتنا گھٹیا الزام لگانے کی۔"

"تمیز سے بات کرو میری بہن سے۔" سعدی ایک دم تیزی سے اٹھا۔ سلگتی نظروں سے شیرو کو دیکھا، اور پھر حنہ کو۔ "چلو۔"

"ابھی کیوں؟ ابھی تو شیرو بھائی کی کلاس شروع ہونی ہے۔" حنین نے منہ بنایا مگر سعدی دروازے کی طرف بڑھ چکا تھا، سو اس نے شانے اچکائے، نوشیرواں کو مسکرا کر دیکھتے بال جھٹکے اور سعدی کے پیچھے ہولی۔

"آپ لوگ چپ کیوں بیٹھے ہیں۔ اس پاگل کو کسی نے ٹوکا کیوں نہیں؟ میں اتنی تکلیف سے گزر کر آ رہا ہوں اور۔" نکلتے ہوئے انہوں نے نوشیرواں کو بپھر کر چلاتے سنا۔ مگر کسی اور کی آواز نہیں آئی۔ سب خاموش تھے۔

برآمدے میں آ کر سعدی نیچے چلا گیا تاکہ کار ادھر لے آئے۔ حنین ستون کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ باہر صبح تازہ دم سی اتر رہی تھی۔ ہوا ٹھنڈی تھی اور دھند بھی پھیلی تھی۔ حنین نے کوٹ کی ہڈ سر پہ گرا دی۔ تب ہی عقب میں دروازہ کھلا۔ وہ چونک کر مڑی۔ ایک لمحے کو دل دھڑکا کہ کہیں شیرو واقعی منہ نوچنے نہ آگیا ہو۔ مگر۔

ہاشم آہستہ سے دروازہ بند کرتا باہر آیا۔ اس نے سوئٹر تک نہیں پہنا تھا، باہر آنے کے باوجود اس کو سردی نہیں لگ رہی تھی۔ چہرہ سفید اور تکان زدہ تھا۔

"تھینک یو بیٹا! تم دونوں کا کہ تم لوگ پوری رات ہمارے ساتھ رہے۔" وہ کس دقت سے بول پا رہا تھا۔ حنین کو اندازہ تھا۔ اس کے دل کو کچھ ہوا۔

"کوئی بات نہیں ہاشم بھائی!" شیرو سے آنکھیں گھما گھما کر بات کرتی وہ کوئی اور تھی اور یہ اتنی نرم کوئی اور تھی۔

"مجھے بتاؤ کس طرح تمہارے اس فیور کا بدلہ دے سکتا ہوں۔" "کوئی چیز، کوئی کام، کچھ چاہیے تمہیں؟"

اپنے گرد بازو لپیٹے، ہڈ سر پہ گرائے حنہ نے نرمی سے مسکراتے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، کچھ بھی نہیں۔ میں اپنے سارے مسئلے خود حل کر سکتی ہوں یا اپنے بھائی کو کہہ دیتی ہوں۔"

"کبھی کبھی انسان اپنے بھائی کو بھی اعتماد میں نہیں لیتا، مجھے آج اندازہ ہوا ہے، اگر کبھی کوئی ایسا مسئلہ ہو جو تم سعدی کو بھی نہ بتانا چاہو، تو مجھے کال کر لینا۔ جیسے تم لوگ میری ایک کال پہ آئے ہو، میں بھی آؤں گا، اوکے؟" دھند آلود صبح میں پھر سے وہی فسوں چھانے لگا۔ دور کہیں کسی نے موسیقی کی تال چھیڑی تھی۔ بدقت وہ ہاشم پہ نگاہیں جمائے مسکرائی۔

"اوکے، لیکن اگر میرے کال کرنے پہ آپ نے پوچھا کہ کون حنین؟ تو؟"

"ایسا نہیں ہو گا۔" پھر وہ ٹھہرا۔ "سنو! علیشا سے کہنا، مجھے کال کر لے۔ میں اس کی فیس کی رقم اسے بھجوا دوں گا۔"

وہ ایک دم چونکی۔ "آپ۔ آپ اس کی فیس بھریں گے؟" خوشی سے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"میں اتنا برا بھی نہیں ہوں، جتنا تم مجھے سمجھتی ہو۔" ہنستے ہوئے چہرے سے وہ مسکرایا۔

سعدی ہارن دے رہا تھا، وہ ہاشم کو خدا حافظ کہہ کر زینے اترتی نیچے آئی۔ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی۔ اپنی پرفارمنس یاد کر کے خود ہی ہنسی۔

"کیا آپ نے دیکھا' میں کس طرح بولی۔ تھوڑا سا دل دھڑکا تھا میرا' ہاتھ بھی کانپے مگر جب میں بولی تو واؤ۔ بالکل ہیروئن لگ رہی تھی میں۔ اور پتا ہے ہاشم بھائی کہہ رہے ہیں کہ وہ **علیشا** کی فیس۔" سعدی خاموشی سے ڈرائیو کرتا کار آگے لے گیا۔

ہاشم برآمدے میں کھڑا انہیں دیکھتا رہا' سخت سردی اور دھند میں' یہاں تک کہ کار دور چلی گئی۔ پھر وہ واپس اندر آیا۔

"کیا یہ سب سچ تھا؟ تم نے اپنے باپ کو بے وقوف بنایا؟" اورنگ زیب کھڑے چلا رہے تھے' جواہرات ہنوز پریشان' مضطرب بیٹھی تھی اور نوشیرواں ان کے مقابل کھڑا تھا۔

"آپ لوگوں کو اس پاگل لڑکی کی بات پہ اعتبار ہے' وہ اور سعدی۔ یہ لوگ ہمیشہ میرے گھر میں فساد کرتے ہیں' وہ سعدی تو۔ ہاشم بھائی! آپ نے اس کو دو تھپڑ کیوں نہیں لگائے جب وہ یہ ساری بکواس کر رہی تھی؟" ہاشم کو آتے دیکھ کر وہ طیش سے چیخا تھا۔

"کاش! میں تمہارا نہیں' سعدی کا بھائی ہوتا۔" نہ غصہ' نہ ناراضی' صرف دکھ سے ایک ایک حرف ادا کیا' پیر سے میز کو ٹھوکر ماری' حنین کے پرنٹ کردہ کاغذات بکھر کر زمین پہ گر گئے۔ اور آگے بڑھ گیا۔ نوشیرواں منہ پہ ہاتھ رکھے' بے یقینی سے اس کو سیڑھیوں پہ اوپر جاتے دیکھنے لگا۔ پھر رخ موڑا۔ اونگ زیب سرخ چہرہ لیے اسے گھور رہے تھے۔

"ہاں کیا ہے میں نے یہ سب۔" ہاتھ ہٹا کر وہ غصے سے چلایا۔ "یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ ایسے ہاتھ روک کر پیسے دیتے ہیں مجھے جیسے میں سوتیلی اولاد ہوں' ہاں! آپ کا بھی دل چاہتا ہے کہ میری جگہ یہ۔ یہ۔" دروازے کی طرف اشارہ کیا جہاں سے حنین نکلی تھی۔ "یہ لڑکی آپ کی بیٹی ہوتی۔ ان ہی لوگوں کی باتوں پہ زیادہ یقین ہے نا آپ کو؟ یہ سعدی زیادہ پسند ہے نا آپ تینوں کو؟" لال بھبھوکا ہوتا بولتا وہ دو قدم پیچھے ہٹا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے۔" وہ بھی طیش سے چلائے تھے۔ ہاشم نے گویا کان بند کیے اور اپنے کمرے میں قدم رکھا اور دروازہ بند کر لیا۔ شیرو نے بے بسی سے اس کے بند دروازے کو دیکھا' آنسو بہنا تیز ہو گئے۔ وہ مڑا اور کف سے آنکھیں رگڑتا سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ اپنے کمرے میں آکر دروازہ دھاڑ سے بند کر کے وہ کمپیوٹر ٹیبل کے سامنے آیا تو اسکرین کو دیکھ کر رکا۔ بند اسکرین پہ ایک Sticky نوٹ چپکا تھا' جس پہ حنین نے لکھا تھا۔

"نقل کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ گیم اوور شیرو بھائی۔" ساتھ میں زبان چڑاتا فیس بنا تھا۔

اس نے نوٹ جھپٹ کر مٹھی میں مروڑا۔ کف سے دوبارہ آنکھیں رگڑیں۔ اب ان میں خون اتر رہا تھا۔ اتنا لمبا ڈرامہ اور سب برباد گیا تھا۔

"آج پھر اسی سعدی نے اپنی بہن کے ذریعے میرے گھر میں فساد ڈالا۔ میں قسم کھاتا ہوں' ایک دن میں سعدی یوسف کو اپنے ہاتھوں سے گولی ماروں گا۔"

اور ڈیڑھ سال گزر جانے کے بعد بھی نوشیرواں کو اپنی قسم یاد تھی۔

باہر اورنگ زیب' جواہرات پہ چلا رہے تھے۔

"ایک لفظ بھی اس کی حمایت میں بولا تو میں سمجھوں گا تم بھی اس کے ساتھ ملی ہوئی تھیں۔ اپنے بیٹے سے کہو صبح دس بجے تک میری ساری رقم میرے اکاؤنٹ میں واپس پہنچا دے ورنہ۔"

باہر سورج کی کرنوں نے دھند میں سے راستہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ یہاں سے دور' اس چھوٹے باغیچے والے گھر میں حنین سونے جا چکی تھی اور سعدی اپنے کمرے میں بیٹھا لیپ ٹاپ پہ وہ فلیش لگا کر دیکھ رہا تھا۔ اس میں وہی تصاویر تھیں جن کی پرنٹ شدہ شکل وہ لاکر میں دیکھ چکا تھا۔ اور دو آڈیو فائلز تھیں۔ ایک میں فارس کہہ رہا تھا کہ اب زمر ہوٹل کے بجائے ریسٹورنٹ آئے۔ دوسری آڈیو طویل تھی۔

سعدی نے پلے کی۔ پہلی دفعہ سنا تو وہ سن رہ گیا۔ زمر ٹھیک کہہ رہی تھی۔ فارس نے اس سے واقعی یہ

سب کہا تھا۔ تو کیا ہاشم کی طرح فارس بھی اس سے جھوٹ بولتا آیا تھا؟

دوسری دفعہ اسے سنا تو مزید صدمہ لگا۔ فارس یہ سب کیسے اور۔ کیوں؟

تیسری دفعہ سنا تو بے یقینی گھبراہٹ میں بدلنے لگی۔ کیا اس کے گرد سب جھوٹ بولنے والے موجود تھے؟ پھر سچا کون تھا؟

چوتھی دفعہ پہ کوئی عجیب سا احساس ہونے لگا۔ کچھ غلط تھا۔ چند الفاظ فارس اس طرح نہیں بولتا تھا۔ وہ بار بار آڈیو دہرانے لگا۔ اتنی دفعہ کہ اسے گنتی بھول گئی۔ چہرے پہ بس ایک چونک جانے کا احساس نظر آرہا تھا۔ وہ فارس نہیں تھا۔ بہت غور کرنے پہ اسے احساس ہوا تھا کہ لہجے میں ہلکا سا فرق تھا۔ پہلی دفعہ سننے میں اسے بھی وہ فارس لگا تھا۔

اور زمر۔ وہ چونکا۔ زمر نے تو وہ آڈیو بس ایک ہی دفعہ سنی تھی۔ اوہ!

ڈھائی سال سے بکھرے ٹکڑے اب پزل میں جڑنے لگے تھے۔ اور جو شکل سامنے آرہی تھی وہ بہت بھیانک تھی۔

وہ ہاشم کی شکل تھی۔



آج دوپہر کے سورج نے دھند کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ روشن دان سے روشنی جھلک کر کمرے کے وسط میں رکھی میز پہ گر رہی تھی جس کے ایک طرف فارس بیٹھا تھا اور دوسری جانب سعدی۔ ساتھ میں فارس کا وکیل۔ وہاں اداس کر دینے والی خاموشی تھی، جس میں پچھتاوے اور تاسف کی سی ویرانی بسی تھی۔ سعدی نے بہت دیر بعد جھکا سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی اور بہت ساری شرمندگی۔

"آئی ایم سوری!"

"کس بات کے لیے؟" غور سے اس کی آنکھوں کو دیکھتے فارس کو اچنبھا ہوا۔

"آپ کو اتنا کم کموزٹ کرنے کے لیے۔"

"کوئی بات نہیں، تم جاب کر رہے ہو، مجھے پتا ہے۔" اس نے سمجھنے والے انداز میں ہلکے سے کندھے جھٹکے۔ سعدی اسی طرح اسے دیکھتا رہا۔

فارس سفید کرتے شلوار میں ملبوس تھا۔ ایک زمانے میں چھوٹے کٹے بال اب بڑھ چکے تھے، اتنے کہ انہیں کس کر پونی میں باندھ رکھا تھا۔ شیو ہلکی ہلکی بڑھی تھی، مگر دوسرے قیدیوں کی نسبت وہ کافی صاف ستھرا سا لگتا تھا۔

"اب اس آڈیو کا کیا کرنا ہے؟" فارس نے وکیل کے موبائل کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ میری آواز نہیں ہے، مگر مشابہت بہت زیادہ ہے۔ اگر میڈم نے یہی سنی ہے تو ان کو اب میں اپنی بے گناہی کا یقین کبھی نہیں دلا سکتا۔"

وکیل صاحب کھنکھارے۔

"ہم نے اسے ایک ایکسپرٹ کو دکھایا ہے، اس نے یہ ثابت کر کے بتایا ہے کہ یہ Converted وائس ہے۔ جعلی ہے۔"

"ہم نے نہیں، میں نے۔" سعدی نے تلخی سے ان کو دیکھا۔ "آپ تو اس کے پاس چلنے تک کو راضی نہیں تھے۔"

"میں ایک اور کیس کے سلسلے میں مصروف تھا۔ اور تمام قانونی پیچیدگیاں آپ کو سمجھا چکا ہوں۔" اس سے پہلے کہ سعدی مزید تلخی سے جواب میں کچھ کہتا، فارس نے بے چینی سے اسے ٹوکا۔

"کیا ہم کورٹ میں یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ یہ میری آواز نہیں ہے؟"

"نہیں، جب تک کہ سعدی اس کا سورس ظاہر نہیں کرتا، کورٹ اس کو کیسے قبول کرے گا۔"

"محمود صاحب! میں آپ کو کتنی دفعہ بتا چکا ہوں، یہ آڈیو مجھے میری پھپھو نے نکلوا کر دی ہے اور میں ان کا نام لے کر ان کو Incriminate نہیں کر سکتا۔ اور میری اجازت کے بغیر آپ بھی یہ نہیں کر سکتے۔"

"بھئی پھر تو مسئلہ بن جائے گا۔ یہ ہمارے حق سے زیادہ خلاف جائے گی۔ میں اسے کورٹ میں پیش

کرنے کی نصیحت کبھی نہیں کروں گا۔" محمود صاحب ہاتھ جھاڑ کر پیچھے کو ہو بیٹھے۔ سعدی نے ایک تیکھی نظر ان پہ ڈالی' پھر واپس فارس کو دیکھا۔

"ماموں! اگر میں آپ کے لیے کوئی فیصلہ لوں تو مجھے اپنی زبان دیں کہ آپ اعتراض نہیں کریں گے۔"

"نہیں کروں گا' لیکن۔" وہ اچنبھے سے بولنا چاہ رہا تھا مگر سعدی فوراً" محمود صاحب کی طرف گھوما۔

"آپ کو میں فارس غازی کے وکیل کے منصب سے ہٹاتا ہوں۔"

وہ ایک دم سیدھے ہوئے' حیرت سے اسے اور پھر فارس کو دیکھا۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" ناگواری سے ماتھے پہ شکنیں ابھریں۔

"یہی کہ آپ یہاں سے جا سکتے ہیں۔"

"میں فارس غازی کا وکیل ہوں' آپ کا نہیں!" وہ ایک دم چمک کر بولے۔ فارس چند لمحے چپ رہا۔ باری باری دونوں کے چہرے دیکھے۔

"میں سعدی کی تائید کرتا ہوں۔ آپ جا سکتے ہیں۔" سعدی کے لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ اس کا مان نہیں ٹوٹا۔ ابھی دنیا سے اس کے اپنے ختم نہیں ہوئے تھے۔

وہ جیسے بہت ضبط کر کے اٹھے۔

"انتہائی بچکانہ رویہ ہے یہ۔ پیشی سے چند دن پہلے آپ وکیل کو فارغ کر رہے ہیں۔ مجھے ہاشم کاردار نے ان کا وکیل مقرر کیا تھا۔"

"اور ان ہی سے وصول کیجئے گا اپنے بقایا واجبات کیونکہ میں تو آپ کو اپنے حلال رزق سے ایک پائی بھی نہیں دینے لگا۔" بے نیازی سے انہیں باہر جانے کا رستہ دکھایا۔ وہ اپنی چیزیں سمیٹتے' کوٹ کا بٹن بند کرتے' منہ میں بڑبڑاتے باہر نکل گئے۔

"یہ سب کیا تھا؟" فارس غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کیا؟"

"سعدی! تم مجھے پریشان کر رہے ہو!" وہ فکر مندی سے کہتا آگے ہوا۔ "یہ آڈیو سن کر بھی زیادہ ری ایکٹ نہیں کیا میں نے' کیونکہ میرے لیے کچھ بھی پریشان کن نہیں ہے سوائے تمہاری شکل کے۔ ہوا کیا ہے تمہارے ساتھ؟"

جینز اور ہائی نیک کے اوپر جیکٹ پہنے بیٹھا لڑکا اداسی سے مسکرایا۔ "میں ریشم کا بن چکا ہوں اور ریشم اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں آتی۔ مجھ سے آپ کچھ بھی نہیں اگلوا پائیں گے۔ اس وقت میرا کام آپ کو یہاں سے نکلوانا ہے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایسا کروں گا۔ سوال مت کریں' وہ بتائیں جو میں نے پوچھا تھا۔" اس نے یاد دلایا۔ "جن لوگوں پہ آپ کو شک ہے' ان کی فہرست بنائی آپ نے؟"

"ہاں لکھو۔" وہ بتانے لگا اور سعدی پین نکال کر لکھنے لگا۔ کولیگز' وہ چند لوگ جن کے خلاف اس نے کیسز تیار کیے تھے۔ وارث کا باس۔ اور بس۔ سعدی نے بے چینی سے نظریں اٹھائیں۔

"ہاشم بھائی کا نام نہیں لکھوایا آپ نے؟"

فارس کچھ دیر سوچتا رہا' پھر نفی میں سر ہلایا۔

"اونہوں۔ اس کا تعلق نہیں ہے اس سب سے۔"

"مگر آپ نے خود کہا تھا کہ۔"

"میں نے ڈھائی سال اس بارے میں سوچا ہے' پہلے گرم دماغ سے' پھر ٹھنڈے دل سے' مگر ہاشم کے پاس یہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اور اس نے میرے لیے بھاگ دوڑ بھی کی ہے کافی' سو میں بے شک اسے شدید ناپسند کرتا ہوں' مگر اس کو اس سب میں نہیں گھسیٹوں گا۔ یہ غلط ہے۔"

سعدی نے گہری سانس لے کر اس فہرست کو دیکھا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔

"بھول جائیں اس بات کو۔" کاغذ مروڑ کر مٹھی میں دبا لیا۔ "آپ کا اے ٹی ایم' کریڈٹ کارڈز اور چیک بکس ہاشم بھائی نے امی کو بہت پہلے دے دیے تھے۔ جیولری وغیرہ انہی کے پاس ہے۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ نئے وکیل کے لیے آپ کے اکاؤنٹ کی رقم کافی ہوگی۔"

"جب اتنے سال میں کہتا رہا کہ ہاشم سے پیسے مت لو میرے وکیل کے لیے تب تم نے یہ نہیں کہا۔ اب کیا ہوا ہے؟" وہ ابھی تک آنکھیں سکیڑ کر اس کو دیکھ رہا تھا۔

"مجھے ان پہ اعتبار نہیں رہا۔" اس کی آواز میں تکلیف تھی۔

"سعدی! کیا چھپا رہے ہو؟"

"سوال مت کریں۔ انتظار کریں۔" اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ فارس متفکر نظروں سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔

باہر دھوپ اب تیز ہو چکی تھی۔ سڑک پہ معمول کی ٹریفک بہہ رہی تھی۔ کار ڈرائیو کرتے سعدی نے ہینڈز فری کانوں میں لگائے اور موبائل پہ نمبر ڈائل کیا۔ چند گھنٹیوں بعد ہاشم نے فون اٹھا لیا۔

"ہاں بیٹا خیریت؟" وہ مصروف لگ رہا تھا۔

"جی ایک کام تھا آپ سے۔" اس کے بعد آج ہاشم سے بات ہو رہی تھی۔

"ہوں بولو۔"

"میں نے محمود صاحب کو فائر کر دیا ہے۔ اب مجھے ماموں کے لیے ایک بہتر وکیل کی تلاش ہے۔"

"کیوں؟ فائر کیوں کیا؟" وہ چونکا تھا۔

"کیونکہ مجھے وہ سست اور نااہل لگتے ہیں۔ خیر! آپ مجھے پانچ چھ بہترین وکیلوں کے نام ٹیکسٹ کر دیں' جن کو مجھے ہائر کرنا چاہیے۔"

ہاشم چند لمحے کو خاموش ہو گیا۔ پھر بولا تو کافی سوچتے ہوئے۔ "اوکے' کرتا ہوں۔ میرے ریفرنس سے ان سے مل لینا۔ کام ہو جائے گا۔ ویسے سماعت کے اتنے نزدیک آکر وکیل کو فائر کرنا بے وقوفی ہوتی ہے سعدی!"

"اور یہ تو میں جان گیا ہوں کہ میں کتنا بے وقوف ہوں۔"

"کوئی مسئلہ ہے تو میں محمود صاحب سے بات کر لیتا ہوں' مفاہمت تو ہر ایشو پہ ہو سکتی ہے۔"

"مفاہمت کی ہی تو گنجائش نہیں رہی۔ آپ ٹیکسٹ کر دیجیے' بس ابھی۔"

اور موبائل فرنٹ سیٹ پہ ڈال دیا۔ چہرے پہ چھائی تلخی میں اضافہ ہو گیا۔ لب بھینچ گئے۔ آنکھوں میں غصہ ابھرا۔ کتنے دن اس کے دل و دماغ میں جنگ جاری رہی تھی۔ ہاشم کے لیے کئی دلیلیں اکٹھی کیں مگر سب بے کار تھا۔ جب آنکھوں سے اندھے اعتماد کی پٹی اتری تو ہر شے کو نئے زاویے سے دیکھنا شروع کیا۔ پہلے لگا' وہ صرف قاتل کو جانتا ہے' مگر اب آہستہ آہستہ احساس ہوا کہ وہی ہے' جو فارس کو باہر نہیں آنے دے رہا۔ اگر ہاشم چاہتا تو فارس باہر ہوتا۔ فارس اور ندرت نے کتنی دفعہ یہ بات اس سے کہی مگر تب سمجھ میں کیوں نہیں آتا تھا؟ یہ اعتماد کتنی بھیانک شے ہے۔ اندھا کر دیتا ہے۔ بہرا' لنگڑا کر دیتا ہے۔

تب ہی موبائل بجا۔ ہاشم نے چند نام اسے ٹیکسٹ کر دیے تھے۔ سعدی نے ان کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ یہ وہ وکیل تھے جن کو ہاشم چاہتا تھا وہ ہائر کرے۔ یعنی یہ وہ تھے جن کو ہاشم خرید سکتا تھا۔ اسے اب معلوم ہو گیا تھا کہ اس فہرست کے وکیل اسے بالکل نہیں ہائر کرنے۔ گڈ!

وہ جب زمر کے گھر کے گیٹ تک آیا تو وہ پورچ میں کار سے اتر رہی تھی۔ دروازہ بند کرتے وہ مڑی تو دیکھا' سعدی نے کار باہر روک دی تھی اور اب قدم قدم چلتا اس کی جانب آرہا تھا۔ جینز پہ جیکٹ پہنے' چہرے پہ چھائی سنجیدگی' وہ قریب آیا تو احساس ہوا کہ وہ اس سے لمبا ہو گیا تھا' پتا نہیں کب سے۔

"کیسے ہو؟" اس نے سپاٹ آنکھوں اور بے تاثر لہجے میں پوچھا۔ وہ "ٹھیک" کہتا اس کے ہمراہ لان میں بچھی کرسیوں کی طرف آیا۔

"کچھ کہنے آیا ہوں آپ سے۔"

"مجھے فارس سے نہیں ملنا' نہ ہی اس کی صفائی سننی ہے۔" وہ کرسی پہ بیٹھی' ٹانگ پہ ٹانگ جمائی۔ بازو سینے پہ لپیٹے۔ بال ہاف کیچر میں بندھے تھے اور دھوپ کے باعث بے زاریت بھری آنکھوں کو سکیڑ رکھا تھا۔

"پھپھو... ایک دفعہ دوسری طرف کی کہانی سن لیں۔" وہ آگے کو ہو کر اس کے مقابل بیٹھا۔

"میں جج نہیں ہوں۔نہ ہی اس کو سزا دے سکتی ہوں۔" اس نے ذرا سے شانے اچکائے۔ "میرے سننے کا فائدہ؟"

"اگر۔۔۔ مجھ سے کوئی گلہ ہے تو کہہ دیں۔" وہ ڈھائی سال سے بتانا چاہتا تھا' ایک دفعہ وہ گلہ کر دے' کہہ دے کہ اس سے بدتمیزی سے بات کرنے کے بعد وہ اس کو چھوڑ کر کیوں چلا گیا؟ سوری کیوں نہیں کہا؟ اس کے آپریشن کے وقت وہ کہاں تھا؟ کیوں اس کی ری کوری کے ان تکلیف وہ دنوں میں وہ اس کے پاس نہیں تھا؟ واپس کیوں نہیں آیا؟ مگر وہ کہتی ہی نہیں تھی۔ اب بھی نظرانداز کر گئی۔

"تم کیا کہنے آئے ہو؟"

"آپ سچ کہہ رہی تھیں۔ واقعی آپ کو کال کی گئی تھی۔ آپ نے جو بتایا واقعی ایسا ہوا تھا۔"

"اچھا! ڈھائی سال بعد یقین آگیا تمہیں سعدی؟" وہ سنتی گئی۔ آنکھوں کی پتلیاں سکیڑ کر اسے دیکھتی۔ بازو ہنوز سینے پہ لپیٹے۔

"مگر وہ کنورٹڈ وائس تھی۔ جعلی آواز۔ یہ سنیں۔" اس نے موبائل نکال کر یہ چند بٹن دبائے۔ آوازیں ابھرنے لگیں۔ زمر سیدھی ہوئی' آنکھوں میں تکلیف ابھری۔ بس چند فقرے وہ سن پائی۔

"بند کرو اسے۔" اور ناگواری سے چہرہ پھیر لیا۔

"کیا یہ سب اسی طرح ہوا تھا؟"

"میرے ہاں یا ناں کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ ڈھائی سال پہلے تم لوگوں نے کہا کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں' آج کہہ رہے ہو میں سچ بول رہی تھی۔ پانچ سال بعد کہو گے' یہ واقعی فارس کی ہی آواز تھی۔"

"آئی ایم سوری۔ جیسے آپ نے ہماری بات نہیں سنی' ویسے ہی ہم نے بھی آپ کی بات نہیں سنی۔ میں سمجھا آپ کسی کو کور کر رہی ہیں' مگر ایسا نہیں تھا۔"

"ڈھائی سال بعد میرا یقین کرنے کا شکریہ۔" وہ سارا کرب ضبط کر چکی تھی۔

"لیکن آپ تیسری بات کا امکان ذہن میں رکھ کر سوچیں پھپھو! یہ کال جعلی تھی۔ ہم کورٹ میں یہ ثابت کر سکتے ہیں۔"

"اور یہ تمہیں کیسے ملی؟"

"میں جواب دینے سے انکار کرتا ہوں۔" وہ بے اختیار پیچھے ہوا۔

"اس صورت میں یہ میرے لیے قابل قبول نہیں ہے۔"

"اگر آپ اس میں لہجے پہ غور کریں تو محسوس ہوگا کہ۔۔۔"

"جب یہ کال مجھے موصول ہوئی' میں ایک Sniper کے نشانے پہ تھی' مجھے لہجے اور آواز کے pitch پہ غور کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس آواز کے ساتھ میری زندگی کی سب سے تکلیف دہ یاد جڑی ہے۔ اس لیے کوئی آج آکر کہہ دے کہ یہ جعلی ہے' تو میں کیسے مان لوں؟" تیز لہجے میں کہتی وہ اس کو شاکی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"ایک دفعہ سوچ کر دیکھیں۔ کوئی تیسرا آدمی بھی اس میں ملوث ہو سکتا ہے۔"

"مثلاً" کون؟" سعدی نے جواب میں تھوک نگلا۔

"مثلاً"۔۔۔ مثلاً" ہاشم کاردار۔" ہمت کر کے اس نے کہہ ڈالا۔ زمر سن سی ہو گئی۔

(باقی آئندہ ماہ انشاءاللہ)

تنزیلہ ریاض



نور محمد برطانیہ میں رہائش پذیر ہے اور لوٹن کی جامع مسجد میں موذن ہے۔ پیسے والا اور خوب دل والا ہے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا ہے۔ جس کا ایک کمرا ایک عربی طالب علم اپنے دوست کے ساتھ شیئر کرتا ہے، جبکہ دوسرے کمرے میں اس کے ساتھ ایرانی زین العابدین رہتا ہے۔ اسے اپنے ایرانی ہونے پر فخر ہے۔ وہ برطانیہ میں اسٹڈی ویزے پر جاب کرتا ہے۔ سخت محنتی ہے مگر پاکستان میں موجود بارہ افراد کے کنبے کی کفالت خوش اسلوبی سے نہیں کر پا رہا۔

عمر شہروز کا کزن ہے، جو اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ وہ لوگ تین چار سال میں پاکستان آتے رہتے ہیں۔ عمر اکثر اکیلا بھی پاکستان آجاتا ہے۔ وہ کافی منہ پھٹ ہے۔ اسے شہروز کی دوست امائمہ اچھی لگتی ہے۔ شہروز کی کوششوں سے ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر زارا شہروز کی سادہ مزاج منگیتر ہے۔ ان کی منگنی بڑوں کے فیصلے کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان محبت ہے لیکن شہروز کے کھلنڈرے انداز کی بنا پر زارا کو اس کی محبت کا یقین نہیں ہے۔

اس کے والد نے اسے گھر پر پڑھایا ہے اور اب وہ اسے بڑی کلاس میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ سر شعیب انہیں منع کرتے ہیں کہ ان کا بچہ بہت چھوٹا ہے۔ اسے چھوٹی کلاس میں ہی داخل کروائیں مگر وہ مصر رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بچے پر بہت محنت کی ہے۔ وہ بڑی کلاس میں داخلے کا مستحق ہے۔ سر شعیب اسے بچے پر ظلم سمجھتے ہیں مگر اس کے باپ کے

مکمل ناول



اصرار پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ بچہ بڑی کلاس اور بڑے بچوں میں ایڈجسٹ نہیں ہو پاتا۔ اسکالرشپ حاصل کرنے والے اس بچے سے حیرت انگیز طور پر ٹیچرز اور فیلوز میں سے بیشتر ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے باپ کی طرف سے غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر سخت مخالفت ہے۔

وہ خواب میں ڈر جاتا ہے۔

73ء کا زمانہ تھا اور روپ نگر کا علاقہ۔

بلی انڈیا میں اپنے گرینڈ پیرنٹس کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ برطانیہ کے رہنے والے تھے۔ گرینڈ پا یہاں کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں آئے تھے۔ گرینی نے یہاں کوچنگ سینٹر کھول لیا تھا۔ جتارا واس کے ہاں پڑھنے آتی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ماس مچھی کھانے والے کسی کے دوست نہیں بن سکتے۔ وہ وفادار نہیں ہو سکتے۔ گرینڈ پا کو بتایا، وہ اسے سمجھاتے ہیں کہ قدرت نے ہمیں بہت محبت سے تخلیق کیا ہے اور ہماری فطرت میں صرف محبت رکھی ہے۔ انسان کا اپنی ذات سے اخلاص ہی اس کی سب سے بڑی وفاداری ہے۔

امائمہ کے کسی رویے پر ناراض ہو کر عمر اس سے انگوٹھی واپس مانگ لیتا ہے۔ زارا شہروز کو بتاتی ہے۔ شہروز اور عمر کا جھگڑا ہو جاتا ہے۔

اس کی کلاس میں سلیمان حیدر سے دوستی ہو جاتی ہے۔ سلیمان حیدر بہت اچھا اور زندہ دل لڑکا ہے۔ سلیمان کے کہنے پر پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل میں بھی دلچسپی لینے لگتا۔ وہ اپنے گھر جا کر امی سے بیٹ کی فرمائش کرتا ہے تو اس کے والد یہ سن لیتے ہیں، وہ اس کی بری طرح پٹائی کر دیتے ہیں۔ ماں بے بسی سے دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ پھر اس کے والد اسکول جا کر منع کر دیتے ہیں کہ سلیمان حیدر کے ساتھ نہ بٹھایا جائے۔ سلیمان حیدر اس سے ناراض ہو جاتا ہے اور اسے ابنارمل کہتا ہے۔ جس سے اس کو بہت دکھ ہوتا ہے۔

کلاس میں سلیمان حیدر پہلی پوزیشن لیتا ہے۔ پانچ نمبروں کے فرق سے اس کی سیکنڈ پوزیشن آتی ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے والد غصے سے پاگل ہو جاتے ہیں اور کمرا بند کر کے اسے بری طرح مارتے ہیں۔ وہ وعدہ کرتا ہے کہ آئندہ پینٹنگ نہیں کرے گا۔ صرف پڑھائی کرے گا۔

اس کے والد شہر کے سب سے خراب کالج میں اس کا ایڈمیشن کراتے ہیں۔ تاکہ کالج میں اس کی غیر حاضری پر کوئی کچھ نہ کہہ سکے اور اس سے کہتے ہیں کہ وہ گھر بیٹھ کر پڑھائی کرے۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ نہ ہو۔ اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔

امائمہ کی والدہ شہروز کو فون کرتی ہیں۔ شہروز کے سمجھانے پر عمر کو عقل آجاتی ہے اور وہ اپنے والد کو فون کرتا ہے۔ جس کے بعد عمر کے والد امائمہ کے والد کو فون کر کے کہتے ہیں کہ بچوں کا نکاح کر دیا جائے۔ دونوں کے والدین کی رضامندی سے عمر اور امائمہ کا نکاح ہو جاتا ہے۔ نکاح کے چند دن بعد عمر لندن چلا جاتا ہے۔

نکاح کے تین سال بعد امائمہ عمر کے اصرار پر اکیلے ہی رخصت ہو کر لندن چلی جاتی ہے۔ لندن پہنچنے پر عمر اور اس کے والدین امائمہ کا خوشی خوشی استقبال کرتے ہیں۔

امائمہ عمر کے ساتھ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں آجاتی ہے، جبکہ عمر کے والدین اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ امائمہ عمر اتنے چھوٹے فلیٹ میں رہنے سے گھبراتی ہے اور عمر سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے عمر کے والدین کے گھر رہنے کو کہتی ہے جسے عمر یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ وہ اپنے والدین پر مزید بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔

اس شخص کے شدید اصرار پر نور محمد اس سے ملنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے دوستی کی فرمائش کرتا ہے۔ نور محمد انکار کر دیتا ہے، لیکن وہ نور محمد کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ وہ نور محمد کی قرات کی تعریف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے نماز پڑھنا نور محمد سے سیکھا ہے۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ اسے نور محمد کے پاس کسی نے بھیجا ہے۔ نور محمد کے پوچھنے پر کہتا ہے۔ خضر الٰہی نے بھیجا ہے۔

روپ نگر سے واپس برطانیہ آنے پر گرینڈ پا کا انتقال ہو جاتا ہے اور گرینی مسٹر ایرک کی دوستی بڑھنے لگتی ہے۔ وہ بلی سے

کہتی ہیں کہ وہ اپنی ممی سے رابطہ کرے۔ وہ اسے اس کی ممی کے ساتھ بھجوانا چاہتی ہیں۔ بلی انکار کے باوجود وہ کوہو کو بلوالیتی ہیں اور اسے ان کے ساتھ روانہ کردیتی ہیں۔

میری کالج میں طلحہ اور راشد سے واقفیت ہوجاتی ہے۔

عمر نے اسے پبلک لائبریری کا راستہ بتادیا ہے۔ عمر کو آرٹ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن وہ امائمہ کی خاطر دلچسپی لیتا۔ دونوں بہت خوش ہیں۔ لیکن امائمہ وہاں کی معاشرت کو قبول نہیں کرپارہی۔ عمر کی دوست مارتھا کے شوہر نے امائمہ کو گلے لگاکر مبارک باد دی تو اسے یہ بات بہت ناگوار گزری گھر جاکر دونوں میں جھگڑا ہوگیا۔

گرینی کے انتقال کے بعد بلی کوہو کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ کوہو پہلے بھی گرینی سے اچھا خاصا معاوضہ وصول کرتی رہی تھی۔ بلی کو اپنے پاس رکھنے کے معاملے پر کوہو نے مسٹر ایرک سے جھگڑا کیا کیونکہ گرینی نے انہیں بلی کا نگراں مقرر کیا تھا۔ پھر دونوں نے سمجھوتا کرلیا اور کوہو نے مسٹر ایرک سے شادی کرلی۔

نور محمد 'احمد معروف کو اپنے ساتھ گھر لے آیا تھا۔ احمد معروف کے اچھے اطوار 'عمدہ خوشبو 'نفیس گفتگو 'اعلا لباس کے باعث وہ سب اسے پسند کرنے لگے تھے۔ نور محمد بھی اس سے گھل مل گیا تھا۔ احمد نے کہا تھا کہ وہ جہاں رہتا ہے وہاں سے مسجد کافی دور ہے' اس لیے وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ نور محمد بھی اس سے گھل مل گیا تھا۔ احمد نے کہا تھا کہ وہ جہاں رہتا ہے وہاں سے مسجد کافی دور ہے' اس لیے وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ نور محمد اس سے کہتا ہے اسے دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے' اس کے لیے اللہ کا دین کافی ہے۔ احمد معروف کہتا ہے۔ "اللہ کا دین تو کیا دنیا اللہ کی نہیں ہے۔" "اسلام کی سب سے اچھی بات یہی ہے' اس میں دنیا کا انکار نہیں ہے۔ آپ دنیا کے ساتھ وہ مت کریں جو ابلیس نے آپ کے ساتھ کیا تھا۔

صبا نورین کالج کی ذہین طالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت چالاک بھی تھی۔ صبا نے اس سے صرف نوٹس حاصل کرنے کے لیے دوستی کی تھی۔ اکیڈمی کے لڑکوں طلحہ اور راشد نے اسے دوسرا رنگ دے کر اس کا مذاق بنالیا۔ اس مسئلہ پر لڑائی ہوئی اور نوبت مارپیٹ تک آگئی۔

امائمہ اور عمر میں دوستی ہوگئی لیکن دونوں کو احساس ہوگیا تھا کہ ان کے خیالات بہت مختلف تھے۔

کوہو کے ساتھ رہتے ہوئے بھی زندگی کا محور صرف کتابیں اور اسکول تھا۔ ایک دوست کے ہاں پارٹی میں ایک عرصے بعد اس کی ملاقات جیتا راؤ سے ہوئی۔ وہ اب ٹیا کہلاتی تھی۔ اس کا تعلق ہندوستان کے ایک بہت اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ وہ رقاصہ کے طور پر اپنے آپ کو منوانا چاہتی تھی اس لیے گھر والوں کی مرضی کے خلاف یہاں چلی آئی تھی۔

احمد معروف کی باتوں سے نور محمد عجیب الجھن میں مبتلا ہوجاتا ہے اور اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں سے گھبرا کر احمد معروف کو سوتے میں سے جگا دیتا ہے۔ نور محمد معروف کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے اور اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتانے لگتا ہے۔

اکیڈمی میں ہونے والی لڑائی کے بعد جنید اور طلحہ کے والدین کے ساتھ نور محمد کے والد کو بھی بلوایا گیا تھا۔ طلحہ اور جنید کے والدین اپنے بیٹوں کی غلطی ماننے کے بجائے نور محمد کو قصوروار ٹھہراتے ہیں جبکہ نور محمد کے والد اس کو مورد الزام ٹھہرا کر لاتعلقی ظاہر کرتے ہیں۔ اکیڈمی کے چیئرپرسن حمید کا دوانی جنید اور طلحہ کے ساتھ نور محمد کو بھی اکیڈمی سے فارغ کر دیتے ہیں۔ نور محمد اکیڈمی سے نکالے جانے سے زیادہ اپنے والد کے رویے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ اسٹیشن کی طرف نکل جاتا ہے۔ ٹرین میں سفر کے دوران نور محمد کی ملاقات سلیم نامی جیب کترے سے ہوجاتی ہے۔ سلیم کو پکڑنے کے لیے پولیس چھاپہ مارتی ہے تو سلیم بھاگنے میں کامیاب ہوجاتا ہے' جبکہ نور محمد کو پکڑ کر پولیس تھانے لے آتی ہے اور پھر نور محمد کے والد پولیس کو رشوت دے کر اسے چھڑا کر گھر لے آتے ہیں۔

بھائی پھیرو سے لاہور تک کے پورے راستے میں نور محمد سے اس کے والد کوئی بات نہیں کرتے۔ لیکن گھر آکر وہ اونچی آواز میں چلا کر غصے کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہتے ہیں کہ "وہ آج سے اس کے لیے مرچکے ہیں اور اس سے ان کا کوئی

تعلق نہیں ہے۔" پہلی بار اس کی ماں بھی کہہ اٹھتی ہیں کہ اس سے بہتر تھا کہ وہ مر جاتا۔ نور محمد 'احمد معروف کو اپنے بارے میں سب بتا دیتا ہے۔ جسے سن کر احمد معروف کا دل بوجھل ہو جاتا ہے اور اسے نور محمد کو سنبھالنا مشکل لگتا ہے۔

بلی ثیا کو بے حد چاہتا ہے 'لیکن وہ انتہائی خود غرض 'مطلب پرست اور چالاک لڑکی ہے۔

بلی کے گھر فیملی فرینڈ عوف بن سلمان آتا ہے۔ جس کا تعلق سعودی عرب سے ہے۔ عوف کو فوٹو گرافی کا جنون کی حد تک شوق ہوتا ہے۔ بلی عوف سے ثیا کو ملواتا ہے۔ ثیا 'عوف سے مل کر بہت خوش ہوتی ہے۔ عوف اپنے کیمرے سے رقص کرتی ثیا کی بہت سی خوب صورت تصویریں کھینچ لیتا ہے۔ عوف اور ثیا تصویروں کو فرانس میں ہونے والی کسی تصویری مقابلے میں بھیج رہے تھے۔ بلی 'ثیا کو ایسا کرنے سے روکنا چاہتا ہے۔ لیکن ثیا اس بات پہ بلی سے ناراض ہو جاتی ہے۔ عوف بتاتا ہے کہ وہ ثیا جیسی بناوٹی 'خود پسند لڑکی کو بالکل پسند نہیں کرتا۔

بلی کو پتا چلتا ہے کہ اس کی ماں کو ہو کے عوف سے تعلقات ہیں 'زارا کے والدین زارا اور شہروز کی شادی جلد از جلد کرنا چاہتے ہیں 'جبکہ شہروز ایک ڈیڑھ سال تک شادی نہیں کرنا چاہتا ہے 'کیونکہ اس نے ایک مشہور اخبار کا چینل جوائن کر لیا ہے اور اسے اپنی جاب کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں رہا ہے۔ شہروز 'زارا سے کہتا ہے کہ جب تک وہ اسے شادی کرنے کے لیے گرین سگنل نہیں دیتا اس وقت تک وہ پھپھو (یعنی اپنی والدہ) کو اس کے ڈیڈی سے شادی کی بات کرنے سے روک کر رکھے۔ زارا کے لیے یہ ساری صورت حال سخت اذیت کا باعث بن رہی ہے۔

امائمہ 'نور محمد کی بہن ہے۔ امائمہ کی ماں نے اس کی شادی عمر سے اسی لیے کی تھی کہ وہ لندن جا کر بھائی کو ڈھونڈے۔ وہ عمر کے علم میں لائے بغیر بھائی کو ڈھونڈنے کی کوششیں کرتی ہے 'مگر عمر کو پتا چل جاتا ہے۔ امائمہ یہ جان کر حیران رہ جاتی ہے کہ عمر 'نور محمد کو جانتا ہے۔ وہ اس کا ساتھ دیتا ہے۔ ثیا رقاصہ بن چکی ہے مگر غلط ہاتھوں میں چلی جاتی ہے اور اپنا بہت نقصان کر کے بلی کو ملتی ہے۔ بلی اس وقت تک ایک کامیاب ناول نگار بن چکا ہے۔ وہ دونوں شادی کر لیتے ہیں۔ ثیا کو بچوں کی خواہش ہوتی ہے۔ کافی علاج کے بعد انہیں خوش خبری ملتی ہے 'مگر ثیا کے مس کیرج ہو جاتا ہے۔ ثیا خود کشی کر لیتی ہے۔ بلی کو کچھ لوگ مجبور کرتے ہیں کہ مسلمان دہشت گردوں کے خلاف ناول لکھے۔ وہ لوٹن کی مسجد کے موذن کے خلاف بات کرتے ہیں کہ وہ مسلمان دہشت گرد ہے۔ بلی اس موضوع پر ناول لکھنے کی تیاری کرتا ہے اور اس سلسلے میں نور محمد سے ملتا ہے۔ نور محمد سے احمد معروف کے نام سے ملنے والا شخص بلس گرانٹ ہی ہے 'مگر نور محمد سے مل کر اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے خلاف کی گئیں ساری باتیں غلط ہیں۔ وہ نور محمد سے متاثر ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ وہ اسے اپنے سارے حالات بتا چکا ہوتا ہے کہ کس طرح اس کا باپ اس پر پڑھائی کے معاملے میں سختی کرتا تھا۔ کس طرح اکیڈمی سے نکالنے پر وہ دلبرداشتہ ہوا 'پاگل ہوا۔ پھر اس کے ماموں اپنے ساتھ لندن لے آئے۔ وہاں انہوں نے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا اور اپنی بگڑی ہوئی بیٹی ثریا سے شادی کر دی 'جو پانچ ماہ بعد ہی ماں بن گئی۔ نور محمد نے سب کچھ سمجھنے کے باوجود اس بچی سے محبت کی۔ اسے پالنے لگا۔ مگر جب ثریا نے بخار کی وجہ سے بچی کو برانڈی پلانے کی کوشش کی اور نور محمد کے منع کرنے کے باوجود باز نہ آئی تو تھپڑ مار دیا۔ جس پر ماموں نے اسے خوب لعن طعن کی اور وہ ان کا گھر چھوڑ کر یہاں آ گیا۔ ماموں نے اس کے گھر والوں کو کہہ دیا کہ نور محمد ان کے گھر سے چوری کر کے بھاگ گیا ہے۔ تب سے نور محمد اور امائمہ کی ماں پریشان ہیں اپنے شوہر سے بھی بائیکاٹ کر چکی ہیں۔ زارا کی زندگی میں اتفاق سے ٹیپو نامی لڑکا آتا ہے۔ وہ بہت اچھا ہے۔ زارا اس پر بہت بھروسا کرتی ہے۔ شہروز خوب ترقی کر رہا ہے۔ اس کی ملاقات عوف بن سلمان سے ہوتی ہے۔ وہ شہروز کو اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر دیتے ہیں۔ شہروز بہت خوش ہوتا ہے۔

تیرہویں قسط

وہ اپنی جیب سے موبائل اور والٹ نکال کر میز پر رکھتے ہوئے بولا تھا۔ وہ سیڑھی پر چڑھا تھا۔ زارا سیڑھی کے قریب آگئی تھی۔ ٹیوب لائٹ کی پٹی فٹنگ تبدیل کرنی تھی۔ اسے "وقتاً" "فوقتاً" اوزاروں کی ضرورت پڑسکتی تھی۔ زارا اسے مہارت سے کام کرتا دیکھنے لگی تھی۔ وہ پیچ کس سے پرانی والی پٹی کے پیچ کھول رہا تھا۔ اسی دوران اس کے موبائل کی بیپ بجی تھی جو میز پر رکھا تھا۔ بیپ بجنے پر زارا نے غور کیا تھا۔ اس کے پاس جدید طرز کا اسمارٹ فون تھا۔

"اوہو۔۔۔ لوگ نیکی کا کام بھی اطمینان سے نہیں کرنے دیتے۔۔۔ زارا دیکھیں تو کون ٹیپو صاحب کو فون کررہا ہے۔" اس نے زارا سے فون اٹھانے کے لیے کہا تھا۔ زارا نے جھجکتے ہوئے فون اٹھا کر اسے تھمانا چاہا۔

"کال ریسیو کرکے اسپیکر آن کردو۔" اس نے وہیں اوپر سے حکم جاری کیا تھا۔ زارا نے ایسا ہی کیا تھا اور فون دوبارہ میز پر رکھ دیا تھا۔

"ہیلو۔۔۔ کیا میں سلمان حیدر سے بات کرسکتا ہوں۔" کسی نے انگلش میں پوچھا تھا۔

"جی۔۔۔ کیا میں جان سکتا ہوں۔۔۔ آپ کون ہیں۔" ٹیپو نے کچھ حیرانی سے اپنا منہ نیچے کی جانب کرکے سوال کیا تھا۔ وہ بھی روانی سے پوچھ رہا تھا۔ زارا کو بڑا شدید جھٹکا لگا۔ اس کی وجہ ٹیپو نہیں تھا' بلکہ دوسری جانب سے آنے والی آواز تھی۔

"میں نور محمد ہوں۔" دوسری جانب سے کہا گیا تھا۔

"میں تمہیں کب سے فون کرنے کی کوشش کررہا تھا' کیا تم فارغ ہو۔ اطمینان سے میری بات سن سکتے ہو؟" دوسری جانب سے پوچھا جارہا تھا۔ ٹیپو اضطراب کے عالم میں نیچے اترا تھا۔ اس نے فون اٹھا کر عجلت بھرے انداز میں اسپیکر آف کیا اور فون کان سے لگالیا تھا۔

"ہاں نور محمد! تم کہاں تھے؟ میں بہت دن سے منتظر تھا۔ تم ٹھیک ہونا۔ سب کچھ کیسا چل رہا ہے؟"

وہ رواں انگلش میں پوچھ رہا تھا پھر اس نے زارا کو اشارہ کیا تھا کہ وہ ابھی آتا ہے۔ چند لمحوں بعد زارا نے اسے کمرے سے باہر جاتے دیکھا۔ وہ حیرانی سے آنٹی رافعہ کی جانب مڑی تھی' لیکن وہ اماں صغریٰ سے بات کرنے میں مصروف تھیں۔ ان کے لیے یہ عام سی بات تھی' جبکہ زارا حق دق رہ گئی تھی۔

اس نے ٹیپو کو کبھی اتنے شستہ مہذب انداز میں بات کرتے نہیں سنا تھا۔ وہ بہت روانی سے انگلش میں بات کررہا تھا۔ وہ شخص جو اس کے لیے ایک عام سا ایف اے پاس انسان تھا۔ جس کے صحیح نام سے بھی اسے آگاہی نہیں تھی۔ وہ یقیناً "اتنا عام سا نہیں تھا۔ شہوز نے ٹھیک کہا تھا۔ اسے انسانوں کی پرکھ نہیں تھی۔



"نور محمد کا عہد الست اور عہد الست کا نور محمد۔" سلمان حیدر نے ان باکس میں سبجیکٹ دیکھ کر نہایت پرجوش انداز میں ای میل کھولی تھی۔

یہ آخری باب تھا جس پر کام کرنا باقی رہ گیا تھا۔ لیپ ٹاپ کی نیلگوں روشنی میں وہ سب واضح ہونے لگا تھا جو اب تک چھپا ہوا رہ گیا تھا۔ وہ کب سے منتظر تھا کہ اسے کب اشارہ کیا جائے اور کب وہ اس کو مکمل کر کے سرخرو ہوسکے۔

نور محمد نے اسے چھ سال کے بعد اجازت دے دی تھی کہ وہ بل گرانٹ کے آخری "ناول" کو پبلک کرنے کی تیاری کرلے' جواب تک نہیں ہوسکا تھا اور اس کی تاخیر کی وجہ سے صرف سلمان حیدر واقف تھا یا نور محمد۔

نور محمد سلمان حیدر کا کلاس فیلو تھا۔ اس سے اس کی دوستی گریڈ سیون میں ہوئی تھی۔ اس کے ابو چونکہ آرمی میں تھے' اس لیے کسی بھی جگہ ان کا قیام چند مہینوں سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے اسکول میں بھی ایڈمیشن کا دورانیہ عموماً" بہت طویل نہیں ہوتا

تھا۔ یہ تب کی بات تھی جب اس کے ابو کا لاہور ٹرانسفر ہوا۔ ہر چیز وقت پر اور ٹھیک ٹھاک ہو گئی' لیکن کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر تب اس کا ایڈمیشن آرمی پبلک میں نہیں ہو سکا تھا' سو اس کے ابو نے اس کا ایڈمیشن گورنمنٹ اسلامیہ اسکول میں کروا دیا۔

نور محمد کو پہلی مرتبہ اس نے گورنمنٹ اسلامیہ اسکول میں دیکھا تھا۔ وہ بہت عام سا سادہ سا چپ چپ رہنے والا بچہ تھا۔ سلمان حیدر کے اندر پیدائشی ایک موروثی جرثومہ تھا۔ اسے انسان کی پرکھ تھی۔ وہ جو گلے سے بھٹک کر دور جا رہے ہوتے تھے۔ وہ اسے فوراً" نظر آ جاتے تھے۔ اس کی چرواہا فطرت برداشت نہیں کرتی تھی کہ کوئی گلے کو چھوڑ کر جائے۔

اس نے اسے پہلی نظر میں پہچان لیا تھا۔ ہیرے کی قدر اگر جوہری کو ہو تو سنہری بھیڑ بھی صرف چرواہا ہی پہچان سکتا ہے۔ اسے اس چھپے ہوئے دبے ہوئے نور محمد میں وہ ہیرا نظر آنے لگا جو نیچے بہت نیچے دبا ہوا ہوتا ہے' لیکن جس کی ٹھنڈی چمک آنکھوں کو تراوت بخشتی ہے۔ اصل ہیرا کبھی آنکھوں کو چکا چوند نہیں کرتا' بلکہ وہ دیکھنے والوں کے لیے راحت ہوتا ہے۔

ایسا ہی بچہ تھا نور محمد۔ انتہائی ذہین۔ اور صرف ذہین۔ وہ کچھ نہیں کرتا تھا۔ صرف کتابیں اس کی دنیا تھیں۔

سلمان حیدر نے اس کے ساتھ دوستی کر لی۔ وہ اسے اچھا لگتا تھا۔ وہ دونوں دوست بن گئے۔ نور محمد ایک ایسی کتاب کی طرح تھا' جسے جلدی جلدی نہیں پڑھا جاتا' بلکہ رات کو بستر پر لیٹ کر سکون سے تھوڑا تھوڑا سمجھ کر پڑھنے میں مزا آتا ہے۔ سو نور محمد سلمان حیدر کے لیے ایک ایسی ہی کتاب کی مانند تھا۔ وہ دونوں اکٹھے کھیلتے تھے' پڑھتے تھے' کوئز حل کرتے تھے' بچوں کے میگزینز پڑھتے تھے۔ وہ اسے کرکٹ کھیلنا سکھانے لگا اور اس سے ڈائیگرامز بنانا سیکھنے لگا۔ وہ اس کے ساتھ خوش رہتا تھا۔ ان کے ٹیچرز بھی اس کی طبیعت میں آنے والی تبدیلیوں کو نوٹ کر رہے تھے اور خوش تھے۔

سلمان حیدر کو کبھی ایسا نہیں لگا کہ وہ اسے تکلیف دے رہا ہے یا اس کے لیے پریشانی کا باعث بن رہا ہے' لیکن ایک دن اس کے ابو اسکول میں شکایت لے کر آ گئے۔ انہوں نے اسکول کے ایڈمن سے سلمان حیدر کی شکایتوں میں بہت کچھ کہا۔ انہوں نے بالخصوص اس بات کا تذکرہ کیا کہ سلمان ان کے بیٹے کو کھیل کود میں لگائے رکھتا ہے اور اسے مجبور کرتا ہے' کہ وہ اپنے گھر سے کرکٹ بیٹ لائے تاکہ وہ اسکول میں کھیل سکیں۔

سلمان حیدر کے لیے یہ بہت تکلیف دہ باتیں تھیں۔ وہ تیرہ سال کا ایک بچہ ہی تو تھا۔ نور محمد کے ابو نے یہاں تک کہا کہ سلمان حیدر کی وجہ سے ان کے بیٹے کے رزلٹ خراب ہو رہے ہیں اور وہ اسے نا صرف اسکول میں پڑھنے سے روکتا ہے بلکہ گھر جا کر بھی کھیلنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔

سر شعیب نے اسے بلا کر سب کچھ بتایا اور صرف اتنا کہا کہ انہیں اس سے شکایت نہیں ہے' لیکن بہتر ہے کہ نور محمد سے دور رہے۔ اسے بے پناہ دکھ ہوا۔

اس دن کے بعد سے وہ نور محمد سے دور رہنے لگا۔ وہ اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا اور کبھی دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد ابو کا ٹرانسفر ساہیوال ہو گیا۔ وہ ساہیوال چلے گئے اور سلمان حیدر سب بھول بھال گیا۔

ان ہی دنوں اس کے ابو کا انتقال ہو گیا۔ زندگی میں ترجیحات بدل گئیں۔ وہ اپنی زندگی میں گم ہو گیا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ نور محمد سے پھر کبھی سامنا بھی ہو گا۔ جب میٹرک کا رزلٹ اناؤنس ہوا تو نور محمد کی ایک چھوٹی سی تصویر اخبار میں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس نے بورڈ میں فرسٹ پوزیشن لی تھی' لیکن تب بھی وہ چونکا نہیں تھا۔ وہ اس کے لیے ایک بھولی بسری یاد کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

یہ سن دو ہزار دو کی بات تھی۔ وہ ماس کمیونی کیشن میں ماسٹرز کر رہا تھا۔ ابو کے انتقال کے بعد وہ چھوٹی موٹی پارٹ ٹائم جابز کرتا رہتا تھا۔ ان دنوں ڈیپارٹمنٹ کے

ایک پروفیسر نے اسے ایک این جی او کے بارے میں بتایا جو فریش ایبرز ہائر کرنا چاہتی تھی۔ وہ ان طالب علموں کو رجسٹر کر رہے تھے جو مستقبل میں برطانیہ یا یورپ میں کام کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ کافی اچھا معاوضہ دے رہے تھے اور کام بھی زیادہ نہیں تھا۔ ڈیٹا انٹری کا کام تھا۔ وہ آرام سے اپنے ہاسٹل کے کمرے میں رات کے وقت یہ کام کر سکتا تھا سو اس نے بھی رجسٹریشن کروالی۔

یہ اتفاق کے سوا کچھ نہیں تھا کہ اس این جی او کے لیے ڈیٹا انٹر کرتے ہوئے اسے نور محمد کے کوائف دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ اسے شاید نہ پہچان پاتا لیکن اس کے بارے میں ہر چھوٹی چھوٹی تفصیل دی ہوئی تھی۔ اس کے ویراباؤٹس' اس کے رزلٹس' اس کی وہ تصویر جو میٹرک کے رزلٹ پر اخبار میں چھپی تھی۔ وہ چونکا تب جب اس نے اس کا پولیس ریکارڈ دیکھا۔ بھائی پھیرو کے کسی پولیس اسٹیشن میں اس کی تفصیلات موجود تھیں جس کا کافی تفصیل سے ذکر تھا۔

یہ اتنے سالوں بعد پہلی دفعہ تھا کہ سلمان کو دوبارہ اپنے اسے بھولے بسرے کلاس فیلو میں دلچسپی محسوس ہوئی۔

وہ لاہور میں ہاسٹل میں رہ رہا تھا۔ ماس کمیونی کیشن پڑھ رہا تھا' اخبار والوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ایک گورنمنٹ کالج کے پروفیسر کے بیٹے کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنا اس کے لیے حلوے جیسا کام ثابت ہوا۔ اسے پتا چلا کہ نور محمد دو سال پہلے یو کے گیا تھا۔ سلمان نے وہ سب پتا لگایا جو یو کے جانے سے پہلے نور محمد پر بیتا تھا۔ اس رپورٹ میں بھی یہی لکھا تھا کہ اس کے والد کی سختی جو انہوں نے اپنے بیٹے پر اس کا کسی

کا موقع ملنا چاہیے۔۔۔ غصہ نہیں کیا تھا میں نے۔۔۔ اتنا ہی کہا تھا کہ یہ کاغذات واپس رکھ دو۔۔۔ بہت اہم ہیں۔" ٹیپو ہنستے ہوئے بولا۔

"واپس رکھنے کے لیے نہیں کہا تھا' بلکہ میرے ہاتھ سے لے کر رکھ دیے تھے' جیسے میں آپ کے وہ دس روپے کے پیپرز کھا جاؤں گی۔" زارا نے ناک چڑھائی تھی۔

"اللہ کو مانو لڑکی۔۔۔ تمہیں کیا پتا کہ وہ کتنے قیمتی ہیں میرے لیے۔۔۔ میں ان کے ساتھ کیا کرنا چاہتا ہوں۔"

زارا نے اس کی بات کاٹی۔

"یہی تو پتا کرنا چاہ رہی تھی کہ آپ کیا کرتے ہیں۔ کون ہیں' کہاں کام کرتے ہیں؟" یہ تھیں وہ باتیں جو زارا واقعی اب جاننا چاہتی تھی۔ ایک فون کال نے اس کے دل میں وہ خدشات جگا دیے تھے جن کا اظہار شہوز نے اس سے کیا تھا۔

"گڈ مارننگ ڈاکٹر زارا۔ آپ کو لمبی نیند سے بیدار ہونے پر میں صبح بخیر کہتا ہوں۔" وہ اسے چڑا رہا تھا۔ وہ نجانے کیا کھاتا تھا۔ اسے بات ٹالنے کا ہنر آتا تھا۔

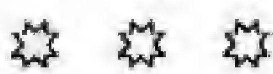
"آپ جب اس طرح میری باتوں کو بچکانہ سمجھتے ہوئے مجھے ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں نا تو مجھے بالکل اچھے نہیں لگتے۔" اس نے اسی کے انداز میں کہا تھا۔

"تمہیں شہوز کے علاوہ آج تک کوئی اچھا لگا بھی ہے؟" وہ ترنت بولا تھا۔ زارا کے چہرے پر مسکراہٹ چمکی پھر وہ اس کا چہرہ دیکھ کر ہنسی تھی۔

"نہیں۔" وہ دو ٹوک انداز میں بولی تھی۔ ٹیپو نے قہقہہ لگایا تھا۔

"مجھے ایک گانا یاد آ گیا ہے۔۔۔ عرض کیا ہے منڈا شہر لاہور دا میرے دل تے تیر چلاوے۔" اس نے گانے کو پڑھنے کے انداز میں گاتے ہوئے آنکھیں بھی مٹکائی تھیں۔ زارا نے قہقہہ لگایا۔

"واہ واہ۔۔۔ مکرر مکرر۔" وہ بولی تھی۔ اسے اب یاد رہا تھا تو شہوز باقی سب جیسے کہیں غائب ہو گیا تھا۔ ٹیپو واقعی بات ٹالنے میں ماہر تھا۔



یہ لندن میں اس کی پہلی صبح تھی۔

وہ آیا تو دس دن پہلے تھا لیکن جس روز آیا اسی شام کو برمنگھم چلا گیا تھا۔ رضوان اکرم لندن میں تھے اور وہ مزید چند صحافیوں کے ساتھ برمنگھم جا رہے تھے۔ وہاں سے ان لوگوں نے تفریحی ٹور کے لیے اسکاٹ لینڈ جانا

تھا۔ شہوز کا یہ شیڈول طے شدہ تھا سو وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ چلا گیا تھا اسے مزا بھی آیا تھا لیکن لندن میں اپنے چاچو کے گھر کا سکون اسے زیادہ پسند آرہا تھا۔

آنکھ کھلی تو روشنی کمرے کی واحد کھڑکی سے چھن چھن کر اندر بستر تک آرہی تھی۔ اس کو پہلی ہی صبح بہت بھلی لگی۔ جاتی گرمیوں کے دن تھے۔ پاکستان میں موسم ابھی بھی گرم تھا لیکن یہاں اسے موسم خوشگوار لگ رہا تھا۔ کمرے میں پنکھا تو تھا ہی نہیں' لیکن اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی' وہ کروٹ بدل کر کچھ دیر ایسے ہی لیٹا رہا۔ ابھی مزید سونے کی طلب تھی لیکن آنکھ کھل گئی تھی سو دوبارہ نیند آنا مشکل بات تھی۔

اس کی توقع کے برعکس نیند اچھی آگئی تھی۔ اسے جو کمرہ دیا گیا تھا وہ چھوٹا لیکن بے حد پرسکون تھا۔ آرام دہ بیڈ کے علاوہ لکھنے پڑھنے کے لیے میز جس پر ڈیسک ٹاپ بھی تھا اور کرسی بھی تھی۔ ایک طرف ٹی وی تھا۔ جس کے سامنے دو موڑھوں کی طرح کے فلور کشن تھے۔ کمرے میں ہلکے ہرے رنگ کا پینٹ تھا جبکہ بیڈ کور اور کمرے کی واحد کھڑکی پر جھولتا پردہ سفید اور ہرے پھولوں والا تھا۔ رنگوں کا بڑا مناسب سا امتزاج تھا۔ اسے سب کچھ بڑا بھلا لگا تھا۔

اس نے بستر سے نکل جانا ہی مناسب سمجھا۔ باتھ روم سے فراغت کے بعد وہ کھڑکی کے پاس آکھڑا ہوا تھا اور باہر دیکھنے لگا تھا۔ آس پاس شاید کوئی اسکول تھا' کیونکہ یونیفارم میں ملبوس مختلف عمروں کے بچے آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا بلاوجہ باہر دیکھتا رہا۔ اسے سگریٹ پینے کی طلب ہو رہی تھی اور وہ یہاں سگریٹ پینا نہیں چاہ رہا تھا۔ کیونکہ وہ لاہور اپنے گھر میں بھی کبھی سگریٹ نہیں پیتا تھا۔

لڑکی کے ساتھ افیئر ہونے پر روا رکھی تھی' کی وجہ سے وہ ذہنی طور پر اپ سیٹ رہتا تھا۔ اس کے متعلق سب جان کر جہاں وہ دکھی ہوا وہاں حیرانی بھی ہوئی۔ ایک این جی او ان سب معلومات کو کیوں اکٹھا کر رہی تھی۔ یہ وہ پہلا سوال تھا جو اس کے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔ یہ ایک برٹش این جی او تھی اور اسے بتایا گیا کہ نائن الیون والے واقعے کے بعد بنا اس سے کچھ عرصہ پہلے یو کے جانے والے ان تمام لوگوں کا ڈیٹا اکٹھا کیا جا رہا تھا جو برطانیہ کسی بھی مقصد کے لیے جا رہے تھے اور ان کا چھوٹا موٹا کوئی بھی پولیس ریکارڈ رہا تھا۔

اسے یقین دلایا گیا کہ یہ روٹین کی سرگرمی ہے۔ دہشت گردی کے بڑھتے واقعات کے باعث آج کل ایسا ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ اس نے کام مکمل کر کے دے دیا تھا لیکن بنا کسی وجہ کے نور محمد کا ریکارڈ اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ ماسٹرز کے بعد اس نے کچھ عرصہ ایک مشہور اخبار میں ملازمت کرلی' لیکن کچھ عرصہ بعد اس کا دل اچاٹ ہونے لگا۔ وہ ہاتھ باندھ کر جی جناب' حاضر جناب کہنے والی مشین نہیں تھا۔ اس لیے وہ لگی بندھی جاب سے کتراتا بہت تھا۔

"میں بھیڑ نہیں ہوں۔ چرایا ہوں۔ میں گلے کا وہ حصہ ہوں جو گلے کے باہر رہ کر اپنا فرض ادا کرتا ہے۔"

یہ اس کا پسندیدہ ڈائیلاگ تھا جو وہ ان لوگوں سے کہتا تھا جو اس سے نوکری چھوڑنے کے متعلق پوچھا کرتے تھے۔ وہ فری لانسنگ کرنے لگا اور ساتھ ہی مزید پڑھائی شروع کردی۔ اسے اس میں مزا آتا تھا۔ وہ پابندیاں قبول کرنے سے نہیں ہچکچاتا تھا' وہ صرف پالیسیز پر معترض رہتا تھا جو اسے ہمیشہ ہی ملک و قوم کے مفاد میں نظر نہیں آتی تھیں۔ وہ ایسا ہی تھا۔ محب وطن' پرجوش مگر لاپروا اور چھپا رستم۔ اسے اپنے کام سے دوسروں کو چونکانے کی عادت تھی۔ وہ انوکھے موضوعات پر رپورٹس تیار کرتا تھا جن کے ہر شعبے میں اس کی محنت صاف نظر آتی تھی۔

اسی لیے اسے فری لانسر صحافی کے طور پر شہرت ملنے لگی تھی۔ اس کا نام پہچان بنانے لگا تھا۔ یہ انہی دنوں کا قصہ تھا۔ سال 2006 شروع ہوا تھا۔ اس نے ایم فل کو بھی ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ جب اسے اسی این جی او سے کال موصول ہوئی' جس کے ساتھ وہ

بہت پہلے ڈیٹا انٹری کی پارٹ ٹائم جاب کرچکا تھا۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر دی۔ اس این جی او کا ریجن برطانیہ کا تھا اور ان کا بنیادی مقصد بھی پاکستانی نژاد برطانوی مسلمانوں کے حقوق کے لیے کام کرنا تھا۔ وہ ایک اچھی پیشکش تھی جس میں مالی منفعت بھی تھی اور نئی راہیں تسخیر کرنے کا انوکھا موقع بھی۔

اس این جی او کے ساتھ کام کرکے ہی اسے ان کے پراسیکٹس کی صحیح سمجھ آئی تھی۔ وہ ان لوگوں کی ذہنی و جسمانی بحالی کے لیے کام کرتے تھے جو مسلمان تھے اور برطانیہ یا یورپ کے اور چھوٹے بڑے ملکوں میں رہ رہے تھے اور مختلف مسائل کا شکار تھے۔ ایسے لوگوں کی ایک لمبی لسٹ تھی جنہیں ایتھنک بنیادوں پر استحصال کا سامنا تھا۔ ان میں زیادہ تر لوگ اٹھارہ سے چوبیس سال کی عمر کے تھے، جو پاکستانی ماں باپ کے ساتھ رہ رہے تھے، لیکن برطانیہ میں پیدا ہوئے تھے اور وہاں کی معاشرت کو ذہنی طور پر قبول کرچکے ہوئے تھے۔

سلمان حیدر جلد ہی اس این جی او سے بھی اکتا گیا تھا۔

اور تب ایک بار پھر نور محمد اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اس تنظیم کے پاس لاتعداد پاکستانیوں کا ریکارڈ تھا جو وہاں ملازمت اور تعلیم کے سلسلے میں گزشتہ پانچ، چھ سالوں سے مقیم تھے۔ نور محمد کا شمار بھی ایسے لوگوں میں ہوتا تھا لیکن اب اس کے متعلق جو کچھ پتا چلا وہ کافی دردناک اور تشویشناک تھا۔ وہ ذہنی طور پر بیمار رہتا تھا اور ایک دہشت گرد تنظیم الہاجرون میں شامل ہوچکا تھا۔ وہ اس گروپ کا آلہ کار تھا جو اپنے قول و فعل کے ذریعے اپنے اردگرد اشتعال پھیلانے کا باعث بن رہے تھے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ تفصیلات تھیں جو اس کی مجرمانہ ذہنیت ظاہر کرتی تھیں۔ سلمان حیدر اس جاب سے بھی جلدی اکتا گیا تھا کیونکہ وہ این جی او صرف ان مسائل کے تدارک کے لیے کام کررہی تھی جو برطانوی معاشرے کے لیے قابل قبول تھیں جبکہ اسلامی اقدار سے متصادم تھیں۔ ہم جنس پرستی، اٹھارہ سال کے بعد نوجوان نسل کی آزادانہ روش، مسلمان لڑکیوں کی عیسائیوں سے شادیاں۔

اس نے آٹھ مہینے بعد ہی استعفیٰ دے دیا تھا اور اس بار اس نے دانستہ طور پر نور محمد سے متعلق سارا ڈیٹا اپنے پاس محفوظ کرلیا تھا۔ اس وقت تک اس کا حلقہ احباب بھی کافی بڑھ چکا تھا۔ صحافیوں، سیاست دانوں، وکیلوں اور اداکاراؤں میں بھی وہ ایک سچا صحافی ہونے کی وجہ سے اچھا مقام حاصل کرچکا تھا۔

نور محمد کے متعلق ملنے والی نئی معلومات نے اس کی صحافیانہ فطرت کو اکسایا تھا کہ وہ اس سارے قصے کی تہ تک پہنچے۔

سو وہ ایک دن پروفیسر آفاق علی سے ملنے ان کے گھر پہنچ گیا تھا۔ وہ اپنی ایک بیٹی اور اہلیہ کے ساتھ اقبال ٹاؤن میں رہائش پذیر تھے۔ اس وقت بھی اس نے یہی سوچا تھا کہ دیکھتے ہیں اصل معاملہ کیا ہے۔



"نور محمد کی ناکامی فرد واحد کی ناکامی نہیں تھی۔ یہ میری ناکامی تھی۔ یہ اس نظام کی ناکامی تھی جس کا میں حصہ تھا۔ یہ اس کوشش کی، اس امید کی ناکامی تھی جو میں نور محمد کے سراپے میں دیکھتا تھا، ڈھونڈتا تھا تلاش کرتا تھا۔"

جھریوں بھرا چہرہ جس پر سفید داڑھی تھی اور حوادث زمانہ کے رنگ تجربہ بن کر بکھرے تھے، لیکن ان کی آنکھیں تھیں جو نم نہ ہونے کے باوجود گیلی محسوس ہوتی تھیں۔ سلمان حیدر کو ان پر بے پناہ ترس آیا۔ وہ انہیں ایک سخت گیر شخص کے طور پر جانتا تھا، جو ایک کرکٹ بیٹ کی خاطر اپنی اولاد کو روئی کی طرح دھنک سکتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے ذہن میں ان کا کوئی خاکہ نہیں تھا۔ اس نے انہیں شاید ہی کبھی ایک آدھ بار اسکول میں دیکھا تھا۔ لیکن یہ اتنی پرانی بات تھی کہ اس کے ذہن سے ایسا ہر خاکہ مٹ چکا

تھا۔ اس لیے اس نے یہ بہتر سمجھا کہ پرانا کوئی حوالہ دیے بغیر ان سے ملا جائے۔

سو اس نے اپنے ایک اور پروفیسر صاحب کے ذریعے اس ملاقات کا اہتمام کیا تھا اور چونکہ وہ ان ہی کے حوالے سے ملا تھا' اس لیے سر آفاق بہت اچھے طریقے سے ملے تھے۔ انہیں اپنے مضمون پر نا صرف بھرپور عبور تھا بلکہ وہ ادب اور سیاست میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ملکی و غیر ملکی حالات حاضرہ پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ انہیں بھی سلمان حیدر سے مل کر کافی خوشی ہوئی۔

"کتنے مہنگے ہوتے ہیں بیٹے۔ کتنی قیمتی ہوتی ہے اولاد۔"

پروفیسر آفاق علی نے ایک جملے میں اسے سراہ کر ظاہر کر دیا تھا کہ وہ اندر سے اس پہاڑ کی طرح نہیں ہیں جو جھرنا بن کر پھوٹ جاتا ہے بلکہ وہ اس میدان کی طرح ہیں جہاں سے پانی تب ہی ابلتا ہے' جب اس پر ایڑیاں رگڑی جاتی ہیں۔ وہ اتنا سپاٹ چہرہ لے کر دنیا کے سامنے آتے تھے کہ کوئی ان کے اندر جھانکنے کی جرات بھی نہیں کرتا تھا۔

تب سلمان حیدر نے فیصلہ کیا کہ وہ انہیں اعتماد میں لے گا۔ وہ انہیں سمجھائے گا کہ نور محمد سے قطع تعلقی انہیں اس مرحلے پر بھاری پڑ سکتی ہے۔ ایک بین الاقوامی این جی او کے ریکارڈ میں اس کے متعلق جو معلومات تھیں' وہ کسی اچھی خبر کی طرف اشارہ نہیں کر رہی تھیں۔ سلمان حیدر کو انہیں ٹٹولنے میں مشکل ہوئی' لیکن وہ جب اپنی بات جتانے پر آئے تو پھر جتاتے چلے گئے۔

"میں خود چاہتے ہوئے بھی میڈیسن نہیں پڑھ سکا تھا۔ لیکن یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ ہزاروں لاکھوں بچے میرٹ پر نہ آنے کی وجہ سے ہر سال میڈیکل میں ایڈمیشن نہ ملنے کے باعث اپنے ماں باپ کے خواب پورے نہیں کر پاتے' لیکن میرٹ پر پورا اترنے کے باوجود میڈیکل کالج میں سیٹ نہ ملنے کا دکھ میرے لیے بہت بڑا تھا۔

میں بہت غریب خاندان سے آیا تھا۔ میرے ماں باپ پیسہ پیسہ جوڑ کر مجھے تعلیم دلوا رہے تھے۔ میں ڈاکٹر تو نہ بن سکا لیکن بی ایس سی اور پھر ایم ایس سی کر کے میں ایک اسکول میں پڑھانے لگا۔ میں نے سوچا تھا کہ ایم بی بی ایس نہیں کیا تو کیا ہوا ایم ایس سی کیا ہے۔ لیکچرر شپ ضرور مل جائے گی' لیکن یہ بھی میرے جیسے عام آدمی کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا' میرے پاس سفارش کروانے کے لیے کوئی بڑا رشتہ دار تھا نہ رشوت دینے کے لیے تگڑی رقم۔ میں نے لیکچرر شپ حاصل کرنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلے۔ رشوت اور سفارش کے بغیر میں نے جن دقتوں سے لیکچرر کی جاب حاصل کی۔ یہ میرا دل ہی جانتا تھا لیکن تدریس کے شعبے نے مجھے سکھایا کہ دراصل ہمارا نظام تعلیم بے حد تعفن زدہ ہے۔ اساتذہ چھوٹے چھوٹے تحائف کے بدلے نالائق طالب علموں کو زائد نمبرز دلواتے تھے۔ رشوت لے کر کمرہ امتحان میں نقلیں کروائی جاتی تھیں اور عملی امتحانوں کے دوران معاونت فراہم کی جاتی تھی۔ پریکٹیکلز کروائے جاتے تھے' انٹرویو میں مدد کی جاتی تھی۔ اپنے پسندیدہ چہیتے طالب علموں کو کامیاب کروانے کے لیے ناجائز کوششیں کی جاتی تھیں۔ میں نے خود اپنے بہت سے انتہائی ذہین اور قابل طالب علموں کو اس چکر میں ناکام ہوتے اور رشوت کی بنا پر بہت سے نالائق طلبا کو کامیاب ہوتے دیکھا۔ مجھے اس نظام سے نفرت تھی جو اخلاقیات کا درس دیتا تھا جو بچوں کو سچائی اور ایمان داری کے سبق سکھاتا تھا۔ لیکن خود ایسی کالی بھیڑوں کے ہاتھوں یرغمال بنا ہوا تھا۔ میں اپنے دوستوں اور کولیگز میں برملا اس نفرت کا اظہار کرتا تھا اور وہ مجھ پر ہنسا کرتے تھے کہ یہ حربے ہیں' ہتھکنڈے ہیں اور ان کے بغیر کامیابی کا ملنا آسان نہیں ہے۔ اگر تمہیں اس نظام سے نفرت ہے یا اس کے خلاف ہو تو اپنی اولاد کو اس کے بغیر کامیاب ہونا سکھا دینا۔ ہمیں ہمارے حال

پر چھوڑ دو۔ ان ہی دنوں میری شادی ہوئی تھی۔ میں اللہ سے بس یہی دعا کرتا تھا کہ مجھے اولاد نرینہ دے۔ میں بیٹا چاہتا تھا اور بیٹا بھی وہ جو نہایت ذہین و فطین ہو۔"

وہ چپ ہوئے تھے۔ ساتویں بار ایڑی کی رگڑنے اندر کہیں دور تک ہلچل مچادی تھی۔ سلمان نے ان کی آنکھ سے آنسو ٹپکتے دیکھا۔

"تم نے ایسی ماؤں کے بارے میں سنا ہو گا جو اولاد نرینہ کے لیے وظیفے کرتی ہیں۔ دعائیں کرتی ہیں۔ اللہ کے حضور گڑگڑاتی ہیں۔ لیکن میں وہ باپ تھا جو اولاد نرینہ کے لیے رات رات بھر جاگ کر دعائیں کیا کرتا تھا۔ میں نہ صرف بیٹا چاہتا تھا بلکہ یہ بھی چاہتا تھا کہ وہ انتہائی ذہین بھی ہو۔"

وہ پھر لمحہ بھر کے لیے رکے تھے۔ ان کی آواز کی ٹون بدل رہی تھی۔ جذبات کا غلبہ ان کی آواز کو کپکپانے لگا تھا۔ "نور محمد بہت ذہین بچہ تھا۔ پہلا لفظ سات مہینے کی عمر میں بولنا سیکھا۔ دو سال کا ہوا تو سارے حروف تہجی کی پہچان کرنا سیکھ چکا تھا۔ ہم سڑک پر کبھی جاتے تو بورڈز پر لکھے لفظ پہچان لیتا۔ اولاد بہت بڑا فخر کا حوالہ ہوتی ہے۔ میرے لیے بھی میری اولاد میرا فخر تھی' لیکن میں نے اولاد کے سامنے کبھی اس فخر کو ظاہر نہیں کیا۔ لیکن یہ میری غلطی تھی۔ میرا گناہ نہیں تھا۔ میں اپنے جذبات کو چھپا کر رکھتا تھا۔ میری طبیعت ہی اس قسم کی تھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ مجھے نور محمد سے محبت نہیں تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی باپ کو بیٹے سے محبت نہ ہو۔ محبت تو تھی لیکن میں نے اپنی اولاد کو نظام کے خلاف لڑنے کے لیے اپنا ہتھیار سمجھ لیا تھا۔ میں اس کے ذریعے اس نظام تعلیم کو شکست دینا چاہتا تھا۔ جو بے ایمانی اور رشوت کی بنا پر قابل بچوں کا حق مار رہا تھا۔ میں نے اس پر بہت محنت کی۔ بے حد بے حساب محنت کی۔ میں اسے کہیں کمزور پڑتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ لوگ سمجھتے تھے' مجھے اپنی اولاد کی کامیابی سے خوشی نہیں ہوتی تھی۔ ایسا کیسے ممکن ہے۔"

انہوں نے بات ادھوری چھوڑی پھر وہ بدقت اٹھ کر ایک چیسٹ دراز کی طرف چلے آگئے' وہ ہاتھ میں کچھ لے کر واپس آئے تھے۔

"یہ دیکھو' میرے پاس اس کی ایک ایک کامیابی کا ریکارڈ ہے۔" انہوں نے سلمان کے آگے ایک ڈائری رکھی تھی۔ اس پر کافی چیزیں درج تھیں۔ وہ صفحات پلٹنے لگے۔

"یہ دیکھو اس کا پہلا ٹیسٹ بارہ مارچ انیس چوراسی کو ہوا تھا۔ یہ دوسرا ٹیسٹ جو اس کے کچھ دن بعد ہوا۔ یہ دیکھو یہ ٹیسٹ۔ یہ دیکھو وہ ٹیسٹ۔"

وہ اپنی لے میں بول رہے تھے۔ انہیں شاید بہت عرصے بعد اپنے بیٹے کے بارے میں باتیں کرنے کے لیے کوئی ملا تھا۔ سلمان کو بے پناہ دکھ ہوا۔ وہ ایک باپ کی ذات کے بخیے ادھیڑنے نہیں آیا تھا جبکہ وہ اپنے حال سے بے خبر بول رہے تھے۔

"یہ دیکھو ایک ایک چیز کو میں سنبھال کر رکھتا تھا۔ لوگ نجانے کیوں سمجھتے ہیں کہ مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔ ایسا ممکن ہے بھلا۔ مجھ سے بس یہ غلطی ہوئی کہ مجھے ظاہر نہیں کرنا آیا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔"

وہ اب چپ ہوئے تھے۔ سلمان نے انہیں سسکتے ہوئے سنا۔ اس کی اپنی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ یہ کوئی قابل دید منظر نہیں تھا۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ انہوں نے اپنی آنکھیں صاف کی تھیں۔

"میں سمجھ سکتا ہوں سر۔! میں شرمندہ ہوں کہ میں آپ کو تکلیف دینے کا باعث بن رہا ہوں' لیکن یہ سب جاننا بہت ضروری ہے۔ بہت سی باتیں ہیں جو میں جاننا چاہتا ہوں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ پھر نور محمد کے ساتھ ایسا کیا ہوا کہ اس کی دماغی حالت اتنی بگڑ گئی کہ اسے پڑھائی چھوڑنا پڑی۔ اس کا پولیس ریکارڈ کیسے بنا۔ اس نے ایسی کون سے غلطی کی تھی آخر اور پھر وہ لندن کیسے گیا۔ کس کے ذریعہ گیا۔ اور آخری سوال کہ اب وہ کہاں ہے؟"

اس نے پوچھا تھا۔ انہوں نے حیرانی سے اس کے سوالات کو سنا پھر سختی سے تردید کی۔

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کا کوئی پولیس ریکارڈ نہیں تھا۔ وہ ایک بار پولیس کی گرفت میں آیا ضرور تھا' لیکن وہ بھی میری غلطی کی وجہ سے ہوا تھا۔ میں نے زندگی کے ہر معاملے میں اس پر بے جا سختی کی۔ میں سوچتا رہا کہ مشکل جنگ جیتنی ہو تو ٹریننگ سخت کرنی چاہیے۔ میں سمجھتا رہا کہ میں نرم پڑوں گا یا نرمی برتوں گا تو میرا بیٹا ناکام ہو جائے گا۔ میں کیسے ثابت کرپاؤں گا کہ کسی رشوت' معاونت کے بغیر بھی بچے پوزیشن لے سکتے ہیں۔ مجھ سے غلطیاں ہوئیں لیکن نور محمد کے ذہن پر میرے رویے کا اتنا برا اثر پڑ رہا ہے یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ سولہ سال کا بھی نہیں تھا جب کالج میں آگیا تھا۔ لیکن وہ اپنی عمر کے باقی بچوں کی نسبت بہت معصوم تھا۔ اکیڈمی میں لڑکے اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ حالانکہ وہ اس لڑکی کو نوٹس وغیرہ دیا کرتا تھا' لیکن چند شرپسند طبیعت کے حامل لڑکوں نے اسے اس بات کے لیے تنگ کرنا شروع کردیا۔ اسی بات کی وجہ سے اکیڈمی میں اس کے ساتھ ان کا جھگڑا ہوا اور وہ میری زندگی کی سب سے بڑی خطا تھی کہ میں نے اسے ایک ناکردہ گناہ کی سخت سزا دی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے اپنی تربیت پر بھروسہ ہونا چاہیے تھا۔ مجھے اپنے بیٹے پر یقین کرنا چاہیے تھا لیکن میں نے اسے جھٹلا دیا اور تب یہ چیز اس کے اعصاب کے لیے بہت بھاری ثابت ہوئی۔"

انہوں نے اسے وہ تمام تفصیلات بتانی شروع کیں۔ اس کا گھر سے چلے جانا پھر ایک دور افتادہ پولیس اسٹیشن سے بازیاب ہونا۔ اس کی ذہنی حالت بگڑنے کا قصہ پھر انٹری ٹیسٹ میں ناکام ہو جانے کا دکھ۔

"میں نے اس پر پڑھائی کا اتنا دباؤ ڈالے رکھا کہ اس کے اعصاب کمزور سے کمزور ہوتے چلے گئے' لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی اس حالت نے میرے اعصاب پر کیا اثر ڈالا۔ میں ایک سڑا ہوا درخت

ہوں۔ جسے کیڑا لگ چکا ہے۔ اولاد کے دکھ کھوکھلا کردیتے ہیں اور کھوکھلے وجود لے کر اس دنیا کا سامنا نہیں کیا جاتا۔ میں دنیا کے سامنے اس کے وجود سے منکر ہونے لگا۔ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ میری خاموشی کو میرے اپنے گھر والے بھی میری سنگ دلی سمجھتے ہیں، لیکن میں پھر بھی اپنے بیٹے کے بارے میں زبان نہیں کھولتا جس دن زبان کھولوں گا ڈھے کر گر جاؤں گا۔ اتنا کھوکھلا ہو چکا ہوں۔ اتنا حوصلہ نہیں ہے میرا کہ دنیا کے سامنے اعتراف کر سکوں کہ اللہ نے مجھے جو ہیرا دیا تھا وہ خاک بنا دیا میں نے۔"

سلمان نے ان کے چہرے کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ درختوں سے جھڑتے پتے بھلے اچھے لگتے ہوں۔ بوڑھے باپ جوان اولادوں کے دکھ روتے کبھی اچھے نہیں لگتے۔ اس کا دل بہت بوجھل ہو چکا تھا۔

"میں آپ کے دکھ کو محسوس کرسکتا ہوں سر.... میں شرمندہ ہوں کہ آپ کو پرانی باتیں یاد دلا کر آپ کے دکھ میں اضافے کا باعث بن رہا ہوں، لیکن معافی چاہتا ہوں یہ بہت ضروری ہے.... میں سب جاننا چاہتا ہوں۔ نور محمد یوکے کیوں گیا۔ اسے کون لے گیا، وہ وہاں کیا کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر وہ کس علاقے میں رہ رہا ہے.... یہ سب باتیں انتہائی ضروری ہیں۔"

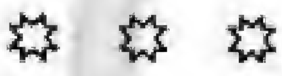
اس نے ایک بار پھر درخواست دہرائی تھی۔ سر آفاق علی نے آنکھیں صاف کیں۔

"وہ سن دو ہزار کے بالکل آخر میں یوکے گیا تھا اور اس کے ماموں اسے لے گئے تھے۔"

وہ بتا رہے تھے پھر انہوں نے مزید تفصیلات بھی بتائی تھیں۔ یہ بہت حیران کن باتیں تھیں۔ یوکے جانے کے بعد نور محمد پر جو بیتی، وہ مزید تکلیف دہ تھی۔ ان ہی کی زبانی سلمان کو پتا چلا کہ نور محمد کے ماموں جو اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے، نے اپنی بیٹی کی شادی نور محمد سے کروادی تھی، لیکن یہ شادی زیادہ نہیں چلی تھی، کیونکہ اس کی دماغی حالت صحیح نہیں رہتی تھی۔ یہاں سے اس کے ماموں نے اسے بلیک برن بھجوا دیا، جہاں سے وہ آخری اطلاع کے مطابق لوٹن چلا گیا تھا۔"

سلمان کو اس مقام پر اس کہانی میں ابہام محسوس ہوا۔ وہ سر آفاق کو مزید کریدنا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس طرح وہ مشکوک بھی ہوسکتے تھے۔

آفاق صاحب سے ملنے کے بعد اس کو نور محمد کے بارے میں مزید تفصیلات تو پتا چلیں، لیکن یہ ابھی بھی واضح نہیں تھا کہ نور محمد کے متعلق ایک این جی او اتنی حساس نوعیت کی معلومات کا ریکارڈ کیوں رکھ رہی ہے اور اب نور محمد کہاں تھا۔ یہ سوال سب سے زیادہ حیران کن تھا۔ اس کا جواب کھوجنے کے لیے سلمان حیدر نے مزید محنت کا ارادہ کیا۔ سر آفاق علی سے ملنے اور ان کی حالت دیکھ کر اس نے انگلینڈ جانے کا پلان بنایا تھا۔



"میں انگلینڈ جانا چاہتا ہوں۔" اس نے رضوان اکرم صاحب سے کہا تھا۔ جن کے ساتھ ان کے چینل پر وہ پہلے ایک مرتبہ کام کرچکا تھا۔ وہ اسے کافی سراہتے تھے اور پسند بھی کرتے تھے۔ وہ اتنا بااختیار بھی نہیں تھا کہ کسی اور ملک میں جانے کا سوچتا اور سب وسائل اس کی دہلیز پر آموجود ہوتے۔ اس کے لیے اسے کسی ایسے شخص یا پلیٹ فارم کی ضرورت تھی جو اسے وسائل اور اختیار دلوا سکتا۔ اس لیے وہ ان کے پاس آیا تھا۔

"اجازت ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے ہنگامی بنیادوں پر ویزا دلوایئے۔" اس نے فورا" فرمائش داغی۔

"اپلائی کردو.... نکل آئے گا ویزا۔" انہوں نے مشورہ دیا تھا۔

"سادہ ویزا نہیں چاہیے۔ اختیارات بھی چاہئیں ورنہ عمارتیں دیکھنے اتنی دور جانے کا مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔ میں جو کرنا چاہتا ہوں اس کے لیے مجھے آپ کی ضرورت ہے۔" اس نے مدعا بیان کیا تھا۔

"میں جان سکتا ہوں کہ جناب کرنا کیا چاہتے ہیں؟"

وہ بھی ایک زیرک انسان تھے۔ انہیں اندازہ ہو گیا

تھا کہ سلمان کے عزائم کچھ اور ہیں۔

"کچھ خاص نہیں۔۔۔ سیر سپاٹا کروں گا۔۔۔ پاکستانی کمیونٹی سے ملوں گا۔۔ ان کے مسائل پر باتیں کروں گا۔۔۔ رپورٹس تیار کروں گا' لیکن اس کے لیے مجھے اختیارات چاہئیں۔ آپ کی معاونت چاہیے' ورنہ اسکاٹ لینڈ یارڈ والے مجھے پکڑ کر لے جائیں گے کہ تم کس خوشی میں معلومات اکٹھی کرتے پھرتے ہو۔"

"میں۔۔۔ سی ای او کابرا در کسبتی نہیں ہوں۔۔۔ (اس زمانے میں ملک میں جنرل مشرف کی حکومت تھی) میری نہر سویز میں مال و اسباب سے لدی کشتیاں بھی نہیں چلتیں۔۔۔ میں ہالی ووڈ کی فلموں میں چھوٹے چھوٹے کپڑے پہن کر فلمیں بھی شوٹ نہیں کرواتا۔۔۔ یعنی نہ کسی سیاست دان کا رشتے دار ہوں نا مال دار ارب پتی شیخ ہوں' نہ ہی ہالی ووڈ کی چمکیلی لچکتی مٹکتی ہیروئن ہوں۔۔۔ میں تو بہت عام سا انسان ہوں۔۔۔ میری اتنی پہنچ کہاں کہ کسی کو ویزا مع اختیارات دلوا سکوں" انہوں نے طنزیہ انداز میں کہا تھا۔

"آپ چاہیں تو کیا نہیں ہو سکتا سر۔۔۔ آپ میری خاطر اتنا بھی نہیں کر سکتے۔" اس نے مزاحیہ انداز میں کہا تھا۔

"تم نے میری خاطر آج تک کیا کیا ہے برخوردار۔۔۔ میرے چینل کو چھوڑ کر چلے گئے۔۔۔ ہمارے اخبار کی ملازمت کو الوداع کہہ دیا۔۔۔ کبھی میل ملاقات کے لیے بھی نہیں آئے۔۔۔ ایک فون کال کے روادار نہیں اور اب کہہ رہے ہو کہ تمہاری خاطر میں ویزا ارینج کروں" وہ سابقہ انداز میں کہہ رہے تھے۔

"سر! اتنی بے مروتی کی توقع آپ سے نہیں تھی۔۔۔ میں نے گزشتہ بقر عید پر آپ کو کال کی تھی۔" وہ مزاحیہ انداز میں بولا تھا۔

"وہ ایک پانچ منٹ والی سادہ فون کال۔۔۔" انہوں نے طنز آمیز نگاہیں اس پر مرکوز کی تھیں۔

"تو آپ کو کیا ساتھ بکرے کا گوشت بھی چاہیے تھا؟" اس کا وہی انداز تھا۔

"سلمان! یہ باتیں کسی اور کو سنانا۔۔۔ میرا وقت ضائع نہیں کرو۔۔۔ مجھے سچ سچ بتاؤ۔۔۔ کیا چل رہا ہے تمہارے دماغ میں؟" انہوں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا تھا اور تب سلمان نے ان کو مختصراً" چیدہ چیدہ باتیں بتا دی تھیں۔

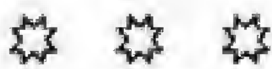
"ہم۔۔۔" انہوں نے ہنکارا بھرا۔

"کام تو ہو جائے گا۔۔۔ دیٹس ناٹ اے بگ ڈیل' لیکن یہ اسٹوری اگر جان دار نکلی تو پھر میرے پروگرام سے بریک ہو گی۔"

انہوں نے یقین دہانی چاہی تھی۔ سلمان کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس طرح ضروری کارروائیوں سے گزرنے کے بعد اسے ویزا مل گیا تھا۔ اس نے سر آفاق سے وہ تمام ایڈریس لے لیے تھے جو ان کے پاس موجود تھے۔ یو کے پہنچ کر وہ سب سے پہلے روچڈیل گیا تھا جہاں نور محمد کے ماموں کی رہائش تھی۔ وہ وہاں سے جا چکے تھے' لیکن ان کا چھوٹا بیٹا ابھی بھی روچڈیل میں ہی رہتا تھا اور اپنے باپ کی دکان کی دیکھ ریکھ کرتا تھا۔

اس سے تو زیادہ معلومات نہیں ملی تھیں' لیکن اسی دکان کے ساتھ والی دکان پر موجود ایک پاکستانی کاریگر نے سلمان کو وہ سب کہانیاں بتائیں' جو پاکستان میں نور محمد کے گھر والوں کو بھی تفصیل سے نہیں پتا تھیں۔ ماموں کی زیادتیاں' ان کی بیٹی کا چال چلن' بیٹوں کی آوارگیاں اور نور محمد کی سادگی۔

وہیں سے سلمان کو مزید تفصیلات پتا چلیں کہ نور محمد شیزو فرینک ہو گیا تھا" اس کو الوژنز ہوتے تھے اور وہ ارد گرد والے لوگوں سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑ پڑتا تھا' اس ری ہیبلی ٹیشن سنٹر کا پتا بھی اسی کاریگر نے سلمان کو دوڑ دھوپ کر کے دیا تھا۔



"نور محمد!" وہ باریش داڑھی والے شخص کے سامنے بیٹھا اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ ان کا نام سیف اللہ نیازی تھا اور وہ ساٹھ کے پیٹے میں ہونے کے باوجود' بہت چاق و چوبند قسم کے انسان تھے۔ انہیں

فوراً" یاد آگیا تھا کہ وہ کس کا ذکر کررہا ہے۔

"جی ہاں۔۔۔ میں جانتا ہوں نور محمد کو۔" انہوں نے سلمان کے سوال کا اتنا ہی جواب دیا۔

"میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے اس کا کچھ اتا پتا دے سکتے ہیں؟" وہ مؤدب انداز میں پوچھنے لگا۔

"جی نہیں۔۔۔ میں ایسے کسی کے متعلق آپ کو نہیں بتا سکتا، جب تک کہ مجھے یہ نہ پتا لگ جائے، آپ کون ہیں اور نور محمد کے بارے میں کیوں جاننا چاہتے ہیں۔۔۔؟" ان کا موقف دوٹوک تھا۔

"میں اس کا کزن ہوں اور پاکستان سے اس سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔" سلمان نے مبالغہ آرائی سے کام لیا تھا۔ ان کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بہت جلدی نیند سے جاگے آپ۔۔۔ اتنے مہینے وہ یہاں اکیلا رہا۔۔۔ اپنے آپ سے بے خبر تن تنہا۔۔۔ تب تو آپ کو اس کی یاد نہیں آئی، اب جبکہ وہ ٹھیک ہو چکا ہے، ایک نارمل زندگی گزارنے لگا ہے تو آپ اسے ڈھونڈتے ہوئے آگئے ہیں۔"

"ہم سب اس کی حالت سے باخبر نہیں تھے۔ وہ یہاں اپنے ماموں کے ہمراہ رہ رہا تھا۔ انہوں نے ہمیں ہمیشہ لاعلم رکھا اور نور محمد کے بارے میں جھوٹی سچی باتیں گھڑ کے بتاتے رہے۔۔۔ اس کے والدین بہت پریشان ہیں سر۔۔۔! وہ اپنے بیٹے سے ملنا چاہتے ہیں، لیکن ہمیں صرف اتنا پتا ہے کہ وہ چند سال پہلے یہاں تھا۔۔۔ اس کے بعد وہ یہاں سے فرار ہو گیا تھا۔۔۔ اس کے بعد سے اس کی کوئی خیر خبر نہیں ہے۔۔۔ ایک بار اس کے متعلق کوئی مثبت رپورٹ مل جاتی تو میں اس کے والد محترم کو بتا کر سرخ رو ہو سکوں گا۔ آپ کو اگر اس کی اطلاع ہے تو پلیز مجھے بتائیے۔۔۔ اس کی ماں کے بے چین دل کو قرار آجائے گا سر!"

اس نے ان بزرگ کو جذباتی انداز میں ٹریپ کرنا چاہا تھا۔ اس مقام پر اس کے دل میں یقین تھا کہ نور محمد کسی نہ کسی غلط سرگرمی میں ملوث ضرور ہو گا اور اسے یہ خدشہ بھی تھا کہ یہ بزرگ بھی اس کے معاون ہو سکتے ہیں۔

"اس کے والد اب تک کہاں تھے؟ جنہیں ہیرے جیسا بچہ پہلے یاد ہی نہیں آیا۔" وہ کافی رعب اور دبدبے والے انسان تھے۔ سلمان کی ہمت ہی نہیں پڑی تھی کہ وہ کوئی وضاحت دے پاتا۔

"لوٹن میں رہتا ہے آج کل۔۔۔ مؤذن بھی ہے اور امامت بھی کرواتا ہے ماشاءاللہ۔" وہ پرجلال انداز میں بولے تھے۔ سلمان نے سر ہلایا، پھر شکل پر مصنوعی رقت طاری کر کے بولا۔

"آپ برا نہ مانیں تو میں ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔۔۔ وہ یہاں سے لوٹن کیوں اور کیسے چلا گیا؟ اور پھر اس نے اپنے ماموں کے پاس واپس جانا کیوں مناسب نہیں سمجھا۔۔۔؟ اس کے والد تو وہاں پاکستان میں یہی جانتے ہیں کہ وہ یہاں سے فرار ہو کر لوٹن گیا تھا۔"

"سب بے کار کی باتیں ہیں۔ جھوٹ کا پلندہ ہیں۔۔۔ وہ جب یہاں آیا تو ذہنی حالت ایسی تھی کہ ہر دوسرے روز دورہ پڑنے لگتا تھا۔ ڈوپامائن لیول بڑھ گیا تھا۔ اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا تھا، کسی کو پہچانتا بھی نہیں تھا۔ اتنی خراب حالت میں بھی اس کے ماموں کو کبھی توفیق نہ ہوئی کہ آکر اس کی خیر خبر لیتے، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس پر کوئی رقم نہیں خرچ کرنا چاہتے تھے۔۔۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ اگر آکر پوچھیں گے تو اس کے اخراجات کے لیے رقم کا مطالبہ کیا جائے گا، سو انہوں نے اس سے لاتعلقی اختیار کر لی۔۔۔ جبکہ ہم نے اسے اپنے خرچے پر دوائیں استعمال کروائیں۔۔۔ اس کی کاؤنسلنگ کی، وہ بہت جلدی صحت یاب ہو گیا تھا۔ اس کو دورے پڑنا بھی بند ہو گئے تھے۔۔۔ اور پھر میں نے اسے قرآن پڑھانا شروع کیا۔ آپ یقین نہیں کرو گے برخوردار! وہ اتنا ذہین بچہ تھا کہ ایسی دماغی حالت کے باوجود اس نے نو مہینے میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ اسے اللہ سبحان تعالیٰ نے ایک حیرت انگیز دماغ دیا تھا۔ دو سال لگاتار یہاں ہماری مسجد میں نماز تراویح کی امامت کرواتا رہا۔۔۔ پھر اسی لیے میں نے اسے لوٹن بھجوا دیا، وہاں جامع مسجد کا ملازم ہے۔ ہفتہ وار تنخواہ کماتا ہے۔

اچھی بھلی زندگی گزار رہا ہے اور وہ بھاگ کر کہیں نہیں گیا تھا۔ میں نے خود اسے وہاں بھرتی کروایا تھا۔ جب صحت مند ہو چکا تھا تو کیوں مفت کی روٹیاں تڑواتے اس سے۔ اپنا کماتا ہے' کھاتا ہے ماشاء اللہ۔" وہ تنک کر بولے تھے۔

"آپ مجھے اس کا کوئی اتا پتا دے دیں۔۔۔ میں اس سے ایک دفعہ ملنا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا تھا۔

"دے دوں گا' اگر تم یہ بتا دو کہ تم کون ہو؟" انہوں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ سلمان گڑبڑا سا گیا۔ وہ صحافی تھا' بھانت بھانت کے لوگوں سے ملتا رہتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا وہ سب کو آرام سے جل دے سکتا ہے' لیکن سامنے بیٹھے بزرگوار نے چند منٹ میں اس کے اس غرور کا تیا پانچا کر ڈالا تھا۔

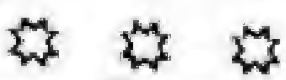
"میں۔۔۔ اس کا کزن ہوں میں نے آپ کو بتایا تو تھا۔" وہ بات بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ انہوں نے اسے گھور کر دیکھا۔

"مجھ سے جھوٹ مت بولو۔ یہ جو کزن' رشتہ دار' دوست احباب ہوتے ہیں نا ان کی آنکھوں میں ایسی کھوج نہیں ہوتی' جیسی تمہاری آنکھوں میں ہے۔" انہوں نے صاف گوئی سے کہا تھا۔

سلمان نے ایک لمحہ ہی سوچا تھا پھر کسی انجانے جذبے سے مغلوب ہو کر اس نے اللہ کو یاد کرتے ہوئے انہیں کچھ نہ کچھ بتا دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے انہیں مختصراً" بتایا تھا کہ نور محمد کا تعلق کس طرح ایک جہادی تنظیم سے جوڑا جا رہا ہے۔ وہ چونکہ سادہ لوح انسان ہے اور ٹریپ کیا جا سکتا ہے تو اس سے ملنا ضروری ہے۔ سیف اللہ نیازی اس کی باتوں کو غور سے سنتے رہے تھے۔

"آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔۔۔ میں نور محمد کو دوست کی حیثیت سے تلاش نہیں کر رہا' لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ میں اس کا خیر خواہ ہوں میری دلی خواہش ہے کہ میں نور محمد کو اس کے والدین سے ملوا سکوں' میرا مقصد صرف اتنا ہی ہے۔" اس نے انہیں یقین دلایا تھا۔

"تم ایڈریس لے لو لیکن ایک بات یاد رکھو' اس سے ایسی کوئی بات مت کرنا جس سے اسے کوئی تکلیف ہو' وہ دماغی طور پر صحت مند ہے' لیکن ابھی بھی اس کے اعصاب بہت مضبوط نہیں ہیں۔ اس کی ذہنی رو بھٹک بھی سکتی ہے۔ سو الزام تراشی سے پرہیز کرنا اور اس کے ماں باپ سے ملو تو ایک بار میری طرف سے ضرور کہنا کہ انہوں نے چاہے اسے دنیا میں چھوڑ دیا ہو۔ لیکن وہ اتنے کرموں والا بچہ ہے کہ جنت میں بھی انہیں اکیلا نہیں چھوڑے گا ساتھ لے جائے گا۔" انہوں نے جتا کر کہا تھا۔ سلمان چپ رہ گیا۔



اس کے بعد وہ لوٹن پہنچا تھا لیکن یہاں پہنچنے سے پہلے اس نے لوٹن کے متعلق کافی معلومات اکٹھی کی تھیں۔ انٹرنیٹ پر بھی اور اخبارات کے ذریعے بھی اور وہاں مقیم مسلم آبادی سے بھی ملاقاتیں کر کے اس نے کافی مواد اکٹھا کیا تھا۔ لوٹن کے بارے میں اسے پتا چلا تھا کہ یہاں مسلم کمیونٹی زیادہ تھی۔ یہاں کافی جگہوں پر مسلم روایات کی پاس داری بھی کی جاتی تھی۔ جس کی بنا پر مقامی آبادی ناخوش رہتی تھی اور مسائل بھی لاتعداد تھے۔ جھڑپیں اور فسادات بھی ہوتے رہتے تھے۔ مقامی سفید فام اکثریت نے ایک تنظیم یو پی ایل بنا رکھی تھی' جو بظاہر غیر فعال نظر آتی تھی۔ لیکن پھر بھی سفید فام آبادی کی جانب سے بھوری رنگت کے حامل بالعموم دیسی اور بالخصوص ریڈیکلز کہلائے جانے والے لوگ عتاب کا نشانہ بنتے تھے۔

مسلمانوں کی ایک نمائندہ جماعت المہاجرون تھی۔ جس کے متعلق سوالات اٹھتے رہتے تھے اور زیادہ تر مسلمان آبادی بھی اس تنظیم سے ناخوش تھی۔ یہ لوگ شریعت کے نفاذ کی بات کرتے تھے۔ جبکہ یو پی ایل کے نمائندگان شریعت کے خلاف زہر اگلتے تھے' اور مسلمانوں اور ان کی روایات کا کھلے عام مذاق اڑاتے تھے۔ قرآن کے اوراق کی بے حرمتی' مسجد میں آنے والے نمازیوں پر آوازیں کسنے کے

واقعات اور خنزیر کا گوشت یا پھر مسجد کے احاطے میں پھینکنے کی باتیں بھی سننے میں آئی تھیں۔ سلمان نے ایک دن جامع مسجد میں ایک وقت کی نماز بھی ادا کی۔ اس نے وہاں نور محمد کو بھی دیکھا۔ اسے پہچاننے میں اسے زیادہ مشکل نہیں ہوئی تھی' کیونکہ سر آفاق نے اسے اس کی ایک دو تصویریں دکھائی تھیں۔

سلمان کو اس سے زیادہ حیرانی اس کے ساتھ موجود سفید فام کو دیکھ کر ہوئی۔ وہ دونوں زیادہ تر وقت ایک ساتھ ہی نظر آتے تھے جبکہ ان کی عمروں میں تقریباً" دگنا فرق تھا۔ نور محمد تیس بتیس سال کا تھا' جب کہ وہ سفید فام پچاس پچپن کے پیٹے میں لگتا تھا۔ سلمان کو بعد میں پتا چلا کہ وہ ایک نو مسلم ہے اور اس کا نام احمد معروف ہے۔ اس نے احمد معروف کے متعلق پوچھ کچھ کی تو اس شخص کی شناخت "بل گرانٹ" کے نام سے ہوئی جو ناول نگار بھی تھا۔

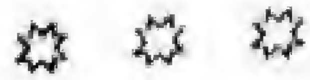
بل گرانٹ کے متعلق اس نے سب سے پہلے انٹرنیٹ پر ریسرچ کی تھی۔ جہاں بمع اس کی تصویر کے اس کے متعلق کافی معلومات مل گئی تھیں۔ دوسری اہم بات جو اس کے متعلق اسے پتا چلی وہ اس کی شہرت تھی' وہ کوئی عام ناول نگار نہیں بلکہ کافی مشہور لکھنے والا ادیب تھا۔ سلمان نے یہاں بھی رضوان اکرم سے مدد لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے انہیں کال کی تھی اور اس شخص کے متعلق کچھ معلومات فراہم کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس کے ناولز اور ان کی تھیمز کے بارے میں اسے رضوان اکرم سے پتا چلا تھا اور یہ بات بھی انہوں نے ہی بتائی تھی کہ وہ اپنی ہندو بیوی کی خودکشی کے بعد سے گمنامی کی زندگی گزار رہا ہے اور اس کا آخری ناول جس پر وہ کام کر رہا تھا بھی مکمل نہ ہو سکا تھا۔ احمد معروف عرف بل گرانٹ کے متعلق مزید معلومات اسے سیف اللہ نیازی سے بھی ملی تھیں۔

سیف اللہ نیازی دراصل وہی شخص تھے جنہوں نے بل گرانٹ کو نور محمد کے متعلق بتایا تھا۔ وہ بل گرانٹ کے متعلق بھی کافی باتیں جانتے تھے جو انہیں خود بل گرانٹ نے بتائی تھیں۔ سلمان نے دوبارہ جا کر ان سے ملاقات کی تھی کیونکہ جامع مسجد سے اسے پتا تھا کہ بل گرانٹ نے بلیک برن کی جامع مسجد کے امام سیف اللہ خان نیازی کے سامنے اسلام قبول کیا تھا' جبکہ وہ اس بات کی شہادت سے انکاری ہو گئے تھے کہ بل گرانٹ نے ان کے سامنے کلمہ پڑھا تھا' لیکن انہوں نے بل گرانٹ کی تعریف کی تھی اور اس بات کا اعتراف بھی کیا تھا کہ انہوں نے بل گرانٹ سے کہا تھا کہ وہ کسی "مومن" بندے سے ملنا چاہتا ہے تو ایک بار "نور محمد" سے ضرور ملے۔

اب کی بار سلمان نے انہیں سب کچھ سچ بتا دیا تھا کہ کیسے وہ نور محمد کے بارے میں جاننے کے لیے یہاں آیا ہے اور کس طرح پاکستان میں کام کرتی ایک این جی او کے پاس اس کا ریکارڈ ہے' جو یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ دہشت گرد تنظیم کے ساتھ وابستہ ہے۔ سیف اللہ خان نیازی نے ہی سلمان کو بتایا تھا کہ بل گرانٹ اچھا انسان ہے' لیکن وہ اس بات کی سو فیصد گواہی نہیں دے سکتے کہ وہ مسلمان ہو چکا ہے یا نہیں۔ اس طرح سلمان نے خاطر خواہ ہوم ورک کر کے ایک دن ان دونوں کو پوسٹ آفس میں جا لیا تھا اور ایسے ظاہر کیا جیسے وہ اتفاقیہ نور محمد سے آملا ہے۔ یہاں تک سب ویسا ہی ہوا تھا' جیسا اس نے سوچا تھا لیکن وہ وہاں چوک گیا تھا جب اس نے بل گرانٹ عرف احمد معروف سے ساری باتیں کھل کر کرنی شروع کی تھیں۔ نور محمد اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلا گیا تھا۔

سلمان کو ان دونوں کی نیت پر جو شک تھا وہ کافی حد تک ختم ہو گیا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ یہ دونوں ہی جھوٹ نہیں بول رہے' لیکن وہ لہجے کو نرم رکھ کر معاملہ نہیں بگاڑنا چاہتا تھا۔ اس نے احمد معروف سے اپنے مخصوص انداز میں ہی بات کی تھی' جو وہ صحافی بن جانے کے بعد اپنا لیا کرتا تھا۔ لیکن اس مقام پر سارا معاملہ الٹا ہو گیا تھا۔ وہ احمد معروف کی گفتگو سے متاثر ہوا تھا۔ تب ہی انہوں نے اسے اپنے ساتھ آنے کے لیے کہا تھا۔ وہ اٹھ کر ان کے ہمراہ دوسرے کمرے تک گیا تھا لیکن تب ہی کسی نے عقب سے اس کے سر پر

کسی وزنی چیز سے وار کیا تھا۔ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر نیچے گر گیا تھا۔



"آپ کا نام سلمان حیدر ہے۔" وہ پوچھ رہی تھی۔
گاڑی راولپنڈی سے لاہور کی جانب گامزن تھی۔ وہ زارا کو لینے بھی خود آیا تھا اور اب ڈراپ بھی خود کرنے جا رہا تھا۔ زارا کو پہلی بار اس سے عجیب سا خوف لاحق ہوا تھا۔ وہ کافی دیر تک اس سے اس بارے میں کوئی سوال نہیں کر پائی تھی۔ وہ فون کال کے آنے کے بعد سب کام ادھورا چھوڑ کر نجانے کہاں چلا گیا تھا اور دو ڈھائی گھنٹے بعد واپس آیا تھا۔ اس کے چہرے پر سوچوں کا جال بنا تھا اور اپنے مخصوص باتونی انداز میں باتیں کرنے کے بجائے کافی خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔
"ہاں... کیوں اچھا نام نہیں ہے کیا۔" وہ اسی انداز میں پوچھ رہا تھا جو اس کا خاصا تھا۔ زارا نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔
"آپ نے مجھے کبھی بتایا نہیں۔" وہ ابھی بھی مناسب الفاظ جمع نہیں کر پائی تھی۔
"کیا...؟" اس نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔
"آپ کو اپنا صحیح نام مجھے بتانا چاہیے تھا۔" وہ لہجے میں زور دے کر بولی تھی۔ اس کی خفگی بھی اب لہجے سے عیاں ہونے لگی تھی۔
"ٹیپو بھی غلط نام نہیں ہے..." اس نے بھی اسی کے انداز میں کہا تھا پھر موڑ کاٹتے ہوئے مزید بولا۔
"یہ نام میرے ابو نے رکھا تھا اور مجھے یہ نام بہت عزیز ہے اور یہ نام صرف ان لوگوں کو بتاتا ہوں میں جو مجھے بہت عزیز ہیں... کوئی اعتراض؟"
وہ اس سے سوال کر رہا تھا۔ زارا چند لمحے سوچتی رہی کہ مزید کیا پوچھے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ میں تمہیں عام سا کم پڑھا لکھا انسان سمجھتی تھی جو کہیں ڈسپنسر یا کمپاؤنڈر کی جاب کرتا تھا۔ یہ کہنا بہت بڑی بد اخلاقی ہوتا۔
"اب مراقبے میں کیوں چلی گئی ہو... اس میں اتنا برا ماننے والی کیا بات ہے کہ اگر ٹیپو کا نام سلمان حیدر ہے تو... لوگ مالٹے کو بھی تو کینو کہتے ہی ہیں... اور شلجم کو گونگلو بھی... اس پر تو کبھی کسی نے ایسے منہ نہیں بگاڑا ہوگا جیسے تم نے بگاڑ لیا ہے۔"
وہ اتنے عام سے انداز میں مثالیں دے رہا تھا کہ نا چاہتے ہوئے بھی زارا کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
"آپ نے کبھی اپنے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں... میں آپ کے گھر جاتی ہوں۔ آپ کی امی کو آنٹی کہتی ہوں، آپ لوگوں کے گھر کھانے کھاتی ہوں، آپ سے اپنے مسئلے ڈسکس کرتی ہوں، اس کے باوجود میں آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" اس نے گود میں رکھے ہاتھوں کو بلاوجہ مسلا تھا۔
"اس کی وجہ بھی میں ہوں کیا؟" وہ پوچھ رہا تھا پھر اسے خاموش دیکھ کر بولا۔
"تمہیں اپنے اور اپنے شہوز صاحب کے بارے میں بات کرنے سے فرصت ملے تو کبھی کسی اور کے متعلق بات ہونا۔ اچھا اب خفا مت ہو، پوچھو کیا پوچھنا چاہتی ہو۔ اب خدارا میری امی کی طرح یہ مت پوچھنا کہ آمنہ کون ہے؟"
"آمنہ کے بارے میں بات کیوں نہیں کرنا چاہتے آپ؟" وہ چڑ کر بولی تھی۔
"ارے میں نے کب کہا کہ مجھے آمنہ کے بارے میں بات نہیں کرنی۔ تم تو بلاوجہ خفا ہو رہی ہو... کہیں بھوک تو نہیں لگی... ؟ آج میں چاکلیٹ لایا ہوں تمہارے لیے۔ یہ چیمبر کھول کر نکال لو۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ زارا نے چیمبر کھولنے کے لیے ہاتھ آگے نہیں کیا تھا۔
"مجھے چاکلیٹ لینی ہے نہ چیمبر کھولنا ہے، پھر آپ کے کوئی ضروری کاغذات میرے ہاتھ لگ جائیں گے اور آپ غصہ کریں گے۔" وہ پچھلی بار کا واقعہ یاد کرتے ہوئے بولی تھی، جب ٹیپو نے اپنے کچھ کاغذات اس کے ہاتھ لگنے پر چھیننے کے انداز میں لے لیے تھے۔
"زارا! تمہیں تو معصوم انسانوں سے بدگمان ہونے

لیکن کراچی اسے کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں تھا۔ اس لیے صبح بیدار ہونے کے بعد سگریٹ پینے کی لت سی لگتی جا رہی تھی۔ اپنی طلب سے لڑتے ہوئے وہ صرف وقت گزاری کے لیے باہر دیکھنے لگا تھا۔

بیرونی بڑی سڑک پر ایک بزرگ سفید فام ہاتھ میں ایک بورڈ لے کر بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ اس نے دیکھا تین بچوں کا گروپ جیسے ہی سڑک پار کرنے کے لیے اس سمت آیا۔ اس بزرگ شخص نے اپنا بورڈ والا ہاتھ ہوا میں بلند کر دیا تھا' جس پر اتنی دور سے لکھا ہوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن شہوز نے دیکھا وہ گاڑیوں نے جو تیزی سے آ رہی تھیں اس بورڈ کو دیکھ کر رفتار آہستہ کر لی تھی۔ اس بوڑھے شخص نے اس کے بعد بچوں کو اشارہ کیا تھا۔ وہ تینوں بچے اطمینان سے بزرگ کی طرف مسکراہٹ اچھالتے ہوئے سڑک پار کر کے آگے بڑھ گئے تھے۔ شہوز کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے یہ سب اچھا لگا۔ لندن کا پہلا تاثر ہی بہت گہرا تھا۔ دروازے پر ہلکی سی دستک دی گئی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تھا پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا۔ دروازہ کھل گیا تھا۔ سامنے عمر کھڑا تھا۔ نہایا دھویا تر و تازہ نکھرا نکھرا سا۔

"اسلام و علیکم۔ گڈ مارننگ میرے ابو کے گھر میں پہلی صبح مبارک ہو۔" وہ اندر داخل ہوتا ہوا بشاشت سے 'لیکن عجلت بھرے انداز میں بولا تھا۔

"میں آفس کے لیے نکل رہا تھا۔ سوچا تم سے مل کر جاؤں پھر واپسی پر تو میں لیٹ ہو جاتا ہوں آج کل ۔۔۔ ذرا یہاں آؤ کچھ چیزیں سمجھانی ہیں۔" وہ بیڈ پر بیٹھ کر اپنا لیپ ٹاپ والا بیگ کھول رہا تھا۔

"امامہ بھی آئی ہے؟" شہوز نے بیڈ کی سمت آتے ہوئے پوچھا تھا۔

"نہیں ۔۔۔ وہ شام کو آئے گی ۔۔۔ میں تو تمہیں کچھ چیزیں دینے آیا تھا ۔۔۔ یہ ووڈافون کی انٹرنیشنل سم ہے اسے اپنے فون میں انسرٹ کر لو ۔۔۔ تمہیں ہم سے رابطہ کرنے میں آسانی رہے گی ۔۔۔ یہ جو بیک اسٹریٹ ہے نا ۔۔۔ اس کے دائیں طرف پوسٹ آفس ہے۔ وہاں سے تم ڈے کارڈ لے لینا' لیکن دس بجے کے بعد جانا ۔۔۔ پہلے جاؤ گے تو کارڈ مہنگا ہو گا۔ دس بجے کے بعد رش کم ہو جاتا ہے تو ریٹ کم ہو جائے گا۔ لندن دیکھنا ہے تو گھوم پھر کر ہی دیکھنا پڑے گا' اس لیے ضروری ہے کہ تم یہاں کا روٹ سسٹم سمجھ لو۔ یہ میپ ہے۔ اس کے مطابق چلو گے تو آسانی سے سب سمجھ میں آ جائے گا۔ میرا مشورہ ہے پہلے دن تم سنٹرل لائن سے جوبلی لائن تک کا کارڈ لینا اس میں چار اسٹیشن آ جائیں گے۔ میں' ابو اور عمیر تینوں شام کو ہی آئیں گے۔ تم اکیلے ہو گے سارا دن' لیکن ایسے گھر بیٹھے رہے تو بہت جلد اکتا جاؤ گے اس لیے بہتر ہے ذرا باہر چلے جانا۔" وہ جلدی جلدی بول رہا تھا۔

"بہت خوب ۔۔۔ تم پاکستان آتے ہو تو ہم تمہیں اکیلے گھمن گھیریاں کھانے بھیجتے ہیں کیا ۔۔۔ میرے ساتھ چلنا میں اکیلا کہیں نہیں گھوم سکتا۔" شہوز مصنوعی ناراضی سے بولا تھا۔

"میں ویک اینڈ پر جوائن کروں گا نا تمہیں ۔۔۔ اس سے پہلے بہتر ہے' تم خود بھی کہیں نکلو ورنہ تم پورا لندن نہیں دیکھ پاؤ گے۔ گھر میں صرف ممی ہوں گی' لنچ کے بعد امامہ بھی آ جائے گی لیکن یہ دونوں خواتین تمہیں بور کر دیں گی' اس لیے بہتر ہے دو تین گھنٹے ذرا باہر نکل جانا۔" وہ وضاحت دے رہا تھا۔ شہوز کچھ نہیں بولا۔

"یہ کچھ کیش ہے ۔۔۔ پچاس پاؤنڈز ہیں اور یہ میرا اے ٹی ایم ہے اس کا پن کوڈ میرا ڈیٹ آف برتھ ہے' مجھے پتا ہے تمہارے پاس پیسے ہیں' لیکن وہ روپے ہوں گے۔ پاؤنڈز نہیں اس لیے جب تک تم روپوں کو پاؤنڈز میں تبدیل نہیں کروا لیتے۔ صرف تب تک تم میرا اے ٹی ایم استعمال کر سکتے ہو۔" عمر نے والٹ کھول کر اس میں سے رقم اور اپنا کارڈ نکال کر میز پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔ شہوز کو حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ عمر اس کو کیش اور اپنا کارڈ تک دے ڈالے گا۔ اسے اس کے خلوص پر بہت پیار آیا۔

"ارے نہیں نہیں ۔۔۔ مجھے ضرورت نہیں ہے۔

میرے پاس یوروز ہیں۔۔۔ یہ مت کرو تم۔" وہ اس کا کارڈ اٹھا کر اسے واپس تھمانے لگا۔

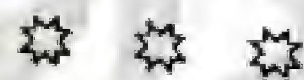
"اوہو۔۔۔ اپنے یوروز بھی سنبھال کر رکھو۔۔۔ یہ پاؤنڈز ہیں۔۔۔ چپ چاپ رکھ لو اب والٹ میں اور اتنے بھی شوخے مت بنو۔ میں جانتا ہوں تم بہت امیر ہو گئے ہو لیکن ہمیں بھی اپنا فرض ادا کرنے دو۔"

وہ دوبارہ لیپ ٹاپ کی زپ بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اب کی بار شہوز کچھ نہیں بولا تھا' حالانکہ وہ پاکستان سے ہی کچھ روپے یورو میں کنورٹ کروا کر لایا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا تھا تاکہ عمر کو دکھا سکے کہ اس کے پاس پیسے ہیں۔"

"اب کدھر جا رہے ہو؟" عمر نے اسے اٹھتا دیکھ کر سوال کیا تھا۔

"ابھی تو صرف واری صدقے جا رہا ہوں تمہارے انداز پر۔۔۔ ماشاء اللہ بڑے ذمہ دار ہو گئے ہو۔" شہوز نے چڑایا پھر وہ اپنا والٹ کھولنے لگا تھا۔ عمر نے ناپسندیدگی سے اس کو دیکھا پھر والٹ پکڑ کر اسے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"چل پھر لا لے! نکلتا ہوں۔۔۔ شام کو ملاقات ہو گی پھر بات کریں گے ذمہ داریوں کی۔۔۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ شہوز نے کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا تھا۔



"نور محمد؟" شہوز نے ناسمجھی کے عالم میں عمر کا چہرہ دیکھا تھا۔

اسے ایک دم یاد نہیں آیا تھا کہ عمر کس کا ذکر کر رہا ہے۔ لندن آمد کے بعد یہ پہلا ویک اینڈ تھا اور عمر اس کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے کافی پُرجوش تھا۔ وہ آفس کے بعد روز ہی ممی کے گھر آجاتے تھے۔ آج بھی وہ آفس سے یہیں آیا تھا اور اب وہ دونوں کافی کے مگ لے کر عمیر کے کمرے میں آبیٹھے تھے۔ ایک دور کے رشتہ دار کی فیملی ڈنر کے لیے آ رہی تھی اس لیے امائمہ بھی ممی کی معاونت کے خیال سے ان کے گھر پر تھی۔ عمر نے یہ موقع مناسب سمجھتے ہوئے شہوز کو ساتھ لیا تھا اور اوپر آ گئے تھے۔ عمر تفصیل سے اس سے نور محمد کے متعلق بات کرنا چاہتا تھا۔

"ہاں نور محمد۔۔۔ تمہیں یاد ہے' سروز بھائی نے ہمیں ایک بار بتایا تھا کہ امائمہ کا بھائی ان کا کلاس فیلو تھا۔ وہ جو بعد میں کسی نفسیاتی بیماری کے چکر میں مینٹل ہاسپٹل میں داخل تھا۔" وہ بغور اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اوہو۔۔۔ تمہیں یاد کیوں نہیں آ رہا۔" عمر نے اکتا کر پوچھا تھا۔ شہوز نے سر ہلایا۔ اب کی توجہ خشک میوہ جات کی پلیٹ میں زیادہ تھی جو عمر کافی کے ساتھ اٹھا لایا تھا۔

"ہاں ہاں۔۔۔ یاد تو آ گیا ہے لیکن مسئلہ کیا ہے اتنی رازداری سے بات کیوں کر رہے ہو؟" اس نے کھٹے میٹھے روسٹڈ کاجو کے دانے مٹھی میں بھرے تھے۔

"وہ یہاں ہے۔ یو کے میں۔۔۔ کسی اسائلم میں نہیں ہے۔" عمر نے اپنے تئیں کوئی راز آشکار کیا تھا اس پر۔

"اچھا۔۔۔ یہاں ہے؟ امائمہ ملتی ہے اس سے۔۔۔ ملنا بھی چاہیے۔۔۔ بھائی ہے اس کا۔" وہ لاپروائی سے بولا تھا۔ عمر نے اس کے انداز کو ناپسندیدگی سے دیکھا۔

"بھائی! مانا تو بہت ہینڈسم ہو گیا ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ عقل کو استعمال ہی نہیں کرنا۔۔۔ اس کو پیکنگ میں رکھنے کا ارادہ کر لیا ہے کیا؟" وہ مصنوعی انداز میں چڑ کر اس کے سر پر انگلی سے دستک دیتے ہوئے بولا تھا۔ شہوز ہنسا۔

"بک بک نہیں کر۔۔۔ تعریف کرنی ہے تو کھل کر کر۔۔۔" اس نے کاجو کا ایک دانہ اس کی جانب اچھالا تھا۔

"تمہیں بھی لڑکیوں کی طرح تعریفیں سننے کا زیادہ ہی شوق ہو گیا۔۔۔ لیکن فی الحال ذرا اپنی ذات سے باہر نکلو اور سنجیدگی سے میری بات سنو۔ یہ بہت اہم معاملہ ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ امائمہ کا ایک بھائی ہے نور محمد۔ یہ بات تمہیں پتا ہے یا نہیں؟" عمر کے چہرے پر

پہلی سنجیدگی محسوس کر کے شہوز بھی سنجیدہ ہوا تھا۔

"ہاں یہ بات تو پتا ہے مجھے۔ اور یہ بھی سمجھ میں آگیا کہ وہ یہاں ہے۔ آگے چلو۔" وہ بتا بھی رہا تھا اور پوچھ بھی رہا تھا۔

"نہیں یہاں لندن میں نہیں ہے۔ لوٹن میں ہے۔" عمر نے اپنے گھٹنے کے نیچے رکھا کشن نکال کر اپنے انداز نشست کو مزید آرام دہ بنایا تھا۔

"میں تمہیں مختصر الفاظ میں ساری بات بتانے کی کوشش کرتا ہوں۔ امائمہ کا ایک بھائی تھا نور محمد۔ جس کے بارے میں ہمیں بہروز بھائی نے بتایا تھا کہ وہ ذہنی طور پر صحت مند نہیں تھا اور بعد میں کسی لڑکی کے ساتھ افیئر کی بنا پر انکل آفاق نے اسے کافی مار پیٹ کی تھی اور وہ گھر سے بھاگ گیا تھا۔ یہ ہیں وہ باتیں جو ہمیں بہروز بھائی سے پتا چلی تھیں لیکن اب امائمہ نے مجھے اس بارے میں کافی تفصیل سے بتایا ہے۔ اصل قصہ یہ نہیں ہے۔"

عمر نے رک کر اس کے چہرے کے تاثرات جانچنے کی کوشش کی کہ آیا اسے ابھی بھی اس کی باتوں میں دلچسپی محسوس ہو رہی ہے یا نہیں۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ شاید شہوز اس مسئلے میں زیادہ دلچسپی نہ لے، لیکن چونکہ وہ امائمہ سے وعدہ کر چکا تھا کہ وہ اس کے بھائی کی تلاش میں اس کی مدد کرے گا تو یہ اس کے لیے اب کسی مہم سے کم نہیں تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ شہوز اس سلسلے میں ذاتی دلچسپی لے۔

"اصل قصہ کیا ہے پھر۔" شہوز نے پوچھا تھا۔

"امائمہ کا بھائی کسی لونیٹک اسائلم میں نہیں تھا، بلکہ 2000ء میں یوکے آگیا تھا اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ وہ ذہنی طور پر صحت مند نہیں تھا۔ اس کا علاج بھی ہو تا رہا تھا، لیکن اس کی وجہ کوئی لڑکی نہیں تھی یا کوئی افیئر وغیرہ کا معاملہ نہیں تھا، جیسا کہ ہمیں بہروز بھائی نے بتایا تھا۔ دراصل انکل آفاق ابتدا سے ہی اپنے بیٹے کے لیے بہت سخت گیر باپ تھے اور پڑھائی کو لے کر مار پیٹ کرتے رہتے تھے۔ حالانکہ بقول امائمہ کے اس کا بھائی ایک بہت ہی آوٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ تھا، لیکن انکل کے سخت تشدد اور ابنارمل رویے نے اسے مکمل طور پر پھلنے پھولنے ہی نہیں دیا۔ ایک بار اس کا اپنے اکیڈمی فیلوز کے ساتھ جھگڑا ہو گیا جسے بلاوجہ یہ رنگ دیا گیا کہ اس کا شاید کسی لڑکی سے افیئر تھا۔ باپ کی حیثیت سے جب انکل آفاق کو اس جھگڑے اور اس جھگڑے کے محرک کا پتا چلا تو انہوں نے عادت کے مطابق اس پر کافی تشدد کیا۔ پہلا پینک اٹیک اس کو تب ہی ہوا تھا۔ آسان اور مختصر لفظوں میں بیان کروں تو انکل آفاق کا رویہ بیٹے کے ساتھ نہایت نامناسب تھا اور اس کی ذہنی مخدوش حالت کی وجہ بھی یہ ہی رویہ تھا۔ اس واقعہ کے بعد سے حالات مزید بگڑ گئے شاید اس کو پینک اٹیکس بھی ہوتے تھے اور وہ انگزائیٹی کا مریض بھی تھا۔ اس کا علاج چلتا ہی رہتا تھا۔ اسی وجہ سے آنٹی روبینہ نے اپنے بھائی کے کہنے پر اسے ان کے ساتھ یوکے بھجوا دیا تھا۔ وہ روچڈیل میں رہتے تھے اور انہیں بھی اپنی آزاد اور روش والی بیٹی کے لیے ایک کھونٹا چاہیے تھا۔ اسی لیے انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی اس کے ساتھ کر دی، لیکن یہ شادی زیادہ دیر نہیں چلی تھی۔ اس لڑکی کا کسی سفید فام عیسائی کے ساتھ افیئر تھا جو اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا اور تب وہ پریگننٹ تھی۔ وہ لڑکی نور محمد کے ساتھ شادی پر خوش نہیں تھی اور صرف زمانے کو دکھانے کے لیے اس نے یہ سرسری سا رشتہ قائم کیا تھا، لیکن کچھ عرصہ بعد مطلب نکلنے کے بعد نور محمد، ماموں، ممانی کو کھٹکنے لگا تھا۔ وہ چاہتے تھے تو نور محمد واپس چلا جائے۔ سو انہوں نے حالات کو اس کے لیے اس نہج پر موڑنا شروع کیا، لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نور محمد کی ذہنی حالت مزید بگڑ گئی۔ وہ لیول اے شیزوفرینک ہو گیا تھا۔ اس لیے امائمہ کے ماموں نے اسے بلیک برن کسی بحالی سینٹر بھجوا دیا۔" عمر نے چیدہ چیدہ سب ہی بتا دیا تھا۔

"یہ تو بہت عجیب باتیں بتا رہے ہو تم۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی فلم کی کہانی سنا رہے ہو۔" شہوز کو اس مرحلے پر واقعی کچھ دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ عمر

نے اپنے کافی کے مگ پر بنے جھاگ کو دیکھا' پھر اسے ہٹانے کے لیے پھونک ماری تھی۔

"فلمی کہانی ابھی کہاں۔ اصل فلمی کہانی تو ابھی باقی ہے۔" کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"امائمہ کا بھائی بلیک برن سے کہیں غائب ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں وہ وہیں کہیں ہے' لیکن کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ لوٹن چلا گیا تھا۔ تم نے شاید کبھی لوٹن کے بارے میں سنا ہو۔ لوٹن ایسے علاقے کے طور پر شہرت رکھتا ہے جہاں مسلم آبادی زیادہ ہے' لیکن یہاں مسائل بھی زیادہ ہیں۔۔۔ یہاں غیر قانونی طور مقیم بیچلرز زیادہ ہیں۔ یہاں کے بارے میں اکثر خبریں آتی رہتی ہیں' جو زیادہ حوصلہ افزا اور مثبت نہیں ہوتیں۔ اس کے علاوہ اس کے متعلق مزید کوئی خیر خبر نہیں ہے۔ امائمہ کے ماموں تو اس کے متعلق بات نہیں کرتے۔ ان لوگوں کے ٹرمز بھی آپس میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہ سب باتیں بھی کسی تیسرے رشتہ دار کے ذریعہ امائمہ لوگوں کو پتا چلی تھیں۔ انکل آفاق ویسے ہی اس معاملے میں دلچسپی نہیں لیتے۔ وہ گویا بیٹے سے دست بردار ہو چکے ہیں' لیکن آنٹی اپنے بیٹے سے ملنا چاہتی ہیں اور ظاہر ہے امائمہ کے دل میں بھی بھائی سے ملنے کی خواہش ہے اور مسئلہ یہ ہے کہ اس کے بارے میں مزید کچھ پتا نہیں ہے۔ امائمہ کے پاس صرف ایک فون نمبر تھا جو اس شخص کا تھا جو اس کے بھائی کو روچڈیل سے بلیک برن لایا تھا' لیکن وہ نمبر بھی رسپانڈنگ نہیں رہا اب۔"

"عمر! کیا پتا۔۔۔ وہ زندہ نہ ہو۔۔۔ میرا مطلب اتنے سالوں سے غائب ہے تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" شہوز نے کندھے اچکا کر خدشہ ظاہر کیا تھا۔

"یہ بات میرے ذہن میں بھی آئی تو تھی' لیکن میں اس نہج پر سوچنا نہیں چاہتا۔ ایسے سوچنے کا مطلب ہو گا شکست تسلیم کر لینا جو کہ میں نہیں کرنا چاہتا۔ میں پوری انرجی کے ساتھ یہ سوچ کر اسے تلاش کر رہا ہوں کہ وہ زندہ سلامت اور ٹھیک ٹھاک ہے اور یہ بات تم امائمہ کے سامنے بھول کر بھی مت کہنا۔۔۔ وہ اپنے بھائی سے ملنے کے لیے بے تاب ہے۔" عمر نے کہا تھا۔

"یہ تو فطری سی بات ہے۔۔۔ خونی رشتے مقناطیس کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کے حصار سے نکلنا آسان تھوڑی ہوتا ہے۔" شہوز نے بھی اپنا مگ سنبھالا تھا۔

"یہ ہی تو بات ہے۔ آنٹی کے بارے میں سوچتا ہوں تو دل بہت دکھتا ہے۔ سوچ یار! کہیں ادھر ادھر ہوں تو ہماری مائیں کیسے بے چین ہو جاتی ہیں۔ میں اب ممی سے الگ رہتا ہوں' لیکن روز یہاں آتا ہوں۔ ایک دن نہ آؤں تو ممی بے چین ہو کر فون کرتی ہیں کہ کہیں میری طبیعت تو خراب نہیں ہے یا کوئی پریشانی تو نہیں ہے۔"

عمر کے لہجے میں تاسف تھا۔ شہوز نے سر ہلایا۔ اس کی ممی بھی اس کے کراچی جانے کے بعد سے اسی طرح بے چین رہنے لگی تھیں' لیکن وہ ان کا مذاق اڑایا کرتا تھا کہ ممی آپ تو جذباتی ہی ہو جاتی ہیں۔

عمر کے لہجے میں اپنی ممی اور پھر اپنی ساس کے لیے اس قدر محبت اور پریشانی دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی تھی۔ وہ جس دن سے آیا تھا عمر کے رویے میں اسے عجیب سی تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ پہلے جیسا غیر ذمہ دار اور لاپروا نہیں رہا تھا' بلکہ کافی سمجھ دار لگنے لگا تھا۔ شادی اس کی شخصیت میں ایک مثبت تبدیلی لائی تھی جو واضح محسوس ہوتی تھی۔

"میری دلی خواہش ہے کہ نور محمد کا جلد از جلد کچھ پتا چل جائے' تاکہ آنٹی روبینہ کا انتظار ختم ہو۔ ان کے بارے میں سوچ کر میرے دل کو کچھ ہوتا ہے شہوز۔۔۔ اولاد کے دکھ پیرا سائٹ ہوتے ہیں۔ یہ والدین کو اندر ہی اندر ختم کر دیتے ہیں۔۔۔ مجھے جس دن سے یہ ساری تفصیل پتا چلی ہے نا آنٹی روبینہ کا چہرہ نظروں کے سامنے گھومتا رہتا ہے۔ ان کو دیکھ کر پہلا خیال یہ ہی آتا تھا میرے ذہن میں کہ یہ میری ممی کی طرح مطمئن اور پرسکون کیوں نہیں لگتیں۔ ان کے پورے وجود سے بے چینی کیوں جھلکتی نظر آتی ہے۔ ایک ہی ان کی بیٹی ہے۔ مالی مشکل بھی نہیں ہے۔ تو پھر ایسا کیا

ہے جو ان کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ اب جا کر اس راز سے پردہ اٹھا ہے۔ تو یقین کرو ان پر ترس آتا ہے۔ اللہ کسی ماں کو ایسی مشکل میں نہ ڈالے۔"

وہ کافی ختم کر چکا تھا۔ شہوز کی کافی ابھی بھی مگ میں موجود تھی۔ وہ عمر کا چہرہ تکنے میں مگن تھا۔ عمر کی آنکھوں کے گوشے نم لگتے تھے۔ شہوز اس عمر سے تو واقف ہی نہیں تھا، جس کا دل اتنا حساس تھا کہ کسی اور کے دکھ اس کی آنکھوں کو نم کر دیتے تھے۔ وہ کسی تیسرے انسان کے لیے پریشان ہو سکتا تھا۔ شہوز اس کے رویے پر حیران ہو گیا تھا۔

"تم مجھے ایسے کیوں گھور رہے ہو۔ کیا پہلے کوئی خوبرو آدمی نہیں دیکھا اور اب دیکھ ہی لیا ہے تو کیا دیکھتے ہی چلے جاؤ گے۔"

وہ اس کی نظروں سے خائف ہو کر نیم مزاحیہ انداز میں بولا تھا، تاکہ اپنی کیفیت پر قابو پا سکے۔

"میں یہ سوچ رہا تھا کہ تم پہلے والے عمر نہیں رہے؟" شہوز نے ٹھنڈی کافی کا پہلا گھونٹ بھرا تھا۔ ٹھنڈی ہو جانے کے باعث وہ اسے بدمزا لگی۔

"کیا بہت برا لگ رہا ہوں؟" عمر نے نیم سنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔" شہوز نے اتنا کہہ کر ایک اور گھونٹ بھرا، پھر لہجے میں قطعیت بھر کر بولا۔ "بہت ذمہ دار لگ رہے ہو۔۔۔ اچھے بیٹے۔۔۔ اچھے شوہر۔۔۔ اچھے بھائی۔"

"میں پہلے بھی ایسا ہی تھا۔۔۔ اچھا بھائی، اچھا بیٹا۔۔۔ اچھا شوہر۔ یعنی ایک ٹکٹ میں تین تین مزے، فل پیکج۔" وہ سنجیدہ نہیں تھا۔

"نہیں، پہلے تمہاری طبیعت میں بچپنا تھا جو اب یک دم غائب ہو گیا ہے۔" شہوز نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی تھی۔

"طبیعت میں بچپنا نہیں تھا۔ میں خود بچپن میں تھا۔ چھوٹا تھا۔ ضد اور جذباتیت تھی مزاج میں۔۔۔ اب خیر سے خود باپ بننے والا ہوں تو ذمہ داری تو آنی تھی

نا۔" اس نے ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں کہا تھا، پھر شہوز کو خوش دیکھ کر بولا۔

"یہ سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ انسانی فطرت ہے۔ اس میں ٹھہراؤ وقت کے ساتھ ہی آتا ہے۔"

اس نے سرسری سے انداز میں کہا، جیسے وہ اپنی بدلتی ہوئی طبیعت سے خود بھی واقف تھا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ انسان وقت کے ساتھ سمجھ دار ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ انسان پیدا ہی سمجھ دار ہوتے ہیں جیسے کہ "میں" شہوز منور۔" وہ آنکھیں گھماتے ہوئے بولا تھا۔

"ہاں جیسے کہ تم سمجھ دار۔۔۔ خوش فہم۔۔۔ خود پسند۔۔۔ اور۔۔۔" عمر کا انداز بھی اس جیسا ہی تھا۔ شہوز نے اس کی بات کاٹی۔

"اور۔۔۔ خوش لباس۔۔۔ خوش ذوق۔۔۔ خوددار۔۔۔ اور۔۔۔" اب کی بار عمر نے اس کی بات کاٹی تھی۔

"اور خود بخود بھی۔۔۔ آٹومیٹک۔۔۔ یعنی کسی کے پوچھنے کہنے سے پہلے ہی اپنی تعریف میں مسلسل بجنے والا باجا۔۔۔ چھچھورا۔۔۔" عمر اسے چڑا رہا تھا۔ شہوز نے شرارتی انداز میں اسے گھورا تھا، پھر بولا "خود بخود نہیں۔۔۔ اسے کہتے ہیں خود شناس۔۔۔ خود آگاہ۔

________ شہوز نے اس کی تشریح پر پاس پڑا کشن اسے کھینچ کر مارا تھا۔ وہ گفتگو جو انتہائی سنجیدگی سے شروع ہوئی تھی بالآخر کسی منطقی لائحہ کو طے کیے بنا ختم ہوتی نظر آ رہی تھی۔



"تم نے آگے کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" آنٹی رافعہ نے اس کے آگے چائے کا کپ رکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

اس کا کلینک باقاعدہ شروع ہو چکا تھا۔ ہر کام اس کی توقع سے زیادہ تیزی سے اور بہترین طریقے سے انجام پایا تھا۔ وہ ہفتے میں دو دن جمعہ، ہفتہ کے لیے دس بجے سے چھ بجے تک کلینک پر رہی تھی۔ اتوار کو فی الحال

چھٹی ہی طے کی گئی تھی۔ اس نے ایک نرس بھی اپنے پرانے اسٹاف میں سے یہاں کے لیے مزید تنخواہ دے کر رکھ لی تھی اور ایک عدد ریسپشنسٹ آنٹی رافعہ نے اپنے سلائی والے اسکول کی لڑکیوں میں سے چن کر منتخب کی تھی۔ سب کچھ اس کی خواہش کے مطابق ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا۔ ابھی تک جو دو دن گزرے تھے وہ تو بے حد مصروفیت والے تھے۔

اس کا خیال تھا کہ یہ کوئی بہت ہی پسماندہ علاقہ ہے تو آنے والی عورتیں سادہ، کم پڑھی لکھی اور دیہاتی ہوں گی، لیکن ایسا نہیں تھا وہ اتنا پسماندہ علاقہ بھی نہیں تھا جیسا زارا نے سوچ رکھا تھا۔ آنے والی زیادہ تر عورتیں پڑھی لکھی اور کھاتے پیتے گھروں سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ آنٹی رافعہ نے پبلسٹی کا ذمہ اپنے سر لے رکھا تھا اور ابتدا میں کنسلٹیشن فیس بہت ہی کم رکھی گئی تھی تو عورتوں کی جانب سے رسپانس اچھا مل گیا تھا اور زارا کو یہ مصروفیت اچھی لگ رہی تھی۔ جمعہ کی وجہ سے آنٹی رافعہ کا اپنا اسکول جلدی بند ہو گیا تھا۔ وہ گھر پر ہی تھیں اس لیے انہوں نے زارا کو اپنے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے بلایا تھا، لیکن ٹیپو گھر پر موجود نہیں تھا۔ وہ آج کل کافی مصروف رہنے لگا تھا۔ کھانا کھا کر وہ چائے پینے بیٹھی تھیں۔

"شادی کب کرو گی؟" وہ اسے خاموش پا کر مزید پوچھ رہی تھیں۔

اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی، لیکن فوراً" سمجھ میں نہیں آیا کہ جواب کیا دے۔ گزشتہ ایک سال وہ شادی کے متعلق بہت سنجیدگی سے سوچتی رہی تھی۔ اس مسئلے کے لیے پریشان رہی تھی، لیکن اب اس نے اس مسئلے پر سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ یہ واقعی اس کے اختیار کی بات نہیں تھی۔

"خدارا اب یہ گھسا پٹا جملہ مت بولنا کہ شادی ایک جوا ہے۔ شادی جوا نہیں ہوتی۔ جوا ہوتی تو سنت نہ ہوتی۔ اس لیے سنجیدگی سے جواب دو کہ شادی کے متعلق کیا سوچا ہے۔" انہوں نے اپنا کپ تھاما تھا اور اس کے سامنے بیٹھ گئی تھیں۔

"ابھی نہیں۔۔۔ چند سال بعد سوچوں گی۔" اس نے گھونٹ بھرا تھا۔

"ویسے تو یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے زارا۔ لیکن میں چونکہ زندگی بھر استاد رہی ہوں، اس لیے اچھی بات بتانے سے رہ نہیں سکتی۔۔۔ شادی مناسب وقت پر ہی اچھی لگتی ہے۔ تم خود ایک ڈاکٹر ہو۔ تم سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ بیس سے پینتیس سال کی عمر بچے پیدا کرنے کے لیے مناسب ترین عمر ہوتی ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے اس عمر میں شادی ہو جانی چاہیے۔"

"اس عمر میں کون کرتا ہے آج کل شادی۔۔۔ یہ عمر تو ابھی کھیلنے کودنے کی ہوتی ہے۔" اس نے ان کی بات کے وزن کو کم کرنے کے لیے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

آنٹی نے اس کی جانب آنکھ ترچھی کر کے دیکھا۔

"ارے بی بی! آج کل بچیوں کو کھیلنے کودنے بھی کون دیتا ہے۔۔۔ پانچ سال کی عمر سے جو موٹی موٹی کتابیں دے کر بٹھاتے ہیں تو تیس تیس سال تک بس اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں دھکے ہی کھاتی رہتی ہیں۔ کمپیوٹرز میں سر کھپا رہی ہیں، موٹی موٹی اسائنمنٹ میں صحت خراب کر رہی ہیں۔ بسوں، رکشوں میں خرچ ہوئی جا رہی ہیں۔۔۔ ایم اے۔۔۔ ایم ایس۔۔۔ ایم فل۔۔۔ پی ایچ ڈی۔۔۔ ہمیں تو نام لینے میں ہی تھکن ہو جاتی ہے۔ خون چوسنے والی اس پڑھائی سے زیادہ بڑی ذمہ داری ہے کوئی آج کل۔" انہوں نے اس انداز میں منہ بنا کر کہا کہ زارا کو ہنسی آ گئی۔

"آپ لڑکیوں کی اعلا تعلیم کے خلاف ہیں کیا؟" اس نے وہی سوال پوچھا جو سب سے پہلے ذہن میں آیا تھا۔

"نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔۔۔ میں تعلیم کے خلاف نہیں ہوں۔۔۔ کوئی بھی تعلیم کے خلاف کیسے ہو سکتا ہے۔" انہوں نے قطعیت سے کہا تھا، پھر مزید اضافہ کرتے ہوئے بولی تھیں۔

"میں تعلیم کی اس بے مقصدیت کے خلاف ہوں

جو آج کل رائج ہوتی جارہی ہے۔ تعلیم آج کل ڈگریوں کے پلندے کا نام بن کر رہ گئی ہے۔ علم محدود ہوتا جارہا ہے۔ بچے بچیاں علم نہیں حاصل کررہے' بلکہ جیسے کسی دوڑ میں گھوڑے بنے دوڑے چلے جارہے ہیں اور ہاتھ پھر بھی کچھ نہیں آرہا۔ ہم نے اتنا بے ذائقہ علم پہلے کبھی نہیں چکھا تھا۔ میں تمہیں اپنی مثال دیتی ہوں۔ جب میں نے بی اے کیا تو میرا شمار انتہائی پڑھی لکھی لڑکی کے طور پر ہونے لگا تھا۔ یہ 75 کی بات ہے۔ جب بی اے کیا تو میں اپنے سارے آس پاس کے گھروں اور رشتے داروں کی منظور نظر ہوگئی تھی۔ کسی کو خط لکھنا ہوتا تھا' کوئی فارم بھرنا ہوتا تھا یا کوئی درخواست لکھنی ہوتی تھی تو سب میرے پاس آتے تھے۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ رافعہ بی بی بہت سیانی لڑکی ہے۔ جو شہر سے پڑھ کر آئی ہے' تم یقین نہیں کرو گی' لیکن اس وقت میں اپنی فیملی کی اس علاقے کی پہلی لڑکی تھی جو ہاسٹل میں رہ کر کالج تک پڑھ کر آئی تھی۔ میں نے اتنی درخواستیں اور خط لکھے ہیں کہ گننے بیٹھو تو ہزاروں نا سہی سیکڑوں تو ضرور ہوجائیں گے اور اب اکیسویں صدی میں یہ حال ہے کہ میرے آس پاس کے ہر گھر میں تین تین' چار چار افراد ہیں جو گریجویٹ ہیں۔ میرے پاس ایک وقت میں چودہ لڑکیاں پڑھنے آتی ہیں جو بی اے کررہی ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی کالج میں درخواست لکھنے کے لیے کہہ دو نا تو تیرہ لڑکیاں پرنسپل کی اسپلنگ ہی نہیں لکھ پائیں گی اور وہ جو ایک لکھ کے لائے گی وہ بھی پرنسپل کے اسپلنگ میں "اے" کے بجائے "ای" لکھ دے گی۔" انہوں نے تلخی بھرے لہجے میں کہا تھا' پھر گفتگو میں اس کا انہماک محسوس کرکے بات جاری رکھتے ہوئے بولیں۔

"یہ ابھی اسی سال کی بات ہے مجھے اپنی پنشن کے سلسلے میں کچھ کام تھے تو لاہور جانا پڑا۔ واپسی میں کچھ بچیوں نے کتابیں منگوائی تھیں' وہ خریدنے کے لیے لبرٹی چلی گئی۔ بک اسٹور پر ایک لڑکی کتابیں خرید رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں "شہاب نامہ" تھا۔ میں بہت خوش ہوئی۔ میری بہت پسندیدہ کتاب ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے یہ کتاب ہی کیوں خریدی۔ میرے ذہن میں تھا وہ تعریف کرے گی کتاب کی اور لکھنے والے کی۔۔۔ میں بھی چار جملے بول کر خوش ہولوں گی۔۔۔ کتابیں پڑھنے والوں کو ایک بیماری ہوتی ہے۔ اپنی پسندیدہ کتاب کے بارے میں اپنی من چاہی اولاد کی طرح ہر وقت بات کرنا پسند کرتے ہیں۔ اسی لیے میں اس لڑکی کے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر مچل سی گئی تھی۔ وہ محترمہ بولیں۔" میں دراصل سی ایس ایس کی تیاری کررہی ہوں تو موٹی موٹی مشہور کتابیں خرید رہی ہوں۔ ان میں سے بھی کچھ یاد کرلوں گی۔ کیا پتا پیپر زیا انٹرویو میں ان میں سے بھی کچھ آجائے۔ اف مت پوچھو۔ مجھے کتنا غصہ آیا۔۔۔ یہ ہے آج کل تعلیم کا معیار' لیکن یہ تعلیم نہیں ہے۔ یہ تعلیم کی ناقدری ہے۔ ایسی تعلیم کی میں حامی نہیں ہوں۔" ان کے چہرے سے ناپسندیدگی جھلکنے لگی۔

"تم میری بات سے اتفاق کرو یا نہ کرو' لیکن آج کل تعلیم حاصل کرنے کا شوق اور لگن اتنی نہیں ہے جتنی کہ پہلے ہوا کرتی تھی۔ تعلیم کی لگن اور شوق بہت کم لوگوں کو ہے۔ آج کل یہ شعور حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کی جارہی ہے۔ میں ایسی تعلیم کے حق میں نہیں ہوں جو صرف ڈگریوں کا انبار جمع کرنے کی خاطر' ملازمت میں پروموشن یا تنخواہ میں انکریمنٹ کی خاطر یا پھر اچھے رشتے کے لالچ میں کی جائے۔ مجھے تھکا دینے والی چیزوں سے شروع سے الجھن رہی ہے۔ ایسی بے مقصد تعلیم جس میں شوق یا لگن کا کوئی عنصر شامل نہیں' تھکن کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ یہ عورتوں کو کمزور کررہی ہے اور اس کا فائدہ صرف فارماسیوٹیکل کمپنیوں کو ہورہا ہے۔ ایک ایک بچہ پیدا ہوتے ہی آج کل کی بچیوں کے گھٹنے جواب دے جاتے ہیں۔ کمر کا درد ہر تیسری لڑکی کا مسئلہ ہے۔ طاقت کی دوائیاں کھا کھا کر لڑکیوں کے بدن اور فارماسیوٹیکل کمپنیوں کے بینک اکاؤنٹس پھولتے جارہے ہیں۔

ہم نے ایک بڑا ظلم کیا ہے۔ ہم نے اپنی بچیوں کو سکھادیا ہے کہ تم ڈگریوں کے ڈھیر نہیں لگاؤ گی تو تمہیں اچھا رشتہ نہیں ملے گا۔ اچھی جاب نہیں ملے گی' اچھا رتبہ نہیں ملے گا۔ "اچھی عورت" کی ایسی ایسی نایاب تعریفیں رائج کردی گئی ہیں کہ اب لڑکی بے چاری کو اچھا بننے کے لیے بڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔ پہلے اچھا طالب علم بننے کے لیے جی جان سے محنت کرتی ہے' پھر اچھی بیٹی' بیوی' بہو بننے کے لیے اپنا آپ خرچتی ہے' کیونکہ وہ پڑھ لکھ جائے تب بھی گھر اور گھر کی ذمہ داریاں اسے ہی اٹھانی ہوتی ہیں۔ اور وہ اس فکر میں گھلنے لگتی ہے کہ ہر کام میں سلیقہ اور جدت لاسکے' ورنہ فورا" طعنہ دے دیا جاتا ہے کہ ایسی تعلیم کا فائدہ جب سیب کی بطخ اور گاجر کے پھول سلاد میں رکھنے کے لیے نہ بنائے آسکیں۔ اس معاشرے کو عورت کی لاتعداد ورائٹی چاہیے۔ اچھی بیٹی' اچھی طالب علم' اچھی ڈاکٹر' اچھی انجینئر' اچھی باورچن' اچھی دھوبن۔۔۔ وہ بھی کولہو کے بیل کی طرح سب کرتی جاتی ہے اور جب اچھی ماں بننے کی باری آتی ہے تو وہ اتنا تھک چکی ہوتی ہے کہ دن انگلیوں پر گنتی ہے کہ بچہ تین سال کا ہو تو اسے کنڈر گارٹن میں ڈال کر پھر سے اچھی عورت ہونے کا ثبوت دے سکے' لیکن سچ پوچھو تو تب اسے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ جن کے لیے اسے اچھا بہت اچھا ہونا چاہیے تھا۔ وہ ان کے لیے ویسی اچھی نہیں ہو پارہی۔ میں جانتی ہوں تم اور بہت سی بچیاں میری بات سے متفق نہیں ہوگی' لیکن میں پھر بھی کہتی رہوں گی کہ اس ملک کا المیہ ہے کہ یہاں کی عورت تو طاقت ور ہو گئی ہے' لیکن وہ ایک کمزور ماں بن چکی ہے۔ ماں کو کمزور نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ماں کسی بھی ریاست کا انرجائزر ہوتی ہے۔ یہ طاقت ہوتی ہے۔ یہ ہی سب سے بڑی ذمہ داری بھی ہے۔ میں اس لیے لڑکیوں کی مناسب وقت پر شادی کی حامی ہوں۔ انہوں نے اولاد پیدا ہی نہیں کرنی ہوتی۔ اسے پالنا بھی ہوتا ہے۔ اس کی تربیت کرنی ہوتی ہے۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے بچے۔ ماں کے قدموں تلے جنت کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ بچہ پیدا کرلیا' تکلیف سہ لی تو جنت مل جائے گی۔ بچہ تو ہر ماں پیدا کرلیتی ہے۔ تکلیف تو بندریا' گھوڑی یا بھینس کو بھی ہوتی ہوگی۔ ماں کے قدموں تلے جنت کا مطلب جو مجھے سمجھ میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ بچہ ماں کی گود سے اتر کر پاؤں پاؤں چلنا سیکھتا ہے۔ یہ ماں کے قدم ہیں۔ اس کی پیروی ہے' اس کی پیش قدمی ہے' جو بچے کو جنت کا راستہ دکھاسکتی ہے' جو صرف درد زہ سہ کر نہیں حاصل ہونے والی۔ اصل مشقت تو اس تربیت کی ہے' جو ماں کی اولین ذمہ داری ہوتی ہے۔" انہوں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"اس لیے تو ماں کا درجہ بہت بلند ہے۔ اس سے بہت احسن کام لینے ہوتے ہیں اللہ کی ذات نے۔ بہرحال میں تمہیں نصیحتیں کرکر کے بے زار نہیں کرنا چاہتی۔۔ میں تو صرف ایک مشورہ دے رہی تھی۔۔ تم خود ایک ڈاکٹر ہو۔۔ ہر اچھی بری چیز بہتر سمجھتی ہو۔ اس لیے اب پڑھ لکھ چکی ہو' جو کرنا تھا کررہی ہو' اللہ تمہیں اس میں کامیابی دے' لیکن آئندہ کے متعلق بھی سوچو۔"

وہ اس کے ہاتھ سے خالی کپ پکڑتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھی تھیں۔

"آنٹی! آپ بہت ذہین ہیں۔ آپ کی باتیں سن کر مجھے ہمیشہ بہت موٹی ویشن ملتی ہے۔ میں بہت متاثر ہوتی ہوں۔ اللہ نے آپ کو بہت فہم و فراست دی ہے۔" اس نے انہیں دل سے سراہا تھا۔ وہ ایک دم ہنس دیں۔

"ذہین نہیں ہوں' نقل چور ہوں۔ ادھر ادھر سے کتابیں پڑھ کر لوگوں کے سامنے خود کو عقل مند ثابت کرنے کے لیے لیکچر دیتی رہتی ہوں۔" وہ مسکرائی تھیں۔

"یہ ہی بات جب میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ نقل چور ہیں تو آپ برا مان جاتی ہیں۔" یہ ٹیپو کی آواز تھی جو صحن سے آئی تھی۔ وہ صحن میں لگے واش بیسن کے پاس کھڑا تھا۔ آواز سے ابھی بھی نیند کے اثرات

چھلک رہے تھے۔

"اٹھ گئے تم۔" آنٹی رافعہ نے اس کو محبت سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"کیسی ہیں آپ ڈاکٹر زارا... سب کام ٹھیک چل رہا ہے نا۔" وہیں کھڑا ہوا پوچھ رہا تھا۔ زارا کا جواب سننے سے پہلے ہی اس نے منہ دھونا شروع کر دیا تھا۔ زارا نے بھی اپنی چیزیں سمیٹیں۔ وہ نہیں جانتی تھی ٹیپو گھر میں موجود ہے۔ وہ نظر نہیں آیا تھا' سو اس نے یہ ہی سوچا تھا کہ باہر ہوگا۔

"میں زارا سے پوچھ رہی تھی کہ اس کا شادی کا کب تک ارادہ ہے... یہ کہہ رہی..." وہ نہ جانے کیا کہنے والی تھیں۔ ٹیپو نے ان کی بات کاٹ دی۔

"ناشتا بنائیں امی... ابھی کوئی نصیحت سننے کا موڈ نہیں ہو رہا... میرے دماغ کے سب سگنلز بھوک کی وجہ سے کام نہیں کر رہے۔" وہ پانی کے چھینٹے مار رہا تھا منہ پر۔

"تم نیٹ ورک تبدیل کر لو برخوردار... تمہارے سگنلز کام کی باتوں پر ہمیشہ ہی ایسا بھونڈا رسپانس کرتے ہیں۔"

زارا نے کچن کی جانب جاتی ہوئی آنٹی رافعہ کی چڑی ہوئی آواز سنی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ماں' بیٹے کے درمیان سینڈوچ بننے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس کا۔ وہ مسکرائی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔



"یہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہوا۔" بل گرانٹ نے اس کی پیشانی پر ایک اور بینڈیج لگائی تھی۔ سلمان نے بدقت اپنے درد پر قابو پایا۔ نور محمد نے وار اس پر عقب سے کیا تھا' لیکن وہ فرش پر اس رخ سے گرا تھا کہ اس کا چہرہ اور پیشانی فرش سے ٹکرائی تھی۔ اس کمزور نظر آنے والے نور محمد میں نہ جانے اتنی طاقت کیسے آگئی تھی کہ اس کی لگائی گئی ایک ضرب نے ہی اس کے ہاتھوں کے طوطے چڑیاں سب اڑا دیے تھے۔ وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گیا تھا اور یہ ہی حال بل گرانٹ عرف احمد معروف کا ہوا تھا' لیکن وہ ہوش میں پہلے آیا تھا اور اب سلمان کی مرہم پٹی بھی وہی کر رہا تھا۔ اضطراب' بے چینی ان کے ہر عمل سے مترشح تھی۔

"سب کچھ ہی اگر ٹھیک ہونے لگے تو زندگی جامد ہو کر رہ جائے۔ اس لیے کبھی کبھی کچھ ٹھیک نہ ہونا ہی ٹھیک ہوتا ہے۔" سلمان نے اسے تسلی دینی چاہی تھی۔ اسے بولنے میں تکلیف کا سامنا تھا جو اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا۔ بل گرانٹ نے آخری بینڈیج لگا کر فرسٹ ایڈ باکس بند کر دیا تھا۔

"میں تمہارے لیے کافی لے کر آتا ہوں۔" وہ کوئی بھی جواب دیے بنا باہر نکل گیا تھا۔ سلمان وہیں بیٹھنے کے بجائے اس کے ہمراہ ہی آگیا تھا۔ نور محمد کے گھر سے اس طرح چلے جانے کے عمل نے اسے بھی حیران کیا تھا۔ وہ بل گرانٹ کی الماری سے اس کا بیگ ہمراہ لے گیا تھا اور اس نے اس کے لیے الماری پر ایک اسٹیکر نوٹ بھی چسپاں کیا تھا جس پر صرف ایک جملہ تحریر تھا۔

"آپ اچھے انسان نہیں ہیں احمد معروف۔" اس نوٹ کو دیکھ کر وہ مزید بے چین ہو گیا تھا۔

"آپ کیوں پریشان ہیں؟" سلمان نے کچن شیلف کے سامنے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"آپ پریشان کیوں نہیں ہیں؟" وہ اکتائے ہوئے انداز میں اس سے پوچھنے لگا۔

"آپ خود ہی تو کہتے ہیں' وہ بہت اچھا اور نیک انسان ہے تو پھر اس کے اس طرح چلے جانے پر پریشان ہونے کا کوئی جواز تو نہیں بنتا... وہ کچھ دیر میں واپس آجائے گا۔" سلمان نے تسلی دینی چاہی۔

"پریشان ہونے کا جواز تو ہے... آپ سمجھ ہی نہیں رہے... وہ میرا بیگ بھی ہمراہ لے گیا ہے۔ نہ جانے کیا سوچ کر لے گیا ہے اور پھر اس طرح تشدد کرنے کی وجہ... میرا ذہن کچھ نہیں پا رہا کچھ بھی... اور آپ کا اس کے ساتھ جو تعلق تھا' وہ میری نسبت زیادہ مضبوط ہونا چاہیے۔ وہ آپ کا کلاس میٹ تھا۔ آپ کا ہم وطن' ہم زبان' ہم مذہب تھا۔ رات کے اس پہر وہ گھر

سے ناراض ہو کر کہیں چلا گیا ہے۔ پریشانی تو جائز ہے' جبکہ آپ جانتے ہیں کہ وہ آپ کی باتوں سے خائف ہو کر گیا ہے۔" اس نے جتا کر کہا تھا۔

"وہ میری باتوں سے نہیں آپ کی باتوں سے خائف ہو کر گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے اس نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔ اسے آپ کے متعلق سب کچھ پتا چل گیا ہے۔ اس کے لیے یہ ہی دھچکا نا قابل برداشت ثابت ہوا ہو گا کہ آپ مسلمان نہیں ہیں۔ اسی لیے وہ جو بیگ لے گیا ہے اس میں یقیناً" آپ کے ناول کا مسودہ ہو گا۔ یعنی اگر کوئی شخص اس ساری صورت حال کا ذمہ دار ہے تو وہ آپ ہیں۔"

سلمان نے بھی اسی انداز میں جتا کر کہا تھا۔ بل گرانٹ کچھ نہیں بولا۔ وہ کیا سوچ رہا تھا اس کے چہرے سے پتا لگانا مشکل تھا۔ سلمان چند لمحے اس کی جانب دیکھتا رہا۔

"میں اعتراف کرلیتا ہوں کہ آپ نے سر توڑ محنت کر کے میرے بارے میں جو بھی معلومات اکٹھی کی ہیں۔ وہ سو فیصد غلط نہیں ہیں' لیکن آپ نے نور محمد کو پہچاننے میں سخت غلطی ہے۔ وہ ایسا انسان نہیں ہے جیسا آپ سمجھ رہے ہیں۔" بل گرانٹ نے دھیمے سے لہجے میں کہا تھا۔

"آپ نور محمد کے بارے میں اتنا کچھ کیسے جانتے ہیں اور آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جو آپ جانتے ہیں وہی سچ ہے۔ میرے پاس بھی جو معلومات ہیں' وہ انتہائی مستند ذرائع سے حاصل کی گئی ہیں۔ یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ میں نے بذات خود جس شخص سے بھی نور محمد کے متعلق پوچھا ہے اس کے منہ سے ایک بھی برا لفظ سننے کو نہیں ملا۔ میرے سب ہی ذاتی ذرائع بھی ان معلومات سے مماثل نہیں ہیں' لیکن بہر حال ایک برطانوی این جی او کے پاس اگر کسی کے متعلق کوئی مواد ہے تو وہ ایک دم سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

سلمان کے لیے یہ سوال واقعی بہت اہم تھا۔ وہ ہر حال میں اس سوال کا جواب چاہتا تھا۔ اس نے تمام تر باتیں جو اس کے پاس ریکارڈ کی صورت موجود تھیں۔

وہ باتیں جو اس نے ایک بوڑھے پروفیسر آفاق علی کے منہ سے سنی تھیں۔ وہ باتیں جو روچڈیل میں رہنے والے ایک کاری گر نے بتائی تھیں اور وہ باتیں جو وہ خود اس کے متعلق جانتا تھا ایک ایک کر کے اس سے کہہ ڈالی تھیں۔ وہ خاموشی سے اس کے چپ ہو جانے کا انتظار کرتا رہا۔

"سلمان حیدر! آپ ابھی اس سمندر میں ایک چھوٹی مچھلی کی طرح ہیں۔ مچھلی بھی وہ جو گہرے پانی میں رہ نہیں سکتی۔ میں نے اس سمندر میں زندگی گزاری ہے۔ میں کنارے پر کھڑے ہو کر بھی گہرائی ملانے جتنا قابل ہو چکا ہوں۔ میں آپ کو یہ سارا نیٹ ورک کھول کر بتا سکتا ہوں' سمجھا سکتا ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں خود ایسے کام کرتا رہا ہوں۔ جھوٹ میں سچ کیسے ملایا جاتا ہے اور سچ کو کیسے جھوٹ ثابت کرتے ہیں' یہ مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ میرا نام بل گرانٹ ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے پہلے چار بیسٹ سیلرز ناول ایسے لکھے ہیں جیسے بچہ کلاس روم میں املا لکھتا ہے۔"

وہ ایسے بات کر رہا تھا جیسے خود کلامی کر رہا ہو۔

"میں آج آپ کے سامنے اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں فنڈز کے نام پر ایک خطیر رقم لے کر ناول لکھتا رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اپنے قلم کا غلط استعمال کیا ہے۔ میں نے اپنے زیادہ تر ناولز ایسے موضوعات پر لکھے جو کچھ مخصوص لوگوں یا قوموں کے فائدے کے لیے تھے۔ میں نے کبھی انسانیت کے متعلق نہیں سوچا' میں شہرت کے نشے میں اس قدر گم رہا کہ مجھے کبھی یہ سوچنے کا خیال ہی نہیں آیا کہ میں کوئی غلط کام کر رہا ہوں' حالانکہ مجھے زندگی میں ایسے بہت سے لوگ ملتے رہے جو مجھے سمجھاتے رہے کہ غلط اور صحیح میں فرق کر کے زندگی گزارنا ہی اصل زندگی ہے۔"

وہ خاموش ہو گیا تھا۔ پشیمانی اس کے ہر انداز سے جھلکنے لگی تھی۔ سلمان حیدر کو اپنی ہر چوٹ کا درد اس کی آنکھوں میں چھپے کرب کے آگے ہیچ محسوس ہوا۔

"بہر حال یہ میری زندگی کے متعلق بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔ میں آپ کو اس گورکھ دھندے کو

سمجھانے کی کوشش کررہا ہوں، جس کا شکار نور محمد ہوا ہے۔ اسے استعمال کیا گیا ہے۔ آپ کو میری باتیں عجیب نہیں لگنی چاہئیں۔ آپ ایک صحافی ہیں۔ آپ اس بات کو سب سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ کہ اپنی من پسند خبریں لگوانے کے لیے یا رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے سیاسی قوتیں یا دوسرے عناصر پانی کی طرح پیسہ بہاتے ہیں۔ دنیا بھر میں کسی ایک متنازعہ موضوع پر اتفاق رائے پیدا کرنے کی خاطر یہ انجانی قوتیں ہمیشہ متحرک رہتی ہیں۔ نور محمد ان ہی قوتوں کا شکار ہوا ہے۔ نور محمد کے متعلق مجھے سب سے پہلے صوفی سیف اللہ نے بتایا تھا۔ وہ نور محمد کو بہت پسند کرتے ہیں۔ یہ بات بھی انہوں نے مجھے کہی تھی کہ یہ بچہ یعنی نور محمد دین میں اس قدر گم ہے کہ اس کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ دنیا بھی کوئی چیز ہے۔ اس کے متعلق ہر بات مجھے ان سے پتا چلی تھی۔ وہ اسے کافی اچھے طریقے سے جانتے تھے۔ وہی چاہتے تھے کہ میں نور محمد کو سکھاؤں کہ دنیا سے لاتعلقی ممکن نہیں ہے۔ وہ ہی چاہتے تھے کہ نور محمد ایک بار اپنی ماں سے ضرور ملے۔ وہ کہتے تھے کہ مائیں بلکتی ہیں تو اللہ ناراض ہوتا ہے۔ ان ہی کے کہنے پر میں نور محمد سے ملنے یہاں آیا تھا، لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ مسٹر ٹیرن سے بھی مجھے نور محمد کے متعلق کافی باتیں پتا چلی تھیں۔ انہوں نے نور محمد کو "دہشت گرد" قرار دے دیا تھا اور وہ مجھ سے دہشت گردی کے موضوع پر ہی ناول لکھوانا چاہ رہے تھے۔ اس ناول میں مجھے ایسا مواد دیا جارہا تھا جس میں اسلامی روایات کی تذلیل کے علاوہ مقدس شخصیات کے متعلق تضحیک آمیز چیزیں بھی شامل تھیں۔ میں وضاحت کرتا چلوں کہ اس سب کے پیچھے ان ہی قوتوں کا ہاتھ ہے، جو "اسلام فوبیا" کو مغرب کا سب سے بڑا ناسور قرار دیتے ہیں۔ اس میں حکومتی اہلکار بھی شامل ہیں۔ سوشل ایکٹیوسٹ بھی ان کا ساتھ دیتے ہیں اور وہ لوگ بھی ان ہی کے حامی ہیں جو جدی پشتی راشسٹ ہیں اور برطانوی امیگریشن پالیسی کے خلاف ہیں، جو نہیں چاہتے کہ برطانوی امیگریشن بھورے لوگوں کو دی جائے۔ یہ لوگ "اسلام فوبیا" کو بہت ہوا دیتے ہیں اور شریعت کو اپنے حقوق کی خلاف ورزی سمجھتے ہیں۔ وہ دین اسلام کو پسماندہ خیال کرتے ہیں اور مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ مسٹر ٹیرن ان ہی کے نمائندہ تھے۔ ان کی زبانی مجھے نور محمد کے متعلق بھی پتا چلا تھا۔ ان ہی کی باتوں نے مجھے بھی متجسس کردیا تھا کہ میں دیکھوں تو سہی یہ شخص آخر کون ہے.... مسٹر ٹیرن کہتے تھے نور محمد ایک جادوگر ہے.... جو اس سے ملتا ہے.... اس کا ہوجاتا ہے.... جب میں پہلی بار اس سے ملا تو حیران رہ گیا۔ جادوگر ایسے ہوتے ہیں کیا.... میں نے سوچا تھا.... میں بہت مایوس ہوا تھا، سلمان حیدر! اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی ہوئے ہوں گے.... لیکن میرا یقین کیجیے یہ شخص ایک ہیرا ہے جو تراشا نہیں گیا اور یہ بات مجھے اس کے ساتھ رہنے سے سمجھ میں آئی.... یہ واقعی جادوگر ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس بات کا اسے خود بھی نہیں پتا۔ اس لیے میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ آپ کسی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ نور محمد استعمال کیا جارہا ہے۔"

وہ چپ ہوگیا تھا.... سلمان نے اپنے سامنے بیٹھے اس پچاس پچپن برس کے سفید فام کو دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں جھوٹ کہتی نہیں لگتی تھیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



عفت سحر طاہر

بن مانگی دعا

امتیاز احمد اور سفینہ کے تین بچے ہیں۔ معیز' زارا اور ایزد۔ صالحہ' امتیاز احمد کی بچپن کی منگیتر تھی مگر اس سے شادی نہ ہو سکی تھی۔ صالحہ دراصل ایک شوخ' الھڑسی لڑکی تھی۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی خواہش مند تھی مگر اس کے خاندان کا روایتی ماحول امتیاز احمد سے اس کی بے تکلفی کی اجازت نہیں دیتا۔ امتیاز احمد بھی شرافت اور اقدار کی پاس داری کرتے ہیں' مگر صالحہ ان کی مصلحت پسندی' نرم طبیعت اور احتیاط کو ان کی بزدلی سمجھتی تھی۔ نتیجتاً" صالحہ نے امتیاز احمد سے محبت کے باوجود بدگمان ہو کر اپنی سہیلی شازیہ کے دور کے کزن مراد صدیقی کی طرف مائل ہو کر امتیاز احمد سے شادی سے انکار کردیا۔ امتیاز احمد نے اس کے انکار پر دلبرداشتہ ہو کر سفینہ سے نکاح کر کے صالحہ کا راستہ صاف کردیا تھا مگر سفینہ کو لگتا تھا جیسے ابھی بھی صالحہ' امتیاز احمد کے دل میں بستی ہے۔

شادی کے کچھ ہی عرصے بعد مراد صدیقی اپنی اصلیت دکھا دیتا ہے۔ وہ جواری ہوتا ہے اور صالحہ کو غلط کاموں پر مجبور کرتا ہے۔ صالحہ اپنی بیٹی ابیہا کی وجہ سے مجبور ہو جاتی ہے مگر ایک روز جوئے کے اڈے پر ہنگامے کی وجہ سے مراد کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ صالحہ شکر ادا کرتے ہوئے ایک فیکٹری میں جاب کر لیتی ہے۔ اس کی سہیلی زیادہ تنخواہ پر دوسری فیکٹری میں چلی جاتی ہے جو اتفاق سے امتیاز احمد کی ہوتی ہے۔ اس کی سہیلی صالحہ کو امتیاز احمد کا وزیٹنگ کارڈ لا کر دیتی ہے۔ جسے وہ اپنے پاس محفوظ کر لیتی ہے۔ ابیہا میٹرک میں ہوتی ہے۔ جب مراد رہا ہو کر آجاتا ہے اور پرانے دھندے شروع کر دیتا ہے۔ دس لاکھ کے بدلے جب وہ ابیہا کا سودا کرنے لگتا ہے تو صالحہ مجبور ہو کر امتیاز احمد کو فون کرتی ہے۔ وہ فوراً" آجاتے ہیں اور ابیہا سے نکاح کر کے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کا بیٹا معیز احمد باپ کے اس راز میں شریک ہوتا ہے۔ صالحہ مر جاتی ہے۔ امتیاز احمد' ابیہا کو کالج میں داخلہ دلا کر ہاسٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ وہاں حنا سے اس کی



دوستی ہے جو اس کی روم میٹ بھی ہوتی ہے، مگر وہ ایک خراب لڑکی ہوتی ہے۔

معیز احمد اپنے باپ سے ایبہا کے رشتے پر ناخوش ہوتا ہے۔ زارا اور سفیر احسن کے نکاح میں امتیاز احمد ایبہا کو بھی مدعو کرتے ہیں، مگر معیز اسے بے عزت کرکے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زارا کی نند رباب ایبہا کی کالج فیلو ہے۔ وہ تفریح کی خاطر لڑکوں سے دوستیاں کرکے ان سے پیسے بٹور کر الّو بنانے والا مزاج رکھتی ہے اور اپنی سہیلیوں کے مقابلے اپنی خوب صورتی کی وجہ سے زیادہ تر ٹارگیٹ جیت لیا کرتی ہے۔ رباب، معیز احمد میں بھی دلچسپی لینے لگتی ہے۔

ایبہا کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے مگر وہ اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ وہ معیز احمد کی گاڑی سے ٹکرائی تھی کیونکہ معیز اپنے دوست عون کو آگے کردیتا ہے۔ ایکسیڈنٹ کے دوران ایبہا کا پرس کہیں گرجاتا ہے۔ وہ نہ تو ہاسٹل کے واجبات ادا کرپاتی ہے، نہ ایگزامز کی فیس۔ بہت مجبور ہوکر وہ امتیاز احمد کو فون کرتی ہے مگر وہ دل کا دورہ پڑنے پر اسپتال میں داخل ہوتے ہیں۔ ایبہا کو بحالت مجبوری ہاسٹل اور ایگزامز چھوڑ کر حنا کے گھر جانا پڑتا ہے۔ وہاں حنا کی اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کی ماما جو کہ اصل میں "میم" ہوتی ہیں، زور زبردستی کرکے ایبہا کو بھی غلط راستے پر چلانے پر مجبور کرتی ہیں۔ ایبہا بہت سر پٹختی ہے مگر میم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ امتیاز احمد دوران بیماری معیز سے اصرار کرتے ہیں کہ ایبہا کو گھر لے آئے مگر سفینہ بھڑک اٹھتی ہیں۔ امتیاز احمد کا انتقال ہوجاتا ہے۔ مرنے سے قبل وہ ایبہا کے نام پچاس لاکھ، گھر میں حصہ اور ماہانہ دس ہزار کرجاتے ہیں۔ اس بات پر سفینہ مزید سیخ پا ہوتی ہیں۔ معیز، ایبہا کے ہاسٹل جاتا ہے۔ کالج میں معلوم کرتا ہے، مگر ایبہا کا کچھ پتا نہیں ملتا۔ وہ چونکہ رباب کے کالج میں پڑھتی تھی۔ اس لیے معیز باتوں باتوں میں رباب سے پوچھتا ہے مگر وہ لاعلمی کا اظہار کرتی ہے۔

عون، معیز احمد کا دوست ہے۔ ثانیہ اس کی منکوحہ ہے۔ مگر پہلی مرتبہ بہت عام سے گھریلو حلیے میں دیکھ کر وہ ناپسندیدگی کا اظہار کردیتا ہے۔ جبکہ ثانیہ ایک پڑھی لکھی، ذہین اور بااعتماد لڑکی ہوتی ہے۔ وہ عون کے اس طرح انکار کرنے پر شدید ناراض ہوتی ہے۔ پھر عون پر ثانیہ کی قابلیت کھلتی ہے تو وہ اس سے محبت میں گرفتار ہوجاتا ہے مگر اب ثانیہ اس سے شادی سے انکار کردیتی ہے۔ دونوں کے درمیان خوب تکرار چل رہی ہے۔

میم، ایبہا کو سیفی کے حوالے کردیتی ہیں جو ایک عیاش آدمی ہوتا ہے۔ ایبہا اس کے دفتر میں جاب کرنے پر مجبور کردی جاتی ہے۔ سیفی اسے ایک پارٹی میں زبردستی لے کر جاتا ہے، جہاں معیز اور عون بھی آئے ہوتے ہیں مگر وہ ایبہا کے یکسر مختلف انداز حلیے پر اسے پہچان نہیں پاتے تاہم اس کی گھبراہٹ کو محسوس ضرور کرلیتے ہیں۔ ایبہا پارٹی میں

ایک ادھیڑ عمر آدمی کو بلاوجہ بے تکلف ہونے پر تھپڑ ماردیتی ہے۔ جواباً" سیفی بھی اسی وقت ایبہا کو ایک زوردار تھپڑ جڑ دیتا ہے۔ عون اور معیز کو اس لڑکی کی تذلیل پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ گھر آکر سیفی میم کی اجازت کے بعد ایبہا کو خوب تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اسپتال پہنچ جاتی ہے۔ جہاں عون اسے دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا معیز کی گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ عون کی زبانی یہ بات جان کر معیز سخت حیران اور بے چین ہوتا ہے۔ وہ پہلی فرصت میں سیفی سے میٹنگ کرتا ہے۔ مگر اس پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ ثانیہ کی مدد سے وہ ایبہا کو آفس میں موبائل بھجواتا ہے۔ ایبہا بمشکل موقع ملتے ہی باتھ روم میں بند ہوکر اس سے رابطہ کرتی ہے مگر اسی وقت دروازے پر کسی کی دستک ہوتی ہے۔ حنا کے آجانے سے اسے اپنی بات ادھوری چھوڑنی پڑتی ہے۔ پھر بہت مشکل سے ایبہا کا رابطہ ثانیہ اور معیز احمد سے ہوجاتا ہے۔ وہ انہیں بتاتی ہے کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ میم اس کا سودا کرنے والی ہیں لہٰذا اسے جلد از جلد یہاں سے نکال لیا جائے۔ معیز احمد، ثانیہ اور عون کے ساتھ مل کر اسے وہاں سے نکالنے کی پلاننگ کرتا ہے اور یہیں اسے اپنا پرانا راز کھولنا پڑتا ہے۔

وہ بتا دیتا ہے کہ ایبہا اس کے نکاح میں ہے، مگر وہ نہ پہلے اس نکاح پر راضی تھا نہ اب۔ پھر ثانیہ کے آئیڈیا پر عمل کرتے ہوئے وہ اور عون میڈم رعنا کے گھر جاتے ہیں۔ میڈم ایبہا کا سودا معیز احمد سے طے کردیتی ہے، مگر معیز کی ایبہا سے ملاقات نہیں ہوپاتی کیونکہ وہ ڈرائیور کے ساتھ بیوٹی پارلر گئی ہوتی ہے۔ وہاں موقع ملنے پر ایبہا، ثانیہ کو فون کردیتی ہے۔ ثانیہ بیوٹی پارلر پہنچ جاتی ہے۔ دوسری طرف تاخیر ہونے پر میڈم، حنا کو بیوٹی پارلر بھیج دیتی ہے، مگر ثانیہ، ایبہا کو وہاں سے

نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ثانیہ کے گھر سے معیز اسے اپنے گھر انیکسی میں لے جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر سفینہ بیگم بری طرح بھڑک اٹھتی ہیں مگر معیز سمیت زارا اور ایزد انہیں سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معیز احمد اپنے باپ کی وصیت کے مطابق ایبہا کو گھر لے تو آتا ہے مگر اس کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ تنہائی سے گھبرا کر ثانیہ کو فون کرتی ہے۔ وہ اس سے ملنے چلی آتی ہے اور حیران رہ جاتی ہے۔ گھر میں کھانے پینے کو کچھ نہیں ہوتا۔ وہ عون کو فون کر کے شرمندہ کرتی ہے۔ عون نادم ہو کر کچھ اشیائے خورونوش لے آتا ہے۔ معیز احمد بزنس کے بعد اپنا زیادہ تر وقت رباب کے ساتھ گزارنے لگتا ہے۔

سفینہ بیگم اب تک یہ ہی سمجھ رہی ہیں کہ ایبہا مرحوم امتیاز احمد کے نکاح میں تھی مگر جب انہیں پتا چلتا ہے کہ وہ معیز کی منکوحہ ہے تو ان کے غصے اور نفرت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ اسے اٹھتے بیٹھتے بری طرح ٹارچر کرتی ہیں اور اسے بے عزت کرنے کے لیے اسے نذراں کے ساتھ گھر کے کام کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ایبہا ناچار گھر کے کام کرنے لگتی ہے۔ معیز کو برا لگتا ہے مگر وہ اس کی حمایت میں کچھ نہیں بولتا۔ یہ بات ایبہا کو مزید تکلیف میں مبتلا کرتی ہے۔ وہ اس پر تشدد بھی کرتی ہیں۔

پرانے شکوے شکایتیں دور کرنے کی خاطر عون کے ابا عون اور ثانیہ کو اسلام آباد نازیہ کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے بھیجتے ہیں۔ جہاں ارم ان دونوں کے درمیان آنے کی کوششیں کرتی ہے اور ثانیہ اپنی بے وقوفی کے باعث عون سے شکوے اور ناراضیاں رکھ کر ارم کو موقع دیتی ہے۔ عون صورت حال کو سنبھالنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر ثانیہ اس کے ساتھ بھی زیادتی کر جاتی ہے۔ ارم کی بہن نیلم ایک اچھی لڑکی ہے 'وہ ثانیہ کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ اگر عون نے پہلے شادی سے انکار کر کے اس کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچائی تھی تو اب اپنی عزت نفس اور انا کو چھوڑ کر آپ کو منانے کے لیے جتن بھی کر رہا ہے۔ عزت کریں عون کی 'اور دوسروں کو اپنے درمیان آنے کا موقع نہ دیں۔ ثانیہ کچھ کچھ مان لیتی ہے۔ تاہم مہندی میں کی گئی ثانیہ کی بدتمیزی پر عون دل میں اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔

رباب 'سفینہ بیگم کے گھر آتی ہے تو ایبہا کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ پھر سفینہ بیگم کی زبانی ساری تفصیل سن کر اس کی تضحیک کرتی ہے۔ ایبہا بہت برداشت کرتی ہے مگر دوسرے دن کام کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ سفینہ بیگم کو شدید غصہ آتا ہے۔ وہ انیکسی جا کر اس سے لڑتی ہیں۔ اسے تھپڑ مارتی ہیں 'جس سے وہ گر جاتی ہے۔ اس کا سر پھٹ جاتا ہے اور جب وہ اسے حرام خون کی گالی دیتی ہیں تو ایبہا پھٹ پڑتی ہے۔ معیز آکر سفینہ کو لے جاتا ہے اور واپس آکر اس کی بینڈیج کرتا ہے۔ ایبہا کہتی ہے کہ وہ پڑھنا چاہتی ہے۔ معیز کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ سفینہ بیگم ایک بار پھر معیز سے ایبہا کو طلاق دینے کا پوچھتی ہیں تو وہ صاف انکار کر دیتا ہے۔

ستر ہویں قسط

اسے دیکھتے ہی معیز گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ایبہا کے دل کی دھڑکنیں تو پہلے ہی اتھل پتھل تھیں 'مگر جب اس کے قریب پہنچنے پر معیز نے آگے جھک کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ ان لاک کیا تو وہ ٹھوکر کھاتے کھاتے بچی۔

ست روی سے دروازہ کھول کے وہ فرنٹ سیٹ پہ سمٹے ہوئے انداز میں بیٹھ گئی۔ چوکیدار گیٹ کھول چکا تھا۔ معیز نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی تو وہ بے حد پر سکون سی کیفیت میں تھا 'لیکن گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے اس نے بے اختیار سائیڈ ویو مرر پر نگاہ ڈالی۔ لاؤنج کا داخلی دروازہ بند تھا۔ سفینہ بیگم صد شکر باہر نہیں آئی تھیں۔

"راستہ تو معلوم ہے نا اکیڈمی کا.....؟"

مین روڈ پہ آکے معیز نے اس سے پوچھا تو۔ دم سادھے بیٹھی ایبہا بری طرح چونک گئی مگر بڑبڑا کر بولی۔

"جی۔۔۔ہاں۔جی۔شاید۔"
معیز نے بے اختیارانہ نگاہ اس پر ڈالی۔ گاڑی کے دروازے کے بالکل ساتھ جُڑ کے بیٹھی وہ گھبراہٹ کا شکار تھی۔
"ہاں یا شاید۔۔۔؟"
"میرا مطلب ہے میں ثانیہ کے ساتھ ایک بار آئی تھی ٹیچر سے ملنے۔" وہ قدرے سنبھل کر بولی۔
"اچھا۔ تو پھر ایڈریس بتا دو۔"
وہ نارمل سے انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ ایہا کا دماغ چکرایا۔
"ایڈریس۔۔۔ تو۔۔۔ نہیں پتا۔" وہ اٹکی' معیز نے بے اختیار گاڑی کی رفتار آہستہ کی تھی۔
"کیا مطلب؟ ایڈریس نہیں پتا ہے؟" وہ ازحد حیران ہوا۔
"مجھے تو ثانیہ لے کے جانے والی تھیں۔" اس نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔ پھر یاد آنے پہ بولی۔
"روڈ مجھے یاد ہے۔ وہاں سے ہم نے گول گپے کھائے تھے۔" معیز بے ساختہ ہلکے سے ہنس دیا۔
ایہا نروس سی بیگ کا اسٹریپ مسل رہی تھی۔
"اب اگر مجھے بھی ساتھ لے گئی ہوتیں گول گپے کھلانے' تو مجھے ضرور یاد رہتا۔" وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا۔
"آئم سوری۔۔۔" اس کا لہجہ بھیگا ہوا سا تھا۔
کیا سوچ رہا ہو گا وہ۔ ساتھ آنے کا اتنا "شوق" تھا کہ بنا ایڈریس کے ساتھ چل پڑی۔ اس سوچ کے ساتھ اسے رونا آنے لگا۔
سگنل پہ گاڑی رکی تو وہ موبائل پہ کسی کو میسج کرنے لگا اور جب تک سگنل گرین ہوا جوابی میسج آچکا تھا۔
گاڑی دوبارہ سے چلی تب تک ایہا شرمندہ ہو ہو کر بے حال ہو چکی تھی۔
"آپ مجھے واپس چھوڑ دیں۔ میں ثانیہ کے ساتھ ہی آجاؤں گی۔"
اس نے ہلکے سے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا تو معیز نے تیکھی نظر اس پر ڈالی۔
"تمہارے خیال میں سوائے تمہاری "ثانیہ جی" کے کسی اور کو راستوں کا پتا ہی نہیں۔۔۔" قدرے خفگی سے کہا۔ ایہا نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔ معیز نے گاڑی روک دی تھی۔ وہ خوف زدہ سی ہوئی۔
کیا اسے غصہ آگیا تھا؟
اس کی شکل پہ پھیلا ہراس دیکھ کر معیز کو خود پر تاسف ہوا۔ زندگی میں اس سے بڑا کوئی افسوس نہیں ہونا چاہیے کہ آپ کی وجہ سے کسی کی زندگی مشکل ترین جائے۔

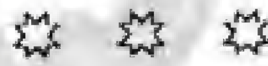
اپنی زندگی تو ہر کوئی آسان بنا لیتا ہے' دوسروں کی زندگیوں کو آسان بنانا کمال ہوتا ہے۔
"یہ دیکھو گول گپے والا۔۔۔ اور وہ تمہاری اکیڈمی۔" وہ بے حد نرمی سے گول گپے کی ریڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اب اسے اکیڈمی کا بورڈ دکھا رہا تھا۔
ایہا کی جان میں جان آئی۔
"تھینک یو۔۔۔" وہ کھل سی گئی۔ پھر گاڑی سے اترتے ہوئے حیران سی پل بھر کو پلٹی۔
"آپ کو کیسے پتا چلا۔۔۔؟"
"ثانیہ سے پوچھا ہے۔" وہ مسکرایا تو ایہا کو پورے ماحول میں سنہرا پن سا گھلتا محسوس ہوا۔

معیز اس کے ساتھ گیٹ تک آیا۔ وہ اس سے واپسی کا وقت پوچھ رہا تھا۔
ایہا نے وقت بتاتے ہوئے ایک ہلکی سی نگاہ اس مہربان سے چہرے پر ڈالی۔
نرم سے تاثرات اور بھرپور توجہ۔
ایہا نے پہلی بار ان بھوری آنکھوں کو دھوپ میں کانچ کی طرح چمکتے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ اسی پل اسے بھوری آنکھوں سے عشق ہوا تھا۔
"ہیلو۔" وہ اس کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجا رہا تھا۔ ایہا گڑبڑا کر حواس میں لوٹی اور اس قدر شرمندہ ہوئی کہ بہ سرعت پلٹ کر گیٹ پار کر گئی۔
اور معیز اس کی نگاہ کے بے خود سے ارتکاز کو محسوس کر کے اپنی جگہ جم سا گیا۔



ثانیہ نے بنا نمبر دیکھے کال اٹینڈ کی تو خیال یہی تھا کہ دوسری طرف ایہا ہی ہوگی۔ آج اس کی اکیڈمی کا پہلا دن تھا۔
"ہیلو۔" بے ترتیب سانس پر قابو پاتے وہ بولی۔
"میں نے تم سے کہا تھا کہ اپنی مرضی کا فیصلہ کرنا۔ پھر شادی کی تاریخ کیسے طے ہونے دی تم نے؟"
عون کے انداز میں اس قدر سرد مہری اور کڑواہٹ تھی کہ ثانیہ بے دم سی بستر پر گر گئی۔
"میرے کندھے پہ بندوق رکھ کے چلانا چاہتی ہو تم۔ تو یہ تمہارا خیال ہی رہ جائے گا ثانیہ بی بی۔"
وہ بے رخی سے بولا تو ثانیہ جلبلا اٹھی۔ اس قدر لاتعلقی اور بے اعتنائی۔
"ثانیہ بی بی۔!" وہ جو ہمیشہ اس کے نام کے آگے اپنا نام لگایا کرتا تھا۔ وہ عون عباس کیا ہوا؟
"یہ بڑوں کا فیصلہ ہے ان سے بات کرو۔" ثانیہ کی انا انگڑائی لے کر بیدار ہوئی تو اس نے بھی بے رخی ہی کو اپنایا۔
"وہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں۔ تمہارا فیصلہ کہاں گیا؟"
"ایک بات یاد رکھو ثانیہ۔ میری زندگی میں کوئی "ٹارگٹ" لے کر مت آنا۔ بدلے کی خواہش ہے تو صاف لفظوں میں شادی سے انکار کر کے بدلہ اتار لو۔"
اس قدر تلخی۔ اس قدر غیریت۔
ثانیہ کو لگا ہی نہیں کہ وہ عون عباس سے بات کر رہی ہے۔ جو اس کے کڑوے لہجے کے گھونٹ بھی امرت سمجھ کر پیا کرتا تھا۔ نرمی، بذلہ سنجی اور شرارت جس کے مزاج کا حصہ تھی۔
ثانیہ اسے روکنا چاہتی تھی۔ اسے بتانا چاہتی تھی کہ اس کے خیالات ہی نہیں بلکہ جذبات میں بھی تبدیلی آچکی ہے، مگر عون کے انداز کی تندی نے اس کی زبان گنگ کر دی۔ محبت کا اظہار تو وہاں کیا جاتا ہے جہاں بے تکلفی ہو، مان ہو۔ اور جہاں ڈیرا ہی غیریت اور بے اعتنائی کا ہو، وہاں اظہار محبت کیسے؟
ثانیہ نے سوچ رکھا تھا کہ اب وہ کبھی بھی عون سے بدتمیزی نہیں کرے گی۔ اور جب عون اس کے انداز کا دھیما پن اور نرمی دیکھے گا تو خود بخود اس کی ذہنی و جذباتی تبدیلی کا احساس کر لے گا۔
مگر یہاں تو کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ نازیہ آپی کی شادی کے دوران شاید وہ حد ہی کر گئی تھی۔ تب ہی تو عون جیسے میٹھے لب و لہجے والے بندے نے بھی شعلے اگلنا شروع کر دیے تھے۔

اس کی آنکھوں میں ضبط کی سرخی اتر آئی۔ ورنہ تو زور زور سے رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ گہری سانس لے کر اندر کی کثافت کو کم کرنے کے ساتھ ثانیہ نے اپنی ہمت کو بھی مجتمع کیا اور ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔
"میں انکار نہیں کروں گی عون عباس۔ کیوں کہ میں اپنے گھر والوں کا دل نہیں دکھا سکتی۔ یہ کام پہلے بھی تم نے کیا تھا اور اب بھی اگر تم ایسا چاہتے ہو تو تم ہی کو کرنا پڑے گا۔" اور بس۔
اس نے لائن کاٹ دی تھی۔ ساتھ اس کے کب سے رکے آنسو بہہ نکلے اور وہ تکیے میں منہ گھسیڑے روئے چلی گئی اور دوسری طرف عون تلملا کر ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا۔ ثانیہ کے لفظوں نے جلتی پہ تیل کا سا کام کیا تھا۔ وہ خود سب کی نظروں میں اچھی بن گئی تھی۔ اب اگر عون انکار کرتا تو ابا جی جوتے مار کے گھر سے نکال باہر کرتے، مگر اس زندگی کا کیا...؟
عون کے اندر بے چینی حد سے سوا ہو گئی۔ پھولوں، تتلیوں، ہواؤں، بادلوں اور گھٹاؤں سے محبت کرنے والا بندہ اپنی زندگی کو بھی رومانوی انداز میں گزارنے کی سوچ رکھتا تھا۔ ایسے میں ثانیہ اس کی زندگی میں "خود کش حملہ آور" کی طرح داخل ہو رہی تھی یا شاید "ٹارگٹ کلر" بن کے اور عون عباس جانتے بوجھتے زندگی ختم کرنے کے حق میں نہیں تھا۔
ماتھے پہ بل لیے وہ کتنی ہی دیر سوچتا رہا تھا۔



وہ سیفی کے ساتھ کسی عام ہوٹل میں ہوٹلنگ نہیں کرتی تھی۔ معیز کے ساتھ تو وہ شہر کے کسی بھی اچھے ریسٹورنٹ میں چلی جاتی تھی، مگر سیفی کے ساتھ وہ ہمیشہ وہاں ہوٹلنگ کرتی جہاں ہائی جینٹری کے لوگ ہوتے اور جہاں "معیز احمد" کے پائے جانے کا امکان کم سے کم ہوتا۔ ابھی تک وہ اپنی زندگی کی ترجیحات متعین نہیں کرپائی تھی۔ دل تو معیز احمد کے مغرورانہ انداز پر بہت بری طرح آیا تھا، مگر سیفی کے ٹھاٹ باٹھ نے بھی اس کے دل کو للچا رکھا تھا اور پھر کالج کے زمانے کی ایسی پکی عادت ہو چکی تھی کہ اپنے حسن کا "صدقہ" وصول کرنا کچھ ایسا برا بھی نہ لگتا تھا۔
ابھی بھی وہ سیفی کے ساتھ لنچ کر کے شاپنگ مال آئی تھی اس نے جس چیز پہ نظر ڈالی سیفی کے اشارے پر اس کے لیے پیک کردی گئی۔
"اب بس... میں تھک گئی ہوں۔"
رباب نے اٹھلا کر بڑے ناز سے کہا تو وہ پے منٹ کے بعد کارڈ اپنے والٹ میں رکھتا شگفتگی سے بولا۔
"لڑکیاں تو شاپنگ سے نہیں تھکتیں سویٹ ہارٹ..."
"جو کبھی کبھار کرتی ہیں وہ نہیں تھکتی ہوں گی۔" وہ ناک چڑھا کر یوں بولی جیسے ارب پتی کی بیٹی ہو۔ سیفی اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے شاپنگ مال سے نکلا تھا۔ اس کی مہنگی ترین گاڑی میں بیٹھتے ہوئے رباب نے گردن یوں راج ہنس کی طرح اٹھا رکھی تھی، جیسے باقی سب اس سے حقیر ہوں۔
"آج تمہیں اپنی آپا سے بھی ملوانا ہے میں نے۔" سیفی نے اس کا ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے معنی خیزی سے کہا تو رباب نے ٹھنک کر اسے دیکھا۔
"اونہوں۔ اتنے رف حلیے میں..."
سیفی نے ایک گہری نگاہ اس کے جدید تراش میں لپٹے وجود پر ڈالی۔ برہنہ سپید بانہوں کی خوب صورتی ہی

نگاہوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی تو پھر۔

"قیامت لگ رہی ہو جان من۔ کہو تو ابھی حسن کو خراج تحسین پیش کردوں۔"

وہ جذبات سے چور لہجے میں کہتا اس کی طرف جھکا تو رباب اس قدر اچانک پیش قدمی پر پیچھے نہیں ہٹ پائی۔ وہ اس کے رخسار کو چھو چکا تھا۔

اس کا چہرہ تمتما اٹھا' رباب نے اس کے سینے پہ ہاتھ رکھ کے پیچھے دھکیلا تھا۔

"سیفی پلیز۔ جگہ کا تو خیال کرو۔"

وہ خفگی سے کہتے ہوئے پیچھے ہو کر بیٹھی۔ تو وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اس کی قربت نے دل و ذہن پر رومان پرور سا احساس طاری کردیا تھا۔

"ہر جگہ ہی "سنسر پلیز" کا اشتہار بنی رہتی ہو سویٹی۔"

"آج میں بہت تھک گئی ہوں۔" وہ بالوں میں ہاتھ چلاتی بڑے نخرے دکھا رہی تھی۔

"تم چلو تو۔ تمہاری تھکاوٹ دور کرنے کا سامان بھی کردیں گے۔"

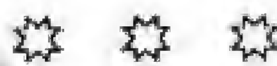
سیفی نے ذو معنی انداز میں کہا تو رباب نے اسے ہلکا سا گھور کے دیکھا۔

"چلو نا سویٹ ہارٹ۔ میں نے آپا سے پرامس کیا تھا آج انہیں تم سے ملوانے کا۔"

سیفی اپنے ارادے میں اٹل دکھائی دے رہا تھا اور پچھلی سیٹ پہ دھرے وزنی شاپنگ بیگز میں اتنی کشش تو تھی کہ رباب کی عقل مختل کردیتے۔ سو وہ بھی گہری سانس بھرتے شانے اچکا کر رہ گئی۔

سیفی کے ہونٹوں پر پراطمینان مسکراہٹ پھیل گئی۔

شکار جال میں پھنسنے کو تھا۔ سیفی نے بہت تحمل سے اس دن کا انتظار کیا تھا اور اب "پھل" کھانے کے دن آگئے تھے۔



معیز نے اسے اکیڈمی چھوڑا تو واپسی کا وقت بھی پوچھ لیا تھا' مگر آفس پہنچنے اور یکے بعد دیگرے دو میٹنگز اٹینڈ کرنے کے بعد اس کے ذہن سے بالکل ہی محو ہو گیا کہ اس نے ابیہا کو پک کرنے جانا ہے۔

"سر پروڈکشن ڈیپارٹمنٹ کا وزٹ کرلیں۔ مال بالکل ریڈی ہے جانے کے لیے۔" اس کے پی اے نے یاد دلایا تھا۔

"آہاں۔ یہ رہ گیا تھا۔" وہ کراہ کے رہ گیا۔ ابھی ہونے والی میٹنگ میں وہ بزنس ڈیلی گیشن کے ساتھ اچھا خاصا سر کھپا کے آیا تھا۔

مگر بہرحال یہ کام انتہائی ضروری تھا۔ سو وہ فوراً" ہی پروڈکشن منیجر کے ساتھ چل دیا۔

ادھر فارغ ہونے کے بعد ابیہا نے وقت دیکھا تو ابھی معیز کو دیے وقت میں بیس منٹ باقی تھے۔ وہ اطمینان سے اکیڈمی ٹیچر کے دیے نوٹس پر نظر ڈالنے لگی۔ اس کے بعد اسٹوڈنٹس نے یکے بعد دیگرے جانا شروع کردیا تو وہ جیسے حواس میں آئی۔ وقت دیکھا تو دس منٹ اوپر ہو رہے تھے۔ وہ جلدی سے نوٹس سمیٹ کر فائل میں لگاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے خیال میں معیز باہر آچکا تھا۔ بیگ شانے پہ ڈال کر فائل اٹھاتی اور بعجلت باہر نکلی۔ گیٹ سے باہر آکے اس نے ادھر ادھر نظر ڈال کے معیز کی گاڑی تلاشنے کی مقدور بھر کوشش کی مگر وہ ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ وہ دوپٹے کو قدرے نقاب کے انداز میں چہرے پر سیٹ کر کے گیٹ کی سائیڈ پر کھڑی ہو گئی۔

مگر اگلے دس منٹ گزرنے کے بعد اس کے دل میں بے چینی پیدا ہونے لگی۔ موبائل بھی چارجنگ پہ لگا چھوڑ

آئی تھی۔
اس سے اگلا وقت خوف زدہ کرنے والا تھا۔ کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں دکھنے لگیں۔
(تو کیا وہ اسے پک کرنا بھول گیا تھا۔ یا پھر اس کا یہی پلان تھا۔ ایبہا کو دنیا میں گم کردینے کا؟)
اس نے دھندلاتی نظروں سے سڑک پہ دوڑتے پھرتے ٹریفک کو دیکھا اور گھر کا ایڈریس یاد کرنے کی کوشش کی۔
اس دنیا میں انسان کو اتنا بھی سادہ نہیں ہونا چاہیے" ایک بار خیال آیا کہ دوبارہ کوچنگ سینٹر کے اندر چلی جائے' مگر پھر خیال آیا کہ ٹیچر نے اگر گھر کا پتا پوچھ لیا یا فون نمبر تو کیا بتائے گی۔ دل مسوس کے وہیں کھڑی معوذ کے آنے کی دعائیں کرنے لگی۔
مگر آنسوؤں کا نمکین پھندا اس کے حلق میں پھنس گیا تھا۔ اسی وقت کوئی شخص اس کے پاس آکے کھڑا ہوا۔



عون کو ثانیہ پر جتنا بھی غصہ آتا کم تھا۔ وہ سوچ کر تلملاتا اور تلملا تلملا کر سوچتا۔
وہ لڑکی جو بانگ دہل اسے کسی اور لڑکی کے ساتھ۔۔ انوالومنٹ کے طعنے دیتی رہی ہو اور بھری محفل میں بے عزت کرکے رکھ دیتی ہو۔ اس کی یہ "بے ایمانی" ہضم نہیں ہو رہی تھی۔
دل سے تو وہ بالکل بھی عون کی زندگی میں آنے کو تیار نہیں تھی۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ پھر فیصلے کے وقت ثانیہ کا کوئی قدم نہ اٹھانا۔ محض بڑوں کی رضا کو نبھانا عون کو جلتے توے پر بٹھا رہا تھا۔
وہ ایک محبت کرنے والی شریک سفر کو زندگی میں لانا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے ثانیہ سے وقت مانگا تھا' لیکن اس گزرتے وقت میں جتنی عون کی محبت میں شدت آئی اتنی ہی ثانیہ کی بدگمانی بھی بڑھی۔
اور اب تو عون بھی یہی چاہتا تھا کہ ثانیہ اپنی نفرت کو لے کر اس کی زندگی میں نہ آئے۔ وہ ایک ناکام زندگی جینے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ اپنی سی کوشش کرچکا تھا' ثانیہ کو اپنے حق میں کرنے کی۔
اور ثانیہ۔۔ وہ اپنا فیصلہ یقیناً" نازیہ کی مہندی والے دن سنا چکی تھی۔
اسے جب جب ثانیہ کا وہ انداز یاد آتا" اس کے اندر طیش سا بھرنے لگتا۔
فرماں برداری کا "ایوارڈ" لینے کی خاطر کیے گئے ثانیہ کے فیصلے کو عون نے قطعیت سے رد کردیا تھا۔ اسی لیے دل کی آواز کو دباتے ہوئے اس نے صاف لفظوں میں ثانیہ کو اچھی خاصی سنادی تھیں۔
مگر آگے سے ثانیہ کے ہٹ دھرم اور خود کو "نیک بی بی" بنائے رکھنے والے انداز نے اسے خاصا تپا کے رکھ دیا تھا۔ جانے کس کے برے دن آنے والے تھے؟



"سر لنچ ٹائم ہوچکا ہے۔"
وہ واپس ہوئے تو اس کے پی اے نے تیسری بار مؤدبانہ اسے یاد دلایا اور اس کا وہی پہلے والا جواب۔
"بھوک نہیں ہے ابھی یار۔۔۔"

اور اپنے آفس میں کرسی پر گرتے ہوئے یونہی اس کے ذہن میں آیا کہ اسے بھوک کیوں نہیں ہے آج۔۔
صبح کیا کھایا تھا؟
وہی روٹین کا ناشتا۔۔ وہ سیٹ سے سر ٹکائے ریلیکس موڈ میں تھا۔
دفعتاً" اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

"ڈبل ناشتا۔" وہ فی الفور سیدھا ہوا۔
وہ صبح گھر سے ناشتا کرنے کے بعد پراٹھے اور آملیٹ کا بھی ناشتا کر کے آیا تھا۔ ایہا کے ہاتھ کا ناشتا۔
"یا اللہ۔۔۔!" وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ کلائی الٹ کر وقت دیکھا۔ وہ ایہا کے بتائے ہوئے وقت سے پون گھنٹہ لیٹ تھا۔
وہ موبائل اٹھاتا بعجلت دروازے تک گیا پھر تیزی سے پلٹا اور ٹیبل پر سے گاڑی کی چابیاں جھپٹ کر اٹھائیں' تیزی سے لفٹ کی جانب بڑھتا وہ اپنے موبائل پر مسڈ کالز چیک کر رہا تھا۔
ایہا کی کوئی کال نہ تھی۔ اس نے ایہا کا نمبر ملا کر موبائل کان سے لگایا اور لفٹ میں داخل ہو کر گراؤنڈ فلور کا بٹن دبا دیا۔ لب بھینچے وہ پریشانی کی زد میں تھا۔



کوئی شخص اس کے پاس آ کے کھڑا ہوا تو ایہا کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ ہاتھ سے تھاما دوپٹے کا نقاب ذرا سا سرکا تو اس نے جھپٹ کر پھر سے دوپٹے کو ٹھیک کیا' مگر حسن کی اتنی سی جھلک ہی مقابل کو مسحور کرنے کے لیے کافی تھی۔
"کیا بات ہے۔۔۔ کافی دیر سے آپ یہاں کھڑی ہیں محترمہ۔ رکشہ' ٹیکسی چاہیے آپ کو۔۔۔ میں لا دوں؟"
وہ کھوجتی نظروں سے اسے دیکھتا بظاہر بڑی شائستگی سے پوچھ رہا تھا' مگر ان وحود چھیدتی لال آنکھوں میں سے جھلکتے ہوسناک تاثر نے ایہا پر کپکپی سی طاری کر دی۔
"نن۔۔۔ نہیں بس۔۔۔" وہ خشک ہوئے حلق کے ساتھ بولی تو منہ سے عجیب سی آواز نکلی۔
سامنے والے خرانٹ شخص کی گہری نظر نے فوراً" ہی اندازہ کر لیا کہ وہ کتنے پانیوں میں ہے۔
"میرے۔۔۔ شوہر آ رہے ہیں۔"
ایہا نے ذرا ہمت پکڑتے ہوئے بے رخی سے کہا اور دو قدم اس سے دور ہوتے ہوئے سڑک کے دائیں طرف سے آتی ٹریفک کو دیکھنے لگی۔
"ارے میری بلبل۔۔۔ جس کے لیے تم یہاں کھڑی ہو۔ وہ اب نہیں آنے کا۔۔۔ چلو میرے ساتھ۔"
وہ پچکارنے والے انداز میں بولا اور پھر جیسے اس کی ہمت بندھانے کو ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ خوف زدہ سی پیچھے ہٹی' اس کی فائل ہاتھوں سے پھسل کے گری تو نوٹس ادھر ادھر بکھر گئے۔
"ارے تم تو ڈر رہی ہو۔۔۔" اس کے ہونٹوں پر مکروہ سی مسکراہٹ تھی۔ ایہا کے یوں کمزوری دکھانے پر وہ مزید شیر ہو گیا تھا۔
خوف اور بے بسی کا شکار ایہا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ آس پاس زندگی رواں دواں تھی' مگر کسی کو بھی اس خاموش حادثے کی خبر نہ تھی۔ اور ایہا کے اندر اتنی بھی ہمت نہ تھی کہ وہ چیخ و پکار کر کے کسی کو متوجہ ہی کر لیتی۔
وہ آگے بڑھا تو ایہا تیزی سے پیچھے ہٹتی دیوار کے ساتھ جا لگی' اسی وقت کسی نے اس شخص کو شرٹ کے کالر سے پکڑ کر پوری قوت سے پیچھے گھسیٹ لیا تھا۔

وہ بوکھلا کر پلٹا تو ساتھ ہی ناک پر پڑنے والے مکے نے درحقیقت اسے دن میں تارے دکھا دیے۔
"ٹھہر تیری تو۔۔۔ سالے۔۔۔"
معیز کا دماغ گھوم گیا تھا۔ سڑک پار کر کے آنے تک وہ سارا معاملہ سمجھ چکا تھا۔ ڈری سہمی ایہا اور اسے

تنگ کرنا گندے حلیے والا شخص۔
معیز کا ارادہ تو اس کی اچھی طرح ٹھکائی کرنے کا تھا، مگر وہ ایک مکا کھا کر ہی یوں بگٹٹ بھاگا کہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ بمشکل ضبط سے کام لیتا پلٹا تو خوف کی حدوں کو چھوتی ایہا روتے ہوئے اس کے ساتھ آ لگی۔
لمحہ بھر کو وہ ساکت سا رہ گیا۔ پھر نرمی سے اس کے سر کو تھپکا۔
"اٹس اوکے ایہا۔ خود کو سنبھالو۔ دفع ہو گیا ہے وہ۔" مگر اس کے خوف زدہ وجود کی لرزش نے معیز پر واضح کر دیا کہ وہ کس حد تک دہشت زدہ تھی۔
سیفی اور میڈم کے شکنجے میں مقید رہنے والی ایہا کے ذہن میں پرانا خوف جاگ اٹھا تھا۔
"بی بریو ایہا۔ چلو۔ گاڑی میں بیٹھو۔ روڈ پہ کھڑے ہیں ہم۔"
اس کے سر کو نرمی سے سہلاتے ہوئے معیز نے اسے احساس دلایا تو وہ بے اختیار پیچھے ہٹ گئی۔
معیز نے اس کے نوٹس سمیٹ کر فائل میں لگائے۔ اسے معاشرے کی بے حسی پر بھی افسوس ہوا۔ اردگرد کے لوگوں کو غیر معمولی واقعات بھی شک میں مبتلا نہیں کرتے تھے۔ اسی لیے تو ہماری قوم حوادث کا شکار ہوتی رہتی ہے۔
وہ اسے لیے سڑک پار کرنے لگا تو ایہا نے اس کے بازو کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ رکھا تھا۔ اس کی کیفیت محسوس کر کے معیز کو ندامت ہو رہی تھی۔
اپنی یادداشت کو وہ بارہا کوس چکا تھا۔ سو گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے ایہا سے معذرت کر لی۔
"آئم سوری۔ میری وجہ سے تمہیں پرابلم ہوئی۔"
وہ سر جھکائے سوں سوں کرتی رہی۔
"مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ تمہیں کوچنگ سے پک کرنا ہے مگر میٹنگز میں ایسا الجھا کہ۔۔۔" اس نے لب بھینچے۔ پھر سر جھکائے بیٹھی ایہا کو دیکھا۔
"میں تمہارے نمبر پہ کال کرتا رہا ہوں۔ تم نے میری کال بھی اٹینڈ نہیں کی۔"
ایہا کا دل دھک سے رہ گیا۔ آہستہ سے سر اٹھا کے دیکھا تو وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔
"وہ۔ موبائل نہیں تھا میرے پاس۔ چارجنگ پہ لگایا ہوا تھا تو گھر پہ رہ گیا۔"
مجرمانہ انداز میں کہا تو وہ گہری سانس بھرتا گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔
"موبائل فون کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ آپ اسے کہیں بھی ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ کوئی پرابلم ہو تو کسی سے بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔"
وہ تحمل سے موبائل کے فوائد پر روشنی ڈال رہا تھا۔ ایہا کو شرمندگی ہونے لگی۔ واقعی اگر اس کے پاس موبائل ہوتا تو وہ چھٹی ہوتے ہی معیز کو کال کر سکتی تھی۔
"آئم سوری۔ غلطی میری ہی ہے۔" وہ رندھے لہجے میں بولی۔
"ارے۔" معیز اس کی بات پر بے ساختہ حیران ہوا اور پھر ہلکے سے ہنس دیا۔
ایہا نے بے اختیار اسے دیکھا اور پھر پلکوں کی باڑ گرالی۔ وہ ساتھ ہوتا تو ایک معصوم سا فخر گھیرنے لگتا کہ وہ "اس کا" تھا، مگر یہ خیال آتے ہی دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں۔
"میں آئندہ کبھی موبائل گھر نہیں چھوڑوں گی اور چھٹی کے بعد بھی کوچنگ سینٹر کے اندر ہی رہوں گی۔"
ایہا نے سارا الزام ہی اپنے سر لے لیا تھا، معیز کی لڑکیوں کی ایک نئی قسم سے واقفیت ہو رہی تھی۔ سو اس کا

حیران ہونا بنتا تھا۔
"اس طرح کے فضول لوگوں سے ڈرنے کے بجائے ان سے سختی سے پیش آنا چاہیے تاکہ ان کی ہمت نہ بڑھے۔" وہ اسے سمجھانے لگا۔
"میں نے اس سے کہا تھا۔ میرے شوہر مجھے لینے آرہے ہیں۔" وہ بے اختیار ہی بول اٹھی، مگر پھر ساتھ ہی گھبرا کر معیز کو دیکھا۔ وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہا تھا۔ پتا نہیں اس نے سنا نہیں یا سن کے ان سنی کر گیا تھا۔ ایمہا کو تسلی ہوئی۔
"یہ رعب ڈالنے کی کون سی قسم ہے؟" معیز نے اس قدر اچانک پوچھا کہ ایمہا گڑبڑا کر اسے دیکھنے لگی۔
وہ سنجیدہ تھا۔
"سوری... آپ کو برا لگا ہے تو، مگر میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔" وہ آہستہ سے بولی۔
معیز نے گاڑی روکی۔ گھر آگیا تھا۔ وہ کچھ کہے بنا گاڑی کا ہارن بجانے لگا۔
"ماما اگر کچھ کہیں تو خاموشی سے سن لینا۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔ تم بس اپنی اسٹڈیز پہ دھیان دو۔" اندر آنے تک وہ اسے سمجھا چکا تھا۔
مگر خیریت ہی رہی۔ سفینہ بیگم پورچ یا لان میں دکھائی نہ دی تھیں۔ ایمہا اپنی چیزیں سنبھالتی نیچے اتری۔
اسی وقت لاؤنج کا داخلی دروازہ کھلا اور کوئی باہر نکلا۔ معیز پلٹا اور گہری سانس بھر کے رہ گیا۔
"ہیلو بڈی..." وہ بہت خوش دلی سے کہتا معیز کی طرف بڑھا اور گرم جوشی سے اس سے لپٹ گیا۔
وہ عمر تھا۔ معیز کا ماموں زاد۔
"تم کب آئے... اور یوں اچانک؟" معیز حیران تھا۔ ایمہا تیزی سے انیکسی کی طرف بڑھ گئی۔
"میری چھوڑو۔ یہ کون تھی؟" عمر کی نگاہ میں ستائش تھی۔ معیز نے ناگواری سے اسے دیکھا۔
"کم آن عمر... تم کبھی اپنی فطرت نہیں بدل سکتے۔"
"خوب صورتی ہوتی ہی تعریف کے قابل ہے میرے دوست۔" وہ زبردستی اس کے شانے پہ بازو پھیلائے عالمانہ و فلسفیانہ انداز میں کہتا اندر کی طرف بڑھا تھا۔
معیز اس سے ماموں اور فیملی کے متعلق پوچھنے لگا۔



ثانیہ کا واپس آنے کو جی تو نہیں چاہ رہا تھا، مگر کسی بھی طرح مجبوراً جاب کے یہ دو ماہ گزارنے ہی تھے۔ سو اس نے بھی آکر آفس جوائن کر لیا، مگر اس بار اس کے اندر کی خوش مزاج ثانیہ کہیں کھو سی گئی تھی۔ ایک اکتاہٹ آمیز بے زاری سی کیفیت مستقل اسے گھیرے ہوئے تھی۔ آج اتوار کی چھٹی تھی تو وہ ایمہا کی طرف آگئی۔
"دو دنوں کا کہہ کے اتنے دن لگا کے آرہی ہیں۔" ایمہا نے شکوہ کیا، مگر ثانیہ تو حیرت سے لنچ کا مینو دیکھ رہی تھی۔
ایمہا نے بریانی کے ساتھ مٹن قورمہ اور چکن ویجی ٹیبل مکس کباب بنائے تھے۔ ساتھ میں پودینے دہی کی چٹنی اور خوش رنگ سلاد۔
بڑے دنوں کے بعد اس کی بھوک چمک اٹھی۔
"تم تو بڑی سگھڑ لڑکی ہو بھئی۔ شوہر کے معدے سے ہو کے دل میں جاؤ گی۔"

کھانے کے دوران اس کے ہاتھ کے ذائقے کی معترف ہوتے ہوئے ثانیہ نے اسے چھیڑا تو ایہا کے چہرے پر ہلکی سی لالی بکھر گئی۔

"انہوں نے بھی شوق سے کھایا تھا۔" وہ چمچ سے چاولوں کو پلیٹ میں ادھر ادھر کرتے ہوئے شرمیلے انداز میں بولی تو بے یقینی سے ثانیہ چیخ ہی تو اٹھی۔

"کیا... کس نے... ؟ معیز کی بات کر رہی ہو؟" ایہا اس کے یوں چلانے پر ڈر سی گئی۔ جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"کب، کیسے۔ پوری اسٹوری بتاؤ۔"

وہ بے چین ہو گئی جواباً" ایہا نے جھجکتے شرماتے سارا واقعہ کہہ سنایا۔

ثانیہ دم بخود تھی۔

"میں نے تو سوچا کوچنگ کے لیے تمہیں وین یا رکشہ لگوا دیا ہوگا۔"

ایہا مسکرادی۔

"آہاں..." ثانیہ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں بھی کہوں اتنی بدلی اور انوکھی سی کیوں لگ رہی ہے میری پیاشہزادی۔"

اس کے ذومعنی انداز پر ایہا جھینپی۔

"ایسا ویسا کچھ نہیں۔ بس ان کا انداز تھوڑا بدل گیا ہے۔"

"تھوڑا...؟" ثانیہ نے لمبا کھینچتے ہوئے پوچھا تو وہ کھنکھدار سی ہنسی ہنس دی۔

"شکر اللہ۔ انہیں اپنے غلط رویے کا احساس ہو گیا۔ میں تمہارے لیے واقعی بہت خوش ہوں ایہا۔" ثانیہ نے محبت بھرے خلوص سے کہا۔ ایہا کے ہر ہر انداز سے جھلکتی خوشی اور طمانیت کا راز اب اس پر منکشف ہو گیا تھا۔

"آپ بتائیں۔ رخصت ہو کے کب جارہی ہیں عون بھائی کے گھر...؟"

ایہا نے مسکراتے ہوئے پوچھا اور برتن اکٹھے کرنے لگی۔

ثانیہ کی مسکراہٹ پھیکی پڑنے لگی۔

"ہوں... جلد ہی۔ دو ماہ بعد کی ڈیٹ فکس ہوئی ہے۔"

"ارے واہ..." ایہا برتن وہیں پہ چھوڑ اس کے پاس آ بیٹھی۔

"کتنا مزا آئے گا ثانیہ۔ ! میں نے زندگی بھر کبھی کوئی شادی اٹینڈ نہیں کی۔"

وہ چمکتی آنکھوں کے ساتھ خوشی بھرے لہجے میں بولی تو ثانیہ کو احساس ہوا کہ "دوسروں" کی شادی میں ہر کوئی خوش ہوتا ہے۔ ثانیہ نے اس کا ہاتھ تھپکا۔

"یو آر ویری لکی ثانیہ۔ اتنے اچھے انسان کی زندگی میں شامل ہونے جارہی ہیں۔"

وہ جذب سے بولی۔ ثانیہ بمشکل مسکراہٹ برقرار رکھے ہوئے تھی۔

"جب میرا نکاح ہوا تب میں بہت ڈیپریسڈ تھی۔ کوئی احساس ہی نہیں ابھرا دل میں ماسوائے خوف کے۔ آئندہ زندگی کا خوف۔ معیز کے متوقع رویے کا خوف۔"

ایہا نے اداسی سے کہتے آخر میں جھرجھری سی لی۔

"مگر اب میں اس وقت کو یاد کرنا نہیں چاہتی۔ اللہ پاک نے اگر مجھ پر آزمائش ڈالی تھی تو اب مجھے خوشی بھی عطا

کردی ہے اور نعمتوں کی ناشکری نہیں کیا کرتے۔"
وہ کھل کے مسکرا رہی تھی۔
اور ثانیہ کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ شادی کی تاریخ طے ہونے کے بعد اس کے دل میں بھی تو عون کے متوقع رویے کا خوف ہی... اس نے سوچا اور اداس سی ہو گئی۔
اسے بھی تو ایک اچھے انسان کی صورت اللہ تعالیٰ نے نعمت بخشی تھی۔ اور بدلے کی جنگ میں وہ کیسے اس کے میٹھے جذبوں کو روندتی اور کڑواہٹ کا شکار کرتی رہی تھی۔
"میں آپ کی شادی کی بہت اچھی شاپنگ کروں گی اور عون بھائی کی سالی بھی میں ہی بنوں گی۔ ہے نا ثانیہ..."
ابیہا پرجوش تھی اور وہ اسے خالی نظروں سے دیکھتی اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔



سیفی کی "آپا" سے ہونے والی ملاقات نے رباب کو بہت متاثر کیا تھا۔ ان کا ماڈرن انداز ان کا لباس قیمتی جیولری اور ان کا رکھ رکھاؤ اور واپسی پر انہوں نے زبردستی رباب کو ڈائمنڈ کے ٹاپس اور بریسلٹ گفٹ کیے تھے۔
"اس کی کیا ضرورت ہے آپا۔" رباب نے ایک نظر خوب صورت تحفے پر ڈالی تو اس کی آنکھوں میں چمک سی اتر آئی۔ مگر یوں پہلی ہی ملاقات میں اتنا قیمتی تحفہ لینا... دل تو چاہ رہا تھا فوراً" قبول کرلے" مگر اسے معیوب لگ رہا تھا۔ "یہ ہمارے گھر کی روایت ہے رباب۔ ہونے والی بہو گھر سے خالی ہاتھ جائے، ہمیں اچھا نہیں لگے گا۔"
وہ بڑے خوب صورت اور شیریں انداز سے بولیں تو رباب نے بے اختیار مسکرا کر ساری باتیں سنتے سیفی کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھ دبا دی۔ وہ بوکھلا کر آپا کی طرف متوجہ ہو گئی۔
واپسی پر وہ سیفی سے الجھی۔
"یہ کیوں کہا تم نے آپا سے... بہو والا چکر... شادی وادی کا خیال تو ابھی میرے ذہن میں بھی نہیں ہے۔"
"کم آن جانی... جب موڈ بنے گا تب کر لینا۔ شادی کا کیا ہے۔"
وہ اسے بہلاتے ہوئے بولا۔
اور بعد میں اسکائپ پر اپنی فرینڈز کو سیفی کی آپا کا دیا ہوا تحفہ دکھاتے ہوئے وہ سیفی کے جذبات کا مذاق اڑاتی رہی اور اپنی ہوشیاری پر ان کی داد وصول کر کے رباب کا حوصلہ اور بڑھا۔
کاش کہ ایک بار بھی اس کے ذہن میں یہ بات آجاتی کہ مفت میں اتنے مہنگے تحفے دینے والے وقت آنے پر ان کی بہت بھاری قیمت وصول کیا کرتے ہیں۔



"پھپھو بتا رہی تھیں تم نے انہیں بہت تنگ کیا ہوا ہے۔"
کھانے کے بعد چائے کے دوران بڑی بے تکلفی سے عمر نے سفینہ بیگم کے سامنے ہی موضوع چھیڑ لیا تو وہ شکایتی نظروں سے ماں کو دیکھنے لگا۔ اسے اچھی طرح سمجھ آگئی تھی کہ عمر کو کیوں کر "موورٹ" کیا گیا تھا۔
"بچے اپنی ماؤں ہی کو تنگ کیا کرتے ہیں آئی تھنک۔" معیز نے اپنا کپ اپنے آگے گھسیٹا۔
"تنگ کرنے اور زندگی اجیرن کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے عمر اس سے کہو۔" سفینہ بیگم چیخ کر بولیں۔
"بہت خوب... تو اب یہ ہمارے درمیان "آربیٹر" کا رول پلے کرے گا۔"
"کم آن معیز... پھپھو نے بتائی ہے مجھے ساری بات، ختم کرو اس قصے کو یار..."
عمر لاابالی تھا۔ سو اس کے مشورے بھی ایسے ہی تھے چٹکی بجا کے یہ کرنے اور چٹکی بجا کے وہ کر دینے والے۔

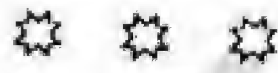
"وہ میرا مسئلہ ہے۔ تم بیچ میں مت پڑو۔ اس کام کے لیے تو نہیں آئے ہو گے تم؟" معیز نے طنز کیا۔
"اوہ نو۔ میں تو لمبی چھٹیاں گزارنے آیا ہوں پاکستان۔" وہ اطمینان سے بولا۔ مگر اس کی چمکتی آنکھیں اس کی بات کی نفی کررہی تھیں۔
معیز کو کوفت کا احساس ہوا۔ عمر کا لاابالی پن اور شرارتیں کسی زمانے میں معیز کو بہت اچھی لگا کرتی تھیں، لیکن اب اگر وہ ماما کے کہنے پر ابیہا والے معاملے میں بھی ٹانگ اڑانے کا ارادہ رکھتا تھا تو یہ اچھی بات نہ تھی۔
معیز کپ خالی کرتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔
"تو ٹھیک ہے، پھر کوشش کرنا کہ اچھی سی "چھٹیاں" ہی گزارو۔" سنجیدگی سے کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا تو سفینہ تلملائیں۔
"دیکھا تم نے۔ اب تو میرا وہم نہیں کہو گے نا تم۔" اور عمر کیا کہتا وہ تو معیز کو اس لڑکی کے ساتھ گاڑی سے اترتے دیکھ چکا تھا۔
"ابھی تو میں یہیں ہوں پھپھو! اچھی طرح دیکھ لوں گا اس کو۔"
اطمینان سے کہا تو وہ اس کے کہے پر اطمینان لے آئیں۔ اپنے بھتیجے کی صلاحیتوں پر انہیں بہت اعتماد تھا۔ باقی کی ساری رپورٹ اسے ایراز اور زارا سے مل گئی تھی۔
"مجھے تو اس بات کی سمجھ نہیں آرہی کہ جب اللہ نے معیز کے لیے ایک راہ متعین کردی ہے تو وہ اس سے بھاگ کیوں رہا ہے؟" یہ عمر کا تجزیہ تھا۔
"ان کی کمٹ منٹ ہے کسی اور سے۔" زارا نے رباب کا نام لیے بغیر دبے لفظوں کہا تو عمر کے لبوں پر محظوظ کن مسکراہٹ پھیل گئی۔
"آئی سی۔"
"لیکن آپ یہ بات انہیں جتایے گا مت عمر بھائی۔" زارا نے اس کی مسکراہٹ کا رنگ جانچتے ہوئے اسے ساتھ ہی متنبہ کردیا تھا۔ عمر نے ہاتھ ہلا کر گویا کان سے مکھی اڑائی۔
"ماما تو ایسے ہی پریشان ہورہی ہیں، جبکہ بھائی کہہ چکے ہیں کہ وہ اس معاملے کو جلد ہی ختم کردیں گے۔"
ایراز کا رویہ حقیقت پسندانہ تھا۔ اسے معیز کی شادی برقرار رہنے سے کوئی ایشو نہ تھا۔
"ہاں۔ میں نے بھی ماما کو سمجھایا ہے۔ جس قسم کے حالات میں بھائی نے یہ قدم اٹھایا، سب ہی جانتے ہیں اور پھر اگر انہوں نے اس شادی کو نبھانا ہوتا تو اسے سیدھا اس گھر میں لاتے، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔" زارا نے کہا۔
"ویسے اگر تم دونوں اس لڑکی کی بات کررہے ہو جسے میں نے پورچ میں دیکھا تھا تو پھر معیز کی بدذوقی پر مجھے کوئی شبہ نہیں کہ وہ اسے چھوڑنا چاہتا ہے۔" عمر نے گہری سانس بھری۔
"ہاں۔ خوب صورت تو بہت ہے وہ۔" زارا نے بھی اعتراف کیا تھا۔
"چلو۔ دیکھتے ہیں پھر ہم کیا کرسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر موضوع بدلتے ہوئے ایراز سے کہا۔
"اور تم چلو میرے ساتھ ذرا۔ عصر کی نماز کے بعد قبرستان جانا ہے میں نے۔ سب عزیز واقارب کی قبروں پر فاتحہ خوانی کرنی ہے۔"
وہ جب بھی پاکستان آتا، یہ اس کا معمول تھا۔ سو ایراز سر ہلا کر وضو کرنے اٹھ گیا۔



"آج ریسٹورنٹ مت آنا تم۔"
ابا نے ناشتے کی ٹیبل پر اخبار پڑھنے کے دوران یوں کہا جیسے اخبار ہی کی کوئی سرخی با آواز بلند پڑھ کے سنائی ہو۔
"یہ کس نے کہا صدر پاکستان نے یا وزیراعظم نے؟" عون یوں چونکا جیسے ان کی بات سمجھ میں ہی نہ آئی ہو۔
بھابھی کی ہنسی اور امی کی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔ ابا نے اخبار نیچے کرکے اسے گھورا تو وہ مؤدب ہوا۔
"یوں ہی... معلومات میں اضافے کے لیے پوچھ رہا تھا۔" اور دل جمعی کے ساتھ فرنچ ٹوسٹ کے ساتھ نبرد آزما ہو گیا۔
"اپنی ماں سے پوچھ لینا آج کا پروگرام... ریسٹورنٹ سے چھٹی ہے تمہاری۔ مزید کوئی سوال مت کرنا۔"
انہوں نے گھما پھرا کر اپنے مخصوص انداز میں رعب سے کہا۔ تو عون نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر معصومیت سے بولا۔
"جی ابا جی... آپ نے کہہ دیا اور میں فوراً" سمجھ گیا۔ لیکن جاننا صرف یہ تھا کہ یہ صرف آج کی چھٹی ہے یا "پکی" والی۔"
"اف..." بھابی نے چہرہ موڑ کر بمشکل ہنسی چھپائی۔
"یہ دیکھ رہی ہو اس نالائق کو۔ مجال ہے، جو سیدھی بات سمجھ جائے۔"
ابا نے ہمیشہ کی طرح امی کو درمیان میں ڈالنا فرض خیال کیا۔ وہ ابا کی پہیلیوں پر پہلے ہی جز بز ہو رہی تھیں، بول اٹھیں۔
"سمجھ تو گیا ہے۔ آپ ہی مشکل باتیں کرتے رہتے ہیں۔ بے چارے سے۔ سیدھے سے کہہ دیتے کہ آج ریسٹورنٹ سے چھٹی کرکے ثانیہ کو ساتھ لے جانا شاپنگ کے لیے۔"
"لو جی۔" عون صاحب کے تو کانوں کے کہیں آس پاس ہی دھماکا ہوا تھا۔
بھابھی نے شوخی سے اسے دیکھا۔ مگر ادھر کہیں "گلاب" کھلے ہوتے تو چہرہ چمکتا نا۔ سنبھلتے ہوئے بولا۔
"وہ کون سا بچی ہے، جو خود سے اپنی شاپنگ نہیں کر سکتی۔"
"اب یہ بھی آپ سمجھائیں گی اسے یا پھر میں ہی زحمت کروں؟" ابا نے طنزاً" امی کو مخاطب کیا تو انہوں نے عون کو گھور کے دیکھا۔
"بیٹا... یہ تم دونوں کی شادی کی شاپنگ ہے۔ میرا دل تھا کہ کپڑا اور زیور ثانیہ کی پسند کا ہی آئے۔"
"تو آپ لے جا کے دلوا دیں نا۔ میں کون سا شاپنگ ایکسپرٹ ہوں۔"
عون نے صاف جواب دیا تھا۔ بھابھی کھنکھاریں۔
"میں ساتھ جانے والی تھی عون، لیکن دونوں ہی بچوں کی طبیعت ذرا ٹھیک نہیں ہے۔ تم ثانی کو لے جا سکتے ہو۔"
بھابھی نے جس انداز میں لفظوں پر زور دے کر کہا عون بخوبی سمجھا۔
مگر وہ کیا کرتا۔ مجبوری بن آئی تھی۔ وہ دل ہی نہیں رہا تھا۔ جو اس کے ساتھ کو "خوش خبری" سمجھ کر کھل اٹھتا۔ پہلے یہ موقع ملا ہوتا تو وہ سر کے بل چل کے ثانی کے ساتھ جاتا۔ مگر اب تو فی الحال دل کے تار بالکل خاموش تھے۔ کسی بھی ردھم کو چھیڑنے میں ناکام۔
"میں یہ سر کھپائی نہیں کر سکتا بھابی! آپ کسی اور دن کا پروگرام رکھ لیں۔ بچے بھی تب تک ٹھیک ہو جائیں گے۔"
عون کے صفاچٹ جواب پر ابا، امی اور بھابھی نے جس طرح بے یقینی سے گھور کے اسے دیکھا وہ گڑبڑا سا گیا۔

"میرا مطلب ہے کہ لیڈیز کی شاپنگ میں میرا کیا کام؟" معصوم شکل بنا کر جواز پیش کیا۔
ابا لمحہ بھر اسے گھور کر گویا اس کے "پوشیدہ عزائم" کا اندازہ کرتے رہے' پھر اخبار تہ کرکے رکھتے ہوئے اطمینان سے بولے۔
"شاپنگ وہ کرے گی اپنی پسند کی۔ تم صرف ڈرائیور کے طور پہ اس کے ساتھ جاؤ گے۔"
"لو جی۔۔۔" ابا تو عزت کا بھرتا بنانے کے ماہر تھے۔ بھابھی قہقہہ لگا کے ہنسیں۔
"آپ بڑا اچھا پیسٹ استعمال کرنے لگی ہیں۔ دانت چمکانے کا کوئی موقع جانے نہیں دیتیں۔"
ابا کے اٹھتے ہی ضبط کرکے بیٹھا عون بھابھی سے الجھنے لگا تو وہ اور ہنسیں۔
"عزت راس نہیں آئی تمہیں۔ اچھا بھلا موقع مل رہا ہے شادی سے پہلے ملاقات کا اور تم ہو کے دے بہانے پہ بہانہ۔"
"کوئی ناراضی تو نہیں کرر کھی ثانی سے۔" امی کو یوں ہی خیال سا گزرا۔
"کوئی نہیں۔۔۔ ناراضی ہوتی تو آپ کی بہو رانی کے تیور ہی ظاہر کردیتے۔ اس نے تو ادب سے سر جھکا کے رخصتی کی ہاں بھری ہے۔"
بھابھی نے مسکرا کر ثانیہ کی تعریف کی تو عون کا دل سلگا۔ کیسے وہ سب کی نظروں میں معتبر بن بیٹھی تھی۔ اب اگر عون اعتراض کرتا تو ساری بات عون پر ہی آنے والی تھی۔ ثانیہ نے تو فرماں برداری سے سر جھکا دیا تھا۔ وہ دانت پیس کے رہ گیا۔
"اچھا۔۔۔ لے جاؤں گا شہزادی صاحبہ کو شاپنگ پہ۔۔۔ بلکہ ابا کہیں تو شہزادی صاحبہ کے وزٹ کے لیے شاپنگ مال بھی خالی کروالوں گا۔ سیکیورٹی کے پیش نظر۔"
"ہاں۔۔۔ تمہاری اتنی اوقات۔۔۔ جتنا کہا ہے اتنا ہی کرو۔۔۔ اور ڈرائیونگ دھیان سے کرنا۔"
ابا ریسٹورنٹ کے لیے نکل رہے تھے۔ طنزا" ہنکارہ بھرتے ہوئے بولے تو وہ تلملا اٹھا۔
مگر اب کی بار ابا کے جانے کا پکا یقین کرلینے کے بعد اگلا جملہ بولا۔
"ایک ابا اور دوسری ابا کی بھانجی۔۔۔ فوٹو کاپی ہیں ایک دوسرے کی۔"
"وضاحت کرو۔۔۔ وضاحت۔"
بھابھی نے شور مچایا۔ امی کو تو سمجھ ہی نہیں آئی تھی۔ وہ بھابھی کو منہ چڑاتا اٹھ گیا۔
ابھی جا کے ثانی سے دو دو ہاتھ کرنے تھے' اسے خیال آیا اچھا خاصا موقع مل رہا تھا۔ ثانیہ سے بات کرنے' بلکہ اس کا دماغ درست کرنے کا۔
معیز اور ایبہا کی ٹائمنگ میں فرق کی وجہ سے معیز نے ڈرائیور کو کہہ دیا کہ وہ ایبہا کو اکیڈمی پک اینڈ ڈراپ کردیا کرے۔ سفینہ بیگم تک یہ بات پہنچی' اب انہوں نے جانے کیسے برداشت کرلیا یا شاید وہ سب اپنے بھتیجے پر چھوڑ بیٹھی تھیں' جو انہیں "سب ٹھیک ہو جائے گا" کا اشارہ دے رہا تھا۔ معیز نے آفس جا کے ایبہا کو کال کی۔
"ڈرائیور سے کہہ دیا ہے میں نے ایڈریس بھی سمجھا دیا ہے۔ باقی تم دیکھ لینا۔"
"جی۔۔۔ شکریہ۔" وہ متشکر تھی۔
اور اب وہ تیار ہو کر بھاگم بھاگ پورچ میں پہنچی۔ رات کے لیے سالن بناتے کافی دیر ہو گئی تھی۔
وہ چلتے چلتے موبائل بیگ میں رکھتی گاڑی تک پہنچی تو فائل گرتے گرتے بچی۔ ڈرائیور نے اسے دیکھ کر ہی گاڑی اسٹارٹ کی تھی شاید۔
وہ پچھلا دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گئی' اور نوٹس کو سمیٹ کر ٹھیک سے پن اپ کرکے فائل میں سیٹ کیا۔

ڈرائیور گاڑی مین روڈ پر لے آیا اور اب وقتاً "فوقتاً" اسے بیک مرر میں سے دیکھ بھی رہا تھا۔
وہ فائل سیٹ پر رکھتی سیدھی ہو کر بیٹھی تو نظر بالکل غیر ارادی طور پر بیک مرر میں جھانکتی ڈرائیور کی نظروں سے جا ٹکرائی۔
ابیہا نے سٹپٹا کر نظریں کھڑکی سے باہر مرکوز کر دیں۔ اب تو ابیہا کو بھی اکیڈمی کا راستہ یاد ہو گیا تھا۔ سو اس روڈ پر آتے ہی اس نے ڈرائیور کو باقی کا پتا سمجھایا اور اشارے سے بورڈ بھی دکھا دیا اکیڈمی کا۔
وہ نیچے اتری تو ڈرائیور بھی دروازہ کھول کے نیچے اترا۔
"واپسی کب ہو گی میڈم؟" یہ لب و لہجہ۔ ڈیسنٹ اور شائستہ۔
ابیہا نے بے تحاشا چونک کر دیکھا تو خوش شکل اور خوش لباس سا بندہ۔ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔
"آپ۔ ڈرائیور تھے۔؟" (میرے کہنے سے باز ہی رہی) ڈرائیور نے ادب سے سر جھکایا۔
"جی میڈم! کتنے بجے پک کرنے آؤں آپ کو؟"
واپسی کا وقت بتا کر وہ اپنی حواس باختگی کو کوستی جلدی سے پلٹ کر گیٹ میں داخل ہو گئی۔
ڈرائیور کے ہونٹوں پر پراسراری مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ ادھر ادھر نگاہ ڈالتا گاڑی میں بیٹھ گیا۔



"اللہ کا واسطہ ہے ثانی۔ اچھی سی شاپنگ کرنا۔ شادی کے بعد میلاد ہی نہیں شادیاں بھی اٹینڈ کرنی ہوتی ہیں۔ کوئی شوخ سے رنگ لینا۔"
خالہ کی ہدایات کا سلسلہ ثانیہ کو ہدایات کم اور طنز زیادہ لگ رہا تھا۔
"میرے خیال میں شاپنگ پہ آپ ہی چلی جائیں۔" ثانیہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تو وہ تحمل سے بولی۔ مگر ادھر بھی اسی کی خالہ تھیں اطمینان سے بولیں۔
"تازیہ کی شادی سے آکے جس طرح تم کپڑوں کے معاملے پہ اچھلی کودی تھیں اسی کے پیش نظر کہہ رہی ہوں کہ گرمیوں کے لیے لان اور سردیوں کے لیے لینن کاٹن نہ اٹھا لانا۔"
گاڑی کے ہارن پر وہ خالہ کو خفگی سے دیکھتی' جلدی جلدی بالوں کو پونی میں قید کرنے لگی۔ خوب صورت بال اب کمر تک آنے لگے تھے۔ اس کے باوجود ثانیہ نے انہیں قینچی نہیں لگائی تھی۔ (عون کو پسند تھے لمبے بال) ورنہ اس سے پہلے تو وہ شانوں سے نیچے تک بڑھاتی اور بس۔ باقی کٹوا دیتی کہ سنبھالے نہیں جاتے۔
اب تو بال ہوں یا بات۔ سب سنبھالنا آگیا تھا۔ گاڑی کا ہارن اب مسلسل بجنا شروع ہو گیا تھا۔
"نہ بھابھی میں صبر ہے نہ ان کے دیور میں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بھاگی۔
وہ گیٹ سے باہر گاڑی لیے کھڑا تھا۔ ثانیہ کو غصہ آیا اسے دیکھ کر بھی ہارن پر سے ہاتھ نہیں اٹھایا تو وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے طنز سے بولی۔
"ہارن نیا لگوایا ہے یا تم پہلی بار بجا رہے ہو۔؟"
"بے فکر رہو۔ تمہارے لیے نہیں۔ کسی اور کے لیے بجا رہا تھا۔"
وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اطمینان سے سامنے ٹیرس پر جنگلے سے لٹکتی خوب صورت دوشیزہ کو دیکھتے ہوئے بولا تو ثانیہ کا دل جل کر رہ گیا۔
یہ تو طے تھا کہ آج کا دن بڑا "یادگار" گزرنے والا تھا دونوں ہی کا۔
"نبھا بھی نہیں آئیں۔ مجھے تو ان کے ساتھ جانا تھا شاپنگ کے لیے۔" ثانیہ نے ماتھے پہ تیوری رکھتے ہوئے

یوں کہا جیسے عون کے ساتھ جانا پتا نہیں کتنا ناگوار ہو۔وہ بھی تپا۔ مگر اطمینان سے بولا۔
"وہی آرہی تھیں ابا نے زبردستی یہ "بلا" میرے سر منڈھ دی۔"
ثانیہ کا سر گھوما۔ مگر قدرے توقف سے وہ بولا۔
"شاپنگ کو کہہ رہا ہوں۔"
اب جس کو بھی کہہ رہا ہو' ثانیہ کے دل کو تو لگ ہی چکی تھی۔
"شادی کا شوق تو تھا نہیں تمہیں پھر یہ شاپنگ کا شوق کیوں؟"
عون تو پتا نہیں کیا سوچ کر آیا تھا۔ مگر ثانیہ نے بھی گویا قسم ہی کھالی تھی' کہ کم از کم وہ رخصتی سے انکار نہ کرے گی۔ عون کو کرنا ہو تو کرے۔
"یونہی۔ سوچا شادی نہ سہی' کم از کم شاپنگ تو اپنی پسند کی ہونی چاہیے۔"
"اوہو۔ تو یہ بھی ارمان تھا۔ پسند کی شادی کا۔" عون نے بات اچکی۔ تو وہ برجستہ بولی۔
"ہاں۔ جیسے تمہیں تھا۔" ان ڈائریکٹ ارم والا طعنہ۔ عون اندر ہی اندر تلملایا۔
"دیکھو ثانی۔ تم نا صرف میری بلکہ اپنی بھی زندگی برباد کرنے پر تلی ہوئی ہو۔ انکار کردیتیں تو ہم دونوں ہی خوش رہتے۔"
ضبط کرتے ہوئے سرد مہری سے کہا تو وہ خاموشی سے پورا باہر دیکھتی رہی جیسے "ثانی" کوئی اور ہو۔ (تو وہ اس کے "بغیر" خوش رہنا چاہتا تھا)
ثانیہ نے لب بھینچے۔
خاموشی بسا اوقات بدگمانیوں کو بڑھا دیتی ہے۔ بات کرنے سے دل کی بھڑاس بھی نکلتی ہے اور دل میں پلتی بدگمانیاں بھی۔ سو جہاں ضرورت ہو وہاں بات ضرور کرنی چاہیے۔ تاکہ بھڑاس بھی نکلے اور بدگمانی بھی۔
دونوں ایک ساتھ مگر دونوں کی سوچ الگ الگ محو سفر تھی۔ ثانیہ نے بہت برے دل کے ساتھ شاپنگ کی اور عون بھی ساتھ یونہی چلتا رہا جیسے شاپنگ بیگز پکڑنے آیا ہو اور بس۔
آئندہ زندگی کا نقشہ ان دونوں کے سامنے واضح ہو کر آگیا تھا ثانیہ کے خود سر انداز نے عون کی بدگمانی کو مزید بڑھایا تھا۔



ڈرائیور گاڑی کو اکیڈمی سے آگے لیتا چلا گیا تو ابیہا جو انہماک سے گزرتے نظاروں کو کھڑکی سے دیکھ رہی تھی چیخ اٹھی۔
"روکو۔ روکو گاڑی کو۔"
ڈرائیور نے فوراً" بریک پر پاؤں رکھ دیا۔
"کیا ہوا میڈم۔؟" وہ مڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔
"اکیڈمی پیچھے رہ گئی ہے۔ گاڑی کہاں لیے جارہے۔؟"
ابیہا نے اسے احساس دلایا تو وہ چونک کر ارد گرد یوں دیکھنے لگا جیسے اسے پتا ہی نہ ہو۔ چار دنوں سے وہ اسے پک اینڈ ڈراپ کر رہا تھا۔ اور آج ایسی سنگین غلطی۔
"سوری میڈم۔ آج دراصل پریشانی کا شکار تھا۔ ذہن الجھا ہوا تھا اس لیے۔ سوری اگین۔"
وہ شرمسار سا معافی مانگنے لگا۔ ابیہا کا دل موم ہونے لگا۔

"کوئی بات نہیں۔ گاڑی پیچھے موڑ لو۔"
وہ چپ چاپ گاڑی موڑنے لگا۔ پھر رہ نہیں سکا تو شکوہ کناں انداز میں بولا۔
"میڈم! آپ نے ایک بار بھی میری پریشانی کے بارے میں نہیں پوچھا۔"
ایہا کے لیے اس کی بات بلکہ شکوہ انتہائی غیر متوقع تھا۔ پھر بھی وہ خفت کا شکار ہوئی۔
"مجھے کسی کے پرسنلز کے متعلق پوچھنا اچھا نہیں لگتا۔"
"غریب آدمی کا تو کچھ بھی پرسنل نہیں ہوتا میڈم۔" وہ آہ بھر کے بولا تو ایہا نے اس کی پشت کو گھورا۔ مہنگی کٹنگ، بہترین برانڈ کے کپڑوں اور جوتوں میں ملبوس۔ وہ گاڑی کے علاوہ کہیں اور ایہا کو نظر آتا تو وہ اسے ڈرائیور تو قطعی نہ سمجھتی۔
وہ بیک ویو مرر میں سے ایہا کو اپنا جائزہ لیتے دیکھ چکا تھا۔ بول اٹھا۔
"میرے حلیے پر مت جائیں میڈم۔ معیز صاحب کا ڈرائیور ہوں۔ ان کے اسٹینڈرڈ کے مطابق رہنا پڑتا ہے مجھے۔" اس کے انداز میں بے چارگی تھی۔
"مسئلہ کیا ہے۔ آئی مین کیا پریشانی ہے تمہیں؟" ایہا کو تو ہر غریب آدمی قابل ہمدردی ہی لگتا تھا۔ وہ جس بھوک اور افلاس کو دیکھ آئی تھی وہاں سے ہر ایک کو اٹھا لینا چاہتی تھی۔
آگے سے ڈرائیور نے گھریلو حالات کی تنگی، بہن کی شادی اور الابلا مسائل کا ڈھیر اس کے سامنے یوں لگا دیا جیسے وہی اس کی مالکن ہو۔
اور مالکن صاحبہ نے بھی اترتے ہوئے کمال فراخ دلی سے پانچ ہزار کا نوٹ ڈرائیور کو مرحمت فرما دیا۔
ڈرائیور کا منہ حیرت کے مارے کھلے کا کھلا رہ گیا۔
"دیکھیں محترمہ! میں۔"
"کچھ مت کہو۔ فی الحال میرے پاس یہی تھے رکھ لو۔ جب تمہاری بہن کی شادی ہوگی تو مجھے بتانا۔ میں کچھ کروں گی اس کے لیے۔"
وہ ہمدردی سے کہتی اسے مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر گیٹ سے اندر داخل ہوگئی۔ ڈرائیور نے نوٹ الٹ پلٹ کر جائزہ لیا لگ تو اصلی ہی رہا تھا۔ وہ متاثر سا گاڑی میں جا بیٹھا اور۔
گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس "مہربان پری" کے متعلق سوچتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔



رباب کا رزلٹ آؤٹ ہو گیا تھا۔ اور رزلٹ دیکھ کر رباب کا دماغ ہی آؤٹ ہو گیا۔ پوزیشن ہولڈر رہنے والی اسٹوڈنٹ اسٹیٹس میں اڑتے اڑتے بچی تھی۔ باقی سبجیکٹس میں اچھے مارکس تھے مگر اس بار اس کی کوئی پوزیشن نہیں بنی تھی۔
کلاسز بنک کرنا، کالج آورز میں اپنے "ٹارگٹ" پورے کرنا۔ ساری خرافات رزلٹ والے دن رنگ لائی تھیں۔
گھر والوں کی سخت سست سننا پڑیں اور اس نے بھی سب کو منہ توڑ جواب دیے۔
"بہت بڑھتی جا رہی ہو تم رباب۔ ذرا رنگ ڈھنگ بدلو اپنے۔ باپ بھائیوں نے سر پہ چڑھا رکھا ہے تمہیں۔"
ماں نے اس کے لاڈلے پن کو ایک طرف رکھتے ہوئے اچھی طرح جھاڑا تھا۔

"فار گاڈ سیک ماما۔ مجھے اپنے طور سے اپنی زندگی جینے دیں۔ میری زندگی میں اپنے فل اسٹاپ اور کوماز لگانے کی کوششیں مت کریں۔" وہ بد تہذیبی سے بولی۔

اسے حیرت ہوئی۔ اسے مختلف چیلنجز دینے والی اور ہر ٹارگٹ کے لیے بک اپ کرنے والی اس کے گروپ کی تینوں لڑکیوں کے بہت اچھے مارکس آئے تھے۔

اب جو بھی ہوا ہو۔ گھر والوں کو جتنے بھی منہ توڑ جواب دیے ہوں مگر اس کا دل بجھ گیا تھا۔

سفیر احسن کا فون آیا۔ اس نے ڈانٹا تو نہیں مگر حیرت زدہ وہ بھی بہت تھا۔ اس نے رباب کو پڑھائی کی طرف دھیان دینے اور آگے ایڈمیشن لینے پر لمبا سا لیکچر دیا تھا۔ سو آج رباب کا موڈ بہت خراب تھا۔ اسے اس وقت کسی اچھے دوست کی بہت سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے معیز کو کال کی۔

پہلے دو بار تو اس نے کال اٹینڈ ہی نہیں کی۔ تیسری بار اٹینڈ کی بھی تو مختصر سا جواب دیا۔

"سوری۔ اس وقت ارجنٹ اینڈ امپورٹنٹ میٹنگ ہے' بعد میں بات کروں گا۔"

وہ لائن ڈراپ کر چکا تھا اور رباب کا چہرہ مارے ہتک کے تپنے لگا۔

معیز نے اس کا ایک لفظ بھی سننے کی زحمت نہ کی تھی' اسے اپنا آپ کسی فقیرنی سے مشابہ لگا۔ جو بھیک کے لیے کسی کے پیچھے بار بار لپکتی ہے اور وہ اسے بار بار دھتکارتا ہے۔

اسے خود سے نفرت محسوس ہوئی۔

میں اس قدر گر گئی ہوں۔ میں۔ جس کے ایک اشارے پر لڑکے دم ہلاتے چلے آتے ہیں۔ اور یہ معیز احمد۔ آئی ہیٹ ہم۔

اسے معیز احمد سے اچانک نفرت محسوس ہوئی۔

وہ چاہنے والا ہی کیا جسے میں پکاروں اور وہ سر کے بل حاضر نہ ہو۔ اس کی کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ اس نے سیفی کو کال کی۔

"ڈارلنگ۔ میں تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔" وہ کھل اٹھا۔ رباب کو ڈھارس ملی۔

"کیا کر رہے ہو؟"

"ایک بزنس ڈیلی گیشن کے ساتھ میٹنگ ہے' بس اس کے بعد فری ہوں۔" وہ چہکا۔

"کینسل کر دو سیفی۔ امیرے لیے۔ میں فوری طور پر تم سے ملنا چاہتی ہوں۔"

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی تو دل کہیں اتھاہ گہرائی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

"آر یو اوکے سویٹ ہارٹ۔؟" وہ پریشان ہوا۔

"تمہاری میٹنگ۔؟" رباب نے پوچھنا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

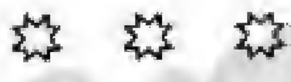
"بھاڑ میں گئی میٹنگ اور فارن ڈیلی گیشن۔ تم بتاؤ کہاں ہو؟ میں آرہا ہوں ابھی۔"

اس کے انداز میں اس قدر بے تابی تھی کہ رباب جیسے زندہ ہو اٹھی۔ امید و ناامیدی کے سمندر میں ڈبکیاں کھاتا دل' نئے خون سے بھر کر توانا ہوا تھا۔

"اور تمہیں تو میں کبھی معاف نہیں کروں گی معیز احمد۔" تیار ہوتے ہوئے اس نے کئی بار سوچا تھا۔

وہ کینہ پرور تھی۔ اپنے سود و زیاں کا حساب رکھتی تھی اور بس۔ اس وقت اسے ذہنی و جذباتی سہارے کی ضرورت تھی' معیز سے نہ مل سکا تو وہ چٹکی بجاتے دل سے اتر گیا۔ اس نے بے پناہ جذباتیت اور انا پرستی سے کام لیتے ہوئے آج سے معیز احمد کو اپنی "ہٹ لسٹ" میں رکھ لیا تھا۔

"کون تھی ؟"
میم نے فون بند ہوتے ہی استفہامیہ انداز میں سیفی کو دیکھا تو وہ معنی خیزی سے مسکرا دیا۔
"بلبل نوخیز تھی۔ رباب احسن۔"
میم کے ہونٹوں پر محظوظ کن مسکراہٹ پھیل گئی۔
"ہوں۔ تو یہ فارن ڈیلی گیشن سے میٹنگ کے بھرم اسے کرائے جا رہے تھے۔"
"چڑیا خود جال میں پھنسنے کو تیار ہے میم۔ اوہ سوری آپا۔"
وہ ذو معنی انداز میں کہتے ہوئے آخر میں جلدی سے تصحیح کرتے ہوئے بولا تو میم نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ پھر اسے تنبیہہ کرتے ہوئے قدرے سنجیدگی سے بولیں۔
"اس بار بی کیئر فل سیفی۔ چڑیا اڑنے نہ پائے۔ وہ لڑکی ایبہا یاد ہے نا کیسا دھوکا دے گئی تھی۔"
"وہ ناکامی تو میرے دل پہ لکھی ہوئی ہے میم۔ ڈونٹ وری اس بار بہترین "پیس" ہے۔ سب ازالہ ہو جائے گا۔"
سیفی نے انہیں تسلی دلائی۔ تو انہوں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔



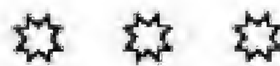
میٹنگ سے فارغ ہو کر اپنے آفس کی طرف آتے ہوئے اس نے کتنی ہی بار رباب کا نمبر ملایا مگر دوسری طرف سے کال اٹینڈ نہیں کی گئی تو وہ جھنجلا سا گیا۔
"شٹ یار۔ ایک تو غصہ اس لڑکی کی ناک پہ دھرا رہتا ہے۔ ذرا جو سمجھ داری اور ٹھنڈے پن سے کام لیتی ہو۔"
وہ جلتا کڑھتا اپنی چیزیں سمیٹتا۔ آفس سے نکل آیا۔ راستے میں رباب کی ناراضی دور کرنے کے خیال سے وہ سرخ گلابوں کا بکے لینے کے لیے رکا۔
سگنل پہ گاڑی رکی تو اس نے ایک بار پھر رباب کو کال ملائی، مگر اب کی بار بھی اس نے کال اٹینڈ نہیں کی تھی۔
سگنل گرین ہوا۔ سب گاڑیاں چل پڑیں۔ دفعتاً" اپنے دائیں طرف سے آگے نکلنے والی گاڑی میں بیٹھی لڑکی پر نگاہ پڑی تو وہ حیران سا ہوا۔ مگر ششدر تو تب رہ گیا جب اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کو دیکھا۔ وہ مارے صدمے یا شاید شدید حیرت کے گاڑی چلانا بھول کر دور جاتی گاڑی کو دیکھتا اس معمے میں الجھا تھا۔ پیچھے سے گاڑیوں نے متواتر ہارن بجانے شروع کیے تو وہ ہوش میں لوٹتا جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔



ایبہا ابھی فریش ہو کے واش روم سے نکلی ہی تھی جب اس نے ڈور بیل کی آواز سنی۔
اس کے خیال میں ثانیہ تھی مگر دروازہ کھلتے ہی معیز کو سامنے پا کر وہ حیران ہو گئی۔
"اب سامنے سے ہٹو گی بھی یا یہیں جم کے کھڑی رہو گی؟" وہ اسے "ایستادہ" دیکھ کر چڑتے ہوئے بولا تو ایبہا خفیف سی ہوتی سائیڈ پر ہو گئی۔
وہ سوٹڈ بوٹڈ تھا۔ یعنی آفس سے سیدھا ادھر ہی آ رہا تھا۔
ایبہا کے دل کو انجانی سی مسرت گھیرنے لگی۔ آج کتنے دنوں کے بعد وہ دکھائی دیا تھا۔ وہ آ کر لاؤنج کے وسط میں کھڑا ہو گیا اور ایبہا کو دیکھنے لگا۔ وہ جو اس کے پیچھے ہی آ رہی تھی اپنی جگہ تھم گئی۔ (اور دل بھی)

"آج کہاں گئی تھیں تم۔؟"
وہ پوچھ رہا تھا۔ ایہا نے حیرت سے اسے دیکھا۔
"اکیڈمی گئی تھی۔ ابھی آئی ہوں۔"
"کس کے ساتھ گئی تھیں۔ بلکہ کس کے ساتھ آئی ہو؟"
معیز کے انداز میں محسوس کن سختی تھی۔ ایہا کا دل لرزا۔
"ڈرائیور کے ساتھ۔" اٹک کر کہا۔
وہ دو قدم اس کی طرف بڑھا۔ اب وہ اس کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔
"واپسی پر کس کے ساتھ آئی ہو۔؟"
اس نے پھر سے پوچھا تو ایہا پریشان سی ہو کر بولی۔
"آپ کے ڈرائیور کے ساتھ ہی آئی ہوں۔ آپ پوچھ لیں اس سے۔"
"تم میرے نکاح میں ہو۔ جانتی ہو نا تم۔؟"
معیز نے بے اختیار سخت لہجے میں کہتے ہوئے اسے شانوں سے تھام کر جھٹکا سا دیا تو وہ برافروختہ ہو گئی۔ وحشت زدہ آنکھوں سے اسے دیکھا جو اسے گھورتے ہوئے جیسے سچائی کی تہہ میں اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔
"اور جب تک ہو۔ کوئی بے ایمانی کی تو جان سے مار ڈالوں گا۔"
ایہا کی تو ابھی سے جان نکلنے لگی۔ جانے کیا ہو گیا تھا جو اسے کوئی بھی "لڑکا" ڈھونڈنے کی آزادی دینے والے معیز کو اس قدر بھڑکا گیا تھا۔
"ہوا کیا ہے معیز! میں تو سیدھی گھر آئی ہوں۔" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ لب بھینچے اسے گھورنے لگا حتیٰ کہ وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کے رو دی۔ وہ گہری سانس بھرتا پیچھے ہٹا۔
اس نے کسی کو کال کی۔
"دانیکسی میں آؤ ذرا۔"
ایہا نے سنا وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ اس نے دوپٹے سے چہرہ رگڑا۔ اور معیز کو دیکھا۔
"آپ مجھے ڈرا رہے ہیں۔ کیا بات ہوئی ہے؟" رندھے لہجے میں بولی۔
وہ تنے ہوئے تاثرات لیے یونہی اسے دیکھتا رہا جیسے پولیس اپنے مجرم کو دیکھتی ہے۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔
"آجاؤ!" کوئی اندر آیا تو ایہا بے اختیار معیز کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ وہ کوئی آدمی تھا۔
"میڈم کو پک اینڈ ڈراپ کر رہے ہو تم۔؟" معیز نے سخت لہجے میں پوچھا تو ایہا نے کرنٹ کھا کر معیز کا چہرہ دیکھا۔
"سر جی! میں تو ایک ہفتے کی چھٹی پر تھا۔ میرے ہاں بیٹا ہوا ہے کب سے چھٹی مانگ رہا تھا بیگم صاحبہ نے دے ہی دی۔" وہ خوش ہو کر بولا۔
"ہوں۔ جاؤ تم۔" معیز کی پیشانی پر شکن تھی۔ وہ آدمی چلا گیا۔ ایہا کا دل اتھاہ گہرائی میں ڈوبنے لگا۔
"یہ ڈرائیور تھا۔"
معیز نے جتانے والے انداز میں کہا تو وہ ششدر رہ گئی۔ اگر یہ ڈرائیور تھا تو ایک ہفتے سے وہ کس کے ساتھ سفر کرتی رہی تھی؟؟
"اب تم بتاؤ۔ تم کس کے ساتھ آتی جاتی رہی ہو؟" معیز نے سختی سے پوچھا تو اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ

صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔ چند ثانیوں تک وہ اسے گھورتا رہا۔
"مجھے نہیں پتا۔ اس دن میں پورچ میں گئی تو کوئی اور ڈرائیور گاڑی میں بیٹھا تھا۔ وہی مجھے پک اینڈ ڈراپ کرتا تھا۔"
ایبہا کی رنگت سفید پڑ گئی۔ وہ در حقیقت بہت خوف زدہ ہو چکی تھی۔ اس کی بات سن کر۔
معیز کو فوراً" ہی سارا معاملہ سمجھ میں آگیا۔
"اس کی تو۔" وہ لب بھینچتا تیز قدموں سے نکل گیا تھا۔ ایبہا متحیر اور پریشان سی دروازے تک آئی۔ وہ تو سارے معاملے کو قطعا" سمجھ نہیں پائی تھی۔
وہ سیدھا ٹی وی کے سامنے نیم دراز پائن ایپل سے شغل کرتے عمر کے سر پر جا پہنچا۔
چند لمحے اسے گھور کے دیکھا تو اس نے ناچار ٹی وی اسکرین پر سے نظر ہٹائی۔
"پائن ایپل چاہیے۔؟" اس نے پائن ایپل کا ٹکڑا کانٹے میں پھنسا کر اسے دکھایا۔
"یہ کیا کھیل شروع کر رکھا ہے تم نے عمر۔؟" معیز نے دانت پیسے۔
"کیا۔ کون سا کھیل؟" عمر نے چونکنے بلکہ حیران ہونے کی بھونڈی اداکاری کی۔ تو معیز کو اور غصہ آیا۔
"تم ایبہا سے دور رہو عمر! وہ میری بیوی ہے۔" بھینچے بھینچے لہجے میں کہا۔ عمر کی فطرتی طبیعت سے اس سے زیادہ اور کون واقف تھا۔
عمر نے پرسکون انداز میں اسے دیکھا اور اطمینان سے بولا۔
"ہاں۔ وہ بیوی جسے تم کسی بھی وقت چھوڑنے والے ہو۔" عمر کے انداز میں پتا نہیں کیا تھا جس نے معیز کو بھک سے اڑا دیا۔
وہ کم از کم ایک گھونسا تو اس کے منہ پر دے ہی مارتا اگر خود پر ضبط نہ کرتا۔
"میں نے کہا نا عمر۔ اس سے دور ہو۔ جب تک وہ میرے نکاح میں ہے۔" انگلی اٹھا کر سرسراتے لہجے میں کہا تو عمر نے معصومیت سے پوچھا۔
"پھپھو تو کہہ رہی تھیں جونہی وہ کسی اور کو پسند کرلے گی شادی کے لیے۔ تم اسے چھوڑ دو گے۔"
"مگر وہ" کوئی اور "تم ہرگز نہیں ہو عمر۔ سمجھے تم۔" وہ دھاڑ کر کہتا ٹھوکروں سے چیزیں اڑاتا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔
اس کے پاس وقت نہیں تھا غور کرنے کے لیے آخر اسے اتنا غصہ کس بات پر آرہا ہے؟
عمر کے ہونٹوں پر محظوظ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ٹی وی کا والیم بڑھا کر وہ پھر سے اپنے پائن ایپل کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔



وہ چھٹی کے وقت اکیڈمی سے نکلی اور ڈرائیور کو ادھر ادھر تلاشا۔ وقت دیکھا تو ابھی دس پندرہ منٹ باقی تھے۔
اسے کوفت ہوئی۔ آج معیز نے خود خاص طور پر اسے ڈرائیور کے ساتھ بھیجا تھا۔
اور ایبہا نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ کسی نقصان سے بچ گئی تھی۔
"ہیلو ایبہا مراد۔" مردانہ لہجہ اس کے پاس گونجا تو کرنٹ کھا کر مڑ کے دیکھتے اس کی جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔
(باقی آئندہ ماہ انشاء اللہ)

صدف آصف

یہ چھوٹو چھوک



"اے بہنا کے (کیا) پوچھتی ہو؟ وہ بڑے بیٹے منوا کی پیدائش پر چمائن (دائی) کا سارا خرچہ ہمارے باوا نے اٹھایا اور تو اور ہماری ساس نے منہ کھول کر بڑا کی پیدائش پر "مبارکی" بھی مانگ لی۔ بس باوا نے فوراً ہی بیس کلو آٹا' پانچ کلو گھی' دس کلو چینی' چار کلو میدہ اور زچہ بچہ کی مالش کے لیے پانچ کلو سرسوں کا تیل اور ڈھیر سارا خشک میوہ خرید کر سسرال بھجوا دیا۔"

رئیس النساء خالہ نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ وہ حاضرین محفل کے ساتھ خود بھی ماضی کی یادوں سے محظوظ ہونے لگیں۔ رقیہ خاتون نے آنکھیں نچا کر اپنی بہو اسماء کو دیکھا' جو ٹھوڑی پر ہاتھ دھرے تائی ساس کی بہن کی باتیں دلچسپی سے سن رہی تھی۔ انہوں نے مسکرا کر دل ہی دل میں جٹھانی کی چھوٹی بہن کے انداز بیاں کو سلام پیش کیا۔

رئیس النساء اپنے میاں کے ساتھ انڈیا سے پاکستان رشتے داروں سے ملنے ملانے اور گھومنے پھرنے آئی ہوئی تھیں۔ انیس النساء نے آج چھوٹی بہن کے اعزاز میں دعوت رکھی تھی' بہو کے اصرار پر انہوں نے اوپری منزل پر رہنے والی اپنی جٹھانی' جن سے ان کا ہمیشہ کا کانٹے کا بیر تھا اور چھوٹی بیٹی سیما کو بھی کھانے پر بلا لیا' بڑی بیٹی نیما تو بیاہ کر دوسرے شہر چلی گئی تھی۔ مہینوں بعد میکے آنا ہوتا' جس کا قلق انیس النساء کو اپنے گھر ہونے والی ہر تقریب کے موقع پر ہوتا۔

"واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ ریان دلہن۔۔۔ جی خوش کر دیا۔"
علیم خالو نے زریں کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ

رکھا۔ انیس النساء کی نئی نویلی بہو زریں کے ہاتھ میں بڑا ذائقہ تھا' اس کا پکایا ہوا مزیدار مچھلی پلاؤ' اچار گوشت اور شاہی ٹکڑے کھانے کے بعد سب پر ایسی سستی چھائی کہ وہ سب بڑے کمرے میں ہی بیٹھ گئے۔

"ہماری بہو... پکاتی ہی اتنا اچھا ہے۔" اقبال احمد نے مسکرا کر کہا۔ وہ بھی اپنے ہم زلف کو کمپنی دینے ان کے برابر میں آبیٹھے۔ ریان نے پیار سے بیوی کو دیکھا' جس کی تعریف کرتے ہوئے علیم خالو نے پانچ سو کا

نوٹ انعام کے طور پر اسے زبردستی تھما دیا۔ میاں بیوی کا رشتہ بھی کتنا عجیب ہے نا' نکاح کے بولوں میں ایسا جادو پایا جاتا ہے کہ دو الگ الگ ماحول کے رہنے والے اس پیارے سے بندھن میں بندھ کر ایک جاں ہو جاتے ہیں' ایک کو دکھ پہنچتا ہے تو دوسرا تڑپ اٹھتا ہے' اور دوسرے کی تعریف پر پہلا فخر محسوس کرنے لگتا ہے مگر یہ ان کے ساتھ ہی ہوتا ہے' جو دل سے اس رشتے کی اہمیت کو مان لیں۔

زریں ماں بننے والی تھی۔ صبح سے دعوت کے انتظام میں مصروف رہنے کی وجہ سے تکان سے اس کی پھول سی من موہنی صورت کملا گئی تھی' ریان کو بیوی پر ایک دم ترس آگیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے اس کے سامنے ہی زریں کو کمزوری اور لو بلڈ پریشر کی وجہ سے مسلسل کھڑے رہنے سے منع کیا تھا۔ وقفے وقفے سے آرام کی تاکید بھی کی تھی' مگر وہ سب کی خوشی کے لیے ایک پاؤں پر کھڑے رہتی۔ ریان نے فکر مندی سے زریں کو دیکھا اور تخت پر سے گاؤ تکیہ اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے مسکرا کر شوہر کو دیکھا اور تکیہ سے کمر ٹکا کر آسودگی کا سانس لیا۔ بعض اوقات بڑی سے بڑی دولت بھی انسان کو وہ خوشی نہیں دے پاتی' جو کسی کے محبت بھرے جملے یا چھوٹے سے پر خلوص عمل سے حاصل ہو جاتی ہے' ریان کی آنکھوں سے ٹپکتی محبت سے زریں کی روح تک میں سرشاری دوڑ گئی۔

انیس النساء کی توجہ ان دونوں کی طرف ہی تھی۔ انہیں بیٹے بہو کی دلداریاں ذرا جو بھاتی ہوں' لیکن وہ ہی ماں تھیں' جو بیٹی کے حاملہ ہونے پر اسے بہانے بہانے سے میکے بلوا لیتیں تاکہ وہ اس حالت میں زیادہ سے زیادہ آرام کر سکے' مگر ساس بنتے ہی بہو کے لیے ان کے نظریات میں تبدیلی آگئی زریں کی طبیعت کی خرابی انہیں معمول کی بات لگی۔

"ارے کیا ہم نے بچے پیدا نہیں کیے۔" وہ اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے اسے ذرا رعایت دینے کو تیار نہ تھیں' ان کی ساس آج کل اپنی بیٹی کی طرف گئی ہوئی تھیں۔

مردوں کو چائے کی طلب نے بے چین کرنا شروع کر دیا' اس سے قبل کہ زریں اٹھتی' اقبال احمد نے فوراً" ہی سیما کو چائے بنانے کا کہہ دیا' انیس النساء نے شوہر کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھا' مگر اتنے لوگوں کے بیچ کیا بولتیں ویسے بھی سامنے اکڑو بہنوئی بیٹھے تھے' وہ جب بھی پاکستان آتے سالی کی دہری پالیسی پر انہیں تنقید سے نوازتے اس لیے چپ رہنے میں ہی عافیت جانی۔

سیما باپ کی فرمائش پر بڑے ناز نخروں کے بعد چائے بنانے کچن کی طرف چل دی' لیکن اب لگ رہا تھا کہ پائے گلا رہی تھی۔ ویسے بھی ویک اینڈ تھا کافی عرصے بعد خالہ سے ملاقات ہوئی' تو سب ان کے گرد ڈیرہ جمائے خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔ ساتھ ہی ان کی انڈیا سے لائی ہوئی سوغاتیں' میٹھی ناریل گری' کھانے کا حلوہ' چیوڑا اور آم پاپڑ بھی چٹخارے لے کر کھایا جا رہا تھا' جو زریں اور اسماء نے پلیٹوں میں لا کر سب کے بیچ میں رکھ دیے۔

رئیس النساء بھی لگے ہاتھوں اپنے شہر بنارس کے قصے سنانے میں مشغول ہو گئیں' ان کی ہندی ملی اردو سننے میں بڑا مزا دے رہی تھی۔ انیس النساء نے موقع محل دیکھ کر بڑی چالاکی سے باتوں کا رخ اپنی منشا کے مطابق موڑ دیا۔ آخر ریان کے یہاں پہلی اولاد کی آمد متوقع تھی' اس نے شادی پر تو لڑ بھڑ کر بہت سی رسومات کو فرسودہ قرار دے کر ان کے دل کے ارمان پورے ہی نہیں ہونے دیے' مگر قدرت نے انہیں

اب ایک اور موقع فراہم کیا تھا۔

ریان ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتا تھا۔ اس کی پوسٹنگ دو سال سعودی عرب میں رہی واپس پاکستان آیا تو اس کے اندر بہت۔ بدلاؤ آچکا تھا۔ کئی معاملوں میں وہ ماں کو بھی سمجھانے بیٹھ جاتا۔ گھر کا بڑا کماؤ پوت، دادی کا لاڈلا، اقبال احمد بھی ہر معاملے میں بیٹے کا ساتھ دیتے۔ اس لیے انیس النساء کئی باتوں میں اسے نہ چاہتے ہوئے بھی رعایت دے جاتیں، ریان جہیز کا سخت مخالف تھا، اسی لیے زریں کے گھر والوں کو صرف لڑکی کی ضروریات کا سامان جہیز کی صورت میں دینے کا عندیہ دیا۔

جمیلہ خاتون نے اس بات پر پوتے کی پیٹھ ٹھونکی۔ انیس النساء نے پھر بھی ساس اور بیٹے کے علم میں لائے بغیر زریں کے والدین سے چپکے چپکے کئی فرمائشیں کر ڈالیں، شادی سے ایک دن قبل جب جہیز کا ڈھیر سا سامان اترا تو جیسے سارا گھر جگمگا اٹھا۔ ریان تو بوکھلا اٹھا، اس کے نظریات مٹی کے ڈھیر کی طرح بے جان پڑ گئے۔ وہ ماں سے لڑ پڑا۔ اقبال احمد نے الگ بیوی کی کلاس لی۔

ریان شرمندگی کے مارے، سسرال فون کر کے سارا اسباب واپس بھجوانا چاہتا تھا، مگر شادی بیاہ کے موقع پر جب کہ پورا خاندان جمع تھا جمیلہ خاتون نے گھر کے مسئلے کو گھر تک محدود رکھنے کی ٹھانی اور ریان کو سمجھا بجھا کر خاموش کرا دیا۔ ویسے بھی اب کچھ ہو نہیں سکتا تھا، کمان سے تیر نکل چکا تھا۔

انیس النساء نے بھی سکون کا سانس لیا۔ بیٹا کتنا ہی روشن خیال بنتا ہو بھلا وہ اپنے رسم و رواج سے کیسے ناتا توڑ لیتیں؟ پھر بات جب اپنے فائدے کی ہو تو ایسی فضول رسموں سے چمٹے رہنا بھی جائز ہو جاتا ہے، پھر کیا انہوں نے اپنی بیٹیوں کو ٹرک بھر کر جہیز نہیں دیے تھے۔ اب اپنی باری پر وہ کیوں خالی ہاتھ رہ جاتیں؟ رقیہ بھی لاکھ اختلافات رکھنے کے اس معاملے میں جٹھانی کی ہمنوا ہی ہوئی تھیں، یوں کہا جائے تو بہتر ہو گا کہ ان مسئلوں پر "ایک چنے کی دو دال ثابت ہوتیں" رقیہ کی بہو اسماء کے یہاں بھی دو مہینے بعد خیر سے دوبارہ خوش خبری متوقع تھی، اسی لیے وہ بھی رئیس النساء کی باتیں بڑے عقیدت و احترام سے سن رہی تھیں۔

"اے ہے، رئیس النساء! اماں نے جو تیرے منور کی پیدائش پر نقدی اور کرتا ٹوپی بھیجی تھی، اس بارے میں تو بہوؤں کو بتا۔۔۔ نا، میں خود اس وقت بنارس گئی ہوئی تھی، اس لیے اماں کے ساتھ مل کر میں نے ہی تو تیری "چھٹی" کی تیاری کی تھی۔" انیس النساء نے مسکرا کر بہو کو نظروں ہی نظروں میں تولا اور بہن کو بڑھاوا دیا۔ ریان نے ماں کی طرف ناگواری سے دیکھا، مگر ادب مانع آگیا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ آپا۔۔۔ کاہے نہیں بتائیں گے، وہ سب تو الگ سے دیا گیا تھا۔" رئیس النساء خالہ نے پان کی گلوری گالوں میں دبائی اور سر ہلا کر بہن کی باتوں کی تصدیق کی، ساتھ ہی کتھے والی انگلی بالوں میں پونچھی۔ زریں نے خالہ کی حرکت دیکھی تو مسکرا کر اسماء کو ٹہوکا دیا۔

"خالہ۔۔۔ یہ کرتا ٹوپی کیا ہوتا ہے؟" اسماء نے اچنبھے سے پوچھا۔ اس کے لیے یہ اصطلاح نئی تھی، زریں نے بھی حیران نظروں سے خالہ ساس کو دیکھا، علیم خالو نے بیوی کو گھورا۔ وہ پاس ہی صوفے پر بیٹھے خبریں دیکھ رہے تھے، انہیں بیوی کی لن ترانیاں کچھ بھا نہیں رہی تھیں، مگر کیونکہ وہ اس وقت حاضرین محفل کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھیں، اسی لیے شوہر کے اشاروں کو نظر انداز کیے جوش و خروش میں تیز تیز بولے جا رہی تھیں۔

"ارے بلال مہرارو (بیوی) کا پوچھتی ہو ہمارے بنارس میں جب کسی کے یہاں بچہ پیدا ہوت نا۔۔۔ تو اس کے ننھیال والوں اور رشتے داروں کی طرف سے اس کے لیے چھٹی پر جو سامان آتا، اسے کرتا ٹوپی کہے ہیں۔" انہوں نے مسکرا کر اسماء کو بتایا۔ مگر اسماء اب بھی کنفیوز ہی رہی۔

"اے، رئیسو! یہاں خاندان بھر میں ابھی بھی کرتا ٹوپی کا رواج چل رہا ہے؟ اب "چھٹی" میں کیا کیا

سلمان آنا ہے؟"

انیس النساء نے پیار سے بہن کو ایسے پکارا جیسے بچپن میں کھیلتے ہوئے پکارتی تھیں' ویسے بڑھاپے میں بھی دونوں بہنیں کھیل ہی تو کھیل رہی تھیں' کھلونوں سے نہ سہی بہوؤں کے جذبات سے ہی سہی۔ انیس النساء جانتی تھیں کہ بہن کو چابی بھر دی ہے' اب وہ بولتی رہے گی اسی لیے انہوں نے اطمینان سے نقرئی پاندان اپنی طرف کھینچا اور پان کی گلوری کلے میں دبائی۔ انگلیوں پر کتھا چونا لگا کر چاٹتے ہوئے معصوم بن گئیں' وہ ریان کی موجودگی کی وجہ سے ذرا احتیاط سے کام لے رہی تھیں۔

"تو... کے (کون) پرکھوں کی رسموں سے منہ موڑ کر گناہ گار بنے' نہ بھئی نا... آپ لوگوں کا تو نہیں پتا' مگر وہاں اب بھی سب کچھ ویسے ہی ہے' بچے کی پیدائش کے پانچویں دن چھٹی کی جاتی ہے' اس دن کے لیے ننھیال کی طرف سے نانی کے لیے بڑے اہتمام سے کرتا ٹوپی کی تیاری ہوتی ہے' جس میں بچے کا گدا' لحاف' پہننے کے کپڑے' جھنجھنا کھلونا' اماں باوا' دادا' دادی کے جوڑے وغیرہ ہوتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی ننھیال زیادہ پیسے والا ہو تو وہ خاندان میں واہ واہی کے لیے لازمی سونے کا کوئی پھول (ٹاپس) چاندی کا توڑا یا بچی کے لیے چھوٹی سی انگوٹھی وغیرہ بھی بھیجتا ہے۔"

انیس النساء نے تفصیلی کرتا ٹوپی کی تشریح کی اور داد کی وصولی کے لیے بڑی بہن کو دیکھا' مگر وہ خاموش رہیں' ان کا مقصد آرام سے پورا ہو گیا تھا' اب انہیں بول کر بیٹا بہو کے سامنے برا بننے کی کیا ضرورت تھی' رقیہ بھی سرشار سی بیٹھی اسماء اور زری کے چہرے پر ایک رنگ آتا جاتا دیکھ رہی تھیں' دونوں بہوویں جو ماں بننے کے مراحل سے گزر رہی تھیں' اب تک وہ باتوں کو بے مقصد سمجھ کر سن رہی تھیں' مگر دھیرے دھیرے ان پر کچھ چیزیں واضح ہونے لگیں' زریں کی تو خیر تھی مگر اسماء حقیقتاً" پریشان نظر آنے لگی۔

✡ ✡ ✡

"تو پھر یہ طے پا گیا نا... تم یہ کمیٹی میری امی کو دے دو گی؟"

اسما نا کی امید بھری نگاہیں' زریں کے چہرے پر ٹک گئیں' اس نے نا چاہتے ہوئے بھی ہامی بھرلی۔ زریں نے اسماء کے اتنا زور دینے پر ہاں تو کر دی' مگر اب وہ سوچ میں پڑ گئی کیوں کہ اس دفعہ کا نمبر تو اس کی بڑی بہن شیریں کا تھا' چلو خیر ان کو منانا چنداں دشوار ثابت نہیں ہوگا۔ اسماء بھابھی کی امی پیسوں کے لیے اتنا پریشان ہیں' دو مہینے سے کیا فرق پڑتا ہے' یہ کمیٹی ان کو دے کر دو مہینے بعد کی بجیا کو دے دوں گی' ایسے منہ بھر کہ انکار کرنا اچھا نہیں لگ رہا۔ چلو جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ زریں نے دل ہی دل میں نئی ترتیب بنائی اور اسماء کو اطمینان دلاتے ہوئے بولی۔

"آپ بے فکر ہو جائیں بھابھی... میں دس تاریخ تک تیس ہزار روپے آپ کو دے دوں گی' آپ اپنی امی کو پہنچا دیجیے گا۔" ان کی آنکھوں میں امید کے دیے روشن تھے جسے بجھانا' زریں کے بس میں نہیں تھا۔

"اللہ تمہارا بھلا کرے' تم نے میرے سر سے ایک بڑا بوجھ اتار دیا' بہن ایک بات کا اور خیال رکھنا' اس بات کا ذکر کسی اور کے سامنے آنے نہ پائے' تم تو خود سسرال نبھا رہی ہو' ایسی نزاکتوں کو مجھ سے بہتر سمجھتی ہو نا۔" اسماء نے زریں کا ہاتھ تھام کر دھیرے سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا کر یقین دہانی کرائی۔ اسماء ایک دم پرسکون نظر آنے لگی۔ اب وہ زریں کی طبیعت کے بارے میں پوچھنے لگی۔

"ارے... انڈیا والی خالہ نظر نہیں آ رہیں؟" اسماء نے پوچھا۔

"جی... وہ اپنے سسرالی رشتے داروں کی طرف رہنے گئی ہوئی ہیں۔ شاید اگلے ہفتے واپسی ہو۔" زریں نے تکیہ کے غلاف میں ٹانکا لگاتے ہوئے جواب دیا۔

وہ ہر تین دن بعد اپنے بستر کی چادر اور تکیہ کے غلاف بدلتی تھی' اسے میلے بستر سے وحشت ہوتی تھی' اسماء بھی اس کی مدد کروانے لگی۔

"یہ انڈیا سے آنے والے بھی عجیب باتیں کرتے ہیں۔ شاید ہندوؤں کے ساتھ رہ رہ کر وہاں کے رسم و رواج ان کے ذہنوں پر سوار ہو گئے ہیں۔" اسماء نے ناگواری سے کہا۔

"ہاں۔ اس دن میں نے بھی سنا۔ خالہ کیسی کیسی بے مقصد کہانیاں سنا رہی تھیں' خیر وہ تو انڈیا میں رہ رہی ہیں تو ان پر وہاں کے اثرات تو ہوں گے مگر میں تو اپنے ملک میں لوگوں کو دیکھتی ہوں کیسے دوسروں کی تہذیب میں فخریہ ڈھلنے کی کوشش جاری رہتی ہے ویسے بھی اس دن دادو نہیں تھیں نا' جب ہی سب کو کھل کر کھیلنے کا موقع مل گیا۔" زریں نے غلاف میں ٹانکا لگا کر اس کا منہ سیا اور سوئی دھاگا پلیٹ کر دراز میں رکھتے ہوئے۔ شرارت سے بولی۔

"ارے۔ بہن! یہ باتیں تمہیں بے مقصد لگ رہی تھیں' مگر ہماری ساسوں کی تو جیسے دل کی آواز تھی' وہ دونوں ہی دادی بننے والی ہیں' اب دیکھو "چھوچھک" کے نام پر ہمارے گھر والوں سے کیا کچھ کی امید لگائے بیٹھی ہوں گی۔" اسماء نے افسردگی سے کہا۔

"چھوڑیئے بھابھی۔ میں اور ریان تو ان باتوں پر یقین ہی نہیں رکھتے' میرا کوئی ارادہ نہیں کہ ڈیلیوری کے موقع پر اپنے گھر والوں سے کوئی فرمائش کروں' ویسے بھی ریان کہتے ہیں کہ جب یہ اولاد میری ہے' تو اس کی ساری ذمہ داریاں بھی میری ہوئیں نا۔ اب یہ کیا کہ بچہ میرا ہو اور پیدائش کا خرچہ ننھیال والے اٹھائیں۔" زریں نے دھیرے دھیرے اسماء کو تفاخر سے بتایا' اس کا چہرہ شوہر کے دیئے ہوئے اعتماد کی وجہ سے چمک رہا تھا۔

"ہاں۔ تم خوش قسمت ہو بہن جو تمہیں۔ ریان جیسا نیک طبیعت لڑکا ملا۔" اسماء نے ٹھنڈی سانس بھری اور غیر محسوس طور پر آنکھوں کے بھیگے گوشے پونچھ ڈالے' زریں نے اسماء کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ دھرا۔

"اب دیکھو ڈاکٹر نے مجھے اگلے مہینے کی تاریخ دی ہے۔ میری امی کو ابھی سے میری چھوچھک کی فکر لگ گئی ہے۔" اسماء نے افسردگی سے بتایا۔

"ہاں۔ مگر آپ کے بڑے بھائی اور چھوٹی بہن کی بھی تو دو مہینے بعد شادی ہے۔" زریں نے پوچھا۔

"ہاں۔ مگر کیا کریں؟" اسماء کے سوال میں ہی بہت سے جواب چھپے ہوئے تھے' زریں بھی افسردہ ہو گئی۔

"ارے بیٹھیں نا۔ ایک کپ چائے کافی کر جایئے گا۔" اسماء ایک دم جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو زریں کو خیال آیا۔

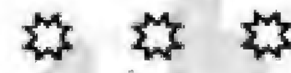
"نہیں بھئی۔ میں کوئی مہمان تھوڑی ہوں' اوپر سے ہی تو اتر کر آئی ہوں' پھر کبھی سہی۔ ابھی تو میں اماں جان کو پالک کاٹنے کو دے آئی تھی' آج تمہارے بھائی کی فرمائش پر دال ساگ بنا رہی ہوں' مزید بیٹھی تو کھانے میں دیر ہو جائے گی۔"

زریں نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ وہ جانتی تھی کہ شوہروں کو دفتر بھیجنے کے بعد خواتین کے پاس کاموں کا ایک انبار جمع ہوتا ہے۔ جو ان کی گھر واپسی سے پہلے نمٹانا ضروری ہوتا ہے۔ گو کہ اس کی شادی کو ابھی سال بھر ہی ہوا تھا' مگر وہ بھی صبح اٹھ کر پھرتی سے امور خانہ داری نمٹا لیتی تاکہ ریان کی واپسی پر اسے فریش چہرے کے ساتھ مسکراتی ہوئی ملے۔ زریں میلی چادر اور تکیہ کے غلاف سمیٹ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

"رات کے لیے کیا پکانا ہے؟" روزانہ کی طرح یہ سوال اس کے سامنے منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ دوپہر کے لیے' تو اس نے رات کے بچے ہوئے دم کے قیمہ میں تازہ ہرا دھنیا اور ہری مرچ ملا کر فریج میں رکھ دی تھی' اب اسے کھانے سے قبل بس گرما گرم قیمے بھرے پراٹھے پکانے تھے' ساتھ میں پودینے کی چٹنی' بہت مزہ دے گی۔ اس نے سوچا اور مطمئن ہو گئی۔

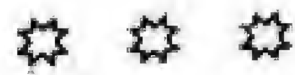
اپنے کمرے سے باہر نکلی تو اسماء بھابھی کو انیس النساء کے سامنے پیشی بھگتاتے دیکھ کر اس کی ہنسی نکل گئی' یہ اپنی دیورانی کے بارے میں پوری سن گن لے رہی تھیں اور اسماء بھابھی اس وقت جان چھڑانے کے

موڈ میں تھیں۔
"ماں بننا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے عورت اپنا جوبن کھو کر ایک نئے اور خوب صورت رشتے کی خوشی سب کی جھولی میں ڈالتی ہے' کسی کو باپ بناتی ہے تو کسی دادی' نانی' کوئی ماموں' پھپھو کے رشتے پر فائز ہو جاتے ہیں اس پر بھی سسرال والے بہو کا شکر گزار ہونے کے بجائے اسے نو مہینوں تک مختلف فرمائشوں کی آزمائشوں میں ڈالے رکھتے ہیں' کسی کو بیٹا چاہیے ہوتا ہے تو کسی کو میکے سے پیدائش کا خرچ۔"
بھابھی کا بے ڈول جسم دیکھ کر وہ مسکرا دی اُسے اپنی نانی کی بات یاد آ گئی جو وہ اکثر اس کی امی اور خالہ سے باتیں کرتے ہوئے دہراتی تھیں' زریں کو وہ باتیں اب اچھی طرح سے سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ وہ بھی تو اب ایسے ہی خوش کن دور سے گزر رہی تھی' شکر تھا کہ شوہر صرف شریک زندگی نہیں تھا' بلکہ شریک غم بھی تھا۔
تائی ساس کی جرح سے پیچھا چھڑا کر اسماء اب دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی طرف جا رہی تھی' زریں کی نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔



"اے دلہن۔۔۔ تم دونوں میں ایک گھنٹے سے کیا راز و نیاز جاری تھے؟" وہ شاید اسماء کی مروّت میں خاموش بیٹھی تھیں' اس کے اوپر جاتے ہی انہوں نے توپوں کا رخ اپنی بہو کی طرف موڑا اور ناگواری سے بولیں۔
"جی۔۔۔ کوئی خاص بات تو نہیں تھی بس وہ مجھ سے کل۔۔۔ ڈاکٹر کے وزٹ کے حوالے سے پوچھ رہی تھی۔" زریں نے نہ چاہتے ہوئے بھی تھوڑی سی غلط بیانی کی۔ زریں کا یہ پہلا تجربہ تھا' اس لیے وہ ذرا ذرا سی بات پر گھبرا اٹھتی تھی' اسماء کے یہاں دوسرے بچے کی ولادت متوقع تھی' تو وہ اس معاملے میں سینئر ہونے کی وجہ سے زریں کی دل جوئی بھی کر دیتی۔
"ہونہہ۔۔۔ تم لوگوں نے ماں بننے کو جیسے ہوّا بنا رکھا ہے' جب دیکھو ڈاکٹر کے پاس دوڑیں لگائی جا رہی ہیں' ڈاکٹر بھی ایسے نا تجربہ کار کہ ٹیسٹ کروا کروا کے بندے کا تیل نکال دیتے ہیں۔ ایک ہمارا وقت تھا کہ ٹائم پر دایہ کو گھر پر بلایا اور ہو گئی فراغت' کہاں کے ٹیسٹ اور کہاں کے اسپتالوں کے چکر' میں خوب جانتی ہوں کہ یہ تو بس سارے مردوں کو بے وقوف بنانے کے چکر ہیں کہ وہ دفتر سے تھکے ہارے آکر لگ جائیں بیویوں کی غلامی میں۔" انیس النساء شروع ہو چکی تھیں' ان کو خاموش کرانا ناممکن تھا۔
زریں کا دل چاہا کہ ان سے پوچھے "مرد کیوں نہ اپنی بیویوں کے نخرے اٹھائیں' آخر عورت اتنی تکالیف سہہ کر ہی تو انہیں باپ جیسے رتبے پر فائز کرتی ہے تو پھر کیا ان کی کوئی ذمہ داری نہیں؟" مگر اسے پتا تھا کہ ایک بحث لاحاصل چھڑ جائے گی۔ اسی لیے کان لپیٹے کچن کی طرف بڑھ گئی۔
یہ دونوں خاندان ورثے میں ملے ہوئے اس گھر میں اوپری' نچلی منزلوں پر رہائش پذیر تھے' بلال کی دادی ابھی حیات تھیں وہ بہت سلجھی ہوئی خاتون تھیں' جب تک ان کا چھوٹا بیٹا انوار زندہ رہا۔ وہ ایک مہینہ اوپر ایک مہینہ نیچے رہتیں' مگر اب وہ صرف اقبال احمد کے گھر ہی رہائش پذیر تھیں' رقیہ خاتون کی ساس سے کبھی نہیں بنی۔ وہ بے چاری اگر بہو کو اس کی غلط روش پر ٹوکتیں تو رقیہ خاتون بھی ان کو چار باتیں سناتیں۔ انوار کی زندگی میں تو ایسا ممکن نہ تھا' مگر اب رقیہ کو کس کا ڈر' بلال کو انہوں نے شروع سے دبا کر رکھا۔ وہ حق بات کہتے ہوئے بھی ڈرتا۔ جمیلہ خاتون مرحوم بیٹے کا زمانہ یاد کرتیں اور روتی ہوئی نیچے اتر جاتیں' اقبال احمد کو دنیا میں ساری باتیں برداشت تھیں' سوائے ماں کی بے عزتی کے۔
"اماں۔۔۔ کی ایک روٹی مجھ پر بھاری نہیں۔۔۔ اب وہ تاحیات میرے پاس رہیں گی۔" بیوی کے ناک منہ چڑھانے کے باوجود اقبال احمد نے صحن کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر اعلان کر دیا۔ پاٹ دار مردانہ آواز اوپر تک جا رہی تھی' رقیہ خاتون چور سی بن گئیں' جمیلہ خاتون بیٹے کی سعادت مندی پر سفید دوپٹے سے آنسو

پوچھتی رہ گئیں' جو خوشی کے مارے ان کی آنکھوں سے چھلک پڑے۔



"کیا بات ہے بہو؟ دو منٹ کا کہہ کر گئیں اور گھنٹہ لگا آئی ہو۔۔۔ سب خیریت تو رہی۔" اسماء ہانپتی کانپتی اوپر پہنچی تو رقیہ خاتون کے سامنے لائن حاضر ہونا پڑا۔ اس نے فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور قریب رکھی کرسی پر بیٹھ کر پانی پینے لگی۔ وہ جٹھانی کا احوال جاننے کو بے تاب تھیں' اس وقت بہو کا پانی پینا بھی ان پر بھاری پڑ رہا تھا۔

"کچھ۔۔۔ نہیں کل زریں گائناکالوجسٹ کے پاس گئی تھی۔ بس اس کی خیر خیریت لینے بیٹھ گئی تھی۔" اسماء نے مختصر بات کرکے جان چھڑانی چاہی' مگر وہ جھاڑ کے کانٹوں کی طرح الجھ پڑیں۔

"آئے۔۔ ہائے۔۔۔ ابھی تو اس کو دوسرا مہینہ لگا ہے اسپتالوں کے چکر لگنا شروع ہوگئے' یہ ہی تو خرابی ہے آج کل کی لڑکیوں میں ذرا برداشت نہیں' چھینک بھی آجائے تو ڈاکٹر کی طرف ضرور جائیں گی۔" گول گول شیشوں والی عینک میں سے رقیہ کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں' مزاج کی کرختگی ان کے چہرے سے عیاں ہوتی تھی۔ اسماء کوفت میں مبتلا ہوگئی۔

"ہونہہ۔ وہ جب سے پریگننٹ ہوئی ہے۔ اس کا بی پی مسلسل لو رہنے لگا ہے' اس لیے ڈاکٹر نے ہر پندرہ دن بعد چیک اپ کا کہا ہے اس کے علاوہ کچھ ٹیسٹ بھی کروانے تھے۔" اسماء نے جلدی جلدی پیاز کاٹتے ہوئے بات بنائی۔ اسے بچوں کے آنے سے قبل ہانڈی پکانی تھی' ویسے ہی دیر ہوگئی تھی' اوپر سے ساسو ماں کی تفتیش۔۔۔ وہ پہلے ہی پریشان تھی اس لیے اس وقت اچھی بات بھی بری لگ رہی تھی' ویسے بھی وہ زریں کو پسند کرتی تھی' جس نے اسے شادی کے بعد سے سگی جٹھانیوں جیسا مان دیا تھا حالانکہ وہ ریان کے تایا زاد بھائی بلال کی بیوی تھی۔

"یہ ہی تو سمجھنے کی بات ہے' ڈاکٹر پیسہ بنانے کے لیے الٹے سیدھے ٹیسٹ کرواتے رہتے ہیں' بھلا بتاؤ کوئی بات ہے' ہم نے اولادیں پیدا نہیں کی ہیں کیا؟ جو کچھ ہم سہہ چکے ہیں' آج کل کی لڑکیوں پر پڑے تو روتی ہوئے میکے بھاگ جائیں' مگر مجال ہے جو ہم نے منہ سے بھاپ بھی نکالی ہو' اوپر سے اس خاندان کے سیدھے لڑکے بیویوں کے پیچھے اتنے باؤلے بنے رہتے ہیں۔ بس نہیں چلتا کہ بیوی کو ہتھیلی کا چھالا بنا ڈالیں' شرم و حیا سب ختم ہوگئی ہے' ارے بلال کے ابا تو کبھی سب کے سامنے ہمارے برابر میں نہیں بیٹھتے تھے۔"

انہوں نے ماتھے پر ہاتھ مار کر اپنے ماضی کی یادوں کو دہرایا' دوسروں پر رکھ کر بہو کو بھی لتاڑا' ایسی باتوں میں تو ان کو ملکہ حاصل تھا۔ اسماء بری طرح تپ گئی' دل چاہا کہ پوچھ لے "اپنے شوہروں کی زیادتیوں کے بدلے آپ لوگ اپنے بچوں سے کیوں لینا چاہتے ہیں؟"

"اماں۔۔۔ ڈاکٹر کچھ بہتر سمجھتے ہوں گے۔۔۔ تب ہی تو ٹیسٹ لکھ کر دیتے ہیں' اگر مریض ان کی منشا کے حساب سے علاج نہ کروائے تو کہاں جائے؟ کتنے ڈاکٹروں کو بدلے؟۔ سب کا ایک سا حال ہے' ہر کوئی علاج شروع کرنے سے قبل ٹیسٹ کروانے کو بھیج دیتا ہے' اب غلط ہو یا صحیح مریض تو مجبور ہوتا ہے' ڈاکٹروں کی ماننی ہی پڑتی ہے۔"

اسماء نے چھری ایک طرف رکھی اور رسان سے ساس کو سمجھانے بیٹھ گئی' شادی کے پانچ سالوں بعد بھی وہ ساس کی باتوں سے زچ ہو جانے کے باوجود منہ نہ بگاڑتی بلکہ نرمی سے سمجھانے بیٹھ جاتی' ورنہ رقیہ جیسی تیز خاتون کے ساتھ گزارا کرنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ گھر کے خوش گوار ماحول کے پیچھے اسماء کی قوت برداشت کا بہت عمل دخل تھا۔

"اچھا چھوڑو۔۔۔ یہ بتاؤ' وہ ریان کی دلہن کچھ بتا رہی تھی کہ بچے کی پیدائش پر اس کے میکے والے کیسی "چھوچھک" بھیجیں گے۔ اس دن تو بھابھی بہن کے ساتھ بہت بڑھ چڑھ کر بول رہی تھیں۔" رقیہ فوراً" ہی مطلب کی بات کی طرف آگئیں۔

"ابھی کہاں۔۔۔؟ ابھی تو اس کے بچے کی ولادت میں

بہت وقت پڑا ہے۔ پھر ریان شروع سے ایسی رسموں کے خلاف ہے۔ اور ویسے بھی میں اس سے ایسی فضول باتیں نہیں کرتی۔"

اسماء کا منہ اتر گیا' اس نے ساس کو جتایا اور تیزی سے آلو کھرچنا شروع کر دیے اور کسی پر نہ سہی بے زبان سبزی پر تو اپنا غصہ نکال ہی سکتی تھی' اس کے دونوں چھوٹے دیور ساگ نہیں کھاتے تھے' اس لیے ان کے لیے آلو کی بھجیا پکانی تھی۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ ریان میاں کے تو ڈھنگ ہی نرالے ہیں' اب اس دنیا میں رہنا ہے تو اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ تھوڑی بنائیں گے' جو دستور ہے اسی پر چلیں گے۔ بھائی میں تو ابھی سے کہے دیتی ہوں تم اپنی اماں کو پہلے ہی بتا دینا کہ اس دفعہ چھٹی میں تمہارے گھر سے آنے والا سامان اتنا شان دار ہونا چاہیے کہ بڑی بھابھی منہ دیکھتی رہ جائیں۔" وہ اسماء کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دھیرے دھیرے اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگیں۔

"اماں۔ اب میں آپ سے کیا کہوں؟۔ عون کی پیدائش کے وقت کی بات اور تھی امی نے نہ صرف اسپتال کا خرچا اٹھایا تھا بلکہ بچے کے علاوہ سب کے کپڑے لتے بھی بنائے تھے' مگر اب چھوٹی بہن سلمیٰ اور بڑے بھائی کی شادی سر پر کھڑی ہے' وہ پہلے ہی اتنے اخراجات میں گھری ہوئی ہیں اب میں ان پر بوجھ ڈالتی ہوئی اچھی لگوں گی۔" اسماء نے بے بسی سے ساس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے تو کوئی احسان کیا' اپنی بیٹی کے لیے کیا۔ سارا زمانہ ہی کرتا ہے۔" وہ ایک دم بگڑ گئیں۔

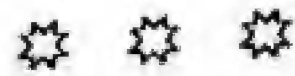
"اماں' گھر میں دو۔ دو شادیاں ہیں' مجھے نہیں لگتا کہ اس دفعہ امی میرے لیے کوئی خاص تیاری کر پائیں گی۔"

اسماء نے بے چارگی سے ساس کی طرف دیکھا' مگر انہیں بہو کی آنکھوں کی نمی کہاں نظر آتی' جبکہ خود ان کی آنکھوں پر جگ ہنسائی کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اسماء کو لگا تھا کہ وہ ساس کو سمجھا لے گی مگر ان کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر اسے اوراک ہوا کہ وہ کچھ نہیں کر پائے گی' بلال بھی تو شروع سے ماں کے دباؤ میں رہے ہیں ان کے اندر ریان جیسی اخلاقی جرات بھی نہیں تھی کہ منہ پر غلط کو غلط کہہ سکیں' اسی کا خمیازہ اسماء سسرال میں بھگتی آئی تھی۔

"اے بہو۔ میں کیا بولوں' کوئی زور زبردستی تو ہے نہیں۔ یہ تو دل کی خوشی ہے۔ پہلے بھی انہوں نے میری بیٹی زارا کو صرف جوڑا بھیجا تھا' حالانکہ ہمارے یہاں دامادوں کی بہت عزت کی جاتی ہے' مگر تمہاری امی نے احسن میاں کے لیے کچھ نہ بھیجا' ہم نے ہی اپنے پاس سے جوڑا خرید کر رکھوایا تھا' اب تمہاری مرضی ہے۔ ویسے بھی وہ بہوئیں اور ہی ہوتی ہیں' جو میکے میں سسرال والوں کی عزت کرواتی ہیں۔ میری بیٹی زارا کو دیکھو' اپنے بڑے بیٹے کے عقیقہ پر اس نے کیسے مجھ سے لڑ لڑا کر اپنے پورے سسرال کے جوڑے بنوائے۔" بہو کی بات سن کر ان کے منہ میں جیسے کڑواہٹ گھل گئی۔

اسماء کے سر میں درد شروع ہو گیا۔ اب وہ ان سے مزید کیا بحث کرتی کہ آپ کی تو ایک ہی بیٹی ہے' جبکہ ہم پانچ بہنیں اور ایک کمانے والا بھائی ہے' امی کو سب کی طرف دیکھنا پڑتا ہے' کسی بہن کی عیدی ہے تو کسی کے سسرال میں تقریب یا پھر کسی بہن کے گھر بچے کی پیدائش۔ اب اس مہنگائی کے دور میں وہ جتنا ہاتھ پیر کھینچ کر کر سکتی ہیں وہی ان کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر زارا نے زور زبردستی سے سب کچھ کروایا تو یہ کوئی اچھی بات نہیں' اسماء کو وہ دن یاد تھے' زارا کے بیٹے کا عقیقہ تھا۔ اسماء نے بڑی مشکل سے زارا اور اس کے میاں کا جوڑا' بچے کے چھ جوڑے' جھولا' پرام چیئر اور کھلونے خریدے تھے' اس پر بھی زارا کا منہ بنا ہوا تھا' وہ ننھیال سے سونے کی کسی چیز کی امید لگائے بیٹھی تھی' پھر اس کے ساس سسر' نند نندوئی کے جوڑوں کی بھی کمی تھی۔ مزید کی گنجائش نہیں تھی بلال نے ماں کو اپنی مجبوری بتا دی کہ وہ تنخواہ دار انسان کہاں سے مزید کچھ کر پائے گا؟' یہ سب بھی اسماء کی کفایت شعاری

کے سبب ہو پایا تھا' آخر اس کی ساس نے اپنے کانوں کے ٹاپس بیچ کر زارا کی فرمائشیں پوری کیں۔



"ارے۔۔۔ آپی وہ سامنے دیکھیں۔۔۔ اسماء بھابھی لگ رہی ہیں' میں نے کل ان کی کمیٹی کے پیسے دیے تھے' لگتا ہے۔ بہن کی شادی کے لیے شاپنگ کرنے آئی ہوں گی' چلونا۔۔۔ دیکھتے ہیں کیا کیا خریدا؟"

زریں نے بڑی سی چادر میں لپٹی ہوئی اسماء کی طرف اشارہ کیا جو اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ ایک دکان کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھ رہی تھی۔ زریں اور اس کی بڑی بہن شیریں بھی شاپنگ کے ارادے سے اس مال میں آئی ہوئی تھیں کہ زریں کو اسماء نظر آگئی وہ بہن کا ہاتھ تھام کر تیزی سے اسماء کے پیچھے بھاگی۔

"یہ کیا' بھابھی کہاں جارہی ہیں؟" اسماء کو نو مولود بچوں کے سامان کی شاپ میں گھستا دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ پیچھے پیچھے وہ بھی دکان میں داخل ہوگئی' جہاں بچوں کا خوب صورت اور مہنگا سامان موجود تھا۔ اسماء ایک خوب صورت گلابی رنگ کے نیٹ لگے گدے کی قیمت کم کروانے پر تلی ہوئی تھی اور سیلز مین اسے سمجھا رہا تھا کہ یہاں "پرائس فکسڈ" ہوتی ہے۔

"بھابھی۔۔۔ آپ تو کہہ رہی تھیں کہ بہن کے جہیز کے کپڑے خریدنے جارہی ہیں۔" صبح میکے جاتے ہوئے اسماء جب گھڑی بھر کو زریں کے کمرے میں آئی تو اس نے یہ ہی بتایا تھا' اسماء نے آواز پر مڑ کر دیکھا تو زریں کو سامنے کھڑا پایا اس کی کیفیت ایسی ہوگئی کہ کاٹو تو جسم میں لہو نہیں۔

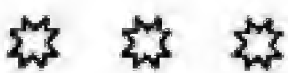
"وہ۔۔۔ وہ زریں۔۔۔ اصل میں بات یہ ہے کہ۔۔۔" آنسوؤں سے گلا ایسا رندھا کہ بولا ہی نہیں گیا۔ شیریں اور زریں اسماء اور اس کی بہن کو لے کر مال میں موجود کولڈ شاپ میں آگئیں۔ ٹھنڈا یخ ملک شیک پینے کے بعد ان سب کے حواس درست ہوئے تو اسماء نے بولنا شروع کیا۔

"بلال۔۔۔ مجھے جو جیب خرچ دیتے تھے۔ اس سے میں نے تمہارے پاس یہ کمیٹی ڈالی' سوچا تھا کہ بہن کو شادی پر جو دوں گی سودوں کی الگ سے یہ پیسے بھی اماں کے ہاتھ پر رکھ دوں گی کہ وہ کچھ خرید لیں گی' اسی لیے تم سے غلط بیانی بھی کی۔ مگر بلال کی امی کا "چھوچھک" کا مطالبہ سن سن کر میرے کان پک گئے۔ ان حالات میں اپنی امی کو کیا پریشان کرتی' اسی لیے بلال سے مشورہ کیا کہ کمیٹی سے خود ہی چھوچھک کا سامان لے آوں' وہ میرے گھر کے حالات سے بھی واقف ہیں' خود اپنی امی کی فرمائشوں پر اکتائے ہوئے تھے مگر بیوہ ماں سے زبان درازی کرکے ان کا دل دکھانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ بولے کہ یہ تمہارے پیسے ہیں جیسے چاہے خرچ کرو' میں اسی لیے شمع کو لے کر بازار چلی آئی تھی کہ بچے کی خریداری مکمل کرلوں' پھر امی کی طرف سے یہ سب دے دوں گی۔" اسماء کی نگاہیں شرمندگی سے دیورانی کے آگے اٹھ نہیں پارہی تھیں' وہ کچھ نہ کرتے ہوئے بھی مجرم سی بن گئی۔

"بھابھی! یہ پیسے آپ نے اپنی بہن کو تحفہ دینے کے لیے رکھے تھے نا اسی کو دیجیے گا۔" زریں نے افسردگی سے اسماء کو دیکھا اور بولی۔

"وہ "چھوچھک" کا کیا ہوگا؟" اسماء خود بھی دل سے یہ ہی چاہتی تھی مگر ابھی ایک تلوار اس کے سر پر لٹک رہی تھی' اسی لیے پوچھنے لگی۔

"ارے۔۔۔ اس کی فکر نہ کریں۔ اس بار بچہ اپنی دادی اماں کے پیسے ہی خرچ کروائے گا۔" زریں نے کچھ ہنستے ہوئے کہا' اسماء نے کنفیوز نظروں سے زریں کو دیکھا' وہ کچھ سمجھی نہیں مگر زریں نے اسے نو لفٹ کا بورڈ لگا دیا اور خوش باش سی شمع سے باتیں بگھارنے میں مشغول ہوگئی۔



"اے بچو! کا کرت ہو یہیں آجاؤ۔" رئیسہ خالہ نے اسماء اور زریں کو آواز دے کر پاس بلالیا۔ وہ سب ٹیرس پر کرسی ڈالے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ سیما خالہ کے پاس ہی زمین پر بچھے کارپٹ پر بیٹھی اپنے

بچے کا دہرا (ولائی) سلوا رہی تھی۔ خالہ رنگ برنگے ٹکڑوں کی ناپ تول میں مصروف تھیں' پاس ہی بلال' ریان اور دوسرے گھر والے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ جمیلہ خاتون بھی تخت پر بیٹھی بچوں کو ہنستا مسکراتا دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ آج تو رقیہ بھی بن بلائے نیچے اتر آئی تھیں۔

"بھائی... سنا... خالہ کیا پوچھ رہی ہیں؟" سیما نے جوش میں ریان کو پکارا۔

"جی... خالہ! کیا بات ہے؟" وہ خوش گوار موڈ میں خالہ کی طرف متوجہ ہوا' انیس النساء بھی دال چنتی ہوئی وہیں آبیٹھیں۔

"ارے کا... بڑوا (بیٹا)... بہن کا نیگ تیار کرت ہو؟" وہ مسکرا کر بولیں۔

"بہن کو کچھ چاہیے تو ایسے ہی مانگ لے یہ نیگ ویگ کیا ہوتا ہے؟" ریان کے کانوں میں آج کل ماں کی طرف سے مسلسل ایسی ہی باتیں پڑ رہی تھیں' اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"ارے بھیا! وہ سب الگ' مگر اب تو اس کا حق ہووے ہے نا' پھوپھو بننے پر اس کے لیے سونے کا کوئی بالی پتا بنوانا چاہیے۔" خالہ نے مسکرا کر کہا' سیما تو خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔

"ہائے' ہائے صرف اس کے لیے کیوں؟ کیا شیما بہن نہیں ہے؟ دونوں بہنوں میں فرق کرے گا۔" رئیس النساء نے جلدی سے مداخلت کی۔ ریان کچھ بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔

"ارے... منو کی پیدائش پر تو ہماری نندیں جمع ہو گئیں' اور جو بٹلوہیا (پیتل کا برتن) بجانا شروع کیا تو مت پوچھو' اس وقت تو ایک بھینس ہی بندھی تھی انگنا میں' ہم نے فوراً کھول کر رسی ان کے ہاتھ میں تھما دی' جب جا کے شور تھما' بھیا... بہنوں کو ایسے نیگ دیا جاتا ہے۔" خالہ نے بتایا۔

"ہاں' ہاں یہ بھی بتایئے نا کہ اس کے بعد کتنے دنوں تک ہم بچا کے لیے رشتے داروں کے یہاں سے دودھ مانگ مانگ کر لاتے رہے... ارے سب پتا تو بات ہے' ان کو تو بس اپنی واہ واہی کی پڑی تھی' بے سوچے اتنی مہنگی بھینس کھول کر دے دی۔ بھیا... ہم منع کرتے رہ گئے۔ انسان اتنا ہی کرے جتنی اس کی اوقات ہو۔" علیم خالو نے چڑ کر بیوی کو گھورا۔

"اے لو میاں تو کیا ہوا؟ پوری برادری میں کتنا چرچا بھی تو ہوا کہ علیم صاب کتنے دیالو ہیں۔" خالہ نے ان کی بات کو خاطر میں لائے بغیر دلار سے کہا۔

"تو صحیح بات ہے نا ایسے موقع زندگی میں بار بار تھوڑی آتے ہیں' یہ ہی تو وقت ہوتا ہے' جب انسان کی ناک اپنے خاندان میں اونچی ہو جاتی ہے۔" انیس النساء نے مسکرا کر بیٹے کو جتایا' ریان کا منہ لال ہو گیا۔

"ہا' ہا... بھابھی! حق بات کرتی ہو۔" رقیہ نے بھی ٹھنڈی سانس بھر کر جٹھانی کا ساتھ دیا' بلال نے فوراً پہلو بدلا۔

"بڑی دلہن نے ایسی کون سی حق بات کی ہے؟ جو تم اتنی ٹھنڈی سانسیں بھر رہی ہو۔ میں تو ان خرافات کے سخت خلاف ہوں۔ یہ ہی دیکھ لو کہ بچے یا بچی کی پیدائش خاندانوں کے لیے خوشی کی گھڑی ہوتی ہے' مگر ہمارے یہاں تو اس خوش گوار موقع پر دوسروں کے اوپر بے جا بوجھ لاد دیا جاتا ہے۔ بچے کی پیدائش پر ہمارے مذہب میں جو امر بھی لازم ہیں۔ اس میں تو مولود کی بہتری کار فرما ہوتی ہے' جیسے عقیقہ' کانوں میں اذان دینا یا نومولود کا بال منڈوانا۔ مگر یہاں تو نت نئی رسموں کو اپنا لیا گیا ہے' جیسے چھٹی' پھلا یا سوا مہینہ کی تقریب وغیرہ۔ بچے کی پیدائش پر ننھیال والوں پر بے جا خرچے کا بوجھ بار لادنا کہاں کا انصاف ہے بھئی؟" ریان کی دادی جمیلہ خاتون نے دونوں بہوؤں کو ایک ساتھ لتاڑ کے رکھ دیا۔ اسماء اور زریں کے سوا ساری خواتین کے منہ بن گئے۔

"یہ اماں... بھی نا... ایسے ہی رنگ میں بھنگ ڈالتی ہیں۔" انیس النساء نے بہن کے کان میں سرگوشی کی۔

"دادو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ایسی لغو رسومات میں دکھاوے کا جو عنصر ہوتا ہے۔ اس سے اسلامی اقدار کی پامالی ہوتی ہے' بلکہ صاحب حیثیت

ایسے موقعوں پر جو دھوم دھڑکے انتظام کرتے ہیں، اس سے دوسروں کو بھی تقلید کا موقع ملتا ہے جس سے معاشرے میں بڑھتی ہوئی رسہ کشی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور غریب طبقہ بے جا تکلفات اور تکالیف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔" بلال کے اندر پلنے والا لاوا آخر باہر نکل آیا۔ رقیہ منہ پھاڑے بیٹے کو تک رہی تھیں، جو آج بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا۔

"ارے بیٹا۔ یہاں تو ہم لوگوں نے زندگی کے ہر معاملے کو فرسودہ رسومات کے جال میں پھنسا دیا ہے، خود بھی الجھ گئے ہیں۔ شادی بیاہ کو ہی لے لو، اسلام میں اس فرض کی ادائیگی کتنی سادہ اور آسان طرز پر ہے مگر یہاں تو پہلے ہی ہندوؤں کے ساتھ ایک عرصہ گزارنے نے کچھ کم قہر ڈھایا تھا کہ اب ان کے گھر گھر میں چلنے والے انڈین ڈرامے اور فلمیں اپنی ثقافت کا یوں پرچار کرتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ ان کی تقلید میں ان سے بھی آگے بڑھ گیا وہ کیا کہتے ہیں "شاہ سے بڑھ کر شاہ کے وفادار" مسلمان گھرانوں میں ایسی ایسی رسموں کی ادائیگی تفاخر سے کی جاتی ہیں جن کی ہم سے دور کی بھی نسبت نہیں۔ منگنی، مانجھا، مہندی، رت جگا، جہیز پسنجائی، بارات، سلامی۔ چوتھی چالے وغیرہ جن کی وجہ سے نہ صرف بہت وقت برباد ہوتا ہے بلکہ اس میں فریقین کے پیسوں کا زیاں بھی ہوتا ہے، اور اس کا سب سے منفی پہلو یہ ہے کہ ہمارے بچوں کے ذہنوں میں یہ باتیں ایسی رچ بس گئی ہیں کہ ایک شادی کی تقریب میں شریک بچی اپنی ماں سے پوچھتی ہے کہ "ممّا۔ پھیرے کب ہوں گے" بھلا بتاؤ اس سے زیادہ مذہب سے دوری کی دوسری مثال کیا ہو گی؟۔" وہ ایسے جوش میں بولیں کہ سب کے منہ پر تالے پڑ گئے، انیس النساء اور رقیہ پہلو بدلتی رہ گئیں مگر ساس کے سامنے ان کی چل نہیں پا رہی تھی۔ رئیس النساء الگ سر جھکائے دوہرا اپنے میں لگ گئیں۔

"آپ لوگ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ہم کا بتائے کہ۔ وہاں انڈیا میں تو مسلمانوں کا اس سے بھی جیادہ برا حال ہے، ہندوؤں کے ساتھ رہ رہ کر ان کے جیسے ہو گئے ہیں، وہاں مسلم گھرانوں میں بھی دولہا بکتا ہے۔" علیم خالو نے بھی میدان سنبھالا۔

"کیا مطلب خالو؟" ریان نے حیران ہو کر پوچھا، سب ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"ارے بھیا کا پوچھت ہو۔؟ وہاں جو لڑکا سرکاری نوکر ہو تو لگن (منگنی) پر پچاس ہزار یا اس سے بھی جیادہ پیسہ مانگے ہے اور چھوٹا موٹا کام کرنے والا بھی کم از کم لڑکی کے ابا سے پندرہ ہزار مانگے ہے، دہیج میں پھور وہیل (کار) یا کم از کم اسکوٹر تو لازمی دینا پڑتا ہے۔" علیم خالو نے دکھ سے حقیقت بیان کی۔

"ارے بیٹا۔ ہمارے مذہب میں تو بہت آسانیاں ہیں، مگر مشکلات ہم خود اپنے لیے پیدا کرلی ہیں اب نئی نسل سے امیدیں وابستہ ہیں۔ مجھے ریان سے تو پوری امید ہے اور وہ میری امیدوں پر کھرا بھی اترا ہے۔ مگر بلال! میں تم سے بھی یہ ہی توقع رکھتی ہوں کہ باپ بننے جا رہے ہو تو بچے کی ذمہ داری بھی اٹھانا سیکھو۔" جمیلہ خاتون نے دونوں ــــ ولی عہدوں کو پیار سے مخاطب کیا تو بلال نے سر ہلا کر تائید کی۔

"رقیہ۔ تمہارے ہاتھوں میں تو بہت سلیقہ ہے۔ سلائی کڑھائی کے فن سے آگاہ ہو، کچھ کام میں بھی کر لیتی ہوں، کیوں نا۔ اس بار میں اپنے پڑپوتے کے لیے اپنے ہاتھوں سے کپڑے سیوں؟ اس پر کشیدہ کاری تم کر لینا، اپنی مشین نکال کر جھاڑ پونچھ لینا۔ میں کل سے اوپر بیٹھ کر تمہارے ساتھ مل کر بلال کے بچے کے کپڑے سیوں گی۔"

انہوں نے بہو کو مخاطب کیا، تو رقیہ نے بادل نخواستہ سر ہلا دیا، ویسے بھی اب ان کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔

بلال نے دادی کو پیار سے دیکھا، زریں نے اسماء کا ہاتھ نرمی سے دبایا۔ اس نے ہی دادی ساس کو فون کر کے اسماء کی مجبوریوں اور رقیہ کے فرمائشی پروگرام سے آگاہی فراہم کی تھی اور جلدی گھر لوٹنے کا کہا تھا۔

اسماء نے مسکرا کر پہلے دادو ساس اور پھر شوہر کو دیکھا۔ دل میں جیسے قطار در قطار امید کی شمعیں روشن ہونے لگیں۔

✿

کنیز نور علی

ایکسچینج پالیسی

"سب سے پہلے تو یہ رسید ادھر دو مجھے ذرا۔ میں اس کے دو ٹوٹے کر کے ادھر ہی پھینک دوں۔" اسجد نے صوفی کے ہاتھ میں موجود بل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ صوفی نے جلدی سے بل پیچھے کر لیا تھا۔

"جی نہیں۔ میں سنبھال کے رکھوں گی یہ سلپ۔" کہتے کے ساتھ ہی اس نے رسید اپنے پاؤچ میں ڈال لی۔

وہ لوگ کپڑے کی ایک برانڈ کے اسٹور میں کاؤنٹر پر کھڑے تھے۔ صوفی نے سوٹ والا بیگ کاؤنٹر سے اٹھایا۔ اسجد نے شرارت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

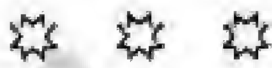
"کل تم نے پھر آجانا ہے سوٹ ایکسچینج کرنے۔ ایک تو یہ بہت مسئلہ ہے۔" بات کرتے ہوئے وہ منیجر سے مخاطب ہو گیا تھا۔

"آپ لوگ ایکسچینج پالیسی ختم کیوں نہیں کر دیتے۔" اس نے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے منیجر سے جیسے درخواست کی تھی۔

منیجر اپنی پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ "سر! کمپنی پالیسی ہے" کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"کیوں ختم کر دیں۔ کیش ری فنڈ ایبل تو ہے نہیں اب ایکسچینج تو ہمارا حق بنتا ہے نا' جو پیسے ہتھیا لیے ہیں' وہ تو واپس ملتے نہیں چیز تو ہماری پسند کی ہونا چاہیے نا۔" صوفی نے پوری دل جمعی سے اپنا نقطہ نظر بیان کیا تھا۔ وہ لوگ اب اسٹور سے باہر نکل رہے تھے۔ لیکن اسجد کا اعتراض وہی تھا۔

"لیکن اب تم چینج ہر گز نہیں کرواؤ گی یہ سوٹ صوفی!" وہ کہے بنا نہیں رہ سکا تھا۔ حالانکہ صوفی کے سابقہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے وہ جانتا تھا کہ وہ ایک اور چکر لگوا کے رہے گی اور حسب عادت صوفی نے اس کی ہدایت کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیا تھا۔



نہ جانے کیا بات تھی کہ جب بھی وہ کوئی چیز خرید کر لاتی تو دو دلی ہو جاتی تھی۔ خریدتے ہوئے ایک دل کہتا کہ لے لے۔ چیز بہت اچھی ہے۔ دوسرا خیال آتا نہیں رہنے دو۔ پھر جب وہ لے آتی تو اندر ہی اندر پریشان ہوتی کہ کیا اٹھا لائی ہوں۔ پھر سوچتی بدل لیتی ہوں۔ پھر ڈرتی کہ امی ڈانٹیں گی۔ پھر خوف زدہ ہوتی کہ سب مذاق اڑائیں گے۔ پھر کوئی اچانک ہی بازار جانے لگتا تو وہ بھی چپکے سے ساتھ ہو لیتی اور بدل کے کوئی اور چیز لے آتی۔ اب تو سب ہی اس کی اس عادت سے واقف ہو گئے تھے۔

اگر کبھی اس کے خیال کی رو بھٹکتی تو وہ لرز جاتی کہ اگر اس کی قسمت میں بھی کوئی ایسا ہی جھول ہوا جیسا اس کی لائی چیزوں میں ہوتا ہے تو۔۔۔ اس تو کے بعد دل خوف میں جکڑا جاتا اور وہ سوچ کو لگام ڈالتے ہوئے دھیان بٹا لیتی۔

"اچھا گمان رکھنا چاہیے۔" وہ یہ سوچ کر خود کو تسلی دیتی۔

اور پھر اس کی شادی ہو گئی۔ اسے جو شوہر ملا تھا' وہ کہیں کھویا کھویا رہتا تھا۔ وہ سوچتی مجھے ایک بٹا ہوا شخص ملا ہے "آدھا ادھورا" ایک یہی اذیت کم نہیں

تھی کہ وہ فرقان کی پہلی پسند نہیں ہے۔ ساتھ اس کی بے اعتنائی کو بھی جھیلنا ایک مشکل ترین کام تھا۔
اس نے اپنے بھائیوں کو ۴ اپنے سارے کزنز کو دیکھا تھا۔ اپنی بیویوں سے ان کا التفات اور چاہت دیکھنے لائق تھی۔ حالانکہ وہ سب شکلاً" کوئی رانیاں نہیں تھیں، لیکن ان سب کی زندگیوں میں راجے آگئے تھے۔ وہ بھی کچھ ایسا ہی چاہتی تھی لیکن فرقان اس کو وہ محبت توجہ اور اپنائیت نہ دے پاتا تھا جس کی وہ توقع کیے ہوئے تھی۔ اس نے ایک محبت کرنے والے ہم سفر کی چاہ کی تھی، جو پوری نہ ہو پائی تھی۔ اس کے پاس اور کوئی راہ نہ تھی۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اطاعت و فرماں برداری کی راہ اپنائے گی۔ فرقان کی ہاں میں ہاں ملا کر وہ ابھی شادی کے چھ ماہ ہی گزار پائی۔
کسی مشکل لمحے میں صوفی کو ایکسچینج پالیسی یاد آجاتی۔ ایک لمبا راستہ زندگی کا آگے پڑا تھا۔ کیسے گزرے گا۔ یہی سوچیں اسے ادھ موا کر دیتیں۔



☆ ☆ ☆

آج وہ اسجد کے ساتھ میکے آئی تھی۔ یہاں آکر اس نے سب کے سوالوں سے بچنے کے لیے بہت سے کام جمع ۔ لیے ہوئے تھے۔

"امی! مجھے فلاں ڈش بنانا نہیں آتی۔ فلاں کھانا میں نے کبھی نہیں بنایا۔ آپ بتاتی جائیں میں بناتی ہوں۔"

وہ اونچا اونچا بولنے لگی تھی اب۔ وہ کاموں میں کھپ کر رویوں کو بھولنا چاہتی تھی۔

اسجد اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھتا تھا کہ وہ چمک کہاں غائب ہو گئی ہے' جو ہر صبح اس کے جاگنے پر اس کی آنکھوں میں لشکارے مارتی تھی۔ اسجد اداس ہو جاتا۔ اس کی بہن ہنستے مسکراتے ہوئے زندگی گزارنے کی خواہش مند تھی' لیکن اداس رہنے لگی تھی۔ وہ دونوں بچپن سے ہی اچھے دوست تھے۔

"کہاں کھوئی رہتی ہو تم؟" اسجد نے اپنے ازلی محبت بھرے انداز میں اسے مخاطب کیا تھا۔ لیکن درپردہ ایک درد تھا۔ بہن کی اداسی کا درد۔

"میں تو یہیں ہوں۔ تمہیں فرصت نہیں بہن کے پاس بیٹھنے کی۔" صوفی بھی چارج ہو کر بولی تھی۔

"بڑی باتیں آگئی ہیں تمہیں۔ مانا مجھ سے ایک سال سینئر ہو۔ شادی بھی ہو گئی ہے لیکن عقل مجھ سے کم ہی رہے گی تمہاری یاد رکھو۔"

یہ صرف ایک بات نہیں تھی تسلی بھی تھی کہ "پریشان مت ہو"

نہ جانے کیسے تھی لیکن تھی۔ صوفیہ مسکرا رہی تھی' لیکن اس کی آنکھیں نم ہو گئیں کہ دل کا حال عیاں ہو گیا۔ اسجد کے چہرے کے تاثرات اس کے لیے تسلی اور دعا بن گئے تھے۔

"چیزوں کو رشتوں کو تھوڑا وقت ضرور دینا چاہیے۔ تم نے ایکسچینج پالیسی کو بہت استعمال کیا ہے نا تو سوچو۔ سب سے بہترین ایکسچینج پالیسی قدرت کی ہوتی ہے۔

ہم انسان تو محض چیزوں کو بدل سکتے ہیں۔ لیکن یہ قدرت ہے کہ وہ انسان کو ہی بدل دیتی ہے۔ باہر سے انسان وہ ہی رہتا ہے۔ لیکن اندر سے یکسر بدل جاتا ہے۔ قدرت انسان کو اندر سے بدلتی ہے اور اندر تک بدل دیتی ہے۔ تم اپنے یقین کو مضبوط رکھو بس۔"

صوفیہ نے حیرت سے اس کی بات سنی تھی اور اس کی گہرائی میں ڈوب گئی تھی۔ سوچتی تو وہ تھی۔ غور بھی کرتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی کسی کی تسلی کٹھن سفر کے لیے ہمیں از سر نو تازہ دم کر دیتی ہے۔ وہ نئے سرے سے پُرامید ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا۔

"بنا بنایا نیا فرقان ہے یہ تو۔" سب اسے دیکھتے جاتے اور کہتے جاتے تھے۔ اپنے بیٹے کو پہلی بار پیار کرتے ہوئے فرقان نے یوں محسوس کیا تھا کہ وہ نئے سرے سے پیدا ہوا ہے۔ ماضی کے تمام غم خوشیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔

صوفیہ حیران تھی کہ یہ کیسا بدلاؤ آیا ہے۔ وہ ست رنگا بدلاؤ' جو اس نے کبھی چاہا تھا' وہ ہی چاہنے والا بہترین دوست سا' اپنا اپنا سا' ایسا ہم سفر جس کے اس نے کبھی سپنے دیکھے تھے۔ اجنبیت کی روکھے پن کی ساری دیواریں گر گئی تھیں۔ سب کے سامنے وہ بلال کے صدقے واری جاتا اور جیسے ہی دادی پھوپھی بلال کو لے کر کہیں آگے پیچھے ہوتیں' وہ صوفیہ کی کلائی پکڑ لیتا۔ ساری باتیں۔ سارے رنگ۔ سارے خواب۔ ساری خوشیاں اس سے بانٹنے لگتا۔ صوفیہ کے اندر کہیں گونج اٹھتی کہ اسجد نے صحیح کہا تھا۔

"سب سے بہترین ایکسچینج پالیسی قدرت کی ہوتی ہے۔"

چیزیں بدلنے کے لیے کمپنیوں کی ہزاروں شرائط ہوتی ہوں گی لیکن قدرت اپنی ایکسچینج پالیسی پر صرف یہی شرط رکھتی ہے۔ صبر' انتظار' خاموشی' رضا' شکوہ' شکایت نہیں۔ واویلا نہیں اور مایوسی تو ہرگز نہیں۔۔۔!

☆



اک طرف طلب تیری' اک طرف زمانہ ہے
پوچھتا ہے دل مجھ سے کس طرف کو جانا ہے

میرے گھر وہ آئے گا' آج گھر سجانا ہے
اِس طرف کی چیزوں کو اُس طرف لگانا ہے

نقش ہائے رنگیں کا اک نگار خانہ ہے
زندگی حقیقت ہے' زندگی فسانہ ہے

پائیں گے خوشی بھی ہم' رنج و غم بھی جھیلیں گے
اس جہاں میں جب تک اپنا آب و دانہ ہے

دشمنوں کے طعنے ہیں دوستوں کی تنقیدیں
تیر سینکڑوں ہیں اور ایک دل نشانہ ہے

آتشیں ہے لہجہ بھی، گفتگو بھی بارودی
سوچیے شفیق، اس سے کس طرح نبھانا ہے

شفیق احمد شفیق

یقین کر لو
محبتوں کی کہانیوں پر
مجھے تو بالکل یقین نہیں ہے
کہ اس طرح کی محبتوں کا
وجود تم کو
کہیں فسانوں میں ہی ملے گا
مگر مری جاں!
یقین نہ رکھتے ہوئے بھی تم سے
بس عشق ایسا ہی کر رہا ہوں
یقین کر لو!

عطا تراب

محبّت لائے اب سوغات کوئی
بدل دے صورتِ حالات کوئی

یہ کیسا اختیارِ زندگی ہے
دن اپنا ہے نہ اپنی رات کوئی

غبار آلود صبحِ شہرِ جاں ہے
سفر میں قافلہ تھا رات کوئی

میں جو کچھ ہوں تری ہی ذات سے ہوں
میری اپنی نہیں ہے ذات کوئی

میں بارِ غم اُٹھا سکتی ہوں تنہا
میرے شانے پہ رکھ دے ہات کوئی

میں اوجھل ہو گئی ماں کی نظر سے
گلی میں آئی جب بارات کوئی

زمینِ دل بڑی زرخیز تھی نورؔ
برس جاتی اگر برسات کوئی

شہناز نور

تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی، وہ سعئ کرم فرما بھی گئے
اس سعئ کرم کو کیا کہیے، بہلا بھی گئے، تڑپا بھی گئے

آشفتگیٔ وحشت کی قسم، حیرت کی قسم، حسرت کی قسم
اب آپ کہیں کچھ یا نہ کہیں، ہم رازِ تبسم پا بھی گئے

رودادِ غمِ اُلفت ان سے، ہم کیا کہتے، کیوں کر کہتے
ایک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھوں میں آنسو آ بھی گئے

اربابِ جنوں پر فرقت میں اب کیا کہیے کیا کیا گزری
آئے تھے سوادِ اُلفت میں کچھ کھو بھی گئے کچھ پا بھی گئے

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اُٹھ بھی گئے، کچھ آ بھی گئے

اس محفلِ کیف و مستی میں، اس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے، ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

اسرار الحق مجازؔ

شگفتہ نگاہ

رنگ رنگ پھول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اگر تم اتنی غلطیاں کرو کہ تمہاری غلطیاں آسمان تک پہنچ جائیں پھر توبہ کرو تو (پھر بھی) اللہ تمہاری توبہ قبول فرمائے گا۔"

فوائد و مسائل،

ا۔ یہ ضروری ہے کہ انسان گناہ کے بعد جلد از جلد توبہ کرے، تاہم اگر نفس اور شیطان کے بہکاوے اور دل کی غفلت کی وجہ سے جلد توبہ نہ کی جا سکے تو جب بھی احساس ہو، توبہ کر لینی چاہیے۔ یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اتنے زیادہ گناہ ہو گئے ہیں۔ وہ معاف نہیں ہوں گے۔ البتہ توبہ وہ ہے جو دل سے ہو، صرف زبان سے نہ ہو۔

شریکِ گناہ،

جھوٹی دنیا میں ووٹ مانگنے والا سچا آدمی ناکام ہو جائے گا اور بُرے آدمی کو ووٹ دینے والا بھی برائی میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔
(واصف علی واصف)

اقوالِ دانش،

پچاس سال کے بعد سارے شہر کی آبادی ساری کی ساری بدل جاتی ہے۔

بات چیت،

جارج برنارڈ اپنی بیوی کے ساتھ ایک ڈانس پارٹی میں شرکت کے لیے روانہ ہوئے لیکن واپس آئے تو اس قدر ناراض کہ ایک دوسرے سے بات چیت کرنے کے روادار نہیں تھے۔
برنارڈ شا تیزی سے گاڑی کو گیراج میں لے گئے۔ نیچے اترے، اسے لاک کیا اور باہر آ گئے۔ گیراج کا دروازہ مقفل کیا اور سونے کے لیے چلے گئے۔
نصف شب کو ان کی آنکھ کھلی تو بیڈ روم میں بیوی کو غائب پایا۔ وہ سمجھے کہ بیوی انہیں چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ وہ گیراج میں یہ دیکھنے کے لیے گئے کہ کہیں مسز ان کی قیمتی گاڑی تو نہیں لے گئیں۔
برنارڈ شا نے گیراج کی لائٹ جلائی تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ گاڑی لاکڈ تھی اور اندر ان کی بیوی گٹھڑی بنی پڑی تھی۔
مسٹر شا نے جلدی سے گاڑی کو کھولا اور نرمی سے بولے۔
"تم نے چلا کر مجھے بتا دیا ہوتا کہ میں تمہیں بند کیے جا رہا ہوں۔"
"کیسے بتاتی؟" ان کی بیوی نے کہا۔ "ہماری آپس میں بات چیت جو بند تھی۔"
ثمرہ، اقرا۔ کراچی

دلچسپ وجہ،

امریکی ایڈمرل رابرٹ برسکو جنوبی یورپ میں اتحادی فوجوں کے کمانڈر انچیف کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تو ان کے ایک دوست نے ان سے دریافت کیا۔
"ایڈمرل! تم یہ بتاؤ تم نے بحریہ میں بھرتی ہونے کا فیصلہ کیوں کیا تھا؟"
ایڈمرل نے جواب دیا۔ "جب میں چھوٹا بچہ تھا تو

میرے والد مجھے ایک جنگی جہاز دکھانے لے گئے۔ وہاں میں نے ملاحوں کو جہاز کے عرشے پر ننگے پاؤں چلتے دیکھا۔ میں نے اس وقت اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ میں نیوی میں بھرتی ہوں گا۔ اصل میں بات یہ تھی کہ میرے والد نے اسی روز مجھے جو نئے جوتے لے کر دیے تھے، وہ میرے پاؤں کو کاٹ رہے تھے۔ اور میرا دل ننگے پاؤں چلنے کو مچل رہا تھا۔"

یہ ریڈیو پاکستان ہے،

ایک بار ریڈیو پاکستان راولپنڈی کے ڈیوٹی اور انجینئرنگ اسٹاف کو لانے والی گاڑی خراب ہو گئی اور وہ صبح کا پروگرام چلانے کے لیے نہ آسکے۔ ڈیوٹی پر موجود چپراسی نے جب یہ دیکھا کہ نہ ڈیوٹی آفیسر ہے اور نہ انجینئرنگ اسٹاف تو اس نے کنٹرول روم کے کل پرزے اسٹارٹ کر دیے۔ اسٹوڈیو میں جا کر مائیکروفون کے سامنے بیٹھا اور بولنے لگا۔

"السلام علیکم! صبح کے چار بجے ہیں۔ نہ ڈیوٹی اسٹاف آیا ہے نہ انجینئر۔ میں عبدالکریم چپراسی بول رہا ہوں مجھے پتا ہے کہ آپ اس وقت تلاوتِ کلامِ پاک سنتے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے بٹن دبا دیا اور گھروں میں ریڈیو سیٹ تلاوتِ کلامِ پاک سے مستفید ہو گئے۔

گمان،

سکندرِ اعظم اپنے آپ کو انسان نہیں سمجھتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کسی قسم کا دیوتا ہے۔ جنگ میں اسے پہلی مرتبہ زخم لگا تو اسے تعجب ہوا کہ معمولی آدمیوں کی طرح اس کے زخم سے خون کیوں بہہ رہا ہے۔

بے نیازی،

نئے نئے دولت مند ہونے والے میاں بیوی یورپ کی سیر کو چلے گئے۔ واپسی پر ان کے دوست احباب بے چینی سے ان کے سفر کا حال سننے کے منتظر تھے۔ ان کے اعزاز میں دی گئی ایک دعوت میں ایک خاتون نے نو دولت مند کی بیگم سے پوچھا۔

"آپ نے روم کو بھی اپنے دورے میں شامل رکھا تھا یا نہیں؟"

"مجھے تو معلوم نہیں" بیگم نے بے نیازی سے کندھے اچکا کر کہا۔ "ٹکٹ ہمیشہ میرے شوہر خرید کر لاتے تھے۔"

شبانہ عندلیب۔ گوجرانوالہ

چائے کے متعلق رائے،

- چائے کی باقاعدہ اپنی ایک تاریخ ہے۔
(بین الاقوامی ٹی کونسل)
- چائے جادوئی مشروبات میں سے ایک ہے اور شاید دنیا کا آٹھواں عجوبہ بھی۔
(عظیم مفکر)
- کیا چائے کے ایک کپ سے بہتر بھی کوئی چیز ہے۔
(ونسٹن چرچل)
- چائے کا کپ ہی زندگی ہے۔
(گریٹ گرانڈ مایجول)
- اگر چائے کا ایک کپ نہ ملے تو اس سے بڑی اور کوئی تکلیف نہیں۔
(برنارڈ یال)
- جہاں چائے ہے وہاں امیدیں ہیں۔
(سر آرتھر پینرو)
- جس ملک میں چائے ناپید ہو وہاں زندہ رہنا مشکل ہے۔
(نوائل کوارڈ)
- ہم جاہلانہ انداز سے زندگی بسر کر سکتے ہیں لیکن چائے کے ایک شاندار کپ کے بغیر نہیں۔
(ملاچی میک کورمک)
- اگر آپ سرد مزاج ہیں تو چائے آپ میں جوش پیدا کر دے گی، اگر آپ نسبتاً گرم ہیں تو یہ آپ کو ٹھنڈا کر دے گی۔ اگر آپ پریشان ہیں تو آپ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دے گی۔
(گلیڈ اسٹون۔ برطانوی وزیراعظم)

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

ترجیح،

شطرنج کے ایک کھلاڑی نے دوسرے سے پوچھا۔
"کل بھی کھیلنے آؤ گے ناں...؟"

دوسرا کھلاڑی سر کھجاتے ہوئے بولا۔
"کل تو میری شادی ہے۔ لیکن خیر کوئی بات نہیں۔ میں شادی ملتوی کر دوں گا۔"
نوال افضل گھمن۔ لاہور

خوف اور خواہش،

خوف دراصل خواہش سے جنم لینے والی کیفیت ہے۔ جو لوگ دُنیا کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ خوف زدہ رہتے ہیں۔
(بانو قدسیہ)
(مردابریشم سے اقتباس)
عذرا ناصر۔ کراچی

قائداعظم اور اسلام،

قائداعظم نے ۱۹۴۷ء میں کراچی بار ایسوسی ایشن کے جلسہ عید میلاد النبیؐ سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے بیرسٹری کی اعلاتعلیم کے لیے لنکنز ان کا انتخاب اس لیے کیا کہ اس ادارے کے عظیم قانون دانوں کے اسمائے گرامی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی موجود تھا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قائداعظم کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کس قدر محبت تھی۔

انہوں نے ایک پارسی لڑکی رتی ڈنشا سے پسند کی شادی کی تھی جو سر ڈنشا کی بیٹی تھی لیکن شادی سے پہلے رتی نے اسلام قبول کیا۔ اپنا نام مریم رکھا اور پھر اگلے روز محمد علی جناح نے ان سے شادی کی۔ اگر وہ ماڈرن مسلمان ہوتے تو رتی کو مسلمان کیے بنا ہی شادی کر لیتے لیکن انہوں نے رتی کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی شرط رکھی۔ جب رتی نے یہ شرط مان لی تو وہ اسے بمبئی کی جامع مسجد کے امام و خطیب مولانا نذیر احمد صدیقی کے پاس لے گئے جنہوں نے رتی کو شرف با اسلام کیا۔

مولانا نذیر احمد صدیقی، شاہ احمد نورانی کے نانا تھے۔

نخبہ اکرم۔ گاؤں گوئیکی

خود پسند،

مشہور ناول نگار وکٹر ہیوگو نے الیگزینڈر سے باتوں باتوں میں کہا۔
"اگر ہم دونوں مل کر ایک ناول لکھیں، تو وہ دُنیا کا عظیم ترین ناول ہوگا۔"
الیگزینڈر نے جواب دیا۔ "واہ گھوڑے اور گدھے کا کیا میل؟"
وکٹر ہیوگو نے جواب دیا۔ "بھئی تم ناول مت لکھو لیکن براہ کرم مجھے گھوڑے کا خطاب نہ دو۔"
حرا قریشی۔ بلال کالونی ملتان

فتح،

0 تمام فتوحات میں سب سے بڑی فتح اپنے آپ پر فتح پانا ہے۔
(افلاطون)
0 میں آیا، میں نے دیکھا اور میں نے فتح کیا۔
(سیزر)
0 گھڑ دوڑ میں تیزی ہمیشہ فتح کی نشانی ثابت نہیں ہوتی اور نہ ہی ہمیشہ طاقت ور ہی نے میدان جنگ میں جوہر دکھائے ہیں۔
(ایکلیسیاٹس)
0 ہماری حکومت سب سے پہلے ہمارے اپنے دل پر ہونی چاہیے، بری خواہشات کو مغلوب کرنا ہی عظیم فتح ہے۔
(پلوٹارچ)
0 فتح ان لوگوں کے قدم چومتی ہے۔ جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ فتح حاصل کر سکتے ہیں۔
(ورجل)
0 فتح خرگوش کے پیروں، مرد کے دماغ اور عورت کی زبان میں ہوتی ہے۔
(مقولہ)
اقصیٰ، عذرا۔ کراچی



آنچلوں کی ڈائری

امت الصبور

سیدہ نسبت زہرا کی ڈائری ہے

میری ڈائری میں تحریر رانا مدثر ضیاء کی یہ غزل آپ سب قارئین بہنوں کے لیے۔

ہر اک زخم کو اس نے ہدف بنایا تھا
ستم ظریف! مرا راز دار کتنا تھا

یہ تیرے شہر میں جو اک فقیر پھرتا ہے
انا پرست، کبھی باوقار کتنا تھا

پھر اس کے بعد جو چاہے سزا سنا دینا
یہ سوچ لینا مجھے اختیار کتنا تھا

یہ اور بات تم میری دسترس میں نہ تھے
محبتوں کا شجر پر بہار کتنا تھا

مجھے تو راس نہ آئے ملاپ کے موسم
شکستِ دل کا سماں سازگار کتنا تھا

یہ تپتی دھوپ ازل سے مرا مقدر تھی
شجر وفا کا مگر سایہ دار کتنا تھا

تمام عمر مجھے جو رلا کے ہنستا تھا
وہ میرے بعد مگر اشکبار کتنا تھا

میں ہار کر بھی بہت مطمئن سا لگتا ہوں
وہ جیت کر بھی ضیا سوگوار کتنا تھا

گڑیا شاہ کی ڈائری ہے

ایک بہت ہی پیاری سی غزل قاری بہنوں کی نذر۔ اس غزل کی تعریف میرے بس سے باہر ہے آپ خود محسوس کریں۔ شاعرہ ہیں فاخرہ بتول۔

جو دل لگانے کا سوچتے ہو
لہو بہانے کا سوچتے ہو

بتاؤ جا کر بھلا سکو گے
یہ جو تم جانے کا سوچتے ہو

کسی کے دل میں مکاں بنا کر
اسے گرانے کا سوچتے ہو

محبتوں کا ہو راج ہر سو
یہ کس زمانے کا سوچتے ہو

نہیں ہے احسان گر محبت
تو کیوں جتانے کا سوچتے ہو

سوال چاہت، جواب وحشت
ستم کمانے کا سوچتے ہو

ابھی تو آئے ہو بعد مدت
ابھی سے جانے کا سوچتے ہو

جو دل کی قسمت میں ہو اجڑنا
تو کیوں بسانے کا سوچتے ہو

ہمارے چہرے کو چاند کہہ کر
ہمیں بنانے کا سوچتے ہو

صبا جمیل کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر "امید" سے بھرپور نظم "مایوس لوگوں کے لیے"۔

کہیں سے سورج نکل پڑے گا،

یہ رات اپنے سیاہ پنجوں کو جس قدر بھی دراز کرلے
میں تیرگی کا غبار بن کر نہیں جیوں گا

مجھے پتا ہے کہ ایک جگنو کے جاگنے سے
یہ تیرگی کی دبیز چادر نہیں ہٹے گی
مجھے خبر ہے کہ میری بے زور ٹکروں سے
فصیل دہشت نہیں ہٹے گی
میں جانتا ہوں کہ مرا شعلہ چمک کے رزق غبار ہوگا
تو بے خبر یہ دیار ہوگا
میں روشنی کی لکیر بن کر کسی ستارے کی مثل بکھر جاؤں گا
بستیوں کو خبر نہ ہوگی
میں جانتا ہوں کہ میری کم تاب روشنی سے سحر نہ ہوگی
مگر میں پھر بھی سیاہ شب کا غبار بن کر نہیں جیوں گا
کرن ہو کتنی نحیف لیکن کرن ہے پھر بھی
وہ ترجماں ہے کہ روشنی کا وجود زندہ ہے
اور جب تک
یہ روشنی کا وجود زندہ ہے
رات اپنے سیاہ پنجوں کو جس قدر بھی دراز کرلے
کہیں سے سورج نکل پڑے گا

سونیا حسین کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر محسن نقوی کی یہ خوبصورت غزل جو کہ مجھے بہت پسند ہے۔ آپ بھی پڑھیے۔

دشت وفا میں پیاس کا عالم عجیب تھا
دیکھا تو ایک درد کا دریا قریب تھا

گزرے جدھر جدھر سے تمنا کے قافلے
ہر ہر قدم پہ ایک نشان صلیب تھا

کچھ ایسی مہربان تو نہ تھی ہم پہ زندگی
کیوں ہر کوئی جہاں میں ہمارا رقیب تھا

اپنا پتا تو اس نے دیا تھا مجھے محسن
میں خود ہی کھو گیا تو یہ میرا نصیب تھا

فرح حسین کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر سلیم کوثر کی یہ غزل باذوق قارئین کے نام۔

جانے کیا بات ہوئی ہے جو خفا بیٹھا ہے
مجھ میں اک شخص بغاوت پہ تلا بیٹھا ہے

وہ پرندہ جسے پرواز سے فرصت ہی نہ تھی
آج تنہا ہے تو دیوار پہ آ بیٹھا ہے

بولتا ہے تو مجھے اذن خموشی دے کر
کون ہے جو پس اظہار چھپا بیٹھا ہے

تم بھی منجملہ ارباب جفا نکلے ہو
تم تو کہتے تھے کہ ہر دل میں خدا بیٹھا ہے

تھک گیا دشت طلب میں تو سوالی بن کر
میرا سایہ میری دہلیز پہ آ بیٹھا ہے

تو کتابوں میں کسے ڈھونڈ رہا ہے سلیم
یہ تو کیا روگ مرے یار لگا بیٹھا ہے





خالدہ جیلانی



ارم کمال ____________ فیصل آباد

درخت کاٹ کے سایہ فروخت کرتے ہیں
اور اس کے بعد کڑی دھوپ سے گزرتے ہیں
ہمیں خود اپنے مسائل پہ غور کرنا ہے
کہ روز روز صحیفے نہیں اترتے ہیں

ثمرہ، اقرا ____________ کراچی

تم نے تو کہہ دیا کہ محبت نہیں ملی
مجھ کو تو یہ بھی کہنے کی فرصت نہیں ملی
پھر اختلافِ رائے کی صورت نکل پڑی
اپنی یہاں کسی سے بھی عادت نہیں ملی

عائشہ خان ____________ ٹنڈو محمد خان

مجھے لہجوں کے بدلنے سے ہمیشہ خوف آتا ہے
کہ لہجے جب بدلتے ہیں کوئی اپنا نہیں رہتا

ثوبیہ ریحان ____________ بنوں

عجیب حسن ہے تیری اداس آنکھوں میں
سکوتِ صبحِ ازل کا خیال آتا ہے

ملیحہ صدیقی ____________ کراچی

غیبر تحیر عشق سن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

ندا افشاں انصاری ____________ کراچی

کتنی دلکش ہے اس کی خاموشی
ساری باتیں فضول ہوں جیسے

حمیرا نوشین ____________ منڈی بہاؤالدین

لیتا ہے اس کی یاد سے مجھ کو بھی کچھ نہ کچھ
جیسے سنار داکھ یونہی چھانتا نہیں
دل کے معاملے میں بھلا کوئی کیا کرے
یہ تو بڑے بڑوں کو بھی گردانتا نہیں

صبیحہ شوکت ____________ لاہور

تم اپنے کسی طور عبادت نہیں کرتے
ہم اہلِ وفا اتنی جسارت نہیں کرتے
ہم لوگ خطا وار محبت سہی لیکن
ہم لوگ وفاؤں کی تجارت نہیں کرتے

رضوانہ شکیل ملک ____________ لودھراں

محبت منفرد ہوتی ہے سب دنیا کے کھیلوں سے
جو ہارا پھر نہیں کھیلا، جو جیتا اس نے توبہ کی

حرا قریشی ____________ بلال کالونی ملتان

میرے بھٹکنے پہ جانِ محسن یہ طنز کیسا ہے اس جہاں میں
ہوتے ہیں بے سمت و بے کنار، کبھی سمندر کبھی ستارا

نور حیا ____________ نواب شاہ

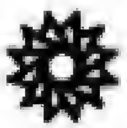
ویران راہ گزر کو دیکھا کریں گے ہم
آئے گی تیری یاد تو رویا کریں گے ہم
وہ دن جو تیرے ساتھ گزارے تھے پیار میں
کتنے حسین خواب تھے سوچا کریں گے ہم

طلعت اقبال ____________ لطیف آباد نمبر 9

جب مٹی میں مل جائے گا میری ہستی کا وجود
یاد تازہ ہو گی میری ان تحریروں سے

عائشہ جمیل ____________ لیک سٹی لاہور

لو یونہی بے سبب نہ پھرا کرو، کوئی شام گھر بھی رہا کرو
وہ غزل کی سچی کتاب ہے، اسے چپکے چپکے پڑھا کرو
کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا، جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو



خبریں وبریں

واصفہ سہیل



مچھلی کے فوائد

روزنامہ خلیج ٹائمز میں شائع شدہ رپورٹ کے مطابق "کلینیکل نیوٹریشن" کی تازہ تحقیق میں انکشاف کیا گیا ہے کہ ہفتے میں دوبار مچھلی کا استعمال خواتین میں سماعت کی کمی کے خطرے کو دور کرتا ہے۔ تحقیق کی سربراہ اور ویمن اسپتال بوسٹن کی ڈاکٹر شیرون کہتی ہیں کہ خواتین میں سماعت کی کمی عام ہو رہی ہے، بڑھتی ہوئی عمر میں یہ ایک عام بات ہے، کچھ ایسی غذاؤں کی فطری قوت کا پتا چلا ہے جو سماعت کی کمی کو جلد واقع ہونے سے روکتی اور سماعت کی کمزوری کو دور کرتی ہیں۔ ان میں مچھلی سرفہرست ہے۔ اسی طرح مچھلی کا تیل دماغی طاقت بڑھاتا ہے دل کو صحت مند رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ مچھلی کا تیل الزائمر سے محفوظ رکھتا ہے۔ مچھلی کا تیل یعنی "کوڈلیور" آئل کا استعمال یادداشت اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو بڑھاتا ہے۔ اس کے استعمال سے دماغ کے اس حصے میں بھی سکڑاؤ پیدا نہیں ہوتا جو عمر کے ساتھ ساتھ گھٹتا ہے اور جو یادوں کو محفوظ رکھنے کا کام انجام دیتا ہے، محققین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جو لوگ مچھلی کے تیل کے کیپسول لیتے ہیں ان میں الزائمر اور فتور دماغ کے مرض کے بڑھنے کی رفتار بہت سست ہوتی ہے۔

قصور

اداکارہ میرا کے سب کے ساتھ اختلافات رہتے ہیں۔ کبھی ساتھی اداکاراؤں کے ساتھ، کبھی کیپٹن نوید اور ان کے والد کے ساتھ، لیکن اب ان کا اختلاف اپنے والد سے بھی ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں میرا تو چپ ہیں، لیکن ان کے والد کا کہنا ہے کہ "میرا کے ساتھ کافی عرصے سے اختلافات ہیں، لیکن وہ میری بیٹی ہے اس لیے اس سے کیا شکوہ کروں۔ انہوں نے مزید کہا کہ میرا یہ سمجھتی ہے کہ میں میرا کی چھوٹی بہن رباب کو شوبز میں آنے سے روک رہا ہوں (کیا واقعی۔؟) جبکہ میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے، رباب خود ہی شوبز میں نہیں آنا چاہتی۔ (حیرت ہے) لیکن میرا چاہتی ہے کہ رباب شوبز کی دنیا میں آجائے (سوچنے کی بات ہے کہ رباب کے آنے سے میرا کو اتنی دلچسپی کیوں ہے؟ کیا واقعی رباب میرا کی بہن ہے یا۔۔۔؟)

انکشاف

عینی خالد کا جب سے نکاح ہوا ہے۔ وہ بہت خوش نظر آرہی ہیں۔ لگتا یہ ہے کہ انہیں خوشگوار ازدواجی زندگی راس آگئی ہے۔ جب ہی تو وہ ایک طرف تو مارننگ شوز میں نظر آرہی ہیں اور دوسری جانب وہ

اگر کوئی بھارتی پروڈیوسر لائک کردے تو ٹھیک ورنہ۔؟



سائبان

یہ خبر تو آپ تک پہنچ ہی چکی ہوگی کہ خیر سے مدیحہ شاہ بھی شادی شدہ ہوگئیں۔ گزشتہ دنوں مدیحہ اپنے شوہر جاوید اقبال کے ساتھ لاہور آئیں تو انہوں نے اپنے قریبی دوستوں اور میڈیا کے لوگوں کو ایک دعوت ولیمہ دی۔ اس موقع پر مدیحہ دلہن کے روپ میں تھیں، اور دولہا بلیک ٹوپیس میں ملبوس تھے۔ مدیحہ شاہ اس موقع پر بہت خوش تھیں۔ اس موقعہ پر انہوں نے کہا کہ "میں اپنی شادی شدہ زندگی کو بھرپور انجوائے کررہی ہوں پیار کرنے والا جیون ساتھی ملا ہے۔ شوہر ایک سائبان ہوتا ہے میں اپنی زندگی خوشگوار گزارنا چاہتی ہوں مجھ پر کوئی بوجھ نہیں (کیسا بوجھ۔؟)" اپنے شوہر کے متعلق مدیحہ نے کہا کہ "یہ صرف میرے ٹام کروز ہیں۔ (آہم!!) فلموں میں کام کے حوالے سے انہوں نے کہا کہ "جاوید کی طرف سے مجھ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ جب جاوید کینیڈا میں ہوں گے تو پاکستانی فلموں میں کام کرنے کا فیصلہ بھی کرچکی ہیں۔ (بھلا بتایئے انڈسٹری میں پہلے کمی تھی جو۔؟) عینی کا کہنا ہے کہ وہ بہت جلد اس فلمی پروجیکٹ کے حوالے سے انکشاف کریں گی۔ (اچھا جی! فلم میں انکشاف بھی ہوتے ہیں۔؟) جس میں وہ جلوہ گر ہورہی ہیں۔ (دیکھیں گے۔)



کوشش

اروا حسین نے فلم نامعلوم افراد کی کامیابی کے بعد بولی ووڈ میں اداکاری کے خواب دیکھنا شروع کردیے ہیں، جب ہی تو انہوں نے انسٹاگرام پر ایک ویڈیو شائع کی ہے، جس میں وہ کنگنا رناوٹ کی فلم کوئین کی ہیروئن کا کردار کررہی ہیں۔ اس میں اروا نے کنگنا کی آواز پر ایسی شاندار اداکاری کی ہے کہ لگ ہی نہیں رہا کہ یہ دو الگ الگ فنکار ہیں۔ بلکہ اروا کی اداکاری پر کنگنا کی آواز زیادہ سوٹ کررہی ہے۔ لگتا یہ ہے کہ ہم سفر کی ماہرہ حسین کے شاہ رخ کے ساتھ فلم سائن کرنے کے بعد ہر اداکارہ یہ چاہ رہی ہے کہ کاش اس کا ڈراما بھی بھارتی ٹی وی کی زینت بن جائے (اور کوئی بھارتی پروڈیوسر اسے دیکھ لے۔) اب اروا کا یہ وڈیو

گھومتے ہوئے لگتا ہے جیسے یہ کسی مسلمان ملک کا شہر ہو۔

(عبداللہ طارق سہیل)

☆ اہل مغرب ناموس رسالت پر حملے کرکے اسے اظہار رائے کی آزادی قرار دیتے ہیں' لیکن مغرب میں کوئی ایسا نہیں ہے جو نازیوں کے خلاف یہودیوں کے پروپیگنڈے پر تنقید کرنے کی جرات بھی کرسکے۔ یہودیوں نے اپنے پروپیگنڈے کے زور پر اتنے یہودیوں کو کنسنٹریشن کیمپ میں ہلاک کروادیا' جتنے پورے جرمنی میں نہیں تھے' پھر بھی اس جھوٹ پر

کوئی زبان کھولے تو اس کے لیے سزائیں مقرر ہیں اور اس وقت آزادی اظہار اور آزادی صحافت یاد نہیں آتی۔ مسلمانوں کے لیے تو ہر نبی اور ہر رسول قابل احترام ہے اور ان پر ایمان رکھنا لازمی ہے' لیکن کیا مغرب کے آزادی پسندوں نے بنی اسرائیل کے انبیاء اور حضرت عیسیٰ کے بارے میں توہین آمیز خاکے بنانے کی جرات کی ہے؟

(روزنامہ جسارت)

☆ ہم امریکیوں کے دلوں میں موجود اپنے خوف کو اپنے لیے استعمال کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے اور وہ ہیں کہ اپنے خوف ہی کے باعث ہماری گردنوں پر سوار ہیں۔ جانے کب ہمیں ہوش آئے گا اور ہم کب اس جنگ کے لیے تیار ہوں گے جس کے خوف سے ہی وہ مرے جاتے ہیں۔

(مریم گیلانی)

☆ صوبہ خیبر پختون خواہ کے وزیر اطلاعات نے کہا ہے کہ بلا اجازت کسی تنظیم کو متاثرین کی مدد کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ کیا حیران کن بیان ہے دنیا کی تاریخ میں ایسا بیان کسی نے نہیں دیا ہوگا۔

(ایکسپریس نیوز عبداللہ طارق سہیل)





میں ان کے ساتھ وہاں ہوں گی اور جب وہ پاکستان میں ہوں گے تو میں پاکستان میں۔" (یعنی جہاں تم۔ وہاں ہم)

ادھر ادھر سے

☆ سوویت یونین کے خاتمے اور مسلم اکثریتی چھ ریاستوں (قازقستان' ازبکستان' تاجکستان' کرغستان' ترکمانستان اور آذربائیجان۔) کی علیحدگی کے باوجود روس میں مسلمانوں کی خاصی آبادی ہے۔ جس میں پچھلے برسوں کے دوران تناسبی اضافہ بھی ہوا۔ روس کا ہر چھٹا آدمی مسلمان ہے اور کئی مسلمان جمہوریتیں ہیں۔ سب سے اہم جمہوریہ تاتارستان ہے جو ماسکو سے نوے کلو میٹر دور ہے۔ قفقاز (کوہ قاف) میں چھ سات ننھی منی ریاستیں مسلمان اکثریتی ہیں اور ان ہی میں چیچنیا بھی شامل ہے۔ دارالحکومت ماسکو میں بیس لاکھ مسلمان مقامی شہری ہیں اور اتنے ہی یعنی بیس لاکھ مسلمان تارکین وطن ہیں۔ ایک مغربی جریدے نے لکھا تھا۔ ماسکو میں

بقیہ زینب جمیل

"بہت مختلف ہوں اور ہمیشہ سے ہی ہوں۔"

75 "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟"

"بالکل کر لیتی ہوں۔ اگر مجھے اندازہ ہو جائے کہ میں نے غلط کیا ہے۔"

76 "دل کی سنتی ہیں یا دماغ کی؟"

"دونوں کی۔"

77 "آپ کی اچھی اور بری عادت؟"

"میرے اردگرد کے لوگ اگر پریشانی میں ہوں تو ان کی مدد کرتی ہوں اور بری عادت کہ جو دل سے اتر جائے وہ دوبارہ جگہ نہیں بنا سکتا۔"

78 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"

"نہیں کبھی نہیں۔"

79 "غصے میں منہ سے کیا نکلتا ہے گالیاں یا بددعائیں؟"

"نہ گالیاں نہ بددعائیں۔"

80 "غصے میں پہلا لفظ؟"

"دفع ہو جاؤ۔"

81 "کب فوراً" نیند آجاتی ہے؟"

"جب بہت تھکی ہوئی ہوتی ہوں۔"

82 "اپنے سرہانے کیا کیا چیزیں رکھتی ہیں؟"

"میری سائیڈ ٹیبل پہ جو گند بلا ہوتا ہے وہ سب پڑا ہوتا ہے۔"

83 "زندگی بری لگتی ہے....؟"

"نہیں کبھی بری نہیں لگتی زندگی۔"

84 "کھانے کی ٹیبل پہ کیا نہ ہو تو کھانا نہیں کھاتیں؟"

"کبھی رائتہ، کبھی پانی.... ویسے ہر کھانے کے علیحدہ ہی لوازمات ہوتے ہیں۔"

85 "محنت سے پیسہ ملتا ہے یا قسمت سے؟"

"قسمت سے۔"

86 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"

"بہت غصہ آتا ہے۔"

87 "جھوٹ بولتی ہیں جب؟"

"مصلحت کے تحت۔"

88 "زندگی میں کب چینج آیا؟"

"جب میں میڈیا میں آئی۔"

89 "آپ کے مزاج میں کیا کمی ہے؟"

"مستقل مزاجی کی یعنی فیصلوں میں مستقل مزاجی۔"

90 "بہت پیسہ ہاتھ آجائے تو؟"

"کسی اچھی جگہ پہ انویسٹ کروں گی۔"

91 "فریش کب ہوتی ہیں؟"

"اٹھنے کے دو گھنٹے کے بعد۔"

92 "گھر آتے ہی دل چاہتا ہے۔"

"کہ گرم گرم چائے مل جائے۔"

93 "سینما میں سب سے پہلی فلم کب دیکھی؟"

"او.... ہو.... یہ تو یاد ہی نہیں ہے۔"

94 "کس ملک کے لیے کہتی ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟"

"یورپ کے لیے۔"

95 "لوگ کن باتوں میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں؟"

"گوسپ پہ.... دوسروں کی برائیاں کرتے ہیں نیگیٹو باتوں پر۔"

96 "شاپنگ ضرورت کے تحت کرتی ہیں یا انجوائے کرنے کے لیے؟"

"کبھی کبھی انجوائے کرنے کے لیے چلی جاتی ہوں' ورنہ تو ضرورت کے تحت ہی کرتی ہوں۔"

97 "ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟"

"اپنی مما کے ہاتھ کا۔"

98 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتی ہیں؟"

"جتنا ہاتھ میں آجائے۔"

99 "حجاب ضروری ہے یا فیشن ہے؟"

"آپ کی مرضی ہے.... آپ سمجھتی ہیں کہ ضروری ہے تو ضرور کریں نہیں تو نہ کریں۔"

100 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"

"دعا کروں گی کہ نہ آئے۔ نہیں تو اللہ مالک ہے۔"

میرے استاد

آسیہ رزاقی

ہمارا تو بچپن گڑیوں سے کھیلتے گزر رہا تھا۔ ہمارے ابا کو بچوں کے ہر کھیل سے دلچسپی تھی۔ گڑیوں کا حال بھی پوچھا کرتے تھے۔ ابا ایک ادیب، شاعر، نقاد، مصنف سب کچھ تھے۔ ہمیں ادب سے پڑھنے کی حد تک دلچسپی تھی۔ پورا خاندان ہی ادیب تھا۔ یہاں تک کہ پھپوئیں بھی اپنے دور میں تہذیب الاخلاق میں لکھا کرتی تھیں۔

میرٹھ (انڈیا) سے منجھلی پھپھو صاحبہ لاہور آئیں۔ ان کے ساتھ ان کے (اور ابا کے بھی) بھانجے ساتھ آئے۔ ہم سے چند سال ہی بڑے ہوں گے۔ مگر ان کے ہاتھ میں ہر وقت قلم اور کاپی ہوتی تھی۔

پھپھو نے بتایا۔ "سوفی میاں بھوپال سے اپنے گھر بیٹھ کر ہاتھ سے لکھ کر اخبار نکالا کرتے تھے۔ چغل خور نام تھا۔ خاندان بھر کی اوٹ پٹانگ خبریں اس میں ہوتی تھیں۔"

"ہاتھ سے لکھ کر اخبار؟ خاندان کی خبریں؟ واہ۔" سب کو دلچسپی ہوئی۔ خبروں کا نمونہ سن کر اور بھی ہنسی آئی۔ سوفی میاں دراصل میرٹھ میں اپنی خالہ کے گھر پر پڑھنے آئے تھے۔ جی نہیں۔ گھر پر نہیں۔ کالج میں پڑھتے تھے۔ اور پڑوسیوں کو اپنی نت نئی شرارتوں سے حیران کرتے تھے۔

لاہور آکر انہوں نے ترقی کمال کا مظاہرہ کرتے ہوئے رسالہ نکالنے کا اعلان کیا۔ ہاتھ سے لکھ کر۔ خاندان والوں سے فرمائش ہوئی کہ اپنی اپنی نگارشات فوری عطا کی جائیں۔ تحریریں شوخ ہونی چاہئیں۔ پرچہ مزاحیہ ہوگا۔ ہم تو حیرت سے دم بخود ہو گئے۔ جب انہوں نے ہم سے بھی تقاضا کیا۔ یعنی کہ اس ادبی فنی سفر میں ہمیں بھی اہمیت دی گئی۔ اب سوچ بچار کا در کھلا۔ کئی دن دماغ میں کھلبلی سی رہی۔ کیا لکھیں۔ اور کیسے۔ بچوں کا رسالہ تو تھا نہیں کہ کہانی لکھ دیں۔ لکھنا آتا ہی نہیں تھا۔ ہاں پڑھنے میں بہت مہارت تھی۔

خیر۔ اب ہم نے جو غور کیا تو چھوٹے بھائی پر نظر پڑی۔ وہ بہت دلچسپ باتیں کرتا تھا اور اس کی حرکتیں بھی بہت عجیب ہوتی تھیں۔ اسے دیکھ کر بہت ہنسی آئی۔ کئی واقعات یاد آئے۔ بس جی دماغ کے روزن کھل گئے۔ روشنی اندر آئی۔ چھوٹے بھائی کو مرکزی کردار بنایا۔ اور لکھنا شروع کر دیا۔

اب قلم رکنا نہ تھا۔ خیر۔ آخر ایک خاص مقام پر وہ قصہ ختم کرکے۔ نئے صاف کاغذ پر لکھ کر ایڈیٹر "تراشے" کے نام کے لفافے میں ڈال کر میز پر رکھ دیا۔ پھر دیکھا کہ ہمارا لفافہ کھول رہے ہیں۔ بڑی شرم آئی۔ ہائے اللہ۔ ناپختہ تحریر۔ بچکانہ خیالات کیا سوچتے ہوں گے۔ کئی دن ہم نے سامنا نہ کیا۔ پھر سنا کہ پرچا تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔ پھر سب جمع ہوئے۔ اور پرچہ پڑھ کر سنانے کے لیے ہماری بڑی بہن کے سپرد کیا گیا۔ آخری۔ ہماری کہانی کی باری آگئی۔ اس سے پہلے اتنے قہقہے لگ چکے تھے کہ۔ اب مزید ہنسنے کی طاقت نہ تھی۔

ارے۔ مگر۔ تعارفی تمہید میں کیا تھا؟

"پڑھنے والے اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ اس شوخ تحریر کی خالق ننھی ادیبہ اپنے ادبی مستقبل میں کیا ہو گی؟"

الفاظ تھے کہ موتی چور کے لڈو۔ سیدھے حلق میں اتر گئے۔ خوشی کے مارے آنسو آگئے۔ (فوراً" خود کو ادیبہ مان لیا)

اور یہ تحریری رپورٹ۔ تعریفی سند بن کر آج تک ذہن میں روشنی بکھیرتی رہتی ہے۔ اور یہ تھی پہلی کاوش۔ تعریف کرنے والے تھے۔ علی سفیان آفاقی۔

انہوں نے بھی ادب کے بحر ذخار میں نیا نیا قدم رکھا تھا۔ کچھ عرصہ "تراشے" چلا۔ پھر وہ پڑھنے پڑھانے میں مصروف ہو گئے۔ وقت گزرا تو اخبار سے منسلک ہو گئے۔ اس کے بعد مزید وقت گزرتا گیا۔ تجربے کی بھٹی کندن سے سونا بناتی گئی۔ فلموں کی کہانیاں لکھتے لکھتے فلم بنانے لگے۔ پھر تو پتا نہیں کیا کیا بن گئے۔ ہمارے بہنوئی بھی بن گئے۔

مگر ہم نے تو اول دن سے انہیں اپنا استاد مانا۔ استاد ہی سمجھا۔ خود کو شاگرد۔ انہوں نے ہی ہمارے ذہن کو جگایا' شوق کو اکسایا تھا۔ اور باقاعدہ ادیبہ کا خطاب دیا۔ تو اس خطاب کی لاج رکھنے کی پوری کوشش بھی کی۔

ایک دن لبنیٰ آفاق (چھوٹی بہن) آئیں۔ کہنے لگیں۔
"آپا۔ کوئی افسانہ لکھا ہوا ہو۔ تو دے دیں۔ ہمارے گھر محمد فاضل صاحب آئے بیٹھے ہیں۔ انہیں فلم کے لیے اسٹوری چاہیے۔"
محمد فاضل صاحب کافی مشہور ڈائریکٹر پروڈیوسر نہ جانے کیا کیا تھے۔ ہمارے پاس ایک افسانہ رف حالت میں پڑا تھا۔ دے دیا۔ پتا چلا۔ کہ انہیں اسٹوری بہت پسند آئی ہے۔ فلم بھی بن گئی۔ "عاشی۔"
سنسر ہونے سے پہلے ہم نے اسٹوڈیو جا کر دیکھا۔ لبنیٰ اور سوفی بھائی کے ساتھ۔ اس سے پہلے بھی کئی فلمیں اسٹوڈیو میں ریلیز سے پہلے دیکھی تھیں۔ لیکن کہانی کے نام کے آگے اپنا نام اسکرین پر جگمگا تا دیکھ کر جو خوشی ہوئی۔ بس۔ فلم کے سب کردار موجود تھے۔ سب سے ملنا ہوا۔ بابرا شریف ہیروئن تھیں۔ وہ بھی بطور خاص ملیں۔ کہانی کی تعریف کی۔ بابرا نے اس میں اپنا کردار بہت اچھی طرح نبھایا تھا۔
سوفی بھائی (گھر میں۔ باہر کے لوگ آفاق کہتے تھے) بے حد بزلہ سنج' حاضر جواب۔ خوش مزاج انسان تھے۔ گھر میں جتنی دیر رہتے۔ سب کو مزاحیہ شعر سنا کر یا ستا کر ہنساتے رہتے۔ (ڈانٹ ڈپٹ کا شعبہ الگ تھا۔)
ایک بار ان کے بڑے بھائی سلطان بھائی نے ایک نظم لکھی۔
مزا آجائے گا واللہ۔
یہاں جب آؤ گی بیگم۔
وہ اس زمانے کے مزاحیہ رسالے چاند میں چھپی۔
ہماری بہن نے فوراً" جواب میں۔
مزا آجائے گا واللہ۔
یہاں جب آؤ گی بھابھی
لکھ ڈالی جس میں سلطان بھائی کے محبت کے جھولے اور خوابوں کے جزیرے میں گھومتے رہنے کی نفی کی تھی اور بتایا تھا کہ میاں کے موزے اور بچوں کے پوتڑے بھی دھونے ہوں گے علاوہ کھانا پکانے اور میاں کی خفگی کے۔ وہ بھی چاند میں چھپ گئی۔ پھر سوفی بھائی میدان میں آگئے۔ پوری مثنوی لکھ ڈالی۔ جس میں بیگم کو ساس نندوں کے ظلم و ستم سے ڈرایا بلکہ خوف زدہ کیا تھا۔ وہ مثنوی بھی چاند میں ہی چھپی۔ ان دنوں چاند کی مقبولیت کا گراف یک لخت آسمان پر جا پہنچا۔ ابا بھی اس میں مزاحیہ مضامین بھیجتے تھے۔ ہم نے بھی گھریلو ڈائری کے نام سے اس میں دلچسپ واقعات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ گھر میں مشاعرے اور ادبی محفلیں ہوتیں۔
ابا اس کے روح رواں تھے' وہ مشرقی پاکستان چلے گئے۔ تو ادبی محفلیں بھی ختم ہو گئیں۔ سوفی بھائی کا سفر جاری رہا۔ بے شمار فلموں کی کہانیاں۔ کسی بھی مکالمے' منظر نامہ وغیرہ کئی فلمیں خود بھی بنائیں۔
اس سے پہلے یہ ہوا کہ "تراشے" بند ہونے کے بعد سلطان بھائی نے بھی ایک نیم سنجیدہ رسالہ نکالا۔ وہ بھی بند ہو گیا تو ہماری آپا بیگم (بڑی بہن) نے ایک اور رسالہ شروع کیا۔ ان کی شادی سلطان بھائی سے ہو گئی۔ تو وہ رسالہ بند۔ پھر ہم نے خلوص' بڑے طمطراق سے نکالا۔ بلکہ بمبئی کے پتے پر کرشن چندر' راجندر سنگھ بیدی کو بھی خطوط لکھے کہ افسانے بھجیں۔ ان دونوں نے افسانے تو نہیں۔ جوابات ضرور دیے۔ شاباشی اور حوصلہ افزائی کے ساتھ۔
پھر ہماری شادی ہو گئی۔ رسالہ بند ہوا۔ عرصہ بعد ہمارے بیٹے اور لبنیٰ آفاق کی بیٹی نادیہ آفاق' سلطان بھائی' آپا بیگم کے بیٹوں ذی شان اور عفان نے مل کر مزاحیہ پرچہ "سنک" نکالا۔ کافی دن چلا۔ گویا ادب اور رسالوں کا شوق علی سفیان آفاق کا ڈالا ہوا تھا۔ جو ہر نسل میں خود بخود بڑھ رہا تھا۔ سوفی بھائی بے حد پُرجوش' محنتی۔ بلکہ ان تھک محنت کی بدولت زبردست کاوش کی وجہ سے ادب کی دنیا میں نام پیدا کر چکے تھے۔ نوائے وقت کے فیملی میگزین کے بانی بھی وہی تھے۔ وفات کے ایک ہفتہ پہلے صاحب فراش ہو گئے۔ لیکن لیٹے لیٹے بھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ اسپتال پہنچ کر بھی اصرار کرتے رہے کہ مجھے آفس جانا ہے۔ کام کرنا ہے۔ شوق کی انتہا۔
اٹھائیس کتابوں کے مصنف تھے۔ بے شمار فلموں کے خالق۔ انہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ شخص صرف لکھنے کے لیے دنیا میں آیا ہے۔
کہتے ہیں انسان چلا جاتا ہے۔ یاد رہ جاتی ہے۔
میرا خیال ہے کہ انسان جا کر بھی نہیں جاتا۔ وہ ذہن کے پردے میں مجسم موجود رہتا ہے۔ مثال بن کر۔
پورے ملک کے اخبارات۔ تمام ٹی وی چینل اس کے گواہ ہیں۔ ہر اخبار میں ہم عصروں کے مضامین۔ ٹی وی کے ہر چینل پر ان کے بارے میں پروگرام چل رہے ہیں۔ مثال در مثال۔ گواہ در گواہ۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ آمین۔

آپ کا باورچی خانہ

فرح رضوی

(1) بھئی ہم تو کھانا پکاتے ہوئے صرف ایک چیز کا خیال رکھتے ہیں اور وہ ہے جیب۔ ظاہر ہے بھئی جتنے جیب میں پیسے ہوں گے اسی کے حساب سے ہی تو ہنڈیا پکائیں گے۔ ویسے بھی میرا بیٹا کہتا ہے جو سبزی سب سے سستی ہوتی ہے مما وہ پکاتی ہیں۔ اس لیے مما سے پوچھنے کے بجائے سبزی والے سے پوچھنا چاہیے کہ آج سب سے سستا کیا ہے۔

(2) کچن بھی گھر کے حساب سے ہے' جیسے کہ ہم لوئر مڈل کلاس لوگوں کے ہوتے ہیں۔ یعنی کمرے کی ہی ایک سائیڈ پر چولہا اور برتنوں والا اسٹینڈ رکھ کر اسی اسٹینڈ کے ایک خانے میں مسالہ جات والے ڈبے رکھے جاتے ہیں۔ چونکہ وہی کمرہ سٹنگ روم' بیڈ روم وغیرہ ہے' اس لیے پکاتے ہی ساتھ ساتھ سب کچھ سمیٹنا سلیقے سے زیادہ مجبوری ہے۔

(3) صبح کا ناشتہ ہمارے ہاں عموماً" ایک ہی طرح کا ہوتا ہے۔ یعنی پراٹھا اور رات کا سالن اور چائے۔ اس کے علاوہ سردیوں میں کبھی مولی کے پراٹھے بن جاتے ہیں اب ان کی ترکیب کیا بتاؤں وہ تو سب کو ہی بنانے آتے ہیں۔

(4) باہر کھانا فیشن تو ہے۔ لیکن وہی حساب یہاں بھی ہے کہ فالتو پیسے جن کے پاس ہوں وہ ایسے اللے تللوں پر ضائع کرتے ہیں ہم جیسے جو گھر میں ناپ تول کر پکائیں وہ ہوٹلنگ کیا جائیں۔

(5) ظاہر ہے بھئی موسم کو تو مد نظر رکھنا ہی ہے' کیونکہ بات تو پھر جیب کی آجاتی ہے' موسمی سبزیاں سستی ہوتی ہیں اور بے موسمی مہنگی۔

(6) اچھا پکانے کے لیے محنت اور خلوص نیت کے ساتھ تھوڑا سا پیار بھی شامل کریں تو لذت دوبالا ہو جاتی ہے۔ چاہے وہ آلو یا دال ہی کیوں نہ ہو۔

(7) مہمان عموماً" بتا کر ہی آتے ہیں جو بتا کر نہ آئیں ان کی تواضع آپ بازار سے کولڈ ڈرنک' چائے' بسکٹ' نمکو اور چپس وغیرہ سے کریں' یہ سب کھا کر ان کی تسلی تو ہو جائے گی۔ اتنی دیر میں گوشت کا کوئی بھی سالن بن جاتا ہے' روٹی' چاولوں کے ساتھ۔ لیکن یہاں میں آپ کو دال کے کوفتوں کی ترکیب بتا رہی ہوں جو کہ محنت طلب تو ہے لیکن قیمے کوفتوں سے کسی طرح کم نہیں آزمائش شرط ہے۔

دال کوفتہ

اجزا :

چنے کی دال	ایک پاؤ
ادرک' لہسن پیسٹ	دو چمچے
ہری مرچ' ہرا دھنیا	تھوڑا سا
نمک' لال مرچ	حسب ذائقہ
پیاز	تین عدد
دہی	آدھا پاؤ
پسا گرم مسالا	ایک چمچہ
گھی	حسب ضرورت
ہلدی' پسا دھنیا	ایک چمچہ

چنے کی دال کو ابال کر سل پر باریک پیس لیں۔ پھر اس میں آدھا ادرک لہسن پیسٹ ہری مرچ' گرم مسالا اور نمک' مرچ ملا کر خوب مکس کریں اور پھر کوفتے بنالیں۔ اب ایک دیگچی میں پانی ابلنے کے لیے رکھ دیں اور اس پر چھلنی اس طرح ایڈجسٹ کریں کہ پانی چھلنی تک نہ پہنچے اور اس چھلنی پر کوفتے رکھ کر ڈھکن بند کردیں اور پانچ سے دس منٹ تک پانی ابلنے دیں۔ اب ایک دوسرے چولہے پر دیگچی میں گھی گرم کریں اور پیاز ڈال کر گلابی کرلیں۔ پھر اس میں ادرک' لہسن پیسٹ ڈال کر بھونیں۔

جب خوشبو آنے لگے تو اس میں تمام مسالا جات ڈال دیں' سوائے گرم مسالے کے اور خوب بھونیں' کوفتے چھلنی سے نکال کر مسالے میں ڈالیں اور اچھی طرح سے بھونیں۔ ان کوفتوں میں چمچ ہلاتے ہوئے ڈریں نہیں' کیونکہ یہ ٹوٹیں گے نہیں' جب کوفتے بھن جائیں تو دہی ڈال دیں۔ دہی کا پانی خشک ہو جائے تو حسب پسند شوربا بنا کر گرم مسالا' ہری مرچ' ہرا دھنیا ڈال کر دم پر رکھ دیں' گرم نان یا روٹی کے ساتھ سرو کریں۔

(8) اگر شیشے کی کسی بوتل کو صاف کرنا ہو تو پسی ہوئی سرسوں کا ایک چمچ بوتل میں ڈال کر بوتل کو ٹھنڈے پانی سے بھر دیں تھوڑی دیر بعد دھولیں صاف ہو جائے گی۔

اب اپنا تعارف کروادوں میرا نام مسز فرح رضوی ہے اور میرا تعلق لاہور سے ہے۔

☆



مزے دار پراٹھے بنائیں

خالدہ جیلانی

آلو اور دال کے پراٹھے

ضروری اشیا :

مونگ کی دال	آدھا کپ
آلو	دو عدد
آٹا	دو کپ
پسی سیاہ مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
نمک 'تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

آٹے میں نمک ڈال کر گوندھ لیں۔ آلو ابال کر چھیل کر میش کرلیں۔ دال کو ابال کر آلو' ہرا دھنیا' ہری مرچ' لیموں کا رس' سیاہ مرچ اور نمک کے ساتھ اچھی طرح مکس کریں' چھوٹے چھوٹے پیڑے بنائیں۔ ایک پیڑے کے اوپر آلو اور دال کا آمیزہ رکھیں۔ دوسرے پیڑے کو اس کے اوپر رکھیں پھر کنارے دبا کر روٹی کی طرح بیل لیں۔ توے پر تیل یا گھی ڈال کر پراٹھے کی طرح سینک لیں۔ چٹنی اور رائتہ کے ساتھ پیش کریں۔

سیخ کباب پراٹھا

ضروری اشیا :

گوشت	ایک کلو
فائن آٹا	آدھا کلو
کھانے کا سوڈا	دو چٹکی
کچری پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
پیاز	چار عدد
ادرک لہسن پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
نمک 'تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

گوشت کے کیوبز کاٹ کر اس میں کھانے کا سوڈا' کچری پاؤڈر' گرم مسالا' پسی سیاہ مرچ' لال مرچ' نمک' پیاز' ہرا دھنیا' لہسن ادرک پیسٹ ڈال کر تھوڑی دیر رکھ دیں۔ اس کے بعد چوپر مشین میں ڈال کر قیمہ بنالیں۔ انگیٹھی میں کوئلے دہکائیں۔ قیمے کو سیخوں میں پرو کر کوئلوں پر سینک لیں۔ سینکتے ہوئے کباب پر تیل لگاتی جائیں۔

آٹے میں نمک اور گھی ملا کر نیم گرم پانی سے گوندھ کر تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں۔ گوندھے ہوئے آٹے کے پیڑے بنا کر پہلے تھوڑا سا بیلیں۔ اس پر سیخ کباب باریک کتری ہوئی، ہری پیاز، ہرا دھنیا اور ہری مرچیں رکھ کر دوسرا پیڑا بیل کر اس پر رکھیں اور کنارے موڑ کر گول پراٹھا بیل لیں۔ کانٹے سے پراٹھے پر شیرمال کی طرح سوراخ کر کے پراٹھے کو پہلے سے گرم توے پر دونوں طرف سے گولڈن ہونے تک فرائی کریں۔ مزے دار سیخ کباب پراٹھا تیار ہے، سلاد اور رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

پنیر پراٹھا

ضروری اشیا:۔

گندم کا آٹا	تین کپ
میدہ	آدھا کپ
نمک	ایک چائے کا چمچہ
گھی، تیل	دو کھانے کے چمچے
پنیر	ایک کپ
ہری مرچ	چار عدد
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
پیاز	دو عدد
گھی	تلنے کے لیے

ترکیب:

آٹے اور میدے میں نمک ملا کر چھان لیں، پھر اس میں گھی ملا کر پانی کے ساتھ گوندھ لیں۔ اس کے بعد ڈھانپ کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پنیر کو چورا کر کے اس میں ہرا دھنیا، ہری مرچیں، باریک کٹی ہوئی پیاز، لال مرچ، نمک اور بھنا ہوا زیرہ کوٹ کر ملائیں اور تمام اجزا کو اچھی طرح مکس کر لیں۔ اب آٹے کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنائیں اور بیل لیں۔ پھر اس میں پنیر بھر کر دوبارہ پیڑا بنائیں اور بیلیں۔ درمیانی آنچ پر توے کے اوپر فرائی کریں۔ اور سنہری ہونے پر اتار لیں۔ خستہ و مزے دار پنیر پراٹھا تیار ہے، اچار، چٹنی یا کیچپ کے ساتھ نوش کریں۔

بند گوبھی کا پراٹھا

ضروری اشیا:۔

بند گوبھی	ایک عدد
آٹا	چار کپ
ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
ہری مرچیں	دو عدد
ٹماٹو پیوری	دو کھانے کے چمچے
ہرا دھنیا	دو کھانے کے چمچے۔
گھی، تیل	دو کھانے کے چمچے۔
نمک	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب:

بند گوبھی اور ہری مرچیں باریک باریک کاٹ لیں۔ آٹے میں پگھلا ہوا گھی، تیل مکس کریں۔ اس کے بعد اس میں بند گوبھی، ہری مرچیں، ہرا دھنیا، ادرک پیسٹ، ٹماٹو پیوری اور نمک ملا دیں۔ اب تھوڑا تھوڑا پانی شامل کر کے گوندھیں۔ اس کے بعد چھ سے آٹھ پیڑے بنائیں۔ پھر انہیں بیل کر توے پر ڈالیں اور گھی، تیل کی مدد سے تلتے جائیں۔ دونوں جانب سے سنہری ہونے پر اتار لیں، دہی کی چٹنی اور اچار کے ساتھ پیش کریں۔

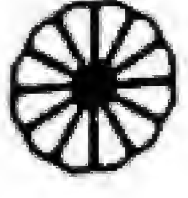
قیمے کے پراٹھے

ضروری اشیا :

میدہ	دو کپ
قیمہ	دو کپ
پیاز	ایک عدد
ہرا مسالا	حسب ضرورت
مکھن	ایک کھانے کا چمچہ
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

میدے میں نمک، مکھن اور گرم پانی ملا کر ہموار آٹا گوندھ لیں اور رکھ دیں۔ قیمہ بھون کر اس میں پیاز، لہسن، ادرک، ہری مرچیں اور دھنیا کتر کر ڈال لیں۔ ہر پیڑے میں قیمہ لپیٹ کر پراٹھے بنا لیں۔ گرم توے پر احتیاط سے گھی کے ساتھ تلیں۔ مزے دار پراٹھے تیار ہیں۔



عدنان

کیسے آتی ہو گی لڑکی کی خوشیاں

نامعلوم۔ گوجرانوالہ

میری شادی کو دو سال کا عرصہ ہوا ہے۔ میں نے ایم۔ اے کیا ہے شادی سے پہلے جاب کرتی تھی۔ ہماری فیملی پڑھی لکھی ہے۔ لیکن سسرال میں صرف میرے میاں پڑھے ہیں۔ میاں باہر ہوتے ہیں۔ شادی کے ایک ماہ بعد ہی وہ باہر چلے گئے۔ اب میرا ایک بیٹا ہے۔ امی ابو نے یہ رشتہ اس لیے کیا تھا کہ لڑکا پڑھا لکھا ہے اور کمائی بھی ٹھیک ہے۔ بیٹی کو خوش رکھے گا۔ لیکن کیا ہوا کہ شادی کے بعد سے میری شادی شدہ نند بھی میرے گھر آگئی ہے۔ اس کا بیٹا بھی ہے میں اپنے سسر اور ساس کے ساتھ رہتی ہوں۔ سب بہن بھائیوں اور ان کے بچوں کے بارے میں میرے میاں کی بات مانی جاتی ہے اور ان سب کو جب بھی ضرورت ہو' خرچا پانی میرے میاں دیتے ہیں' بڑے بھائی اور ایک بہن تو مستقل میرے میاں کی ذمہ داری ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ میرے سسرال والے بمعہ میرے میاں مجھے خرچا نہیں دیتے۔ اگر دیتے ہیں تو گن گن کر۔ کہتے ہیں کھانے پینے کی کمی نہیں۔ گھر بھی ہے۔ کپڑے بھی تو پھر مسئلہ کیا ہے۔ اگر کچھ پیسے دیتے بھی ہیں تو ان کا بھی حساب دینا ہوتا ہے۔ جن سے مجھے پریشانی ہو جاتی ہے۔ میاں ویسے تو اپنا دل کرے تو پیار سے بات کرتے ہیں۔ لیکن جب میں کچھ بات کروں تو ان کا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ دو سال میں سسرال والے جو کر سکتے تھے وہ کیا۔ مجھے اور میرے گھر والوں کو برا بھلا کہا۔ طعنے دیے۔ بات بات پر نکتہ چینی کی۔ خاوند نے شک کیا۔ جب وہ باتیں سوچتی ہوں تو دماغ پھر جاتا ہے۔ میرے خاوند اب آنے والے ہیں' لیکن وہ تمام باتیں یاد کروں تو کسی سے بھی بات کرنے کو دل نہیں کرتا۔ اب سسرال والے بھی ٹھیک ہو رہے ہیں۔ لیکن خرچ کا مسئلہ ویسا ہی ہے۔ میری رہنمائی کریں؟ سمجھ نہیں آتی میاں کو بھی مجھ سے محبت ہے کہ نہیں؟ جب میاں کو غصہ آتا ہے تو وہ مجھے اتنی باتیں سناتے ہیں کہ کیا بتاؤں۔ میرا دل ہے کہ مجھے جاب مل جائے۔ جس کے لیے میں اور میرے والدین کوشش کر رہے ہیں۔ سسرال کا ماحول بھی کافی مختلف ہے۔ میاں سب کا خیال رکھتے ہیں میرا کیوں نہیں؟ وہ چاہتے ہیں میں سب برداشت کروں گونگی بن کر۔

ج ۔ اچھی بہن! ایک مرد سے بہت سے رشتے اور بہت سی ذمہ داریاں منسلک ہوتی ہیں۔ شادی ہونے کے بعد مرد کی اولین ذمہ داری بیوی ہوتی ہے لیکن باقی رشتوں سے بھی تعلق ختم نہیں ہو جاتا۔ مڈل کلاس گھرانوں میں اگر خاندان کے کسی فرد پر اللہ تعالیٰ کا کرم ہو جاتا ہے اور وہ کسی بڑے عہدے پر فائز ہو جاتا ہے یا بڑا کاروبار کرنے لگتا ہے تو گھر کے دیگر افراد کو اس سے توقعات ہوتی ہیں کہ وہ ان کی مدد کرے گا۔ آپ کے شوہر کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔ آپ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے بہن بھائی معاشی لحاظ سے کمزور ہیں۔ اس لیے وہ ان کی مدد کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ آپ کے شوہر کو آپ کا خیال نہیں ہے یا وہ آپ سے محبت نہیں کرتے لیکن وہ اپنی ذمہ داریوں سے بھی منہ نہیں موڑ سکتے' اسی لیے جب آپ ان لوگوں کے متعلق کچھ بات کرتی ہیں تو ان کا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔

ابھی شادی کو صرف دو سال کا عرصہ گزرا ہے اتنی جلد شوہر میں تبدیلی کی توقع نہ رکھیں۔ تھوڑا انتظار کریں۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ویسے بھی آپ نے لکھا ہے۔ سسرال والے ٹھیک ہو رہے ہیں۔ آپ جاب

کرنا چاہتی ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں' اس سے ایک تو آپ کچھ دیر کے لیے اس ماحول سے نکل سکیں گی' دوسرے خرچ کا مسئلہ حل ہو جائے گا ویسے بھی آپ کے میاں صاحب باہر ہوتے ہیں۔ اس لیے آپ پر ان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے لیکن اس کے لیے آپ کو اپنے شوہر سے کی اجازت لینا ہو گی' ان کی اجازت کے بغیر کوئی قدم اٹھانا مناسب نہیں۔

آپ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ سمجھ دار اور متحمل مزاج ہیں' نرمی اور محبت سے اپنے شوہر کو اپنے اور اپنے بیٹے کے حقوق کا احساس دلائیں گی تو یقیناً" ان پر اثر ہو گا۔ شوہر کے بارے میں آپ سوچتی ہیں کہ ان کو آپ سے محبت ہے یا نہیں؟ اپنے بارے میں بھی سوچیں کہ آپ کو شوہر سے محبت ہے یا نہیں۔ جن سے محبت کی جاتی ان سے منسلک چیزوں کو بھی انسان خوشی سے قبول کرتا ہے۔

عائشہ پسرور

میں کہاں سے شروع کروں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اٹھارہ سال سے بیمار ہوں' بہت علاج کرواتی ہوں۔ آرام نہیں آتا۔ کچھ عرصہ پہلے مجھے خواب میں قرآن کریم کی سورہ توبہ کی آیت جس میں اللہ تعالیٰ نے تین صحابہ پر فرمایا ہے کہ زمین اتنی وسیع ہو کر ان پر تنگ ہو گئی کہ وہ اپنی جان سے تنگ آ گئے۔ مجھے خواب میں اس آیت کے بارے میں اشارہ ہوا تو میں سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ میں تو اس آیت کی عملی تفسیر ہوں۔ میں اٹھارہ سال سے بیمار ہوں۔ مجھے کسی دوائی سے آرام نہیں آتا۔ خدا کی قسم رل گئی ہوں۔ مجھے لگتا ہے اللہ مجھ سے ناراض ہے۔ عدنان بھائی وہ مجھے معاف کیوں نہیں کرتا۔ میں نماز اور قرآن بھی پڑھتی ہوں۔ اپنے سب گناہوں کی اللہ سے معافی مانگتی ہوں' مجھے لگتا ہے کہ وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ ہر اس انسان سے جس کی اللہ دعا قبول کرتا ہے یا جو خدا کے زیادہ قریب ہے میری درخواست ہے کہ وہ میرے لیے دعا کرے کہ اللہ مجھے معاف کر دے۔ مجھ پر رحم کر دے۔ میں نفسیاتی مریض بن گئی ہوں۔ خدا کے لیے میرا خط ضرور شائع کریں کہ شاید میرے لیے کوئی دعا کر دے۔ اللہ مجھے معاف کر دے۔

پیاری بہن! آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اللہ تعالیٰ آپ سے ناراض ہے۔ تکلیفیں' بیماریاں' پریشانیاں سب انسانوں پر آتی ہیں لیکن اللہ کے نیک بندوں پر زیادہ ہی آزمائشیں آتی ہیں۔ آپ نے حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ نہیں پڑھا۔ وہ پیغمبر تھے۔ ان کی صحت' مال و دولت' اولاد بیویاں سب اللہ تعالیٰ نے ان سے لے لیں۔ سترہ سال تک بیمار رہے اور بیماری بھی کیسی اذیت ناک کہ زخموں میں کیڑے پڑ گئے پھر ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوئی اور اللہ نے ان کو وہ سب کچھ لوٹا دیا جو ان سے لے لیا تھا۔

آپ نے اپنے خواب میں سورہ توبہ کی آیت کا ذکر کیا ہے یہ ان تین صحابہ کے بارے میں ہے اللہ تعالیٰ نے جن کی توبہ قبول کر لی تھی اور انہیں معاف فرما دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا اور معاف کرنے والا ہے ویسے بھی خواب کی تعبیر کوئی عالم ہی بتا سکتا ہے۔ آپ مایوس نہ ہوں۔ دعا کرتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ فضل کرے گا' آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ستر ماؤں سے زیادہ مہربان ہے۔

قارئین بھی بہن عائشہ کے لیے دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کی پریشانیاں دور کرے اور انہیں صحت و تندرستی عطا فرمائے۔



امت الصبور

بیوٹی بکس



رضوانہ خان۔ گاؤں میلو سیلو

س : میرے چہرے پر بال ہیں جہاں میں رہتی ہوں وہاں بیوٹی پارلر کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ تھریڈنگ کا طریقہ بھی مجھے نہیں آتا۔ کوئی ایسی ترکیب بتائیں جو میں آسانی سے کر سکوں اور بال بھی صاف ہو جائیں۔

ج : ایک خوبانی لے کر اس کو اچھی طرح پیس کر گاڑھا سا پیسٹ بنالیں پھر اس میں ہم وزن شہد ملا لیں اس آمیزہ کو چہرے پر لگا کر اس وقت تک چھوڑ دیں جب تک وہ بالکل خشک نہ ہو جائے۔ خشک ہو کر یہ جھلی کی طرح ہو جائے گا پھر اس جھلی کو رگڑے بغیر کھینچ کر اتار لیں۔ اس طرح بال بھی کھنچ کر جھلی کے ساتھ اتر جائیں گے اور جلد بھی تروتازہ اور دلکش ہو جائے گی۔

افشاں۔ لاڑکانہ

س: پیاری باجی! میں بالکل بھی خوب صورت نہیں ہوں، سب بہن بھائی گورے چٹے سرخ سفید ہیں ان کے نقش بھی اچھے ہیں دونوں بہنوں کی آنکھیں بھی بڑی ہیں اور بال بھی لمبے گھنے ہیں میں ان کے ساتھ بیٹھوں تو الگ ہی نظر آتی ہوں مجھے کوئی ترکیب بتائیں کہ میں بھی خوب صورت ہو جاؤں۔

ج۔ آج کی دنیا میں خوب صورتی کا تصور کافی حد تک بدل چکا ہے۔ اب یہ کہا جاتا ہے کہ ہر صحت مند عورت خوب صورت ہے۔

آپ درج ذیل مشوروں پر عمل کریں۔ آپ کی صحت بہتر ہوگی اور آپ خوب صورت نظر آئیں گی۔

(1) پریشان رہنا چھوڑ دیں۔ اچھی باتیں سوچیں۔ اچھی امیدیں رکھیں۔ پریشانیوں اور ٹینشن سے جلد خشک، بے رونق، آنکھوں کے گرد حلقے اور چہرے پر جھریاں پڑ جاتی ہیں، بال گرنے لگتے ہیں۔

(2) پوری نیند لیں روزانہ 6 سے آٹھ گھنٹے گہری نیند لینا ضروری ہے۔ نیند کے دوران چہرے کے پٹھے پھیلتے ہیں جس سے ہماری جلد پر خوشگوار اثرات ہوتے ہیں۔

(3) ایسی خوراک لیں جس میں تمام غذائیت موجود ہو جسم کے لیے پروٹین بہت ضروری ہیں۔ پروٹین سے بھری غذائیں یہ ہیں۔ دالیں، لوبیا، مونگ پھلی، خشک میوے اور چھلکوں والے اناج۔

تازہ ہری سبزیاں اور پھل بھی بہت مفید ہیں۔ سبزیوں اور پھلوں میں موجود ریشے ہمارے نظام ہضم کو بہتر کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ اس سے جلد بہتر ہوتی ہے اور جو گھنے ریشم جیسے بالوں کے لیے بہت اہم ہے۔ وٹامن اے حاصل کرنے کے لیے دودھ، مکھن، پنیر کا استعمال بھی اپنی روزمرہ کی زندگی میں بڑھا دیں۔

